

پایگنہ

دسمبر 2015

مجلد ہفت
معارف و حقائق

PDFBOOKSFREE.PK

☆ قیصرہ حیات، نگہت سیما اور ڈاکٹر نجمین بلال کے خوب صورت ناول

☆ فیلم احمد بشیر، سکینہ فرخ و تابندہ نعیم کی دلکش تحریریں

☆ جانی پچپانی صدکارہ ربیعہ اکرم کی کاوشوں کی حوصلہ افزا داستان



ماڈل : سونیا
میک اپ : روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی : موسیٰ رضا

پاکینہ

نگران اعلیٰ: معراج رسول
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد



رکن آل پاکستان فیڈریشن

شعبہ اشتہارات

فیجراشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانالے حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید فراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچہ (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچہ (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

www.pdfbooksfree.pk

جلد: 43 شمارہ: 09 ستمبر 2015ء

- سہولت کے لئے ہمارے ہاں تک فریدہ لاکھانی 61
 تم بن کائنات غزل 63
 نور دیار دل غزالہ عزیز 91
 معذورا قرة العین خرم ہاشمی 133
 اے عمر و ان آہستہ چل عاشفہ مسعود 155
 وہی ہونا ہے جو شمیم فضل خالق 161
 ہم روح سفر ہیں شہناز وسیم 187
 زندگی تیرا شاہی نیلم احمد بشیر 219
 وہ کون تھی ہالہ احمد 227

خصوصی مضامین

- یادوں کی مار ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی 18
 شمعِ ہدایت اختر شجاعت 255
 کیا خیال ہے عظمیٰ آفاق سعیدہ 261
 باتیں ہیں بہانہ جوان کی قارئین 263
 پاکیزہ کے مہمان شائستہ زریں 268

مستقل عنوانات

- دین کی باتیں ادارہ 16
 بہنوں کی محفل مدیرہ 278
 پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق سعید 287
 جلت رنگ انجم انصار 290

اداریہ

- مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

- نگہت سیما 26
 قیصرہ حیات 68
 اے عشق تیرے ہیں کھیل و محب دُرّ اُمس بلال 166

منی ناول

- شیریں حیدر 104

ناولٹ

- تائبندہ نعیم 140
 جبرک الفت کے اسیر فرحین اظفر 196

مکمل ناول

- سکینہ فرخ 230

افسانے

- شبانہ شوکت 57



298	پاکیزہ بہنیں	بزمِ کیا پیرہ	293	صغریٰ زیدی	میں اکثر گنگنائی ہوں
300	ادارہ	روحانی مشورے	295	پاکیزہ بہنیں	خوش فائقہ
302		ہومیوکلینک	297	مہ جبین	حسن نمکھار کے آریے

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200

Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

www.pdfbooksfree.pk





بے شک موت برحق ہے لیکن حادثاتی، اچانک اور ارضی و آسمانی آفات سے ہونے والے سانحات گہرے زخم چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ قدرتی آفات ہزاروں گھروں کو برباد کرتی ہیں، بچوں کو یتیم اور بزرگوں کو ان کی اولاد سے محروم کر دیتی ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کے بدترین زلزلے نے پوری پاکستانی قوم کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا ہے بلکہ اس حقیقت سے بھی روشناس کرا دیا ہے کہ پاکستان میں قدرتی آفات سے پیشگی خبردار کرنے والا نظام شاید کوئی ہے ہی نہیں.....

زلزلے کا مرکز کوہ ہندوکش میں افغانستان کے صوبہ بدخشاں کا علاقہ فیض آباد تھا۔ ہندوکش وہ پہاڑی سلسلہ ہے جہاں گزشتہ دو سالوں سے قدرے کم شدت کے زلزلے بھی تواتر سے آرہے ہیں..... ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ چھبیس اکتوبر کو آنے والا زلزلہ مزید خطرناک زلزلوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ یوں بھی پاکستان زلزلوں کی پٹی پر واقع ہے۔ اور ماضی میں آنے والے زلزلوں اور سیلاب جیسی قدرتی آفات سے بچاؤ کے معاملے میں حکومتوں کا ریکارڈ کوئی قابل رشک نہیں رہا۔ دوسرے ممالک میں جہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں، اچھے حفاظتی انتظامات کی بدولت نقصانات برائے نام ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسی آفات کے بعد بھاگ دوڑ تو خوب دکھائی جاتی ہے کہ ہم نے یہ کیا اور ہم نے وہ کیا..... اور فلاں سے زیادہ کیا..... مگر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہماری حکومت بعد کی بھاگ دوڑ کے بجائے قدرتی آفات سے بچاؤ کے پیشگی اقدامات پر توجہ دے اور عوام کی جان و مال کو بچانے کی بھرپور تدابیر کرے..... کہ کسی بھی حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ وہاں کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کی جائے..... دوسری باتیں تو بہت بعد کی ہیں جو زندگی سے مشروط و مربوط ہیں۔ بحران..... افراد اور قوم کو بے نقاب کیا کرتے ہیں..... اس لحاظ سے یہ ہم سب کے لیے بھی امتحان کی گھڑی ہے..... اس لیے آج آپ اپنے آپ سے پوچھیں..... کہ آپ نے اس میں کیا حصہ لیا ہے۔

مدیر
انجم انصار

ہر طرح کی تعریف اللہ کو (سزاوار) ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیاں اور روشنی بنائی پھر (اس قدر ظاہرہ کے) جو لوگ کافر ہیں وہ (دوسروں کو) اپنے پروردگار کے برابر کرتے ہیں (۱) (اے لوگو) وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر (تمہارے مرنے کا) ایک وقت معین کیا اور (قیامت کے آنے کا) اس کے ہاں ایک وقت معین ہے پھر (بھی) تم شک کرتے ہو (۲) اور وہی اللہ ہے (حاکم) آسمانوں میں اور زمین میں جانتا ہے تمہاری پوشیدہ بات کو (بھی) اور تمہاری ظاہر بات کو بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو (بھی) جانتا ہے (۳) اور (ان لوگوں کا عجب حال ہے کہ) ان کے پاس اللہ کی آیتوں میں کوئی آیت نہیں آئی مگر یہ کہ یہ لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں (۴) پس ثابت ہو گیا کہ (امر) حق جب ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو عنقریب انہیں اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کے ساتھ یہ مسخر این کرتے ہیں (۵) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے گروہ ہلاک کر ڈالے ہیں (یا جو یکہ) ہم نے انہیں زمین میں ایسا قابض کیا تھا کہ اس قدر تمہیں نہیں قابض کیا اور آسمان کو ہم نے ان پر لگا تار پانی برساتا ہوا چھوڑ دیا تھا (یعنی بارش خوب ہوتی تھی) اور ہم نے ان کے نیچے بہتی ہوئی نہریں بنائیں پھر ان کے گناہوں کے سبب سے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگ پیدا کیے (۶) اور اگر ہم تم پر کاغذ پر لکھا ہوا (قرآن آسمان سے) اتارتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے (تب بھی نہ مانتے اور) بے شک جو لوگ کافر ہیں کہتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے (۷) اور کہتے ہیں کہ کوئی فرشتہ نبی پر کیوں نہیں اتارا گیا حالانکہ اگر ہم فرشتہ بھیج دیتے تو بے شک ان کا کام تمام ہو جاتا پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی (۸) (سورۃ النعام آیت نمبر ۸ تا ۱۴)



سیدنا محمود علیہ السلام

اسم مبارک 'محمود' عدد '۸' کی خصوصیات کا مظہر:

نیز سورۃ الحاقۃ میں ارشاد ہے۔ اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے یعنی وہ آٹھ فرشتے بھی انتہائی معزز و مقرب ہوں گے نیز بہشتوں کی تعداد بھی آٹھ گنوائی جاتی ہے۔ نیز عدد '۸' انتہائی طاقت اور حکومت کا علمبردار ہے اور ابدی عظمت وہی ہے جو بہشت میں عطا ہوگی اور بہشت کا مقام محمود، آپ ﷺ کے لیے مخصوص ہے اور آپ ﷺ کا اسم مبارک 'محمود' اسی مقام عظمت سے منسوب ہے اس لیے احمد، حامد، محمود، سب کا نمبر آٹھ ہے۔

۶۔ الفضائل:

۱۔ روزانہ با وضو حالت میں ۴۰ مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے والا بہت جلد دولت مند ہو جائے گا۔

۲۔ روزانہ نماز فجر اور نماز عشا کے بعد ۱۴۰ مرتبہ پڑھنے سے ہر دعا پوری ہوگی اور چند دنوں میں حاجت پوری ہو جائے گی۔

نوٹ: ہر قسم کا ورد کرنے سے پہلے کسی مستند روحانی بزرگ کی اجازت ضروری ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



پر عقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز روداد

یہ داستان جو میں رقم کر رہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں..... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستان عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

تیسرا باب

قلم پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔ مجھے اپنی زندگی کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ میں نے اگر کسی کو کوئی تحفہ دیا ہے تو قلم اور قرآن شریف کا..... اور ملا تو بھی قلم اور قرآن شریف..... میں قابل ذکر تحفے کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے زندگی میں سب سے پہلا قابل ذکر تحفہ ملا وہ قرآن حکیم ہی تھا۔ جس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں اور میں نے لکھ کر دیا وہ بھی قرآن حکیم.....

آج بھی میں اپنے قلم کے ذریعے اگر کسی کے حق میں کوئی کلمہ خیر لکھ سکتی ہوں تو ضرور لکھتی ہوں۔ کوئی

یہ داستان جو میں لکھ رہی ہوں وہ صرف قلم اور قرآن حکیم کے حوالے سے ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں میری زندگی صرف دو چیزوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایک قلم اور دوسرا قرآن حکیم..... اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور قرآن حکیم کے اندر پورا کا پورا علم بند ہے۔ جس شخص نے ان دو چیزوں کو تھام لیا اس نے فلاح پائی۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ قلم میں قسم کھائی ہے۔

”ج۔ قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم!“ (۱-۲۸)

قلم اور اہل قلم دونوں کی قسم کھائی گئی۔ اب اہل

”تم ہماری طرف ایک قدم بڑھاؤ، ہم تمہاری طرف دس قدم بڑھائیں گے۔ تم چل کر آؤ، ہم دوڑ کر آئیں گے۔“ اللہ سے محبت کرو دل کو سکون ملتا ہے۔ قرب الہی حاصل ہوتا ہے۔ عزت ملتی ہے، کامیابی ملتی ہے۔ برخلاف اس کے کہ کسی انسان کی محبت میں ڈوبو تو رسوائی ملتی ہے، جدائی مقدر بنتی ہے اور غم ملتا ہے۔ جس قدر اس کی جانب بڑھو وہ دور بھاگتا ہے۔ تیز اور تیز..... پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا اور اپنے آپ کو وہ سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے جو وہ ہوتا نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس ہستی کو دل میں بسائیں جو عطا کرنے والی ہے۔ سکون کی دولت سے مالا مال کرنے والی، عزت دینے والی اور سو گنا محبت کرنے والی۔

مجھے اپنے قلم پر اختیار ہے نہ جذبول پر..... خیالات کا ایک سمندر ہے جو مجھے بہا کر نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، لکھنا چاہتی ہوں مگر وہ سب کچھ لکھ نہیں سکتی نہ کہہ سکتی ہوں۔ میں تو اس یادوں کی مالا میں صرف چند باتیں لکھ رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری تحریر میں ربط ہے یا یہ بے ربط ہوگئی ہے۔ اب پھر اپنے لکھے ہوئے قرآن حکیم کی بات کروں گی۔

میں نے دوسرا قرآن پاک 3 دسمبر 1973ء میں مکمل کر لیا تھا پھر یکے بعد دیگرے دو بچوں کی پیدائش (کاشف 14 فروری 1974ء اور عالیہ 10 مئی 1975ء) نے مجھے بے حد مصروف کر دیا۔ میں قرآن پاک کثرت سے پڑھا کرتی لیکن دل میں ایک ہوک سی اٹھتی، ایک بار پھر لکھنے کی..... میں بے چین رہنے لگی۔ میں نے اپنے شوہر سے ایک ریکویسٹ کی کہ قرآن پاک لکھنے کے لیے کاغذ کا انتظام کریں وہ میری بات کب ٹالتے تھے مگر جانتے تھے کہ میں گھر میں کتنا کام کرتی ہوں، تین بچوں کی پرورش اور پورے گھر کا کام..... ان دنوں میری صحت بھی گر گئی تھی مگر میرے ذہن میں قرآن حکیم لکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ چنانچہ میرے شوہر نے کاغذ پرنٹ

سورہ لکھ کر گفٹ کر دیتی ہوں یا پھر دعا کے لیے قرآن حکیم بھی پڑھ دیتی ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں، رشتے داروں، دوستوں اور کئی لوگوں کے لیے قرآن پاک ختم کیے اور دعائیں کیں۔ میری بے شمار دعائیں قبول ہوئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم ہے۔

عجب بات ہے کہ کسی بات کو صرف سوچ لوں وہ بھی ہو جاتی ہے۔ دل میں کسی چیز کا خیال کروں وہ پوری ہو جاتی ہے۔ کسی سے ملنا چاہوں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ کسی کا فون نمبر چاہیے، وہ مل جاتا ہے۔ دور دراز بیٹھی دوستوں سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ (جن سے رابطے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہوتی) صرف میرے سوچ لینے کی دیر ہوتی ہے اور غیب سے کوئی ایسا انتظام ہو جاتا ہے کہ میری خواہش فوراً پوری ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں، بہت بڑا گناہ ہے۔ دعائیں پوری ہونے کے تین طریقے ہیں۔

1۔ جوں کی توں دعا قبول کر لی جائے۔

2۔ اس سے بہتر چیز عطا ہو جائے۔

3۔ آخرت کے لیے دعا کو اٹھا کر رکھ لیا جائے

اور دوسری زندگی میں اس کے عوض بیش بہا تحائف سے نوازا جائے۔

ساری بات عقیدے کی ہے، یقین کی ہے اگر یقین نہیں تو کچھ بھی نہیں..... دنیاوی زندگی صرف سراب ہے، دھوکا ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں، اصل زندگی وہ ہے جو آنے والی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور یہی ہمارا یقین ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر گزار ہونا ہے۔ خواہ ہمیں کچھ ملے یا پھر چھین جائے۔ راضی بہ رضا ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جب اللہ تجھ سے راضی اور تو اللہ سے راضی۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

”تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔“

(۱۵۲-۲) اپنے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یاد کو بسائے رکھنا چاہیے۔ باقی سب بیکار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرو، اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

کروائے اور 6 مئی 1976ء کو تیسرا کلام پاک لکھنا شروع ہوا۔ اس وقت میرے بچے، دو اور ایک سال کے تھے۔ میں دوپہر کے وقت بعد نماز ظہر لکھا کرتی تھی۔ آصف اسکول سے واپس آ کر سو جاتا۔ کاشف دو سال کا تھا۔ وہ کھلونوں سے کھیلتا رہتا۔ عالیہ ایک سال کی تھی اور چلتی نہیں تھی۔ (اس نے دیر سے چلنا شروع کیا) ان دنوں میں نے کھانے کی میز پر اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ میں اپنے برابر کی کرسی پر عالیہ کو بٹھاتی اور اس کے سامنے میز پر باریک دال موٹھ رکھ دیتی اور وہ ایک ایک دانہ لکھٹا کر کھاتی رہتی، خاموشی کے ساتھ اور میں قرآن پاک لکھتی رہتی۔

میری خواہش کتنی آسانی سے پوری ہوتی رہی۔ اب سوچتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ بچوں نے اس معاملے میں بالکل تنگ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ عام بچے تھے۔ آپس میں کھیلنے کودنے اور لڑنے جھگڑنے والے، اودھم مچانے والے مگر بہت کہنا ماننے والے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی مارا نہیں، ہمیشہ پیار سے سمجھایا۔ پیار سے پڑھایا۔ اپنے تینوں بچوں کو قرآن پاک میں نے خود ہی پڑھایا، کوئی مولوی نہیں رکھا۔

یہ قرآن حکیم جو میں نے 6 مئی 1976ء کو شروع کیا تھا وہ اسی سال 8 دسمبر 1976ء کو مکمل ہو گیا۔ دیکھیں اللہ کی قدرت اور اس کا کرم..... کس طرح اس کی رحمت میرے ساتھ ساتھ رہی۔ اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ یہ بڑا کام کتنی جلدی مکمل ہوا۔ قرآن حکیم کے ساتھ، ساتھ مجھے ناؤز کی بھی فکر تھی جو تین عدد ناؤز میں نے مسلم باغ میں لکھے تھے وہ جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ ان کی اشاعت کا مسئلہ تھا۔ میرے دو ناول فروغ ادب سے شائع ہوئے تھے۔ جناب سرور کیفی صاحب نے خوشی سے شائع کیے تھے مگر پھر انہوں نے اپنا یہ اشاعتی ادارہ بند کر دیا اور نعت گوئی میں مشغول ہو گئے۔ ان کے 18 نعتیہ کلام کے مجموعے شائع ہوئے اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ (آمین) میری شدید

خواہش کو دیکھتے ہوئے بلگرامی صاحب نے میرا ناول ”اک دیا بجھا بجھا سا“ خود شائع کر دیا۔ ان دنوں ان کی جیب خالی تھی مگر جو کچھ تھا کتاب کی اشاعت پر لگا دیا۔ اس کی چھپائی اور کاغذ معیاری نہیں تھا کیونکہ اتنی رقم پاس نہیں تھی مگر میری خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا ناول ”ستاروں سے آگے“ ایک ہفت روزہ میں شائع کروایا جس کی غالباً 180 اقساط تھیں۔

ابھی میں تیسرے کلام پاک کو لکھ کر فارغ ہوئی تھی کہ افسانہ نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ میرے شوہر نے مجھ سے کہا افسانے لکھا کرو۔ میں چونکہ صرف ناول ہی لکھ رہی تھی اور اس وقت تک پانچ ناول لکھ چکی تھی۔ اس وجہ سے افسانے کی طرف دھیان نہیں گیا مگر بلگرامی صاحب کے مشورے اور زور دینے پر میں نے 1977ء سے افسانہ نگاری شروع کر دی پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں کی کہانیاں بھی لکھنی شروع کر دیں جو لاہور کے ماہنامے تعلیم و تربیت میں شائع ہونے لگیں۔ سب سے پہلے میں نے تعلیم و تربیت میں اپنی بیٹی عالیہ کے لیے لکھی گئی نظمیں شائع کروائیں۔ اس وقت ماہنامہ تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر پروفیسر خالد بزمی (مرحوم) تھے جو میو کالج لاہور میں تھے۔ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ نہ صرف یہ کہ میری نظمیں شائع کیں بلکہ کہانیاں اور مضامین بھی..... میری اکثر کہانیوں پر انہیں اعتراض ہوتا تھا کہ انجامِ غم ناک ہے پھر یہ کہ میری کہانیاں بہت چھوٹے بچوں کے لیے نہیں تھیں۔ ان میں افسانوی رنگ جھلکتا تھا۔ وہ مجھ سے شکایت کرتے تھے مگر میں مجبور تھی اپنا طرزِ تحریر بدل نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتی رہی اور وہ چھاپتے بھی رہے۔

میرے افسانے ہر ماہ کسی نہ کسی ڈائجسٹ میں چھپتے رہے۔ ان دنوں پاکیزہ ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ دیگر ڈائجسٹ بھی چل رہے تھے۔ کبھی نئے تھے اور انہیں اچھے رائٹرز کی سپورٹ کی ضرورت تھی۔ افسانہ نگاروں

کی حوصلہ افزائی کے لیے پاکیزہ ڈائجسٹ نے 1978ء اور 1979ء میں افسانہ نگاری کا مقابلہ کروایا اور اول آنے والے افسانے پر 500 روپے کا انعام مقرر کیا۔ میں نے اس میں پہلا انعام حاصل کیا۔ 1979ء میں، میں نے بہت زیادہ لکھا۔ اس سال میرے 18 افسانے شائع ہوئے۔ بچوں کی کہانیاں اس کے علاوہ تھیں اور ”بندھن“ ناول بھی قسط وار شائع ہوا۔ ان ڈائجسٹوں کے علاوہ میں اردو ڈائجسٹ میں بھی لکھ رہی تھی۔ اردو ڈائجسٹ میں بڑے ادیب ہی شائع ہوتے تھے۔ میں نے یہاں بھی اپنی جگہ بنالی۔ ایک دن یگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر میرے گھر آئے اور میرے ساتھ ایک شام منانے کی تجویز رکھی۔ میں نے منع کر دیا، میں نہیں سمجھتی تھی کہ اتنی جلد لوگوں کو میرے ساتھ شام منانی چاہیے۔ وہ صاحب مایوس ہو کر واپس چلے گئے مگر پھر وہ صاحب 1982ء میں دوبارہ آئے۔ اس وقت تک میں بہت زیادہ چھپ چکی تھی۔ اس بار میں نے منع نہیں کیا اور بلگرامی صاحب کی اجازت سے راضی ہو گئی۔ چنانچہ وائے ایم سی اے میں میرے ساتھ ایک شام منائی گئی جس میں سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ عراق تو نصل خانے کے میڈیکل چیئر مین ڈاکٹر علی مطلق مہمان خصوصی تھے۔ مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر طاہرہ اور شمع زیدی تھے..... رُوداد جنگ اخبار میں شائع ہوئی۔ انٹرویوز کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور افسانہ نگاری کے ساتھ، ساتھ ناول نگاری بھی ہوتی رہی۔ مختلف رسالوں کے مالکان کے یہاں اکثر تقریبات ہوتیں اور بلگرامی صاحب مجھے ہمیشہ لے جاتے۔ ہر ایک سے ملواتے۔

مجھے تمام زندگی اللہ کی رحمت سے کامیا بیاں ملتی رہیں۔ میں نے جس چیز میں ہاتھ ڈالا کامیاب ہوئی۔ جس راستے کو چنا منزل کا پتا پایا۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف قرآن حکیم کی برکتیں تھیں، مجھے ہمیشہ ایک قسم کے تحفظ کا احساس رہا۔ اسکول کے زمانے میں جب نویں

اور دسویں جماعت کا ایک ساتھ امتحان ہوتا تھا (میٹرک کے لیے) اس وقت نویں جماعت کا ہوم انگریز سیشن ہوتا تھا۔ ہمارے جیکب لائن اسکول میں نویں جماعت کے پانچ سیکشن تھے۔ نویں کلاس کے سالانہ امتحان میں، میرے پانچوں سیکشن میں سب سے زیادہ نمبر تھے۔ میں تصور ہی تصور میں خود کو اس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ دن دکھایا۔ میں نے گورنمنٹ کالج فار ویمن فریروڈ سے بی ایس سی کیا۔ اس کالج میں ہر سال ہر مضمون میں اول آنے والی لڑکی کو ایک تقریب کے دوران انعام ملا کرتا تھا۔ ایف ایس سی میں تو میں انعام حاصل نہ کر سکی مگر بعد میں بی ایس سی پارٹ ون اور پھر بی ایس سی پارٹ ٹو میں بھی بائنی میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر اول انعام حاصل کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان کے ہاتھ سے انعام لیتے ہوئے میرے پاس یادگار تصاویر موجود ہیں۔

اب میں آپ کو ایک عجیب سی بات بتاؤں۔ مجھے تقریر کرنا نہیں آتی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی تقریر کی تھی۔ مگر مجھے یہ شوق تھا کہ میں اردو ڈیپارٹمنٹ سوسائٹی کی وائس پریزیڈنٹ بنوں۔ میں اس کرسی پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ یہ میری خواہش تھی اور جو خود تقریر نہ کرتا ہو وہ وی پی کی پوسٹ پر کیسے پہنچ سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو میری خواہش پوری کرنی تھی اس لیے یہ ہو گیا۔ میں اپنی کلاس کی سی آر تھی۔ اردو ڈیپارٹمنٹ سوسائٹی میں بھی اور بزم ادب میں بھی۔ انٹرسائنس میں بائنی سوسائٹی کی سی آر بھی رہ چکی تھی۔ بہر حال اس وقت بات ہو رہی ہے بی ایس سی کے زمانے کی۔ مجھے سی آر تو چن لیا گیا تھا پھر انہی سی آر لڑکیوں میں سے کسی ایک کو وی پی نامزد کیا جانا تھا۔ سوسائٹی میں پورے کالج کی آرٹس اور سائنس کی تمام کلاسوں کی سی آر شامل تھیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک لڑکی نے میرا نام لے دیا۔ پھر اس کے بعد اسی نام پر سب نے اتفاق رائے کیا اور یوں میں وی پی بن کر ایک دن اس کرسی پر جا بیٹھی۔ جس کا میں نے خواب

دیکھا تھا اور ایک بڑے تقریری مقابلے کی صدارت کی جس میں کراچی کے کئی کالجز آئے ہوئے تھے۔ پھر یہ سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وحیدہ نسیم ہماری بائنی کی استاد تھیں اور افسانے ناول لکھتی تھیں۔ شاعری بھی کرتی تھیں۔ انہوں نے میری شاعری دیکھی اور سرپیٹ لیا۔

”ذکیہ تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیا لکھ کر لائی ہو۔ یہ تم شاعرے میں پڑھو گی؟“ میں نے ان سے کہا آپ اسے ٹھیک کر دیں۔ غرض یہ کہ میرا شوق دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے نوک پلک سے درست کیا اور یوں میں نے اپنی یہ خواہش بھی پوری کی۔ میں اپنی ان استاد سے بے حد متاثر تھی۔ وہ بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ کلاس میں بہت سخت تھیں مگر کلاس کے باہر دوستانہ انداز میں گفتگو کرتی تھیں۔ میں چونکہ بائنی میں اچھی تھی اس وجہ سے وہ مجھے پسند کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بے حد چاہا۔ یہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔ کوئی ٹیچر اپنی کسی شاگرد کو اس طرح نہیں چاہے گا۔ 1992ء میں جب حکیم محمد سعید صاحب نے مجھے شام ہمدرد میں مہمان بلایا تھا اس دن وحیدہ نسیم صاحبہ بھی مہمانوں میں شامل تھیں (کل چار مہمان ہوتے تھے) انہوں نے جب یہ دیکھا کہ میرے ہاتھ میں قرآن پاک ہے (میرے ہاتھ کا لکھا ہوا) اور آج اسی حوالے سے مجھے ان کے ساتھ بلایا گیا ہے تو انہوں نے بے اختیار میرے ہاتھ چوم لیے۔ پروگرام کے بعد میری پیشانی پر بوسہ دیا اور بہت اچھی باتیں کیں۔ وہ میری افسانہ نگاری اور ناول نگاری سے بھی بہت خوش تھیں۔ بزم سائنسی ادب کے ایک پروگرام میں وہ مہمان خصوصی بن کر آئیں تو اس پروگرام میں، میں نے اپنا افسانہ پڑھا۔ ”فیصلہ“ جو بہت پسند کیا گیا۔ اس دن میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے بائنی میں ایم ایس سی صرف اس لیے کیا کیونکہ وحیدہ نسیم نے یہ مضمون بہت اچھا پڑھایا تھا اور مجھے اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ دو سال تک میں سب سے زیادہ نمبر لے کر اول انعام بھی لے چکی تھی۔

یونیورسٹی کے دو سال بہت یادگار ہیں۔ میں نے ایم ایس سی 1965ء میں کیا۔ ان دنوں ہمارا بائنی ڈیپارٹمنٹ زیر تعمیر تھا۔ ہماری کلاسز بیرکس میں ہوتی تھیں۔ بہت تھوڑے اسٹوڈنٹس تھے، ایم ایس سی میں داخل ہونے والے ہم صرف دس طالب علم تھے۔ جن میں آٹھ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ ہمارے چیئر مین ڈاکٹر ارتفاق علی تھے جو بعد میں V.C بھی بنے۔ ڈیپارٹمنٹ میں بہت زیادہ ڈسپلن تھا۔ سارے اساتذہ بھی اچھے تھے اور ماحول بھی اچھا..... ان دنوں گاؤں کی بڑی پابندی ہوتی تھی۔ ہر اسٹوڈنٹ سیاہ گاؤں میں ہی نظر آتا تھا اور اساتذہ سبز گاؤں میں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک ایک کینٹین تھی جہاں سے ہم دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت ہمارے پورے ماہ کے لُنج کا خرچ 5 روپے ہوتا تھا۔ ایک آنے کی روٹی اور دو آنے کا کباب خریدتے اور پیٹ بھر کر کھانا کھاتے۔ ایم ایس سی میں پر پولیس میں ہم نے کینٹین سے کھانا کھایا لیکن فائنل ایر میں گھر سے لے کر آتے تھے اور لیب میں کھانا کھاتے تھے۔ شام کی چائے بھی لیب میں بیکر میں بنتی تھی اور چھوٹے بیکروں میں پی جاتی تھی۔ فائنل میں چونکہ special paper ہوتا ہے اس وجہ سے سب لڑکے، لڑکیاں اور کم ہو کر الگ الگ بٹ گئے تھے۔ ہم نے physiology میں داخلہ لیا تھا۔ اور ہم کل پانچ اسٹوڈنٹس تھے، ایک لڑکا اور چار لڑکیاں..... ہمارے physiology کے استاد ڈاکٹر رفیق تھے جو کہ کلاس نہیں لیتے تھے لیکن topic اور کتابیں بتا دیتے تھے۔ ہم تیاری خود ہی کرتے تھے لیکن پریکٹیکل جو صبح سے شام تک جاری رہتا تھا۔ ہمارے ساتھ واحدی صاحب ہوتے تھے۔ یہ ہم سے صرف دو سال سینئر تھے اور محنتی استاد تھے۔ اپنا خوب رعب رکھتے تھے۔ میں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے پورے دور میں ان سے بہتر استاد نہیں دیکھا۔ وہ بہت اچھا پڑھاتے تھے۔ ہمارے فائنل امتحان سے قبل ہی وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہوائی یونیورسٹی

زمانہ ہے جب میرے بے تحاشا افسانے شائع ہوئے اور ناول بھی، بچوں کی کہانیاں الگ تھیں۔ پورے قرآن پاک کو ایک ہفتے کے اندر ختم کر کے دعا مانگنے کا سلسلہ جاری تھا اور میں نہ جانے کتنے کام اللہ میاں سے کروا چکی تھی۔ اپنی بات منوا چکی تھی۔ یقین بہت پختہ تھا، دعا کیوں نہ پوری ہوتی۔ انہی دنوں مجھے ڈاکٹر عبدالغفار کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کا گھر ہمارے گھر سے قریب ہی تھا۔ یہ میرے استاد ہیں plant pathologist، ان ہی کے انڈر بعد میں، میں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا۔

ان کا بڑا بیٹا ان دنوں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ نارمل نہیں تھا، اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ ایک بار ہم ان سے ملنے گئے تو اسے ہمارے سامنے دورہ پڑ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہر طرح کا علاج کر چکے، امریکا بھی علاج کے لیے لے گئے مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

رمضان شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اس رمضان میں ان کے بیٹے کے لیے قرآن حکیم ختم کیا اور دعا کی، ان سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ رمضان ختم ہوئے عید آئی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہمارے گھر بائنی کے لوگوں کی گیٹ نوکیر ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر غفار اور ان کی بیگم بھی مدعو تھیں۔ اس روز میں نے ان کی بیگم سے پوچھا۔ ”اب تو آپ کے بیٹے کو دورے نہیں پڑتے؟“ کہنے لگیں۔

”نہیں!“ میں نے کہا۔

”اور اب پڑیں گے بھی نہیں۔“ پھر میں نے انہیں بات بتائی۔ مجھے اپنی دعا پر اس قدر یقین تھا کہ آج اس بات کو کم و بیش 25 سال گزر چکے ہیں، اسے پھر کبھی دورہ نہیں پڑا۔

عرصہ ہوا ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا ہے، مرحومہ میرے افسانے شوق سے پڑھتی تھیں۔ سیدھی سادی نیک ملنسار خاتون تھیں۔ بے حد خاطر مدارات کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

میں نے پاکستان کے مختلف شہر دیکھے تھے، وقت

امریکا چلے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنا مضمون تبدیل کر لیا اور Genetics میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور اب وہ اسی ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔

یونیورسٹی کے دنوں میں بھی میں نے سالانہ پروگرام کے لیے کچھ نہ کچھ لکھا۔ قوالی لکھی اور پیش بھی کی۔ اسی طرح ٹیبلو اور کچھ دوسرے اسکرپٹ اب یہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔

یادوں کی مالا کچھ الجھ سی گئی ہے۔ بہت سے موتی ہیں، میں انہیں ایک لڑی میں پرونا چاہتی ہوں مگر ایسا نہیں کر پاتی اور اگر کوئی کام انسان کرنا چاہے اور کسی وجہ سے نہ کر سکے تو اسے وہ کام اس مقام پر اسی طرح چھوڑ دینا چاہیے۔ بقول ساحر لدھیانوی کے وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن

اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا اس لیے فی الحال اس بیان کو اس جگہ چھوڑ کر ہی میں ایک بار پھر اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ رہی ہوں۔ یعنی قرآن حکیم کی کتابت اور اس سے حاصل ہونے والی مراعات۔

میں نے اپنا تیسرا قرآن پاک 1976ء میں ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد کچھ گیپ آ گیا کیونکہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری زوروں پر تھی۔ ابھی مشکل سے تین سال گزرے تھے کہ دل اداس ہو گیا۔ قرآن حکیم کو لکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ اب میں اردو ترجمے کے ساتھ لکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر بلگرامی صاحب نے میرے لیے کاغذ کا انتظام کیا۔ مجھے دو طرح کے قلم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے میرے لیے دو قیمتی قلم خریدے۔ ایک شیفر جس سے عربی لکھی گئی اور دوسرا پارکر جس سے اردو ترجمہ لکھا گیا۔ اس کو مکمل کرنے میں پونے تین سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس بار میں نے انگریزی تاریخ نوٹ نہیں کی تھی۔ قرآن حکیم پر جو تاریخ درج ہے وہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ ہجری ہے اور اس کی تکمیل ۲۳ ذیقعد ۱۴۰۱ ہجری ہے۔

یہ غالباً 1979ء تا 1981ء کا زمانہ تھا۔ یہ وہی

گزارا تھا مگر پاکستان سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے شوہر کی دلی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ کا ایک چکر لگا آئیں اور بیوی بچوں کو بھی اپنے آبائی گھر لے جائیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شادی کے بعد جانے کا پروگرام بنایا تھا کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا اور انڈیا سے مدتوں تعلقات خراب رہے۔ اس وجہ سے جانا ٹل گیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ اور ارادہ کیا، ویزا بھی لے لیا مگر انہی دنوں ہندو مسلم فسادات ہونے لگے اور ہمارا جانا پھر ٹل گیا۔

چونکہ میرے شوہر رشتے میں میری امی کے ماموں زاد ہیں، اس وجہ سے جب ان کے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی اس وقت ہم انڈیا میں تھے تب ہم لوگ بلگرام سے علی گڑھ گئے تھے۔ مجھے بس خواب سایا د ہے کیونکہ میں بہت چھوٹی تھی۔ ان کا گھر بہت بڑا ہے۔ یہ اللہ والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے کیونکہ کوٹھی کے اوپر ”اللہ“ لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اللہ والی کوٹھی سے واقف ہیں اور ان کے مکینوں کو بھی جانتے ہیں۔ اس کا کل رقبہ پچیس ہزار مربع گز تھا۔ کوٹھی کے پیچھے دس ہزار مربع گز پر آم کا باغ تھا جسے کچھ سال قبل فروخت کر دیا گیا۔ اب بھی بہت زمین ہے۔ پانچ ہزار مربع گز پر دو منزلہ عمارت ہے اندر تہ خانے میں بھی کمرے ہیں اور تقریباً دس ہزار گز زمین خالی پڑی ہے۔ اس کے اندر کمرے اور اسٹور ملا کر تقریباً پچاس کمرے ہیں۔ اب سب ادھر ادھر ہو گئے۔ وہاں چند افراد رہتے ہیں۔ پورے علی گڑھ میں اس سے بڑی اور اس سے زیادہ خوب صورت کوئی اور کوٹھی نہیں۔ اب اس کوٹھی کو علی گڑھ یونیورسٹی کو گفٹ کر دینے کا پروگرام ہے تاکہ اس میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ہاسٹل قائم کر دیا جائے۔ ایک ہزار مربع گز کے دو پارک بنائے جائیں گے جنہیں میری دو مرحوم تندوں (پھول آپا اور ڈاکٹر رفعت) کے ناموں سے موسوم کیا جائے گا..... ان دنوں کا انتقال 35 اور 40 سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ اس طرح یہ کوٹھی اپنی اصلی حالت میں ہی محفوظ

رہے گی۔ گھر کے اندر خوب صورت مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ ویسے تو اس کوٹھی کی قیمت کروڑوں میں ہے مگر فروخت کرنے پر اسے مسمار کر دیا جائے اور وہاں Multistoried بلڈنگ کھڑی ہو جائے تو.... یہ صورت حال میرے سرال والوں کو گوارا نہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا مجھے وہاں جانا خواب سایا د ہے۔ اس گھر میں ایک لڑکا سفید کرتا پا جامہ پہنے ایک گیت گاتا تھا۔

جلدی میں لپ اسٹک بھول گئے، رومال پرانا چھوڑ گئے وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے یہ گانا فلم جگنو کا ہے جس میں دلپ کمار اور میڈم نور جہاں نے کام کیا ہے۔ ان دنوں غالباً مقبول رہا ہوگا۔ میں یہ بات اس لیے لکھ رہی ہوں کہ وہی چھوٹا لڑکا جو یہ گیت گاتا تھا، میرا شریک سفر بنا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ گھر میری سرال ہے۔ مجھے آگرہ جا کر تاج محل دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ کیونکہ یہ پاکستان آنے سے قبل دیکھا تھا اور ایک عدد تصویر بھی چھپوائی تھی۔

نہ جانے کتنی یادیں ہیں جو ذہن کی اسکرین پر ابھرتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ لیکن بعض یادیں مٹی نہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے اثرات پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یادیں دل میں بستی ہیں، اس میں بسرا کرتی ہیں، جب تک دل زندہ رہتا ہے یاد بھی زندہ رہتی ہے۔ یاد کو دل سے نکال پھینکنا ناممکن ہوتا ہے اور سچ پوچھیں تو ہمارے پاس ہوتا ہی کیا ہے سوائے یادوں کے۔ یہی یادیں جینے کا سہارا بنتی ہیں، سکون مہیا کرتی ہیں۔ میری ایک تازہ طویل نظم جو یادوں کے حوالے سے ہے اس کے ابتدائی مصرعے کچھ یوں ہیں۔

نہ ہوتی یاد گردل میں
تو دل خالی مکاں ہوتا
یہ تنہائی یہ بے چینی
یہ سوز دل کہاں ہوتا

یہ داستان جو میں رقم کر رہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں، نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستان عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔ عشق میرے نصیب میں لکھ دیا گیا۔ یہ اوپر والے کی نظرِ کرم ہے، اس کی دین ہے، اسی کی عطا ہے، اسی نے یہ راہ دکھائی۔ وہ جسے چاہے جس راستے پر ڈال دے، کسی کے اختیار میں نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔ بات عشق اور یادوں کی ہو رہی ہے تو اسی حوالے سے چند تازہ اشعار اس جگہ لکھ رہی ہوں۔

یارے نبی..... کومن میں بسا کر دل کا مگر آباد کروں
یاد کے موتی جن جن کر رکھوں من کو اپنے شاد کروں
ہاتھ بڑھاؤں اشک بہاؤں آپ ﷺ کی جالی چھونہ پاؤں
من کی چٹا کیوں کر پاؤں کس کس سے فریاد کروں
نور کی کرنیں ہر سو بکھریں دل بھر کر جب یاد کروں
ایک تمنا دل میں ہی ہے خواب میں دیکھوں خواب میں پاؤں
آپ ﷺ کو اپنی نعت سناؤں پوری دل کی مراد کروں

میں آپ ﷺ کو خواب میں دیکھ چکی ہوں، جب بہت چھوٹی تھی تب دیکھا تھا۔ ایک چوکی ہے جس پر آپ ﷺ کے دائیں جانب بیٹھی ہوں اور آپ ﷺ اپنی انگلی مبارک کو قرآن حکیم کے اوپر رکھے کچھ بتا رہے ہیں۔ یہ خواب مجھے اچھی طرح یاد ہے اور بالکل نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تعبیر پچاس سال کے بعد ملی۔ 2005ء کے رمضان المبارک میں جب کراچی یونیورسٹی کے V.C نے مجھے کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں ایک استقبالیہ دیا اور میں نے وہاں اپنا مخطوطہ کلام پاک کا نسخہ دیا تو اس نسخے کو جس طرح وہاں رکھا گیا ہے اس سے اس خواب کی تائید ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ نسخہ جو K.U میں ہے اسے میں نے محمد ﷺ کے لیے لکھا تھا اور پھر لائبریری میں جہاں سے داخل ہوتے ہیں وہاں پر ایک شوکیس میں اس

قرآن حکیم کو رحل پر کھول کر رکھا گیا ہے۔ یہ ایک بڑے سائز کا قرآن پاک ہے۔ ایسا کچھ ڈاکٹر اخلاق احمد Pro vice chancellor کی ایما پر ہوا۔ میرے دوسرے نسخے جو مختلف جگہوں پر رکھے گئے وہ کہیں بھی رحل پر نہیں ہیں لیکن یہ کلام پاک جو حضور ﷺ کے لیے ہے وہ رحل ہی پر کھلا رکھا ہے۔ شوکیس کے باہر میرا نام آویزاں ہے۔ میں نہیں رہوں گی مگر یہ اسی جگہ رہے گا۔ (انشاء اللہ)

لکھتے ہوئے نہ جانے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہوں۔ میں وہ سب کچھ لکھ دینا چاہتی ہوں جو میرے دل میں ہے، میری یادوں میں ہے مگر لکھ نہیں سکتی یا لکھنا نہیں چاہتی۔ اب میں اس قرآن حکیم کا تذکرہ کروں گی جو میرا پانچواں قرآن حکیم ہے، چوتھا قرآن حکیم ختم کیے کئی سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے بے شمار افسانے شائع ہوئے۔ جو ناول شائع ہوئے ان میں ”غمِ دل“ ”اپنی منزل“ ”ستاروں سے آگے“ ”اک دیا بجھا بجھا سا“ کے علاوہ ”بندھن“ ”گئے موسم کے گلاب“ ”موم کی لڑکی“ ”سرابِ زندگی“ ”رہ گزر“ اور ”خلش“ شامل ہیں۔ یہ سارے ناول قسط وار مختلف رسالوں میں چھپے اور مجھے داد ملتی رہی۔ بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ”سرابِ زندگی“ سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ یہ کتابی صورت میں بھی آیا لیکن پاکستان میں شائع ہونے سے قبل یہ دہلی (انڈیا) سے بھی شائع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے ”پاکیزہ“ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہوا۔ میرے تمام ناول آڈٹ آف مارکیٹ ہیں لیکن اب یہ سب دوبارہ شائع ہو رہے ہیں۔

یہ 1988ء کی بات ہے۔ میں نے ایک بار پھر قرآن حکیم لکھنے کا عزم کیا۔ جب بھی کوئی نیا نسخہ تیار کرنے کا پروگرام بنتا، پہلے سے بہتر کاغذ اور ڈیزائن کا انتخاب عمل میں آتا۔ چنانچہ کتابت شروع ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اولین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جھی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





”کون، کون ہے..... کیا نام ہے ان کا؟“ بجل کی آواز کانپ رہی تھی۔

”حاتی دادا.....“ سنہری نے سرگوشی کی۔

”حاتی دادا.....؟ تمہیں یقین ہے؟“ بجل کی آواز اب بھی کانپ رہی تھی۔

”نہیں، یقین تو نہیں ہے۔“ سنہری متذبذب ہوئی۔

”لیکن مجھے شک ہے یقین جیسا..... میں نے ظہور سے سنا تھا، وہ اماں سے کہہ رہا تھا کہ وہ مان کیوں

نہیں جاتیں کہ بھو، حاتی دادا کی اولاد ہے اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اسے پورا یقین ہے کہ حاتی دادا ہی بھوکا باپ ہے۔“

”اور..... اور پھر اماں نے کیا کہا؟“ اس نے امید بھری نظروں سے سنہری کی طرف دیکھا۔

”اماں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ فضول باتیں نہ کرے۔“

بجل کی آنکھیں بجھ گئیں۔

”ہاں، ظہور سے کی تو عادت ہے فضول باتیں کرنے کی اور تم بھی سچ سمجھ بیٹھیں۔“

”چلو ظہور سے کی بات فضول ہی سی لیکن تم اماں سے پوچھو تو سہی، اگر اتنا ہی شوق ہے تمہیں جاننے کا تو وہ

تمہاری بات نہیں ٹالیں گی..... اتنی تو لاڈلی ہو تم ان کی۔“

”میں نے ایک بار پوچھا تھا لیکن اماں نے کہا انہیں کیا خبر کون ہے میرا باپ۔“ شرمندگی اور ذلت کے

احساس سے اس کے رخسار سرخ ہوئے اور آنکھیں جھک گئیں اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کچلنے لگی۔

”خیر، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ اماں کو خبر نہ ہو۔“ سنہری نے دایاں ہاتھ ذرا سا اونچا کر کے جھٹکا۔

”اماں کسی کو منہ ہی کب لگاتی تھیں، بس ایک حاتی دادا تھا یا پھر خان دادا جن کی اماں بہت عزت کرتی تھیں۔

موتیا کہتی ہے بہت احسان تھے ان کے اماں پر۔“

”اچھا یہ کون لوگ تھے؟“ یک دم ہی بجل کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔

”مجھے زیادہ تو نہیں پتا لیکن تمہاری پیدائش سے پہلے ان لوگوں کا بہت آنا جانا تھا چو بارے پر، خان دادا

جنہیں وہاں گلی میں سب خانو دادا کہتے تھے، اکثر محفل میں بھی آتے تھے۔ رقص دیکھتے، گانا سنتے تھے لیکن حاتی دادا

کبھی محفل میں نہیں آتے تھے۔ بس اماں کے بلانے پر ہی آتے تھے، کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا، کبھی اماں کو کوئی کام ہوتا

اور.....“ سنہری نے بتایا۔

”تم نے دیکھا تھا انہیں؟“ بجل کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”دیکھا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں ہے۔ بیس اکیس سال پہلے میری عمر ہی کتنی تھی بھلا..... ہاں، موتیا اور موراں سے سنا

ہے حاتی دادا کی شخصیت بڑی شاندار تھی، بہت وجیہ تھے اور خانو دادا بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن حاتی دادا تو حاتی دادا تھے.....

موراں کہتی ہے وہاں تب گلی کی کئی لڑکیاں ان پر مرئی تھیں..... تب ہی تو بقول ظہور سے اماں ان پر مرئی تھیں۔“

بجل کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو گئی۔

”تو کیا ظہور اچھا کہتا ہے کہ حاتی دادا.....“ اس کے دل میں خیال آیا۔

”دونوں غنڈے، بد معاش تھے، بڑا رعب تھا ان کا، علاقے میں سب ڈرتے تھے۔ ان کی وجہ سے کسی کی

جرات نہیں ہوتی تھی کہ اماں کے چو بارے پر کوئی دغا فساد کرے۔“

سنہری نے تفصیل سے بتایا۔

”اچھا..... غنڈے تھے۔“ بجل کا تجسس اور اشتیاق یک دم ختم ہو گیا اور اسے لگا جیسے اس کا دھڑکتا دل ایک

لمحے کو ساکت ہو گیا ہو۔

”چل دفع کر تو کیا کرے گی باپ کا نام جان کر مر کھپ گیا ہوگا۔ ظہور اکہتا ہے غنڈے تھے، کسی کو قتل و قتل کر کے پھانسی چڑھ گئے ہوں گے۔ زندہ ہوتے تو کبھی تو چوبارے پر آ جاتے۔ حاتی دادا نہ سہی، خانو دادا تو خاصے شوقین تھے ناچ گانے کے۔“ سنہری نے مزید تفصیل بتائی۔

”دونوں کا کیا رشتہ تھا؟“ بجل نے یوں ہی پوچھ لیا..... ورنہ اب اسے ان کے متعلق جاننے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ اگر وہ ان میں سے کسی کی بیٹی تھی بھی تو وہ کوئی معزز بندے نہ تھے۔

”خانو دادا تو بڑے استاد تھے اور حاتی دادا غالباً ان کا شاگرد خاص.....“ سنہری ہنسی۔

”بلکہ ولی عہد، تب ہی تو دادا کہلاتا تھا۔“ بجل کا چہرہ یک دم سپاٹ ہو گیا تھا اور وہ خاموش بیٹھی سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے اب سنہری کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

”سن.....“ سنہری کی آنکھیں یکا یک چمکنے لگی تھیں۔ اس نے بجل کے بازو پر ہاتھ مارا۔

”سن بچو چل اسے فون کر۔“

”کسے؟“ بجل نے بے دھیانی سے اسے دیکھا۔

”عظام کو اور کسے؟“

”سچ بھو میری بات مان لے، وہ لڑکا تیری محبت میں آدھا مر چکا ہے باقی کا آدھا تو اسے اپنی اداؤں اور باتوں سے مار ڈال۔“ وہ یک دم اٹھی۔

”چل میں اپنا فون لے کر آتی ہوں۔“

بجل نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن وہ تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”پتا نہیں عظام کے پاپا آئے ہیں یا نہیں اور پتا نہیں اس نے ان سے بات کی بھی ہے یا نہیں..... اس وقت شاید اس نے جذباتی ہو کر حامی بھر لی ہو اور پھر گھر جا کر جب سوچا ہو تو ارادہ بدل گیا ہو بھلا ایک میرے جیسا بیک گراؤ نڈر کھنے والی لڑکی سے کون شادی کر سکتا ہے لیکن عظام.....! سنہری کہتی ہے وہ مختلف ہے، اس نے اس کی آنکھوں میں میرے لیے ایک الوہی محبت کی چمک دیکھی ہے، بڑا پاکیزہ سا جذبہ دیکھا ہے اور شاید سنہری صحیح کہتی ہو۔“ وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب سنہری نے لا کر اس کے ہاتھ میں فون پکڑ لیا۔

”لو میں نے نمبر ملا دیا ہے، بات کر لو۔“ بجل کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فون لے کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف بجل جا رہی تھی۔

☆☆☆

ثمر حیات دونوں بازو پیچھے باندھے بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور ہونٹ بھنے ہوئے تھے۔

عظام صوفے پر بیٹھا ثمر حیات کو ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”پاپا پلیز..... بیٹھ جائیں..... آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہیں، یہ ایسی پریشانی والی بات نہیں ہے۔“

”کیسے پریشانی کی بات نہیں ہے، اگر ممتاز خان بروقت نہ پہنچتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔“

وہ چلتے چلتے رک کر عظام کو دیکھنے لگا۔

”اور یہ ممتاز خان احمق، اس نے گاڑی کا نمبر تک نوٹ نہیں کیا۔“

”ممتاز خان اور گاڑی دونوں ایک ساتھ ہماری طرف آئے تھے اور وہ لوگ تیزی سے گاڑی بھاگ کر لے گئے۔

دراصل وہ غیر متوقع پھویشن دیکھ کر یک دم گھبرا گیا تھا۔“

عظام نے وضاحت کی۔
 ”اے گھبرانا نہیں چاہیے تھا..... وہ کوئی نو عمر نوجوان لڑکا نہیں ہے اور اس طرح کے حالات سے پہلی بار سامنا نہیں ہوا تھا اس کا۔“
 ثمر حیات نے غصے سے کہا۔
 ”پاپا پلیز..... ایزی ہو جائیں کچھ نہیں ہوا، سب ٹھیک ہے۔“ عظام باپ کو یوں پہلی بار اس طرح غصے میں دیکھ رہا تھا۔

”آج کچھ نہیں ہوا تو کل کچھ ہو بھی سکتا ہے۔“
 ثمر حیات کے لہجے سے خفگی اور پریشانی ایک ساتھ جھلک رہی تھی۔
 ”پاپا پلیز ریلیکس.....!“ عظام اپنی جگہ سے اٹھا اور ثمر حیات کے دونوں بازوؤں پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے بیڈ پر بٹھایا۔
 ”عظمی.....“ اس کے تنے ہوئے اعصاب یک دم ڈھیلے ہوئے تھے۔ اس نے عظام کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لیے۔
 ”سب کچھ کھو کر، گناہوں میں نے تمہیں پایا ہے اور میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اگر وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتے صرف اس تصور سے ہی میرا کلیجہ کٹ رہا ہے۔“
 ”آپ آج بالکل رواحہ کے بابا کی طرح بات کر رہے ہیں۔“ عظام ہولے سے ہنسا۔
 ”روحہ کے بابا کی طرح.....؟“ ثمر حیات نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”ہاں..... وہ بھی اس کے لیے ایسے ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔“

وہ بھی عظام کے لیے اس طرح جذباتی نہیں ہوا تھا۔ اپنے بیٹے کے لیے دل میں کیا جذبات رکھتا تھا اس نے کبھی اس کا اظہار بھی نہیں کیا تھا، بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے جذبات سے بے خبر تھا، اس نے عظام کے لیے زندگی کی ہر سہولت مہیا کی تھی اور سمجھتا تھا کہ اس نے عظام کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے کر سکتا ہے۔ اس نے اس سے زیادہ عظام کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن جب عظام نے اس کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی اور انہوں نے مری میں اکٹھے کچھ دن گزارے، بس ان ہی دنوں اس پر اپنا آپ ظاہر ہوا..... اور اسے پتا چلا تھا کہ عظام اس کے لیے کیا ہے اور اگر وہ زندہ ہے تو صرف اس لیے کہ اس کے پاس اس کا بیٹا عظام ہے اور اگر عظام نہ ہوتا تو شاید فرجی کے بعد وہ بہت جلد تھک کر ہمت ہار کر آنکھیں بند کر لیتا۔
 اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔

”تم کل سے یونیورسٹی نہیں جاؤ گے عظام۔“
 وہ یک دم جذباتی ہو گیا تھا۔ عظام کے ہاتھ ابھی تک اس نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے۔
 ”ہم یہاں نہیں رہیں گے..... میں تمہیں لے کر کہیں اور کسی دوسرے ملک چلا جاؤں گا..... میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

بہت سے خوف ایک دم ہی اس کے دل سے لپٹ گئے۔ جب سے مٹھا سائیں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت سے واہموں نے اس کے دل میں بے را کر لیا تھا اور انہی واہموں میں گھرے اس نے ممتاز خان کو گارڈ کے ساتھ بھیجا تھا۔
 ”پاپا.....!“ عظام نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔
 ”وہ ہمارے دشمن نہیں تھے، نہ ہی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ رواحہ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔“

”وہ رواحہ کو اغوا کرنا چاہتے تھے..... لیکن کیوں؟ کون تھے وہ؟“ اس کے بے قرار دل کو ذرا سا قرار آیا تھا لیکن اب وہ رواحہ کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ عظام کا یہ دوست اسے بہت پسند تھا۔ دل اس کی طرف کھینچتا تھا..... حالانکہ وہ بہت زیادہ نہیں ملا تھا اس سے لیکن جتنی بار بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اس کے لیے اپنے دل میں عظام جیسی محبت محسوس کی تھی۔

”ہم نے پہچان لیا تھا انہیں۔“

”پہچان لیا تھا تو رواحہ کے بابا کو چاہیے کہ وہ فوراً اپنے قریبی تھانے میں رپورٹ درج کروائیں ان کے خلاف۔ اگر ان کے خلاف کارروائی نہ کی گئی تو وہ پھر بھی ایسی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”جی! لیکن رواحہ کے بابا اب انہیں چاہتے، دراصل وہ لوگ.....“

عظام نے اپنے ہاتھ ثمر حیات کے ہاتھوں سے نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

”رپورٹ کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا پاپا..... دراصل ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وہ لوگ.....“

”آخر کون لوگ ہیں وہ اور دشمنی کی وجہ کیا ہے؟“ ثمر حیات نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”ظفری ہمارا یونیورسٹی فیلو ہے، ہم سے سینئر ہے، اس کے فادر ایم این اے ہیں ممتاز سومرو اور اس کے چچا ایم پی اے ہیں، سکندر سومرو لیکن سائیں مٹھا کے نام سے مشہور ہیں۔“

”سائیں مٹھا!“

ثمر حیات کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا..... اور اس کے اعصاب پھر کھینچ گئے۔

”بس..... اب نہیں..... اب نہیں سائیں مٹھا..... اب اگر تم نے میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو

ثمر حیات بھول جائے گا کہ وہ کس عہد میں بندھا ہے۔“

اس کی آنکھوں کے سامنے کلینک کے باہر کھڑا سائیں مٹھا آ گیا۔ سانپ کی سی چمک لیے اس کی آنکھیں جیسے اس کا تمسخر اڑا رہی تھیں..... اور وہ کہہ رہا تھا کہ سائیں مٹھا اپنی بے عزتی نہیں بھولتا کبھی..... ضرور عظام کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کے بندے رواحہ کے پیچھے نہیں عظام کے لیے آئے ہوں گے۔ ضرور اس نے کھوج لگا لیا ہوگا کہ عظام میرا..... نہیں سائیں مٹھا نہیں اب میں تمہیں وار نہیں کرنے دوں گا.....“ اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر زور سے بیڈ کی پٹی پر ماری۔

”پاپا..... کیا ہوا.....؟“

عظام پریشانی سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھرجھری لے کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا وہ آج عظام کو سب کچھ بتا گزرے، ایک ایک لمحے کی روداد سنا دے۔ اسے بتائے کہ یہ وہی سائیں مٹھا ہے جس نے اس کا دل فوج کر پھینک دیا تھا۔ آج اپنے دل میں چھپی ساری کرچیاں وہ عظام کو دکھائے..... سارے زخم، سارے درد..... اذیت ناک یادوں کا کرب اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکنے لگا۔

”پاپا کیا ہو گیا ہے آپ کو..... بی لیومی..... کوئی ڈروالی بات نہیں ہے۔“

اس نے بہ مشکل خود کو کمپوز کر کے عظام کو دیکھا۔

”پاپا کوئی بہت بڑا ایشو نہیں تھا، ظفری نے خواہ مخواہ اسے مسئلہ بنا دیا ہے۔“

”تم عظام..... تمہیں یقین ہے کہ وہ لوگ رواحہ کے لیے آئے تھے؟“

”جی پاپا.....! ارتقا ہمارا کلاس فیلو ہے۔“ وہ ہولے ہولے پوری بات بتانے لگا۔

”ظفری یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا ہم سمجھ رہے تھے وہ شرمندہ ہے بلکہ ہم نے ارتفاع سے کہا تھا کہ اگر وہ سوری کرے تو وہ اس کا سوری قبول کر لے..... معاملہ خود ہی ختم ہو جائے گا..... لیکن آج جب اچانک وہ آگئے اور روادح نے پہچان بھی لیا..... ایک تو ظفری کے چچا کا گارڈ تھا۔“

”روادح پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے، اللہ نہ کرے کہ اسے کچھ ہو۔ یہ ظفری، سائیں مٹھا کا بھتیجا ہے تو اسی کی طرح کا ہو گا کینہ پرور، منتقم مزاج.....“ اس نے سوچا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا..... لیکن مجھے اس وقت عظام کو پریشان نہیں کرنا چاہیے..... صبح میں خود روادح کے بابا سے بات کروں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ وہ کس قدر ظالم اور شقی القلب لوگ ہیں۔ وہ روادح کو کہیں دور لے جائیں، یا کچھ اور جو بھی انہیں بہتر لگے۔“ وہ اپنی سوچ میں گم تھا۔

”پاپا آپ کیا سوچنے لگے؟ یقین کریں..... سب کچھ ایسا ہی ہے جیسا میں نے آپ کو بتایا۔“ اس نے چونک کر عظام کو دیکھا۔

”مجھے یقین ہے بیٹا لیکن میں روادح کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔“

”پریشانی کی بات تو ہے پاپا لیکن ہم کل خود ظفری سے بات کریں گے۔ وہ خواہ مخواہ معاملے کو نہ بڑھائے۔ ارتفاع اپنی مرضی کی مالک ہے وہ جس سے چاہے بات کرے جس سے چاہے بات نہ کرے۔“

عظام نے ہلکے ہلکے انداز میں بات کی تو اس نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ عظام کو کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”پاپا آپ پھر کچھ سوچنے لگے۔ اتنے دنوں بعد ہم ملے ہیں کچھ اچھی باتیں کریں ناں.....“

اس نے ثمر حیات کے ٹکٹے پر ہاتھ رکھا۔

وہ کتنا پُرشوق تھا، کتنی بے قراری سے ملا تھا اس سے اور اب بھی بڑی پُر امید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عظام کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”ہاں، بتاؤ کیسا وقت گزر روادح کے ساتھ!“

”بہت اچھا..... بہت خوشگوار.....“ وہ مسکرایا اور اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”روادح کے بابا بہت شفیق، بہت محبت کرنے والے ہیں۔ وہ بالکل روادح کی طرح ہی میرا خیال رکھتے تھے۔

انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں بھی روادح کی طرح انہیں بابا کہوں تو انہیں اچھا لگے گا۔ اور مجھے بھی انہیں بابا کہنا اچھا لگا

اور پتا ہے پاپا، خدا بخش چاہا بھی بہت شفیق انسان ہیں۔ وہ روادح سے اور بابا سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرا بھی

انہوں نے بہت خیال رکھا۔ میں آپ کو ان سے ضرور ملواؤں گا۔ ویسے آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟“

”پتا نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پتا نہیں کب جانا پڑ جائے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اب کے آؤں تو ہمیشہ کے لیے

آؤں..... سواتی جلدی آنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ممتاز خان نے بتایا تم کچھ پریشان تھے۔ پھر مجھ سے رہا نہیں گیا فوراً

چلا آیا۔“ اس نے بغور عظام کو دیکھتے ہوئے اس کی پریشانی کا اندازہ لگانا چاہا لیکن وہ اسے پریشان تو نہیں لیکن کچھ

بے چین سالگا۔

”نہیں پاپا میں پریشان نہیں تھا۔ مجھے آپ سے بات کرنا تھی لیکن آپ کا فون بند تھا۔ آپ کا فون کیا رومنگ پر

نہیں تھا.....؟ آپ والٹس ایپ اور واٹس ایپ کیوز نہیں کرتے؟“ اس نے پوچھا۔

”رومنگ پر ہی تھا لیکن کچھ سم کا مسئلہ تھا۔“ ثمر حیات کی نظریں اسی پر تھیں۔

”اور میرے پاس آپ کا کوئی اور کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا..... ممتاز خان کے پاس بھی کوئی دوسرا نمبر

نہیں تھا..... پاپا پلیز..... اب آپ جائیں تو مجھے کوئی اور نمبر بھی دے جائیے گا۔ وہاں کا کوئی نمبر.....؟“

”کیا کوئی خاص بات تھی؟“

ثمر حیات مسکرایا۔

”جی.....!“ وہ جھجکا۔

”دراصل وہ مجھے.....“ اس نے جھجک کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ ثمر حیات نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس

کے اندر کہیں کچھ کلک ہوا..... اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

”کیا کوئی لڑکی پسند آگئی ہے میرے بیٹے کو.....؟“

”پاپا وہ.....“

عظام کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے باپ کو بچل کے متعلق بتائے۔ وہ کبھی اپنے پاپا سے بے تکلف نہیں رہا تھا.....

ایسے جیسے روادا اپنے بابا سے بے تکلف تھا۔

”کیا نام ہے اس کا..... کہاں ملی؟“ ثمر حیات کا لہجہ بہت خوشگوار تھا کچھ دیر کے لیے وہ ساری پریشانی بھول

گیا تھا۔

”بچل.....“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ثمر حیات نے خود ہی پوچھ کر اسے مشکل سے نکال دیا تھا۔

”پاپا دراصل مجھے بچل کے متعلق ہی بات کرنا تھی۔“ وہ پھر جھجکا۔

”ارے یا کیا بات کرنی ہے..... جو میرے بیٹے کی پسند وہی میری پسند۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”کہو تو صبح ہی چلتے ہیں دامن پھیلانے۔“

”پاپا مجھے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن اب مسئلہ ہو گیا ہے۔ بچل چاہتی ہے کہ آپ اس کی اماں سے رشتے کی بات

کر لیں۔“

”تو کر لیتے ہیں بات.....“

ثمر حیات کا موڈ اور بھی خوشگوار ہوا۔

”میرے بیٹے کی پسند کوئی معمولی لڑکی تو نہیں ہوگی۔ اور پھر زندگی تم نے گزارنی ہے..... جان من رٹیکس

ہو جاؤ..... مجھے ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کا کوئی شوق نہیں۔“

”میں جانتا ہوں پاپا اور مجھے آپ پر فخر ہے، دراصل.....“ وہ کچھ بے چہن تھا۔

”کیا اس کے والدین رضا مند نہیں؟“ ثمر حیات سنجیدہ ہوا۔

”ہاں نہیں..... پاپا..... یہ تو ابھی علم نہیں ہے۔ وہ تو آپ بات کریں گے تو ہٹا چلے گا، ایک اور بات بھی ہے۔“

اسے بہر حال ثمر حیات کو سب کچھ بتانا تھا بچل کے متعلق.....

”وہ بچل کی اماں اسے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں جبکہ بچل کو اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ شوہز میں نہیں جانا

چاہتی۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ ہم شادی کر لیں تاکہ اس کی والدہ اسے مجبور نہ کر سکیں۔“

”کیا مطلب.....؟ شادی کر لیں..... کیسے؟ اس کے والدین کی مرضی کے بغیر.....؟“ ثمر حیات کے دل

میں ایک ساتھ درد کے کئی نوکیلے کانٹے اتر گئے تھے۔ کیا، کیا اذیتیں یاد نہیں آئی تھیں۔

”نہیں..... نہیں پاپا.....!“ عظام نے تیزی سے لٹی میں سر ہلایا۔

”بچل چاہتی ہے آپ اس کی والدہ سے رشتے کی بات کریں اور ساتھ ہی فوری شادی کی بھی۔“

”ہوں.....“ ثمر حیات نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے وہ رضا مند ہو جائیں گی؟“

”پتا نہیں میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ان کے متعلق، بس دو بار سرسری سی ملاقات ہوئی ہے میری ان سے..... لیکن بجل کو یقین ہے کہ اگر کوئی اچھا پرو پوزل ہوا تو وہ مان جائیں گی۔“
عظام نے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ اسے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں، تم نے اس سے پوچھا نہیں کیوں.....؟ لوگوں کی خواہش تو ہوتی ہے کہ ان کے بچے ڈاکٹر بنیں..... یہ کیسی خاتون ہیں جو اپنی بیٹی کو اداکارہ بنانا چاہتی ہیں۔“
”شوہر میں پیسہ بہت ہے ناں شاید اسی لیے۔“

”کیا وہ تمہاری کلاس فیلو ہے؟ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟“ شمر حیات نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔
”نہیں..... وہ ادھر رواجہ کے پڑوس میں رہتی ہے۔ یونہی بس اتفاقات ملاقات ہوئی تھی..... اور.....“ وہ فیملی بیک گراؤنڈ والی بات گول کر گیا تھا۔ کم از کم آج کے دن وہ اس کے بیک گراؤنڈ کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”اس کے فادر کیا کرتے ہیں..... کیا نام ہے ان کا؟“

”اس کے فادر نہیں ہیں..... والدہ ہیں، ان کا نام شاہجہان بیگم ہے۔“ وہ چونکا..... اس نام نے یک دم ہی جیسے اسے حال سے ماضی میں پہنچا دیا تھا..... تب ہی عظام کے فون کی بیل ہونے لگی۔

عظام نے پاکٹ سے فون نکال کر دیکھا کوئی انجانا نمبر تھا۔ وہ آف کرنے لگا تھا کہ یک دم رک گیا کہیں بجل کا نہ ہو۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور فون آن کرتا ہوا باپ سے معذرت کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس نے عظام کی معذرت نہیں سنی تھی۔ اس نے اسے باہر جاتے دیکھا تھا لیکن نام کی مشابہت نے اسے ماضی میں جلیل خان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا اپنے سامنے سیاہ برقع میں ملبوس شاہجہان بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ شاہی محلے کا سن کر اسے اس زور کا دھچکا سا لگا تھا لیکن وہ فوراً ہی حیرت کے اس دھچکے سے باہر آ گیا۔

”آپ کہیں شاہجہان بیگم، کیا مسئلہ ہے؟“
”وہ کیا کہیں صاحب، طیفہ بد معاش نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ چوبارہ اجڑ کر رہ گیا ہے..... صرف خان دادا ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“ وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے سن رہا تھا۔ وہ جلیل خان کے ان معاملات سے بالکل آگاہ نہ تھا، نہ ہی جلیل خان نے کبھی اس کے متعلق بتایا تھا۔ پتا نہیں جلیل خان کی زندگی کے کتنے پہلو ابھی اس سے پوشیدہ تھے۔

”آپ نے تھانے میں رپورٹ کی؟“
”تھانے میں رپورٹ؟“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔

”پولیس تو خود ہڈ حرام ہے اور ایسے بندوں سے پیسے کھاتی ہے..... ہمیں تو خان دادا ہی اس بندے سے نجات دلا سکتے ہیں..... بس کسی طرح انہیں اطلاع پہنچا دو کہ شاہجہان بیگم بہت مشکل میں ہے، بہت تکلیف میں ہے۔ خان دادا اڑ کر پہنچیں گے ہماری مدد کو..... بہت انتظار کیا صاحب، بہت صبر کیا کہ خود ہی سب ٹھیک ہو جائے، خان دادا کو تکلیف نہ دیں..... لیکن کیا کریں مجبور ہو گئے ہیں۔ ظہور اسرف بڑک مار سکتا ہے..... شیدا ٹانگیں تڑوا کر بیٹھا ہے۔ وہ کمبخت جیسے ہی قدم رکھتا ہے۔ سب کونوں کھدروں میں گھس جاتے ہیں۔ زنجے بھرے ہیں سب وہاں، کب کب کس کس کی مدد نہیں کی میں نے اور میرے وقت سب ہی منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ کیا کریں جی سب کو اپنی عزتیں پیاری اور اپنا مفاد عزیز ہے اگر گلی والے ایک کر لیں تو مجال ہے کہ وہ گلی میں گھس سکے۔“ وہ مسلسل بول رہی تھی جب اس نے اسے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہے بی بی میں دادا سے بات کرتا ہوں پھر جو ان کا حکم ہوا۔“

”بس دادا کو اطلاع مل گئی تو کام ہو گیا صاحب.....“

وہ برقع کے کھل جانے والے بن بند کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ بھی کبھی غریب خانے کو رونق بخشیے..... یقین کیجیے نصیب جاگ انھیں گے ہمارے۔“

جاتے جاتے اس نے دعوت دی تھی اور وہ جی بھر کے بیزار ہوا۔

لیکن اگلی صبح وہ ملاقاتی کمرے میں جلیل خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

”آپ نے بھی سر جانے کیا کیا بکھیرے پال رکھے ہیں۔“

”بکھیرے کیسے ثمر حیات..... ایک بار شاہی مسجد کے قریب کچھ لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ تھے

میں اکیلا..... زخمی ہو گیا..... سر پھٹ گیا..... گو میں خالی ہاتھ تھا پھر بھی وہ مار کے بھاگے..... میں ان کے پیچھے

تھا..... رات کا وقت تھا..... وہ شاہی محلے میں گھس گئے اور میں بھی ان کے پیچھے..... لیکن شاہجہان بیگم کے

دروازے پر ٹھوکر کھا کر گر پڑا..... اور ایسا گرا کہ ابھی تک وہاں ہی گرا ہوا ہوں۔“ اس نے اونچا قہقہہ لگایا تھا۔

”شاہجہان مجھے اندر بھیج کر لے گئی تھی۔ مرہم پٹی کی..... دو روز دیکھ بھال کی تو بس تب سے اس کے احسان کا

بدلہ چکارہ ہوں۔“

وہ پھر ہنسا تھا۔

”بیچاری عورتیں..... کبھی کبھی مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ تم ایسا کرنا کل یا آج مغرب کے بعد شیر خان کے

ساتھ چکر لگا کر دیکھنا کون پھنسنے خان ہے وہ جو.....“ اس نے گالی دی تھی پھر جیسے چونکا..... ”کیا نام بتایا تھا تم نے؟“

”طیفا..... سر..... یہی نام بتایا تھا شاہجہان نے؟“

”ہاں..... اوئے..... وہ الوکا..... وہی ہے ناں جس کی ناک پچکی ہوئی ہے اور دائیں آنکھ کے کونے میں بڑا

سامتہ ہے۔“

”بتا نہیں سر.....“

اس نے جلیل خان کی طرف دیکھا تھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھا اے۔“

”ہاں وہی ہے، جانتا ہوں۔“ جلیل خان نے سر ہلایا۔

”آج کل بڑے پر پُزے نکال رہا ہے۔ کہہ دینا جا کر اسے کہ آج کے بعد اگر شاہجہان کے چو بارے پر

قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ کر پھینک دوں گا اور ماس..... چیل کو کھلا دوں گا..... بول دینا اسے زیادہ پھنسنے خان نہ بنے.....

اس نے ابھی صرف جلیل خان کی فیاضی دیکھی ہے۔“

”میں..... سر میں جاؤں وہاں؟“

وہ جھجکا تھا۔ ”شاہی محلے.....“ کا نام سن کر اس کی جھجک لازمی تھی۔

”اوکے، تو تم نے کون سا دل پشوری کرنے جانا ہے۔ ایک بیچاری خاتون کی مدد ہی تو کرنی ہے، پھر اتنی سی

عمر میں اتنا زہد خشک نہ بن..... ذرا آج اسی بہانے اس گلی کی رونق بھی دیکھ لے۔“

اس نے سر ہلایا تھا لیکن دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ وہاں ہرگز قدم نہیں رکھے گا۔ بلکہ شیر خان کے ساتھ کسی اور کو

بھیج دے گا۔ ہاں اگر معاملہ نہ سلجھ سکا تو مجبوراً جانا پڑے گا۔ بہر حال وہ ایک مظلوم عورت تھی۔ بھلے لوگوں کے لیے

قابلِ نفرت ہی سہی لیکن اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی..... لیکن شام کو وہ خود بھی تیار ہو کر شیر خان کے ساتھ چل پڑا

تھا۔ بتا نہیں اب یہ صرف ایک مظلوم کی مدد کا خیال تھا..... جلیل خان کے حکم کی تعمیل تھی یا اندر کہیں اس محلے کو دیکھنے

کی چاہ بھی تھی جس کا ذکر وہ سنتا اور پڑھتا چلا آیا تھا..... شاہی مسجد کے قریب گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی قلعے کی بوسیدہ دیواروں کو تکتے ہوئے سر جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ دل عجیب طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ وہ یہاں سے ہی پلٹ جائے اور شیر خان کو جانے دے لیکن دل میں آنے والے خیال کے برعکس وہ یونہی سر جھکائے چلتا ہوا شیر خان کے ساتھ گلی میں داخل ہو گیا۔ اندر پہلی تیز روشنیوں والے بلب جل رہے تھے۔ موچے اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پھولوں والی دکانوں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کہیں کسی دکان سے خریدار پھول خرید رہے تھے۔ وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھے تو بوسیدہ لکڑی کی رنگ اڑی بالکونیوں، دروازوں اور درپچوں پر رنگین آئینے لہرا رہے تھے، کبھی کی پڑھی منٹو کی کہانیوں کے منظر آنکھوں کے سامنے آئے تو اس نے گھبرا کر شیر خان کی طرف دیکھا۔

”شیر خان کسی سے شاہجہان کے گھر کا تو پوچھو۔“

شیر خان نے ایک پان کی دکان پر رک کر شاہجہان کا پتا پوچھا تو اس نے کتھے والی انگلیاں چاٹتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے یہی تو ہے سامنے شاہجہان بیگم کا چوبارہ.....“ انہوں نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ جانے کس نے شاہجہان بیگم کو خبر کر دی تھی کہ وہ خود ہی لپکتی جھپکتی باہر آگئی تھی۔

”آئیے..... آئیے صاحب آجائیے۔“ وہ انہیں لیے اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک بڑا ہال نما کمر تھا جس کے آدھے فرش پر قالین بچھا تھا۔ اور سرخ سائن کے غلاف والے گاؤٹیکے رکھے تھے۔ وہ اس ہال نما کمرے سے گزر کر انہیں ایک اور کمرے میں لے آئی تھی جس میں ایک صوفہ اور ایک ڈبل بیڈ تھا۔

”بیٹھے صاحب.....“ اس نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”شیدے نے آپ کو گلی کی طرف آتے دیکھا اور دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ خان دادا کے بندے آرہے ہیں۔ مانو میں تو قربان ہی ہو گئی۔ مجھے پتا تھا کہ خان دادا میری درخواست پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔“

”نہیں شکر یہ ہم بیٹھنے نہیں آئے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ یک دم ہی اسے کوفت سی ہونے لگی تھی۔

”تمہارا وہ طیفا، بد معاش نہیں آیا؟“

”آتا ہی ہوگا..... بس آپ بیٹھو آرام سے۔“ اس نے ایک بار پھر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور خود دروازے سے سر نکال کر آواز دینے لگی۔

”موراں..... اوموراں..... ادھر مر جلدی آ دو ٹھنڈی بوتلیں لے آ.....“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے منع کیا۔

تیرہ چودہ سال کی ایک دیہی پتلی سانولی سی لڑکی اندر آئی تھی۔

”جا بھاگ کے پکڑ لا دو بوتلیں.....“

”نہیں..... ضرورت نہیں ہے۔“ اس بار اس نے سختی سے منع کیا تھا۔

”اچھا پان تو لیں گے ناں..... کیا غضب کی گھوری بناتا ہے اپنا شیرو..... گھنٹوں منہ مہکا رہتا ہے، اصلی

چاندی کے ورق میں لپیٹ کر دیتا ہے۔“ اس سے بات کرتے مکتے اس نے موراں کی طرف دیکھا۔

”جا ناں..... کھڑی منہ کیا تک رہی ہے، بھاگ کر دو بیٹھے خوشبو والے پان پکڑ لا..... شیرو سے کہنا خاص

مہمان ہیں۔“

”تو بہ کس قدر بولتی ہے یہ عورت.....“ وہ از حد بیزار ہوا تھا۔ ایک بار تو..... اس کا جی چاہا تھا شیر خان کو اکیلا

چھوڑ کر چلا جائے۔ شیر خان کون سا کسی سے کم ہے۔ نیز لے گا خود ہی اس سے..... لیکن پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا..... اب یہاں تک آ گیا تھا تو اس پھنے خان کو بھی دیکھ لے۔ موراں، شاہجہان کے آرڈر پر بھاگ گئی تھی وہ بیزار سا بیٹھ گیا تھا۔ اور اس نے شیر خان کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا تھا..... شاہجہان بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا بتاؤں صاحب کتنی رونق ہوتی تھی یہاں پر، اس کمبخت نے وہ دن کا فساد کیا یہاں آ کر کہ اب اس کے ڈر سے کوئی جھانکتا بھی نہیں..... کہتا ہے میرے اور میرے بندوں کے علاوہ کسی نے یہاں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دے گا۔ گردن دبا دے گا۔“

وہ پھر شروع ہو چکی تھی..... اور ابھی نہ جانے کب تک بولتی کہ ظہور اندر داخل ہوا۔

”وہ آ گیا ہے..... شیرو سے پان بنوا رہا ہے..... تین بندے ساتھ ہیں۔“

شاہجہان بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”اندر آنے دو دیکھ لیتے ہیں اسے۔“

”آپ ابھی ادھر ہی بیٹھو میں دیکھتی ہوں۔“ شاہجہان بڑی پھرتی سے باہر نکل کر غالباً اسی ہال نما کمرے میں گئی تھی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ بھی شیر خان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا ہال میں آیا تھا۔ شاہجہان ہال کے وسط میں ہر اس کی کھڑی تھی اور ظہور اس کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑا تھا۔

”ایک بات کا دھیان رکھیے گا صاحب یہاں خون خرابہ نہ ہو..... بس زبانی کلامی سمجھا دیجیے گا۔“

اس نے شیر خان کو ریوالور نکالتے دیکھ لیا تھا۔

”اور اگر وہ زبانی کلامی نہ سمجھا تو.....؟“ شیر خان نے ریوالور دوبارہ جیب میں ڈال لیا تھا۔

”ویسے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے شیر خان لیکن خون خرابے سے چوبارہ بدنام ہو جاتا ہے، ایک بار.....“ وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی کہ دروازہ زور سے کھلا..... اور وہ اندر داخل ہوا۔ ثمر حیات نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ بوسکی کا کرتا ٹٹھے کی کلف لگی شلوار، سنہری زری کی کھیریاں اور کندھے پر قیمتی چادر..... دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دائیں مونچھ کو بل دیتا ہوا یہ وہی تھا چچی ناک اور بڑے سیاہ مستے والا..... اس کے پیچھے اس کے تینوں بندے بھی اندر آئے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈال کر اس نے شاہجہان کی طرف دیکھا تھا۔

”یہ تو نے آج پھر تماش بین اکٹھے کر لیے..... کیا کہا تھا میں نے تم سے کہ ادھر اب کوئی نہیں آئے گا۔“ وہ بولا۔

”چل اوئے ادھر سے نکلو..... گم کرو اپنی شکلیں۔“ اس کے بندوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا تھا جبکہ

طیفا اسی بے نیازی سے مونچھ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مروڑتا ہوا کارپٹ کی طرف بڑھتے ہوئے شاہجہان بیگم کے قریب رکا تھا۔

”بلاؤ ذرا اس چمک چھلو کو آج کچھ ایسا پیش کرے کہ پھڑک اٹھوں۔“

”اوئے تم ابھی تک کھڑے کیا پٹر پٹر تک رہے ہو، ہٹو یہاں سے۔“ اسی بندے نے آگے بڑھ کر شیر خان

کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ شیر خان سے ذرا پیچھے کھڑا گہری نظروں سے طیفے کو دیکھ رہا تھا جب شیر خان نے اس بندے کا ہاتھ جھٹک کر اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ وہ درد سے بلبلایا تو طیفیا بیٹھتے بیٹھتے رک گیا اور شیر خان کو زہریلی نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی چٹکی ہوئی ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

”کون ہو تم اور تمہیں جرات کیسے ہوئی طیفے کے بندے کا بازو مروڑنے کی۔ اور سنا نہیں تھا تم نے، چلتے

پھرتے نظر آؤ یہاں سے ورنہ۔

• ”ورنہ کیا؟“

وہ آگے بڑھا تھا..... لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے طیفے نے اپنے بندوں کو اشارہ کیا۔
”اٹھاؤ انہیں اور پھینک آؤ باہر کسی گندے نالے میں۔“ وہ واپس کارپٹ کی طرف مڑا تو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ہمیں جلیل خان نے بھیجا ہے۔“

”کون جلیل خان.....؟“ وہ پلٹتے ہوئے جیسے دہاڑا تھا۔

”تم احسان فراموش، گندی نالی کے کیڑے، تم نہیں جانتے جلیل خان کو؟“

شیر خان جو قدرے اندھیرے میں تھا یک دم روشنی میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی کی چمک نظر آئی پھر یک دم اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس کا مونچھوں کوئل دیتا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اب شمر حیات نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت آہستہ لیکن مضبوط آواز میں اسے جلیل خان کا پیغام دیا تھا۔ طیفے کا سر جھک گیا تھا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے اپنے بندوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور ان کے جاتے ہی یکا یک شمر حیات کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

”معاف کر دیں دادا..... میں جلیل خان کا غلام اس کے در کا کتا..... خان دادا کہے تو میں اپنی گردن خود کاٹ کر اس کے سامنے رکھ دوں..... غلطی ہو گئی..... خان دادا سے کہیں مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے سر ہلایا تھا۔

”دادا..... میں اپنے باپ کی اولاد نہیں اگر دوبارہ یہاں بلکہ اس گلی میں قدم رکھوں۔“

پہلی بار اس کے لیے دادا کا لفظ طیفے نے استعمال کیا تھا اور اسے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ کیا وہ دیکھنے میں دادا ٹاپ لگتا ہے؟ وہ صوفی نصیر کا بیٹا..... برصغیر میں تقسیم سے پہلے ہندوستان میں اڈوں اور باڑوں کے استاد دادا کہلاتے تھے۔ پتا نہیں اب بھی ایسے اڈے پاڑے ہوں گے۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ نہ تو کسی اڈے کا دادا تھا نہ استاد وہ تو جلیل خان کا ایک کارکن تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ایک روز لوگ اس کا اصل نام بھول جائیں گے اور ایک طویل عرصے تک دادا کا نام اس کے نام سے جڑا رہے گا۔ پہلے حیات دادا پھر حیات دادا اور پھر حاتی دادا.....

طیفا اٹھا تھا اور سر جھکائے جا رہا تھا۔

”تم نے اچھی طرح سن لیا ہے ناں پھر کبھی یہاں قدم رکھا اور شاہجہان بیگم کی لڑکیوں کو تنگ کیا تو کان کھول کر سن لو پھر عمر بھر اپنی ٹانگوں پر نہ چل سکو گے۔“

اس نے اسی مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ طیفے نے اب زبان سے کچھ نہیں کہا تھا بس ہاتھ جوڑ دیے تھے اور تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے جاتے ہی جیسے سوئے ہوئے چوبارے میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔ موراں نہ صرف مراد آبادی نقشین پلیٹ میں چاندی کے ورق میں لپٹے پان لے آئی تھی بلکہ ٹھنڈی، ٹھنڈی بوتلیں بھی لے آئی تھی۔ شاہجہان نے منہ کھولے کھڑے شیدے کو گھر کا تھا۔

”منہ کیا دیکھ رہا ہے..... اندر سے موڑھے پکڑ کر لا اور چھوٹی تپائی بھی پکڑ لا۔“

”نہیں بس اب ہم چلیں گے۔ اگر پھر کوئی مسئلہ ہو تو فون کر دیجیے گا۔“

”ارے نہیں ایسے کیسے جانے دوں آپ کو.....“ شاہجہان ان کی خاطر تواضع کے لیے ہنسی جا رہی تھی۔ شیداموڑھے لے آیا تھا اور تپائی بھی۔ موراں نے جھٹ سے پان اور بوتلیں تپائی پر رکھی تھیں۔ شاہجہان نے پھر اسے ڈپٹا تھا۔

”موراں تجھے کب عقل آئے گی جا گلاس لے کر آ..... اب کیا یہ بوتلیں منہ سے لگائیں گے۔“ اس نے.... بے بسی سے شیرخان کی طرف دیکھا اور بیٹھ گیا۔

”موراں نے گلاسوں میں بوتلوں کا ٹھنڈا مشروب انڈیلا اور گلاس ان کی طرف بڑھائے۔ تب ہی رنگین کپڑوں میں ملبوس مہکتی ہوئی چند لڑکیاں نہ جانے کہاں سے آ کر ہال میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ وہ چپک رہی تھیں۔ خوش ہو رہی تھیں اور اس کی طرف اشارے کر کے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔

”ہم چلتے ہیں۔“ اس نے خالی گلاس تپائی پر رکھا اور اٹھنا چاہا۔

”ارے نہیں صاحب بیٹھے ناں کچھ دیر تو.....“ شاہجہان نے پھر اصرار کیا اور پان پیش کیے۔

اس کے بے حد اصرار پر اس نے پان اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور پان منہ میں ڈالتے ہی اسے نہ جانے کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ جب چھوٹا تھا اور ہر عید پر اماں سے کہہ کر بیٹھا پان لے کر آتا اور اصرار کر کے اماں کو بھی کھلاتا..... بڑا ہونے پر بھی اس کی یہی روٹین رہی تھی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی کتنے سالوں بعد آج اس نے بیٹھا پان کھایا تھا۔ اماں، ابا کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ وہ اس کا کھلے محن والا گہرا اور برآمدے میں دیوار پر لگا وہ بڑا سا آئینہ جس میں پان کھا کر وہ بار بار اپنے سرخ ہو جانے والے ہونٹ دیکھتا تھا۔ اماں ہنستی تھیں لیکن وہ ان کی ہنسی پر شرمندہ نہ ہوتا تھا۔ پان وہ صرف عید پر ہی کھاتا تھا کیونکہ ابا نے سمجھایا تھا کہ پان کھانے سے دانت گندے ہو جاتے ہیں۔ وہ کھوسا گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ رنگ برنگے کپڑوں والی لڑکیاں غائب ہوئی تھیں اور کب وہ گہرے سانولے رنگ کی بنگالی نقوش والی لڑکی اندر ہال میں آئی تھی۔ کیسے سب کچھ لمحوں میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کا گھر، اماں، ابا..... ایک گہرا اور اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا اور آنکھوں سے چھلکنے لگا تھا۔

”صاحب اٹھیے..... آرام سے نیچے بیٹھ جائیں، آپ کو کوئل کا گانا سنواتے ہیں۔“

شاہجہان نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ تب ہی ظہور ابھی آ گیا۔

”ایسا بھلا کچھ ہے ناں کہ سر بھی نہیں اٹھایا۔ گلی کے باہر تک اس کے پیچھے گیا ہوں۔ شاہجہان بیگم آج تو اس خوشی میں کوئل کا گانا سنوا دو۔“ وہ چپکا تھا۔

”ہاں، ہاں اسی لیے تو بلوایا ہے اے۔“

”ہائے دادا کیا بتاؤں کیا آواز ہے، کیا لوج ہے، بندہ کوئل کی آواز میں ڈوب جاتا ہے، کھو جاتا ہے۔“

وہ اب اس سے مخاطب تھا۔

وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا منع کرنا چاہتا تھا لیکن اندر شاید کہیں کوئی خواہش چھپی بیٹھی تھی۔ خواب کے سے عالم میں وہ گاؤں تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کب سازندوں نے ساز سنبھالے تھے اور کب اس سانولی لڑکی نے مرتضیٰ برلاس کی غزل شروع کی تھی۔

جب آ کے سناتا ہے عدوتیری خبر ہر روز

ہم پر تو قیامت سی گزر جاتی ہے ہر روز

کوئل کی آواز میں واقعی جادو تھا۔ وہ گم سا ہو گیا تھا۔ یہ پہلی اور آخری بار تھی جب اس نے شاہجہان کے چو بارے پر گانا سنا تھا۔ حالانکہ جب جب وہ شاہجہان کے چو بارے پر آیا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر اس کا گانا سن لیں اس نے کبھی شاہجہان سے کہا نہیں تھا۔ ورنہ شاہجہان تو منتظر رہتی تھی کہ وہ کوئی فرمائش کرے اور وہ اسے پورا کرے۔ اس رات وہ کوئل کا گانا سن کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور گلی سے نکلتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی یہاں قدم نہیں رکھے گا اگر فرجی کو پتا چلا کہ اب وہ ایسی جگہوں پر بھی جانے لگا ہے تو وہ کتنی خفا ہوگی۔ کبھی

جب جلیل خان آجائے گا اور وہ ایک نئی زندگی شروع کریں گے تب وہ فرجی کو اس کے متعلق بتائے گا۔ اور یہ بھی کہ وہاں دو بندوں نے اسے دادا کہہ کر بلایا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہاں نہ آنے کے عہد کو کئی بار دہرایا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ انسان کے ارادے اور عہد تو ریت کی دیوار کی طرح ہوتے ہیں۔ اس روز وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں ایک بار نہیں کئی بار آئے گا۔ اور یہ پہلی بار نہیں تھی اس کے بعد بھی وہ کئی بار آیا تھا۔ ایک بار ریکھا کو پولیس والے تنگ کر رہے تھے۔ اس کی لڑکیوں کو باری باری تھانے بلاتے اور بلاوجہ ہی لاک اپ میں بند کر دیتے۔ دراصل ریکھا نے اپنے علاقے کے ایس ایچ او سے پنکا لے رکھا تھا۔ اور وہ جان بوجھ کو اسے تنگ کر رہا تھا۔ ایک بار رانو بیمار پڑ گئی تھی اور اس کے علاج کے لیے نہ تو پیسہ تھا اور نہ ہی کوئی ڈاکٹر اس کا علاج کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ ہر بار شاہجہان ہی اس کے پاس آتی تھی یا فون کر دیتی تھی۔ پہلی بار کے بعد اس نے پھر جلیل خان سے نہیں پوچھا تھا وہ سمجھ گیا کہ جلیل خان نے مدد کے لیے آنے والوں کو کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ وہاں شاہی محلے میں سب ہی اس کی عزت کرتے تھے۔ پھولوں والوں سے لے کر چوبارے والی لڑکیاں تک سب اسے حیاتی دادا کہنے لگے تھے۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا اس کے پاس آتے۔ وہ جلیل خان پر حیران ہوتا تھا۔

وہ اب اور بے چینی سے جلیل خان کی رہائی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہر پندرہ دن بعد خانوال آ جاتا تھا۔ فرجی اپنے بچوں میں مگن تھی۔ ہر بار اس کا دل مچلتا کہ وہ پلٹ کر اس دنیا میں نہ جائے اور یہاں ہی خانوال میں رہ جائے۔ وہ دنیا اس کے لیے نہیں تھی۔ وہ پندرہ سولہ سال گزرنے کے بعد بھی خود کو اس میں اُن فٹ سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ فرجی اور بچوں کے ساتھ ایبٹ آباد جا کر کچھ گھر بھی دیکھ آیا تھا۔ فرجی کو ایک گھر پسند آ گیا تھا۔ وہ وہاں جلیل خان کے کسی دوست کے ہاں ٹھہرے تھے اور جلیل خان کے کہنے پر ہی وہاں گئے تھے اور جلیل خان کے دوست نے ہی انہیں گھر دکھائے تھے۔ تاہم گھر کا سودا نہیں ہو سکا تھا کیونکہ وہ گھر جو فرجی نے پسند کیا تھا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دنوں بعد پھر چکر لگائیں گے انہوں نے جلیل خان کے دوست سے کہا تھا کہ وہ ان کے لیے کوئی اچھا لیکن مناسب قیمت والا گھر دیکھ کر رکھے۔ لیکن پھر وہ ایبٹ آباد نہ جاسکے تھے حالانکہ جلیل خان کے دوست نے انہیں بلایا تھا کہ ان کی پسند کے عین مطابق ایک گھر مل گیا ہے اور مالک مناسب قیمت مانگ رہا ہے۔ ریحان کی طبیعت ان دنوں بہت خراب رہنے لگی تھی۔ کمزور تو وہ شروع سے تھا لیکن ایک ٹوٹا مگر اب اچانک اسے سانس کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات فیڈر لیتے ہوئے بھی اس کی سانس اکھڑتی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے۔ خانوال میں فرجی نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن روز بروز جسے وہ نچڑتا جا رہا تھا۔ پھر ایک ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا کہ اسے لنگو کا نہیں دل کا پرالیم ہے۔ شدید دل میں سوراخ ہے۔ اس نے ہی انہیں ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شہریار کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا جو اُن دنوں اسلام آباد میں تھے اور دل کے ایسے کئی آپریشن کر چکے تھے۔ وہ شیر خان اور دلدار کے علاوہ جلیل خان کے ایک اعتبار کے بندے افضل کو خان ہاؤس میں چھوڑ کر اور سارے معاملات ان کے سپرد کر کے خود فرجی کو اور بچوں کو لے کر اسلام آباد آ گیا تھا۔ ڈاکٹر شہریار نے تصدیق کر دی تھی کہ ریحان کے دل میں سوراخ ہے۔ ابتدا میں وہ ہوٹل میں رہے تھے لیکن پھر انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر ریحان اور زیتون بانو کو بھی بلالیا تھا۔ وہ تقریباً دو ماہ اسلام آباد میں رہے تھے۔ ریحان کا آپریشن ہو گیا تھا۔ شروع میں ہر ہفتے اور پھر پندرہ دن بعد وہ اسے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر جاتے رہے تھے۔ وہ صحت مند ہو رہا تھا اس کے رخساروں پر سرخی آ گئی تھی جب وہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر خانوال آئے تھے۔ لیکن وہاں آنے کے چند دن بعد ہی اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ جب لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا، لاہور کا ارادہ ملتوی کر کے ایک بار پھر اسلام آباد آ گیا تھا۔ ایک بار پھر اس بچے کو آپریشن کی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا لیکن ایک امید تھی جو دل کے تاروں سے جڑی

تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ فرجی کی پلکیں ہر وقت بھیگی رہتیں۔
 ”فرجی دعا کرو اللہ ہماری دعا ضرور سنے گا۔“ وہ اسے تسلی دیتا لیکن سب دعائیں ہتھیلیوں پر ہی انگلی رہ گئیں اور ریحان نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بہت کڑا وقت تھا اس کے لیے اور فرجی کے لیے بھی..... فرجی یوں تڑپ تڑپ کر روتی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

”کیا ہماری سزا کبھی ختم نہیں ہوگی شمر.....؟“ وہ بھی منہ انداز میں سوچنے لگی تھی۔

”تم تو ایسی نہیں تھیں فرجی..... پھر اس طرح کیوں سوچ رہی ہو..... یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ تم خود ہی تو کہتی تھیں کہ اللہ بعض اوقات اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ اللہ سے صبر کی دعا مانگو اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔“

وہ اسے سمجھاتا لیکن بچے کی موت نے ایسا گھاؤ لگایا تھا جسے بھرنے میں وقت لگتا تھا۔ اس گھاؤ نے کتنے ہی پرانے زخموں کے منہ کھول دیے تھے..... فرجی کو سمجھاتے سمجھاتے وہ خود حوصلہ کھودیتا تھا۔ ریحان کے بعد بھی وہ لاہور نہ جاسکا۔ جب بھی اس نے لاہور جانا چاہا فرجی کے آنسو اسے زنجیر کر لیتے..... وہ سراپا شکوہ تھی۔
 ”ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا شمر؟“ وہ بے تحاشا روتی اور اسے اس حال میں چھوڑ کر جانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

کبھی فرجی اسے سمجھاتی تھی..... اب اس نے یہ فرض سنبھال لیا تھا..... اور چاہنے کے باوجود لاہور نہیں جا پارہا تھا۔ اسے لاہور سے آئے تین ماہ ہو گئے تھے..... ان تین ماہ میں کئی ایسے معاملات تھے جنہیں خود ہی شیر خان وغیرہ نے نبٹا دیا تھا کیونکہ جلیل خان نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ شمر حیات کو پریشان نہ کریں لیکن پھر بھی تین ماہ بعد شیر خان کا فون آ گیا تھا۔

”میں آپ کو اب بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے معاملات آپڑے ہیں کہ ہم تنہا کچھ نہیں کر سکتے۔ خان دادا سے بھی ملاقات نہیں ہو پارہی..... آپ کے دکھ کا احساس ہے مجھے لیکن مجبوری ہے۔“
 ”کہو شیر خان کیا مسئلہ ہے؟“

”بیگم عبدالغفور کو ایک شخص بہت تنگ کر رہا ہے۔ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور انہیں دھمکتا ہے کہ اگر انہوں نے رشتہ نہ دیا تو لڑکی اٹھالے گا یا چہرے پر تیزاب ڈال دے گا..... دو تین بار ہم نے زبانی کلامی سمجھایا ہے لیکن وہ باز نہیں آ رہا..... خدا نخواستہ کچھ ایسا واقعہ ہو گیا تو دادا تو دادا ہم بھی محلے میں سر اٹھا کر نہ چل سکیں گے۔“ وہ تفصیل بتا رہا تھا اور شمر حیات خاموشی سے سن رہا تھا۔

”شاہجہان بیگم بھی دو تین چکر لگا چکی ہیں کافی پریشان ہیں..... کوئی بڑا ہی مسئلہ ہے انہیں بھی..... اور سب سے بڑھ کر بسل خان، سنگا پور اور ہانگ کانگ سے کافی مال لے کر آیا ہے..... کسی اور سے بھی بات چیت چل رہی ہے اس کی، کہہ رہا تھا کہ اگر ہم نے مال نہ اٹھایا تو کسی اور کو دے دے گا، گولڈ بھی لایا ہے..... ادھر کسٹمر بھی مال کا تقاضا کر رہے ہیں..... اگر ہم نے.....“

”ٹھیک ہے.....“ شمر حیات نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”میں صبح آ رہا ہوں، تم پریشان مت ہو۔“ اور پھر پورے تین ماہ بعد اس نے لاہور خان ہاؤس میں قدم رکھا تھا۔ بسل خان سے سودا کرنے اور مال آگے پہنچانے کے بعد اس نے بیگم عبدالغفور سے ملاقات کی تھی اور شاہجہان بیگم کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ خود ہی آگئی۔ پریشان حال سی وہ بار بار برقع کے بٹن بند کرتی اور کھولتی تھی۔
 ”دادا آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”بہت مشکل میں ہیں ہم..... بد معاش سے جان چھوٹی تو شریف آدمی گلے پڑ گیا۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے شاہجہان کو دیکھا تھا۔

”کسی جاگیردار کا بیٹا ہے..... اور اس کا باپ صرف جاگیردار ہی نہیں سیاست دان بھی ہے..... ہماری مدد کرو

دادا، ہم تباہ ہو جائیں گے۔“

شاہجہان ہاتھ جوڑنے لگی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ ایسا مت کریں۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”کوئل مرگئی حیاتی دادا..... ان ظالموں نے اسے مار ڈالا۔“

شاہجہان رونے لگی تھی۔

”کوئل.....!“ اس کے کانوں میں کوئل کی آواز گونجنے لگی۔ رنج اور غصے سے اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

”وہ اسے گانا سننے کے لیے لے گئے تھے زبردستی..... اور پھر دو دن بعد اس کی لاش نوگزرے کی قبر کے پاس

پڑی ملی۔ رات کی تاریکی میں وہاں پھینک گئے تھے۔“

”کون ہے وہ؟“ ثمر حیات نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔

”اس کا ملازم اسے مٹھا سائیں کہتے ہیں۔“

”پاپا.....“ عظام نے اندر قدم رکھا تو ثمر حیات نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ تہمتار ہا تھا اور آنکھیں لو

دے رہی تھیں۔

اس نے اس کی دکتی آنکھوں کو دیکھا۔ یقیناً آنے والا فون اسی لڑکی کا ہو گا اور عظام کو اسی کے متعلق بات کرنا

ہو گی لیکن وہ ابھی ابھی ماضی کے سفر سے لوٹا تھا۔ ریحان کی موت کا دکھ اتنے سالوں بعد جیسے تازہ ہو گیا تھا اس کی

آنکھوں کے سامنے بار بار دو سالہ ریحان آرہا تھا۔ اس کے ننھے ہاتھوں کا لمس جیسے اس کے چہرے پر زندہ ہو گیا

تھا..... وہ اس کی گود میں تھا جب اس نے آخری سانس لی تھیں۔

”پ..... پاپا.....“ ننھے لبوں سے نکلا تھا۔

اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اور ہاتھ بلند کر کے اس کے رخساروں کو چھوا تھا پھر اس کے

ہاتھ نیچے گر گئے تھے اور وہ خوب صورت آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

”بیٹا میں اس وقت بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں، انشاء اللہ صبح ہم طے کر لیں گے کہ کب جانا ہے بجل کے

گھر..... اور بے فکر رہو..... مسز شاہجہان انکار نہیں کریں گی۔ کیونکہ میرا بیٹا ہے ہی اتنا خوب صورت اور اچھا۔“

اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے پاپا.....!“ اس نے ثمر حیات کے تھکے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنے کمرے

میں چلا گیا۔

☆☆☆

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں

جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے

جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے

جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے

جیسے بارش کی دعا آبلہ پا مانتے ہیں

وسعت دید نے تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں بھی تو دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے
رواحہ کی بھیجی گئی محسن نقوی کی اس نظم کو پڑھتے ہوئے ارتقا کے لبوں پر ایک بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آج سنڈے تھا۔ اور ناشتے کے بعد وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ کسی ٹاک شو کا ریپیٹ پروگرام چل رہا تھا۔ اسے اس ٹاک شو کا میزبان بہت پسند تھا۔ اس کا لب و لہجہ اس کی نالج سب ہی متاثر کن تھے۔ عموماً وہ نشر مکر میں ہی یہ پروگرام دیکھا کرتی تھی۔ وہ بہت دلچسپی سے پروگرام دیکھ رہی تھی جب میزبان ٹون ہوئی تھی اس نے فون اٹھا کر دیکھا، روحہ کا نام اسکرین پر چمک رہا تھا اور اس کی بھیجی ہوئی نظم نے اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑائی تھی۔ فون ہاتھ میں پکڑے وہ ایک بار پھر نظم پڑھنے لگی تھی۔

”میں نے اس طور سے چاہا تھے اکثر جاناں.....“

یہ روحہ بھی ناں.....“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ اسے شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔“ اس واقعے کے بعد ان کے درمیان دوستی کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی میں اکثر فری پیریڈ میں وہ اکٹھے کہیں نہ کہیں بیٹھے نظر آتے۔ اکثر عظام بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ ہرگز رتے دن کے ساتھ روحہ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی اور بہت نا محسوس طور پر وہ اس کے حواسوں پر چھاتا جا رہا تھا۔ اس کی سوچوں اور تنہائیوں میں دخیل ہو گیا تھا۔ اس کے شب و روز پر حاکم ہو گیا تھا اور اس کے سارے بھاگتے دوڑتے لمحوں کو اس نے جیسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا دل کب روحہ کا تمنائی ہوا۔ کب اس میں روحہ کی محبت نے سراٹھایا اور کب اسے اس کی محبت کی طلب ہونے لگی

دسمبر کی الوداعیہ سرد سائیں
جاسوسی کے شارے کی پڑ بہار نکلیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

قسمت اور زیت کے سفر میں توازن ہو تو پھر آسانیاں اور خوشیاں دور نہیں رہ سکتیں... بیٹی کے گرد گھومتی ایک یادگار داستان **احمد اقبال** کی سوغات
شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عمار کی یکجائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم ہے
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

اولین صفحات

انگاریے

اوارہ گرد

سرورق کی کہانیاں

بساط پر بچھے مہروں کو نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے حصے میں مات سے اور کون
قانع۔ ایسے ہی کھیل کی سنسنی خیز روداد **فاروق انجم** کے قلم سے
قانون ست اور جرم کتنا ہی تیز تر ہو، دونوں کا ٹکراؤ ایک نہ
ایک دن ضرور ہوتا ہے... **کاشف زبیر** کی انوکھی تحریر

بھلا رنگ

دوسرا رنگ



آپ کے تیرے...
مشوے... مجبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

تھی... لیکن روادح کے دل میں کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے..... کئی بار اسے گمان تو ہوا تھا کہ روادح کے دل میں بھی اس کے لیے کچھ خاص جذبہ ہے لیکن وہ پریقین نہیں تھی..... اور اپنی ایک طرفہ محبت کا خیال اکثر اسے پریشان کر دیتا..... وہ اپنی محبت کا راز داں کس کو بتائے...؟ کس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے...؟ عالیہ پتا نہیں کیوں اس سے دور ہو گئی تھی..... وہ بہت کم یونیورسٹی آتی اور آتی بھی تو اس سے دور دور اور اکھڑی اکھڑی رہتی اور عالیہ کے علاوہ کسی اور سے اس کی اتنی گہری دوستی نہ تھی کہ دل کے ساتھ ہونے والی اس واردات کا بھید اسے دیتی۔ سو وہ محبت کے اس نئے نئے احساس سے ہراساں اور پریشان سی رہنے لگی تھی۔ اسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ روادح کے تصور سے ہی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ چند ماہ بعد فاسل ایگزام کے بعد سب ہچکڑ جائیں گے پھر شاید وہ کبھی روادح سے نہ مل سکے اسے نہ دیکھ سکے۔ اس خیال سے ہی اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ اور روادح کو تو شاید کبھی خبر بھی نہ ہو کہ اس کے نوخیز دل میں اس کی محبت کیسے اچانک اتر آئی تھی۔

یہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ کلاس چھوڑ کر لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی..... اور گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی..... ذہن میں سیکڑوں خیالات آرہے تھے۔ وہ تو محبت کا مذاق اڑاتی تھی۔ جب کبھی عالیہ محبت کا ذکر کرتی وہ اسے حماقت اور بے وقوفی کہتی لیکن اب خود اس کا دل اس حماقت میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ بھی ایک طرفہ..... عالیہ ہوتی تو آج وہ ضرور اس کے سامنے اعتراف کر لیتی کہ وہ بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے لیکن آج بھی وہ نہیں آئی تھی..... وہ اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی جب بہت آہستگی سے آ کر روادح اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”رتی کیا ہوا کیا تم کچھ پریشان ہو.....؟ تم فوراً کلاس سے نکل آئیں، میں تمہارے پیچھے آنا چاہ رہا تھا لیکن پھر سر آگئے تو نہیں آ سکا۔“

”بس یونہی پڑھنے کا موڈ نہیں تھا۔“

”نہیں رتی تم کچھ پریشان لگ رہی ہو..... گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں.....“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

روادح نے اس کی پریشانی کو محسوس کیا..... اس احساس نے اس کے اندر پھول کھلائے تھے۔

”یونہی بس وہ ممتاز حیدر جو جدائی کی نظم سن رہا تھا اس سے دل ادا ہو گیا۔ چند ماہ کی بات ہے پھر سب ہچکڑ جائیں گے۔ کوئی پتا نہیں کسی کو کوئی یاد بھی کرے گا یا نہیں۔“

”کم از کم میرے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتیں رتی..... میں کبھی کسی کو نہیں بھول سکتا اور تمہیں تو بالکل بھی نہیں..... لیکن تم..... ہو سکتا ہے میں تمہیں یاد بھی نہیں رہوں، لڑکیاں شادی کے بعد اپنے گھر اور بچوں میں کھو کر سب کچھ بھول جاتی ہیں۔“

روادح شاید اسے کھوجنا چاہ رہا تھا کیونکہ اس کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”ناممکن.....“ اس کی آنکھیں جھللا گئی تھیں۔

”میں.....؟ مجھے سب یاد ہیں گے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا رتی کہ ہمیں ایک دوسرے کو یاد نہ کرنا پڑے اور ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں ایک ساتھ؟“

آج اس نے وہ بات کہہ دی تھی جسے سننے کو اس کے کان کب سے منتظر تھے۔ اس کی سماعتوں میں جیسے کسی نے رس گھول دیا تھا۔ اندر ایک ساتھ بہت سارے چراغ جل اٹھے تھے۔

”کیا ایسا ممکن ہے روادح.....؟“ اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

”ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے رتی..... اگر تم بھی چاہو تو.....“

”میں بھلا کیوں نہ چاہوں گی؟ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر اس کی پلکیں جھلک گئی تھیں۔
رخساروں پر جیسے آگ سی دکھ اٹھی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے رواد بے حد دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں
کی حدت سے اس کا دل پگھلا جا رہا تھا۔

”رتی.....“ اس کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔

”کیا میرے کانوں نے صحیح سنا.....؟ کیا واقعی تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو؟“ اور اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے
اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تھینک یورٹی..... تھینک یو۔“ اس نے رواد کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے تھے لیکن اس کے لہجے سے
چھلکتی خوشی کو محسوس کر رہی تھی..... یعنی اس کی محبت یک طرفہ نہیں تھی اگر اس کا دل رواد کا اسیر ہوا تھا تو رواد بھی
اس کے لیے اپنے دل میں ایسے ہی جذبے محسوس کرتا تھا۔

”بہت دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم میرے لیے کیا ہو..... اور یہ کہ میں بری طرح
تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور اب اس محبت کے جال سے نکلنا میرے لیے ممکن نہیں..... میں بے بس ہو چکا
ہوں..... اور یہ ابھی کی بات نہیں، بہت پہلے کی بات ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تب ہی تم نے میرے
دل میں اپنی مسند سنبھال لی تھی۔ میں کبھی ایک نظر کی محبت کا قائل نہیں رہا..... لیکن یقین کرورتی، میں پہلی نظر میں ہی
تمہارا گھائل ہو گیا تھا اور جب جب تمہیں دیکھا دل نے ہمیشہ تمہاری رفاقت کی چاہ کی۔“ دھیمے دھیمے لہجے میں اپنے
جذبات کا اظہار کرتے رواد کا ہر لفظ اس کے دل پر نقش ہوتا چلا ہو گیا۔

”پتا ہے؟ وہ ہولے سے ہنسا۔

”میں ہر روز جب گھر سے نکلتا تھا تو یہ عہد کر کے نکلتا تھا کہ آج میں تم سے ضرور حالِ دل کہوں گا اور تم سے
تمہاری عمر بھر کی رفاقت کی چاہ کروں گا لیکن ہر روز ہمت ہار دیتا..... تمہاری ناراضی کا خیال مجھے روک دیتا.....
حالانکہ میرے بابا چاہتے تھے کہ میں جلد تم سے بات کروں..... پتا نہیں انہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟“
”کیا.....؟ کیا تم نے اپنے بابا سے بات کی میرے متعلق.....؟“ وہ از حد حیران ہوئی۔

”ہاں.....“ وہ مسکرایا تھا۔

”میرے بابا میرے بہت اچھے دوست ہیں۔“ اپنے بابا کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹیں سی
اتر آئی تھیں۔

”اور وہ اب چاہتے ہیں کہ میں تم سے بات کروں اور تمہاری اجازت ہو تو وہ تمہارے گھر آئیں۔“

”تم نے اتنا سوچ لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔“ وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو..... کیا کرتا..... تمہاری ناراضی سے ڈر لگتا تھا ناں کہ کہیں تم خفا ہو جاؤ تو چند لمحوں کی رفاقت سے بھی محروم ہو جاؤں۔“

”تم بہت فضول ہو، تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا ناں کہ تم مجھ سے.....“

اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”تو اب بتا تو دیا ہے ناں.....“ وہ شریر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا بتاؤ اگر پہلے بتا دیتا تو کیا کرتیں؟“ اور وہ اسے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ اگر پہلے بتا دیتے تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔

”تو بابا کو بھیج دوں؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”نہیں ابھی نہیں..... پہلے میں اپنے بابا کو بتا دوں تمہارے متعلق پھر.....“

”تمہارے بابا.....“ اس کی خوب صورت آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے فکر کا سایہ سالہا ایا تھا۔

”تمہارے پاپا ایک بزنس مین ہیں اور میرے بابا پروفیسر گو کسی چیز کی کمی نہیں لیکن شاید تمہارے پاپا جتنی دولت نہ ہو ہمارے پاس تو کیا وہ پھر بھی.....؟“

”میرے پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی چیز سے مجھے منع نہیں کیا..... اور انہوں نے ایک بار خود کہا تھا مجھے کہ وہ میری پسند کو ہر حال میں ترجیح دیں گے۔ ہاں ہو سکتا ہے ماما کو کچھ اعتراض ہو..... لیکن بہر حال فیصلہ تو پاپا کا ہی مانا جائے گا۔“

اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

”اوکے..... تم پاپا سے بات کر کے بتانا..... میرے بابا کو بہت جلدی ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔

”بھلا کتنی جلدی؟“ وہ بھی ہلسی۔

”ابھی تو ہمارے ایگزام ہونے ہیں۔“

”تو ایگزام کے بعد ہی سہرا باندھ لیں گے۔“ وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”بس تمہیں اپنے نام کر لیں۔ تم آج ہی اپنے پاپا سے بات کرنا۔“

اس نے تاکید کی تھی لیکن پاپا کل رات ہی لاہور سے آئے تھے اور آج ناشتا بھی انہوں نے اپنے کمرے میں کیا تھا۔ یوں بھی اس کا آج بات کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا پھر کسی روز مناسب موقع دیکھ کر بات کرے گی۔ بلکہ پہلے کسی بہانے پاپا کو روادے سے ملوادے گی..... روادے نے محبت کا اظہار کیا کر دیا تھا کہ کل سے اب تک وہ ڈھیروں میسجز کر چکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر نظم پڑھنی شروع کی تھی کہ افغان نے پیچھے سے آکر اس کا فون پکڑ لے۔

”ایسا کیا لطیفہ سینڈ کیا ہے کسی نے کہ جنابہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہی نہیں جدا ہو رہی۔“

”نہیں وہ لطیفہ تو نہیں۔“

وہ ذرا سا گھبرائی۔

”عالیہ نے ایک نظم بھیجی ہے۔“ اس نے فون لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن افغان نے ہاتھ ذرا سا بلند کرتے ہوئے پڑھا۔

”میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں.....“

جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے.....

واؤ..... یہ عالیہ کو شاعری سے کب شغف ہوا۔؟“ اور شوکیں میں رکھے کرٹل کے ڈیکوریشن پوسر ناز و صاف کرواتی۔ ایل نے چونک کر ارتفاع کی طرف دیکھا..... اور اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔

”اسے نہیں ہے شغف شاعری سے، کسی فرینڈ نے بھیجی ہوگی تو اس نے مجھے بھیج دی۔“

ارتفاع کو بروقت بات سوجھ گئی تھی۔

”اچھا مجھے دو فون.....“ اس نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”پڑھنے تو دو کتنی خوب صورت نظم ہے، بھیجنے والی بڑی رومیٹک ہے۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کیا لیکن ارتفاع نے

ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لے لیا..... تب ہی ڈور بیل ہوئی۔

”اوہ میرا دوست آگیا ہے..... میں چلتا ہوں لیکن رتی اسے ڈیلیٹ مت کرنا میں آکر پڑھوں گا۔ بہت خوب

صورت نظم ہے۔“

ارتفاع نے سر ہلایا تو وہ ایل کی طرف مڑا۔

”او کے ماما! میں جنید کے ساتھ جا رہا ہوں، جلدی آ جاؤں گا۔“

ایمل نے سر ہلایا تھا اس کی نظر بس اب بھی ارتفاع پر تھیں جس نے فون ہاتھ میں لیتے ہی روادحہ کا میسج بہت تیزی سے ڈیلیٹ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ افنان، روادحہ کا نام دیکھے۔ تب ہی پھر سے میسج ٹون ہوئی اس نے دیکھا روادحہ نے پھر شعر بھیجا تھا۔

”دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں“

اور ساتھ ہی افسردگی ظاہر کرنا کارٹون۔ فوراً ہی ایک اور میسج آ گیا۔

”اب تو ایک دن گزارنا بھی مشکل ہے..... کیا بابا کو آج ہی میسج دوں.....؟“ اس کے ہونٹوں پر حیا آلودی مسکراہٹ جی تھی اور آنکھیں دکنے لگی تھیں اور ارتفاع کی طرف دیکھتی ایمل کو جانے کیا ادراک ہوا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑا کرشل کا گلدان ناز کو پکڑا یا اور خود وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی لیکن اس کی نظریں ارتفاع کے چہرے پر ہی تھیں۔ جہاں رنگ بکھرے ہوئے تھے، یہ رنگ اسے چونکا رہے تھے۔ ارتفاع کی انگلیاں تیزی سے موبائل فون سیٹ پر حرکت کر رہی تھیں۔ وہ روادحہ کو میسج ٹائپ کر رہی تھی۔ ارتفاع تو ہمیشہ اس سے خفا تھا اور ناراض ناراض رہتی تھی لیکن پچھلے کئی دنوں سے وہ کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی لیکن ایمل نے آج سے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ وہ بہت خوش لگتی تھی اور خوشی کے یہ رنگ جو اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دمک رہے تھے یہ رنگ تو.....

”وہ کیوں اتنی خوش تھی آخر ایسا کیا مل گیا ہے اسے؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن جھجک گئی اس کے اور ارتفاع کے درمیان کبھی اتنی دوستی نہیں رہی تھی کہ ارتفاع اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتی..... وہ اس سے کبھی اتنی بے تکلف نہیں تھی۔ یک دم یہ احساس بڑی شدت سے اس کے اندر پیدا ہوا کہ اس کے اور اس کی بیٹی کے درمیان بہت فاصلے ہیں اتنے کہ چند ماہ پہلے وہ اسے اپنی سوتیلی ماں سمجھ رہی تھی۔ اور کیا پتا اب بھی اس کے دل میں ایسا ہی کچھ خیال ہو..... ایک احساس زیاں یک دم ہی اس کے اندر پیدا ہوا۔ اسے ارتفاع کو خود سے دور نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اسے یاد آیا کہ مئی نے ایک بار کہا تھا۔ ”ماؤں کو اپنی بیٹیوں کا دوست ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے دل کی ہر بات اپنی ماؤں سے کر سکیں۔“ لیکن وہ تو کبھی اس کے اتنے قریب نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دل کی ہر بات باپ سے ہی کرتی تھی لیکن بہت سی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بیٹیاں اپنے باپوں سے نہیں کر سکتیں..... اس نے ارتفاع کو خود سے دور رکھ کر بڑی غلطی کی تھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب افنان پیدا ہوا۔ وہ اتنی جلدی دوسرا بچہ نہیں چاہتی تھی لیکن افنان کو دنیا میں آنا تھا سو آ گیا تھا اور پھر افنان تھا بھی بہت کمزور..... وہ اسی کی وجہ سے ارتفاع کو توجہ نہ دے پاتی تھی۔

جس کے نتیجے میں ارتفاع چڑچڑی ہوئی چلی گئی تھی۔ ایسے میں بابر نے ارتفاع کو سنبھال لیا تھا اور وہ اس کے لیے بابر کی ممنون تھی اور یہ ممنونیت آج بھی اس کے دل میں موجود تھی..... اور پھر جب افنان کچھ بڑا ہو گیا تھا..... تب بھی ارتفاع، بابر کے ساتھ ہی اٹیچڈ رہی..... یہاں اس سے غلطی ہوئی تھی اسے ارتفاع کو اس کے حال پر چھوڑنے کے بجائے اس پر توجہ دینی چاہی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا اور ارتفاع خود سر ہو گئی تھی۔ وہ اپنی من مانی کرتی تھی اور اس کی باتیں انور کر دیتی تھی۔ کاش اس کے اور ارتفاع کے درمیان بے تکلفی ہوتی تو اسے آج اس سے بات کرتے ہوئے اتنی جھجک نہ ہوتی۔ اس نے پھر ارتفاع کی طرف دیکھا..... اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بلا کی نرمی اور ملائمت تھی۔

”یہ نرمی اور ملائمت تو محبت کی عطا ہوتی ہے۔ تو کیا ارتفاع کسی سے.....؟ نہیں۔“ اس نے خود ہی اپنے

خیال کی تردید کی۔

”نہیں..... یہ تو بہت معصوم اور سادہ ہے.....“ ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے ایسی ہی رائے رکھتی تھی اور پھر اسے بھلا انسانوں کی کیا پہچان..... یہ دنیا تو دھوکے باز اور فریبی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے اندر کسی اذیت ناک یاد نے چٹکی بھری.....

”مجھے اس سے بات کرنی چاہیے..... اسے سمجھانا چاہیے کہیں میری طرح یہ بھی محبت کے دھوکے میں نہ آجائے..... مجھے اس سے پوچھنا چاہیے..... لیکن میں کیا پوچھوں گی.....“ وہ یک دم ہی بہت مضطرب اور بے چین نظر آنے لگی..... ”کیا باہر سے بات کروں.....؟ لیکن نہیں۔“ ان دنوں باہر کا بی بیویر بھی کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ روادح نے پھر میسج کیا تھا۔

”میں عظمیٰ کی طرف جا رہا ہوں، واپس آ کر بات کروں گا۔“
 ”او کے.....“ اس نے رپلائی کیا اور فون وہیں صوفے پر رکھ کر پاس پڑا ریوٹ اٹھا کر آواز قدرے بلند کی اور تب ہی ایمل کی نظروں کا ارتکا محسوس کر کے اس نے ایمل کی طرف دیکھا۔
 ”کیا ہوا اما آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے؟“
 ”کچھ نہیں.....“ ایمل چونکی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ بیٹیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں، لیکن ایک دن باہل کا گھر سونا کر جاتی ہیں۔ ایک دن میری پیاری بیٹی بھی ہمارا آنگن سونا کر جائے گی۔“ اس کی آواز میں کمی تھی..... ارتقا کا دل جیسے یک دم پگھلا تھا..... ایک روز اسے بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا..... اپنا گھر، اپنا کمرہ، اپنا پاپا، افتان سب کو چھوڑ کر وہ پیادیس چلی جائے گی۔ سب کچھ پرایا ہو جائے گا..... لیکن اس کے ساتھ کچھ انوکھا نہیں ہوگا۔ سب لڑکیوں کو ایک روز باہل کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ ہاں انوکھا اور خوب صورت روادح کا ساتھ ہوگا۔ روادح کتنا شاندار ہے، کتنا لونگ..... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دہکی اور آنکھیں لودے انھیں۔ اس نے انہی دہکتی آنکھوں سے ایمل کی طرف دیکھا۔
 ”لیکن آپ تو لگی ہیں اما، آپ تو باہل کے گھر سے رخصت ہو کر باہل کے گھر میں ہی رہی تھیں۔“
 ”نہیں تو.....“ ایمل اس کی مسکراہٹ میں کھو گئی تھی..... وہی مدثر جیسی مسکراہٹ.....

”میں رخصت ہو کر تمہارے پاپا کے گھر گئی تھی۔“ مدثر اور بابا نے اس کا کتنا شاندار استقبال کیا تھا۔ پورا گھر پھولوں سے سجایا تھا..... تازہ گلابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا..... اور مونا نے اس کے گاڑی سے اترتے ہی ٹیپ جلا دی تھی۔ ”بہار و پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔“
 ”لیکن..... پاپا تو نانو کے گھر میں ہی رہتے تھے۔“ ارتقا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
 ”ہاں.....“ وہ چونکی۔

”لیکن وہ پہلے میں رخصت ہو کر تمہارے دادا ابو کے گھر گئی تھی۔“
 ”ہاں، وہ تو چند دن کے لیے گئی ہوں گی پھر تو واپس آ گئی ہوں گی۔“
 ”ہاں پھر واپس آ گئی تھی۔“ اندر جیسے کسی پرانے زخم سے کھرٹا اتر گیا تھا۔ بہت جلن اور دکھن ہو رہی تھی۔
 ”کاش وہ واپس نہ آتی..... کاش وہ ہمیشہ وہاں ہی رہتی..... محبتوں کے سائے تلے..... مدثر ایسا نہ ہوتا..... بے وفا، دھوکے باز.....“ زخموں سے جیسے خون رسنے لگا تھا۔

”پاپا تو آپ کے کزن تھے ناں اور نانو نے انہیں بیٹا بنا رکھا تھا تو کیا آپ شادی سے پہلے انہیں پسند کرتی تھیں۔ پہلے سے آپ کی شادی ان سے طے تھی یا پھر اچانک طے ہوئی تھی؟“
 وہ ارتقا کے اس سوال پر حیران ہو کر اسے تنکٹے لگی۔ ارتقا سے اس کی ایسی بے تکلفی تو کبھی نہ تھی کہ وہ اس

سے اس طرح کا سوال کرتی..... اور یہ آج کیسی باتیں کر رہی ہے۔ اس نے تو ایسی باتیں کبھی نہیں کی تھیں بلکہ اس نے تو کبھی اس سے کوئی فالتو بات کی ہی نہیں تھی۔

”بتائیں ناں ماما! کیا آپ پاپا کو پہلے سے ہی پسند کرتی تھیں؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت سی کوندی تھی۔ ایک بار اس نے بھی ممی سے ایسا ہی سوال کیا تھا اور یہ تب کی بات تھی جب پہلے پہل اس کے دل میں مدثر کی محبت کا احساس جاگا تھا تو کیا ارتقاع..... اس نے ہر اسماں ہو کر ارتقاع کی طرف دیکھا۔

”چلیں، آپ بتانا نہیں جانتیں تو نہ سہی۔“ اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور آنکھوں میں کوندی شرارت ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی جھلکنے لگی۔

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”شادی سے پہلے میں نے تمہارے پاپا کے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا..... بس حادثاتی طور پر.....“ اس نے یک دم بات ادھوری چھوڑ دی..... اگر اس نے مدثر سے محبت نہ کی ہوتی اگر وہ اسے دھوکا نہ دیتا..... بے وفائی نہ کرتا تو شاید وہ کبھی بابر سے شادی نہ کرتی..... اس نے کبھی بابر کو پسند نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اسے ناپسند کرتی تھی..... حالانکہ اسے ناپسند کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی بس وہ بغیر کسی وجہ کے اسے ناپسند کرتی تھی..... لیکن وہ اذیت ناک رات جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ ساری ترجیحات بدل گئیں۔ پسند، ناپسند، سوچ، فکر..... اس رات کی اذیت نے اس کی آنکھوں میں دھند سی بھردی اور دل کٹنے لگا جیسے برسوں پرانی اذیت دل میں پھر سے کچھ کے لگا رہی ہو..... اس نے ارتقاع کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سر جھٹکا کہ اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگی..... اس رات مدثر کو فون کرنے کے بعد وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر ڈھسے گئی تھی..... اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر روئے..... دیواروں سے سر پیٹنے..... تکلیف، درد اور اذیت سے اس کا وجود چور چور ہو رہا تھا..... مدثر نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا..... بلکہ خود اس نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا مدثر جیسے شخص سے محبت کر کے..... بے وفا، دھوکے باز شخص سے محبت کر کے اسے چاہ کر..... اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ رہی ہوں اور اندر جیسے کوئی چھریاں چلا رہا تھا، اذیت سی اذیت تھی..... جانے کب تک وہ اذیت برداشت کرتی رہی تھی..... لیکن پھر جیسے سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا..... وہ ہمت ہارنے لگی تھی۔ اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا تھا اور ڈیڈی کے فون کا نمبر ملا یا تھا۔

”ڈیڈی پلیز ممی سے بات کروادیں۔“ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا خیریت ہے؟“ ممی پوچھ رہی تھیں.....

”ممی کی آواز سنتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

”ممی..... میں مر رہی ہوں..... بہت تکلیف میں ہوں..... بہت اذیت ہو رہی ہے آپ ابھی واپس آ جائیں پلیز.....“

”کیا ہوا..... میری جان..... کیا ہو گیا؟“ ممی گھبراہٹ سے بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھیں۔

”ممی، مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی مجھے کند چھری سے ذبح کر رہا ہو..... میرے پورے وجود میں درد کی تیز لہریں اٹھ رہی ہیں اور میرا سر..... ممی میرا سر پھٹ جائے گا۔“ وہ رونے لگی تھی..... اونچی آواز میں.....

”حوصلہ کرو..... میری بچی..... بابر کدھر ہے.....؟ اسے کہو فوراً تمہیں اسپتال لے جائے..... ہم پہلی دستیاب فلاسٹ سے آرہے ہیں..... حوصلہ کرو جانو اللہ سے دعا کرو.....“

”بابر بھائی تو خالہ سے ملنے چلے گئے تھے۔“ اس نے بہ مشکل کہا تھا۔

”نہیں..... وہ آگیا ہوگا..... اسے پتا تھا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں تو اس نے رات تک آ جانا تھا۔ تم ماسی کو بھی ساتھ ہی لے جانا۔“

”اچھا.....!“ وہ ریسور کریڈل پر ڈال کر اٹھی تھی لیکن پھر جیسے زمین آسمان گھوم گئے تھے اس نے گرتے ہوئے بیڈ کی پٹی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لہرا کر گر گئی تھی۔ ہوش کھونے سے پہلے اس نے فون کی گھنٹی کی آواز سنی تھی جو مسلسل بج رہی تھی۔ پھر اسے پتا نہیں چلا تھا کہ کب باہر اس کے بیڈ روم میں آیا تھا اور کب ماسی اور چھوٹی ملازم لڑکی کی مدد سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر اسپتال لایا تھا..... اسے جب لیبر روم میں لے جایا جا رہا تھا تب لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اسٹریچر کے ساتھ، ساتھ چلتے باہر کود کچھ کراذیت کی ایک تیز لہر اس کے اندر اٹھی تھی..... ”یہاں تو مدثر کو ہونا تھا“ اس کا دل جیسے پاتال میں گر رہا تھا..... نیچے ہی نیچے اور اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئی تھیں..... پھر کیا ہوا تھا اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ جیسے گہری غنودگی میں اپنے ارد گرد باتوں کی بھنبھناہٹ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ آنکھیں نہیں کھول پارہی تھی جیسے اس کے پوٹوں پر کوئی بھاری بوجھ آ پڑا ہو..... اور پھر ہولے ہولے یہ مدھم آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں پھر جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ روم میں تھی اور مئی اس کے بیڈ کے پاس بیٹھی اس کے بالوں میں اٹھکیاں پھیر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

”ممی.....!“ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں..... نہیں مت اٹھو.....“

ممی نے اپنا ہاتھ اس کے اوپر رکھ کر اسے روکا تھا..... اور تب ہی اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب تھی اس نے مئی کو فون کیا تھا اور مئی کو پاس بیٹھے دیکھ کر اس نے بے حد طمانیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مئی آگئی تھیں اور وہ زندہ تھی لیکن آنکھیں بند کرتے ہی اسے یکا یک اپنے اندر کی خالی پن کا احساس ہوا۔

”ممی.....“ اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔

”ممی میرے نیچے۔“

”مبارک ہو اللہ نے تمہیں بیک وقت اپنی نعمت اور رحمت سے نوازا ہے۔“

اس نے متلاشی نظروں سے کمرے میں دیکھا..... کمرے میں کوئی کاٹ وغیرہ نہیں تھا..... ممی نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ لیا تھا۔

”وہ فی الحال نرسری میں ہیں، شام تک آ جائیں گے تمہارے پاس.....“

”ممی میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس کا دل انہیں دیکھنے کو مچلنے لگا تھا۔ ابھی سسٹر آتی ہے تو میں بات کرتی ہوں سسٹر سے..... اچانک ہی تمہارا پی پی بہت شوٹ کر گیا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ شاید تم نے کچھ زیادہ ٹینشن لی ہے۔ تمہاری اور بچوں، دونوں کی زندگیوں کو خطرہ تھا سو فوری آپریٹ کرنا پڑا۔ باہر نے فون پر ہم سے بات کر کے ہماری اجازت سے آپریشن کے اجازت نامے پر دستخط کیے تھے۔ میں تو اس خیال سے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی تھی کہ ڈاکٹر نے پندرہ دن بعد کی ڈیڈی دی تھی۔“

ممی نے اسے تفصیل بتائی تھی۔

”صبح تو تم بالکل ٹھیک تھیں بیٹا پھر ایسا اچانک کیا ہو گیا تھا.....؟ کیا مدثر نے کچھ کہا.....؟ اس سے بات ہوئی تمہاری.....؟ تمہارے ڈیڈی نے یہاں پہنچتے ہی اسے فون کیا تین چار بار لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تو وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں یا پھر فون خراب ہے۔“ اس نے مئی کی پوری بات جیسے سنی ہی نہیں مئی..... اس کے اندر جیسے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

”ہاں بیٹا تم نے بتایا نہیں کیا ہوا تھا اچانک..... اب تو ٹینشن والی کوئی بات نہیں تھی..... تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا..... تمہاری طرف سے اطمینان ہو جائے تو تمہارے ڈیڈی خود جا کر مدثر کو بتا آئیں گے۔“

”نہیں..... میرا فیصلہ غلط تھا می..... بالکل غلط.....“ وہ رونے لگی تھی۔

”مجھے مدثر کے ساتھ نہیں رہنا..... ہرگز نہیں..... مجھے طلاق چاہیے..... طلاق.....“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

”میں گھبرا کر اسے تسلی دینے لگی تھیں لیکن اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔“

”ایما..... ایما میری جان..... میری زندگی جو تم کہو گی جیسا تم چاہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔“

”میں اسے تسلی دے رہی تھیں..... لیکن اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور جسم بے جان ہو رہا تھا..... پھر اگلے دو دن اس کی حالت بہت خراب رہی اور اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولتی اور پھر غنودگی میں چلی جاتی۔ چار دن بعد اسے کمرے میں منتقل کیا گیا تو اس نے بچوں کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ می، بیٹی کو اس کے پاس لائی تھیں..... اسے گود میں لیتے ہوئے جیسے اس کا دل بھرا آیا تھا۔ کانوں میں مدثر کی آواز گونجنے لگی تھی۔“

”جس روز ہمارے شہزادوں نے دنیا میں قدم رکھا اور اس روز تم دیکھنا میں اسپتال میں بھگڑا ڈالوں گا.....“

”بھلے اسپتال والے مجھے پاگل سمجھیں..... اور پورے اسپتال میں مٹھائی تقسیم کروں گا.....“ اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کی لکیریں سی بہنے لگیں۔

”میرا بیٹا، می اسے بھی تو لائیں۔“

ہاتھوں کی پشت سے اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے می سے کہا تھا۔

”وہ..... دراصل ابھی ٹھیک نہیں ہے اسے انکوبیٹر میں رکھا گیا ہے۔“ می نے نظریں چرائی تھیں۔

”مجھے وہاں لے جائیں پلیز..... بس ایک نظر دیکھ لوں۔“ اس روز می اسے ٹالتی رہی تھیں لیکن دوسرے روز وہ جیسے بے بس سی ہو گئی تھیں اور انہوں نے پاس بیٹھے بابر سے کہا تھا۔

”تم ہی اسے سہولت سے بتا دو بیٹا۔ میری تو ہمت نہیں ہو رہی۔“

”کیا..... کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“ وہ ہراساں سی ہو کر می اور بابر کو دیکھنے لگی تھی۔

بابر اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

”میری بات تحمل سے سنو ایما..... اور حوصلے سے اس کو برداشت کرو، تمہارا بیٹا بیمار تھا..... پیدائش کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں..... اس کے پھیپھڑوں میں پرابلم تھا..... وہ پیدائش کے وقت رویا بھی نہیں تھا۔“

”نہیں..... وہ رورہا تھا بابر بھائی۔“ اس نے ضد کی تھی۔

”میرے کانوں میں پہلے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی تھی اور پھر چند منٹ کے وقفے سے دوسرے بچے کی۔“

”شاید ایسا ہو لیکن.....“ بابر نے اس کی تائید کی تھی۔

”وہ چلا گیا۔ ڈاکٹر اسے بچا نہیں سکے۔ آئی ایم سوری.....“

”وہ چلا گیا اور میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ وہ رونے لگی تھی اور بابر اسے ہولے ہولے تھپک رہا تھا۔

”آپ اس کی تصویر ہی بنا لیتے ہیں دیکھ تو سکتی، وہ جس کے دنیا میں آنے کا ہم کتنی شدت سے انتظار کر رہے تھے وہ کیسا تھا..... اس کی آنکھیں کیسی تھیں..... اس کے ہونٹ..... اس کی ناک.....“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”وہ بالکل تمہارے جیسا تھا۔“ بابر نے اسے بتایا تھا۔

”جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اس کی قبر پر لے جاؤں گا۔“
 ”مئی آپ ہی ڈیڈی سے کہہ کر اس کی تصویر بنوائی تھیں۔“ اس نے روتے، روتے مئی سے گلہ کیا تھا۔
 ”ہمیں ہوش ہی کب تھا ایسا..... ہمیں تو تمہاری زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں تو تمہارے بیڈ کے پاس سے ہلی تک نہیں اور تمہارے ڈیڈی..... صدقے کے بکرے یتیم خانوں میں بھجوا رہے تھے..... مسجدوں میں جا کر تمہاری زندگی کے لیے دعائیں کروا رہے تھے۔ باہر نے ہی بچے کی ڈیڈ باڈی لی اور دفن وغیرہ کروایا۔ سچ پوچھو تو میں نے بھی بس ایک نظر ہی اسے دیکھا تھا۔“

نازو نے شوکیں میں رکھے سب پیسز صاف کر کے رکھ دیے تو اس کی طرف دیکھا۔

”باجی یہ کام تو ہو گیا ہے اب کیا کرنا ہے۔“

”ہاں.....“ اس نے چونک کر نازو کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں..... تم جاؤ جا کر کچن میں دیکھ لو اور کوئی کام ہے تو.....“

اور نازو سے ہونی ہوئی اس کی نظریں ارتفاع پر واپس پڑیں جو کچھ ابھی ابھی سی بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک ایل کے اس ادھورے جملے میں اٹکا ہوا تھا۔

”حادثاتی طور پر..... کیا ماما اور پاپا کی شادی حادثاتی طور پر ہوئی...؟ شاید میری ماما کی ڈ۔تھ کے بعد ماما نے ماما سے کہا ہوگا آخر وہ پاپا کو ایک بیٹے کی طرح چاہتی ہیں تو یوں حادثاتی طور پر ماما کی پاپا سے شادی ہو گئی ہوگی۔“ وہ دل ہی دل میں واقعات کے تانے بانے بن رہی تھی اور آج پھر اس کے اندر وہی شک پیدا ہوا تھا کہ ایل اس کی سگی ماں نہیں ہے۔ کتنی مشکل سے اس نے افتان کے کہنے پر خود کو یقین دلایا تھا کہ ایل ہی اس کی سگی ماما ہیں لیکن آج پھر یہ یقین متزلزل ہو رہا تھا..... بے حد مضطرب ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے مڑ کر صوفے پر پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ ”رواحہ کالنگ.....“ اس نے ایک نظر ایل پر ڈالی اور پھر بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے فون آن کر کے کانوں سے لگایا۔

”رتی..... رتی سنو..... شاید پھر تم مجھے کبھی نہیں سن سکو..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، دل اور روح کی گبرائیوں سے۔“

”کیا..... کیا ہوا ہے رومی تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“ وہ بے چین ہوئی۔

”میرا بہت خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میرا بہت خون بہہ رہا ہے۔ سر سے بازو سے..... پتا نہیں کہاں کہاں.....“ اس کی آواز ڈوب گئی۔

”رومی..... رواحہ.....“ اس نے بے قراری سے پکارا۔

”سنو..... میرے بابا سے ضرور ملنا۔“ اس کی آواز پھر ابھری تھی اور وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ انہیں کہنا میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں اور وہ دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔“

”تم..... تم کہاں ہو رواحہ؟ یہ ایکسیڈنٹ کہاں ہوا ہے.....؟ تم تو عظام کی طرف جا رہے تھے..... تم مذاق کر رہے ہونا..... کہہ دو۔“ اس کے آنسو اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے۔

”نہیں..... آئے..... کو.....“ اس کی آواز بہت مدھم تھی پھر اسپیکر سے بہت ساری آوازوں کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی جیسے موبائل بند ہو گیا۔ شاید آف ہو گیا تھا یا گر گیا تھا۔

”نہیں.....“ اس کے لبوں سے نکلا اور پھر وہ نہیں نہیں کی تکرار کرتی ہوئی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

(جاری ہے)

خطائے نظر سے پہلے

شبانہ شوکت



دہلی سی مسکراہٹ پھیلی تو دونوں کھیا کر بیگنز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ نوال نے خوب بڑا سا ہینڈ بیگ لیا تھا۔ منال کو چھوٹا سا پرس لینا پڑا کیونکہ پیسے ہی اتنے بچے تھے۔ گھر آ کر جب نوال نے بیگ الٹایا تو منال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

”مجھے ہینڈ بیگ لینا ہے خوب بڑا سا، یہ چھوٹے چھوٹے کلچ اور پرس مجھے کبھی پسند نہیں آتے۔“

نوال نے ناک چڑھائی۔

”ہر جگہ بڑا سا بیگ بھی اچھا نہیں لگتا، تمہارے

پاس تو پہلے بھی جبو سائز کا ہینڈ بیگ موجود ہے۔“

منال نے بحث کی، سیلز مین کے ہونٹوں پر دہلی

”یار مجھے میک اپ کا کچھ سامان لینا ہے اور ہمیر کچر اور کلپس وغیرہ بھی..... آؤ، ذرا میرے ساتھ چلو۔“
عافیہ نے نوال کو ساتھ کھینٹا تھا۔

”اس لپ اسٹک کی کیا پرائس ہے؟“

”450 روپے۔“ سیلز گرل نے بتایا۔ عافیہ نے وہ لپ اسٹک لے لی اور base کا جو کمر بتایا وہ کاؤنٹر پر موجود نہیں تھا۔ سیلز گرل دوسرے شیف سے لینے مڑی، جھٹ نوال نے دو لپ اسٹک اٹھا کر اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیں۔ پاس کھڑی عافیہ کو بھی اس کا علم نہ ہوسکا کیونکہ اس کی توجہ مکمل طور پر سیلز گرل کی طرف تھی یہی عمل نوال نے دوسری چیزوں کے ساتھ کیا تھا۔ جب وہ گھر آئی تو اس کے بیگ سے ایک مہنگا ہمیر کلر، ہمیر برش، دو کچر اور دو لپ اسٹک نکلیں جن کی ادائیگی ایک روپے کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی مہارت سے یہ کام کرتی تھی کہ عملے میں سے کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ دل ایسے دھڑکتا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا لیکن رفتہ رفتہ اس کا اعتماد اتنا بڑھ گیا کہ اب تو وہ ذرا سا بھی نہیں ہچکچاتی تھی۔

☆☆☆

”نوال چلیں؟“

ارسل نے زور سے آواز دی تھی، وہ تیزی سے دو پٹاشانوں پر برابر کرتی کمرے سے باہر آئی تھی۔
”جی چلیں۔“

وہ ایک بڑے سپر اسٹور آئے تھے۔ ارسل فوڈ کورٹ میں رک گیا تھا، جبکہ نوال لفٹ کے ذریعے اوپر لیڈیز یا بچکانہ سامان کے اسٹور پر چلی گئی تھی۔ ارسل نے کچھ چیزیں پیک کروائیں اور کاؤنٹر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر یونہی غیر دلچسپی سے سامنے لگے مانیٹرز کو دیکھنے لگا، جہاں مال کے مختلف فلورز پر چلتے بھرتے، شاؤنک کرتے لوگ نظر آ رہے تھے۔ معا سے نوال نظر آئی۔ ارسل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری۔ وہ اس وقت بچکانہ فلور پر تھی اور

شاڈل اور باڈل کے کپڑے سلیکٹ کر رہی تھی۔ اس نے تین، تین سوٹ الگ کیے اور سرگھما کر ارد گرد دیکھا اور ایک سوٹ ہینگر سے اتار کر اسے طے کر کے اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا اور باقی کے پانچ ہینگر ڈسٹ اٹھا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ ارسل کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مسکراتے ہوئے لب سکڑ گئے اور وہ کشیدہ اعصاب کے ساتھ وہاں سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ سامنے موجود سیلز مین کو لپک کر فون کا ریسور اٹھاتے دیکھ کر اسے صورت حال سمجھنے میں ایک لمحہ ہی لگا تھا۔ اس نے فوراً اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے منع کرنا چاہا، اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”پلیز اسے رکھیں، کسی کو انفارم مت کریں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ میں اس سوٹ کی پے منٹ آپ کو دے دیتا ہوں۔ یہ میری مسز ہیں۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی سائیکلی پر اہلیم ہے۔ اس لیے یہ ایسا کر جاتی ہیں، پلیز۔“ مارے شرمندگی کے اس کی آواز بہت دھیمی پڑ گئی تھی۔ اسے بہت سخت شاک لگا تھا مگر اس وقت اپنے اعصاب پر قابو پا کر اس نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ سیلز مین کو بھی اس کے چہرے پر پھیلی ندامت نے متاثر کیا تھا جب ہی وہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

”لیکن یہ کتنی غلط حرکت.....“

”میں مانتا ہوں یہ یقیناً غلط ہے، بہت غلط۔ لیکن آپ اس بات کو یہیں رہنے دیں۔ آپ مجھے معلوم کر کے بتائیں اس سوٹ کی کیا قیمت ہے، میں ادائیگی کر رہا ہوں۔“

جب تک وہ لڑکا اوپر سے فون کر کے قیمت پوچھتا اس نے نوال کو سیل فون پر کال کر کے نیچے آنے کے لیے کہا۔

”مگر ابھی تو بہت سی چیزیں رہتی ہیں۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”مجھے بہت ضروری کام ہے، تم فوراً نیچے آ جاؤ۔“ اس کے لہجے میں خود بخود سختی آ گئی تھی۔
”سر بائیس سو تک بھر روپے۔“

خطائے نظر سے پہلے

اتنے بڑے مال میں چوری کرتی پھرے.... اتنی گھٹیا حرکت، تم تصور تو کرو اس کا رزلٹ کیا نکلنے والا تھا۔“ وہ بہت کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو۔ ”یہ یقیناً تم نے پہلی بار نہیں کیا۔ تمہارا انداز بہت ماہرانہ تھا۔ یقینی طور پر تم اس کی عادی ہو گئی اور بہت خوش قسمت بھی کہ کبھی پکڑی بھی نہیں گئیں ورنہ اتنے کیسروں اور لاتعداد ملازمین کی موجودگی میں ایسی کھلم کھلا چوری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔“ نوال کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ مارے شرمندگی کے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اپنی صفائی کے لیے کچھ کہہ پاتی۔

”تمہیں معلوم ہے، میں نے اس کا وٹنر مین کو کیسے روکا تھا جو اسی فلور والوں کو فون کر کے تمہارے بارے میں انفارم کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ وہ تم خود تصور کر سکتی ہو۔ آج میں

”جی یہ لیجیے۔“ اس نے جلدی سے والٹ سے رقم نکال کر ادائیگی کی۔ ہر چند کہ دل تاسف سے بھر گیا تھا۔ اتنی سی رقم کے لیے چوری..... ”کیا کمی ہے نوال تمہیں کہ تم نے یہ کیا، میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلیں۔“ وہ مڑا تو حیران پریشان نوال اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ گھر آ کر وہ لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔

”آپ کو تو کہیں جانا تھا ناں؟“ اسے آرام سے بیٹھتے دیکھ کر وہ حیرت سے بولی۔ ”ہاں، تم بھی بیٹھ جاؤ اور دکھاؤ کیا کیا لیا ہے؟“ نوال تو حیران ہی رہ گئی۔ اس سے پہلے اس نے کب اس طرح دلچسپی لی تھی۔

”بس جلدی میں یہی لے سکی۔“ اس نے وہی پانچ سوٹ دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”وہ سوٹ بھی دکھاؤ ناں جو تمہارے ہینڈ بیگ میں موجود ہے۔“ اس نے بہت سکون سے اس کے اعصاب پر بم دے مارا تھا۔

”کک، کون سا سوٹ؟“ وہ پوری کی پوری ہل گئی تھی۔ ہینڈ بیگ کو یوں دونوں ہاتھوں میں جکڑا جیسے وہ اس سے چھین لے گا۔

”وہی، جو تم نے اپنے تئیں تو چھپا لیا تھا مگر کیمرے کی آنکھ سے نہ جانے کس کس نے دیکھا مجھ سمیت۔“ نوال کا رنگ اتنا سفید ہو گیا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

”کیا بہت کم پیسے تھے تمہارے پاس کہ تمہیں چوری کی ضرورت پیش آئی؟“ وہ اسی طرح گنگ بیٹھی تھی۔

”اب اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو مجھے..... تمہیں لگتا ہے شاپنگ کے لیے رقم کم ہے تو تم اور لے لیا کرو..... اے لی ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے تم میرے بچے کو چوری کے کپڑے پہنانے لگی تھیں۔ کیا میرے بچے اسی قابل ہیں؟ تو پھر میں کس لیے کماتا ہوں کہ میری بیوی کھلم کھلا

نوبلسورت کہانیوں کا مجموعہ

سیریس ڈائجسٹ

ماہنامہ

میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

شیش محل

ہر عزیز اور معروف قلم کار

اسما قادری کے قلم سے

کبھی خوش امید اور کبھی مایوس کن جذبات۔ میں ابھی زندگی کے تیسرے انداز.... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ۔ لیے

نے جتنی شرمندگی محسوس کی ہے وہ میں بتا نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارا شوہر ہونے کی وجہ سے آج میں بہت شرمسار ہوا ہوں۔“

وہ گئی سے کہتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور وہ وہیں پھرائی ہوئی سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

منال حیرت سے پھٹی آنکھوں سے وہ سارا سامان دیکھ رہی تھی جو نوال کے ہینڈ بیگ سے نکلتا تھا۔
”یہ..... یہ.....“ وہ ہٹکاسی گئی تھی۔

”یہ ہے بڑے بیگ کا صحیح استعمال۔“ وہ فخریہ مسکرائی۔ ”کیا کچھ آگیا اس کے اندر اور وہ بھی بالکل فری ورنہ ہماری امی تو ہمیں جو پیسے دے کر بھیجتی ہیں، اس میں تو ہم یونہی حسرت بھرے دل کے ساتھ واپس آجائیں..... یہ میری ”کارکردگی“ ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم شاباش ہی دے دو۔“

”مگر یہ تو چوری ہے، بہت بری بات بلکہ سراسر گناہ.....“ منال نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”چھوڑ یار، اب ہم کوئی غلط طریقے سے کسی لڑکے سے تو نہیں گفٹ نکلا رہے ناں، لڑکیاں تو کیا کیا غلط حرکتیں کرتی ہیں۔ اللہ معاف کرے۔ میں نے ایسا کوئی غلط کام نہیں کیا صرف اپنا ”فن“ استعمال کیا ہے۔“ وہ بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی مہلت کافی لمبی تھی، تبھی تو اس کا کیا کرایا چھپتا رہا۔ ارسل اس کا کزن تھا، خوب امیر و کبیر، اسے نوال اتنی بھائی کہ شادی کر کے ہی چھوڑی۔ اب وہ دو بیٹوں کی ماں بن چکی تھی اور ہر طرح سے خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔ کہیں کوئی کمی نہیں تھی پھر..... پھر یہ تو اس کی عادت بن چکی تھی۔ وہ ایک آدھ چوری کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی، پر آج اس کی مہلت تمام ہو چکی تھی۔ اس کی رسی کھینچ لی گئی تھی۔ وہ کس طرح سے پکڑی گئی تھی۔ کس بری طرح سے ارسل کی نظروں سے گری تھی کہ اٹھنے کے لیے صدیاں درکار تھیں۔ جب وہ ایک

انسان ہو کر اتنا ناراض تھا تو وہ رپ جو ہر بار اسے چوری کرتے دیکھتا رہا تھا، وہ کتنا ناراض ہوگا۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا، وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

”پلیز ارسل مجھے معاف کر دیں، آئندہ آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

وہ بیڈ پر اس کے بالمقابل آ بیٹھی۔ ارسل نے ناراض نظر اس پر ڈالی۔

”معافی مجھ سے نہیں، اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ جس نے چوری کرنے والے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”تو ارد گرد انسانوں کی موجودگی کا اندازہ تو کرتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا لیکن مجھے کیا اتنا کمتر سمجھتا ہے کہ میں سب دیکھ رہا ہوں اور تو پھر بھی چوری کرتا ہے۔“

نوال مارے ندامت کے سر نہیں اٹھایا۔
”تم نے غلطی نہیں گناہ کیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور سچے دل سے توبہ کرو کیونکہ.....“

ارسل نے رک کر نوال کا چہرہ دیکھا جو ندامت کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا، وہ ہلکے سے کھنکرا۔ ”کیونکہ چور، چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔“

نوال نے شرمندگی سے اسے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ ارسل کو اس پر اتنا غصہ تھا کہ آج تین دن سے اس نے اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ ایک بہت اچھی بیوی تھی۔ اسے نوال سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ پر اب جو شکایت ہوئی تھی تو اس نے ٹھیک ٹھاک طریقے سے اس پر اپنا غصہ ظاہر کیا تھا۔ اب وہ اتنی شرمندہ تھی کہ ارسل کو امید تھی کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی..... وہ اسے ایک بار ضرور چانس دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس قبیح حرکت سے باز رکھے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ چوری انسان سے اس کا نفس کرواتا ہے۔ جب انسان نفس کی خواہش پر چلنے لگے تو پھر گناہ کا احساس باقی نہیں رہتا اور اب نوال کا احساس ندامت صاف عیاں تھا۔

سہوئی آنکھیں تھک گئیں

منسردہ لاکھانی

بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ میں اپنی دھن میں تھی۔
”جگہ تو تم نے اپنی آج سے اٹھارہ سال پہلے ہی
بنائی تھی۔“

”اور کہاں بنائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”جناب ہمارے دل میں بھلا اور کہاں۔“
”ارے وہاں تو اب کوئی اور رہتی ہے۔“ میں نے
جتانے والے انداز میں کہا۔

”تم نے اتنی جگہ لے رکھی ہے کہ اور جگہ کی گنجائش
ہی نہیں..... ماشاء اللہ صحت اچھی ہے تمہاری اور یہ کیا تم
نے تو موضوع ہی بدل دیا ہے۔“ شوہر نے کہا۔
”ارے بھی موضوع بدلا ہے ارادہ تو نہیں۔“ میں
اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے بولی۔

”یہ تم کس الجھن میں ہو؟ جس کی وجہ سے پورا گھر
الٹ پلٹ کر رکھا ہے۔“ شوہر نے پھر دہرایا۔
”پاپا آپ کی جرابیں ضرور جہاں مشین رکھی
جائے گی وہیں سے نکلیں گی۔“ بیٹے عارف نے پیچھے
سے آواز لگائی۔

”میرا خیال ہے مجھے ماتھے پر ایک neon
sign لکھ کر لگانا پڑے گا کہ میری پریشانی کی وجہ کیا
ہے۔ چلیں دوبارہ بتا دیتی ہوں کہ میری پریشانی کی وجہ کیا
ہے۔“ میں نے گلا کھنکھارا۔ ”دراصل میں نے جو ایک عدد
سلانی کی مشین خریدی ہے جس کے لیے گھر میں ایک
بوزوں جگہ ڈھونڈ رہی ہوں اور میں اسے کھڑکی کے پاس
رکھنا چاہ رہی ہوں وہاں سے روشنی آئے تاکہ بجلی کا خرچ
بھی بچے اور اس سے میری کچھ کمائی بھی ہو سکے۔“ میں
نے پوری بات بتائی۔

”کھڑکی کے پاس رکھنے سے تو تم ہر وقت کھڑکی
کھلی رکھا کرو گی اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں.....
کیونکہ مجھے نزلہ فوراً پکڑ لیتا ہے۔“ شکیل صاحب نے
ایک منہ لگائی۔

”لو اب یہ ایک اور مسئلہ نکل آیا۔ بھی تو بہ ہے اتنے
نازک تم کب سے ہو گئے؟ لگتا ہے تمہاری اماں نے بڑے
لاڈ میں تمہیں پالا ہے اور لاڈ میں پلنے والے بچے کبھی نہ



”ایک سلانی مشین تم نے کیا خرید لی جس کے لیے
پورا گھر تم نے الٹ پلٹ کیا ہوا ہے۔ اور اب اسے رکھنے
کی لیے جگہ ڈھونڈ رہی ہو۔“ شوہر نے کھٹ پٹ کی صدا پر
کہا۔ ”آخر یہ کیا ماجرا ہے بیگم، اس گھر میں کبھی کوئی چیز
ٹھکانے پر یا وقت پر ملتی ہی نہیں..... دیکھو میری جرابیں
بھی نہیں مل رہی ہیں۔ تم نے تو نہیں دیکھیں؟“ وہ الجھے
ہوئے انداز میں بولے۔

”نہیں“ میں تو خود اپنی الجھن میں ہوں اور جگہ

زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور نہ ہی جلد بڑے ہوتے ہیں۔
بس ذرا دبلے ہو جاتے ہیں اور لمبے لگنے لگتے ہیں۔ جسے
بڑا بڑا سمجھا جانے لگتا ہے۔ اب یہ سن کر تمہارے منہ پر بارہ
کیوں نہ بننے لگے ہیں، شاید سچ سننے سے ڈرتے ہو اسی لیے
میرے پوچھے ہوئے سوالوں کے جوابوں کو دل میں دفن
کر دیا ہے تم نے۔ خیر اس وقت تو یہ سوچتا ہے کہ اس کا حل
تلاش کرنا سب سے پہلے ضروری ہے کہ مشین کے لیے کوئی
موزوں جگہ نکل آئے۔“

”اچھا، تم ایسا کرو یہ کونے کا می والا کمرالے لو اور اسے
سجا بنا لو میری جان چھوڑو اور مکڑی کی طرح مجھ سے مت چپکی
رہو اپنے سوالوں کو لے کر۔“ میاں صاحب بولے۔

”خدا کی پناہ ہے شکیل، ارے وہ کمر تو صندوق جیسا
ہے، بند بند سا، اسے سجا یا نہیں جاسکتا، اس میں یقین جانو
سجاوٹ نہیں حراست ہوگی اور میری سہیلیاں کبھی کبھار جب
سلائی کے کام کے دوران آئیں گی تو انہیں کیسے وہاں بٹھاؤں
گی۔ خاصی پشیمانی ہوگی۔“ میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”میرا خیال ہے پریشانی سے تو پشیمانی بہتر
ہے۔“ شکیل نے کہا۔ ”اچھا اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ
اپنی پشیمانی دور کرنے کو اور دوستوں میں سراونچا رکھنے کے
لیے ایک ترکیب اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کبھی ایسا
مسئلہ درپیش آئے تو تم کھڑکی کے پیچھے ایک گدھا رکھ لو اور
اس کے کان کھینچ کر اپنا غصہ نکال کر دیا کرنا کہ دھوبی اکثر
یہاں سے میرا گدھا چرا لے جاتا ہے اسی لیے میں نے
اس کمرے کو سلائی کا کمرا بنایا ہے تاکہ اس پر نظر بھی رہ سکے
اور تمہارا غصہ بھی نکل جائے۔“ شکیل نے مسخرانہ انداز
اختیار کیا۔

”بات یہ ہے کہ گدھے کے کان کھینچنے سے غصہ تو
نکل جائے گا لیکن اس گدھے کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم اس
دھوبی کے ساتھ مت جانا۔ کسی نے خوب کہا تھا کہ گدھے
کے کان کھینچ کر اسے چلایا نہیں جاسکتا، نہ ہی اس سے
کمرے کی خوبی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کا
سائز بدلا جاسکتا ہے۔“ میں نے ان کی بے تکلی بات کا
فوری جواب دیا۔

”تو فرزانہ، رہ گئی بات کمائی کی تو یہ بتاؤ کہ میں
تمہیں کافی پیسے جب دیتا ہوں اور تمہیں کافی خوش بھی
رکھتا ہوں تو پھر پیسے کمانے کی کیا حاجت تمہیں پیش آگئی
ہے۔“ انہیں پیسے کی بات بڑی بری لگی تھی۔

”واہ اللہ کی پناہ، آج تو ہوا کے ہاتھ بھی اپنے ہنر کو
دیکھنے لگے گویا وہ اپنے درِ دل کو دیکھنے لگے۔“ میرے منہ
سے اچانک یہ نکلا۔ وہ مجھے دیکھتے رہ گئے۔

”پہلی وجہ پیسہ کمانے کی یہ ہے کہ پیسہ کمانے کے
معنی ہیں آئندہ کے لیے کچھ بچت لیکن اتنا بھی نہیں کہ محل
اس سے کھڑا کر لیا جائے۔۔۔ بس بچوں کا اضافی خرچ اس
سے نکل آئے گا اور دوسری بڑی وجہ ذرا غور سے
سنو۔۔۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سے دماغ چلتا رہے گا اور یہ
بڑھاپے میں ذہن کے لیے اتفاق دے گا اس سے
بڑھاپے میں dementia سے انسان بچا رہ سکتا ہے
کیونکہ ذہن جتنا بڑی رہے گا اتنا ہی عمر رسیدگی کے لیے
اچھا عمل ہے۔“ میں نے انہیں اخلاقی طور پر سہارا دیا۔

”یہ ہوئی نہ بات کہ ہماری بیگم خواہ کیسی بھی ہوں
اپنی بات منوانا خوب جانتی ہیں اور سونے پر سہاگا کہ انہیں
تو اندھیرا ہو کہ وہ غصے میں ہوں، اپنی سوئی تلاش کرنا خوب
آتی ہے۔“ شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی تم نے میرے دل کی گہرائیوں میں جب
ایسی سچائی کو جنم دے ہی دیا ہے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اب می
والا کمر خوب سجا، سجا نظر آ رہا ہے اور لاؤ اسی پر اکتفا
کر لیتے ہیں، کپڑے بھی سل جایا کریں گے اور دھوبی کی
چوری بھی پکڑی جائے گی، ادھر دوست بھی خوش، خوش
آجایا کریں گی بچوں کے خرچ سے بھی نمٹا جاسکے گا اور
..... اور میں بھی دور وئی زیادہ کھا کر بڑھاپے کی بیماری کو
مات دے سکوں گی۔“ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
”بھئی سوئی سے دھاگے تک کا حل آسان نہ تھا۔
خصوصاً میاں صاحب کی عقل کو کھولنے کے لیے تو بڑے
پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔“ پوری کہانی اپنی سہیلی کو سنا کر آخر میں
میں نے یہ جملہ لگایا تو وہ ہنستے ہوئے مجھے داد دینے لگی۔



مہم بین کائنات غزل

انسان جب خواہشات پر انحصار کرنے لگتا ہے تو
منہ کے بل گرتا ہے مگر وہ اسے منہ کے بل گرنے سے
بچانا چاہتا تھا۔

وہ ایک سنہری شام تھی..... گاڑی گھر میں داخل
ہوئی تو دونوں اپنی، اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر
گئے۔ واصله زوردار انداز میں دروازہ بند کر کے اندر کی
طرف بڑھ گئی۔ جبکہ جاذب اپنی طرف کے دروازے
سے کھڑا ٹیک لگائے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

جب سے انا بی نے واصفہ کو جاذب کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی تب سے واصفہ کے انداز اسی طرح کے ہو گئے تھے جبکہ بچپن کے کئی سال اور جوانی میں رکھتے قدم دونوں نے پیار محبت اور شرارتوں میں ایک ساتھ گزارے تھے..... کبھی لڑتے جھگڑتے تو اگلے پل ہنس دیتے۔

لیکن اب.....؟ جاذب کے ہونٹ بھیج گئے تھے۔ وہ اس کے عشق میں پور، پور ڈوبا ہوا تھا..... اس سے جدا ہونے کا تصور ہی روح فرسا تھا..... لیکن واصفہ کی بے لگام ہوتی خواہشات اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

☆☆☆

حسین ولا جب آباد ہوا تھا تو اس وقت بھی یہاں افراد کی قلت ہی تھی وقت گزرنے کے ساتھ بڑھنے کے بجائے مزید کم افراد ہوتے گئے۔

میسجر حسین نے بڑی محبت کے ساتھ اپنا آشیانہ بنایا تھا کئی خواب تھے ان کی آنکھوں میں دو بیٹوں محارب حسین، ثاقب حسین اور شریک حیات قانتہ کے ساتھ وہ یہاں شفٹ ہوئے تھے..... چند دن اپنے اس آشیانے میں گزار کر وہ شہید کا درجہ پا گئے تھے۔ قانتہ بیگم جنہیں بچے انا بی کہتے تھے انہوں نے اپنے بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

ماں اور باپ دونوں بن کر پالا..... اتنے بڑے گھر میں محض تین نفوس زندگی گزار رہے تھے۔ بیٹوں نے قد نکالا تو انہیں گھر کی رونق بڑھانے کا خیال آیا.....

محارب حسین اپنی کلاس فیلو زاریہ وقار میں انٹر سٹڈ تھے۔ وہ چھان بین کر کے اسے خوش دلی سے بیاہ لائیں لیکن زاریہ وقار کو سو برسی انا بی تو پسند تھیں پر ان کے اصول پسند نہ تھے۔ چند ماہ میں انہوں نے بالا ہی بالا کینیڈا جانے کا پروگرام بنالیا..... جہاں ان کی آدمی فیملی آباد تھی۔ محارب حسین نے کینیڈا کی ایک کمپنی میں انٹرویو دیا اور اپنا سمنٹ لیٹر ملتے ہی دونوں کینیڈا سدھار گئے۔ انا بی نے ایک بار بھی نہ روکا۔

وہ جانتی تھیں پرندے کے جب پر لگ جائیں تو وہ اپنی اڑان سے رکنا نہیں۔

ثاقب حسین بھائی کے اس عمل سے شاکڈ رہ گئے۔ انہوں نے اپنی شادی کا فیصلہ انا بی پر چھوڑ دیا سو وہ اپنی بیٹی سنبل کو بیاہ کر لے آئیں۔

سنبل کے آتے ہی خاموش گھر میں قہقہے گونجنے لگے جو کہ زاریہ کے آنے سے بھی نہ گونجتے تھے، وہ زیادہ تر باہر نکل جاتی جبکہ سنبل نے آتے ہی گھر کے سارے کام اپنے ذمے لے لیے تھے..... سارا دن بولتی رہتی..... اس کی ہنسی کے جھرنے بہتے رہتے، وہ امید سے ہوئی تو انا بی نے اس کی ساری ذمے داریاں واپس لے لیں اور اسے ہتھیلی کا چھالا بنالیا.....

ادھر محارب حسین بھی ایک بیٹے کے باپ بن گئے تھے۔ زاریہ سے بچہ بالکل نہ سنبھلتا اس نے گورنس رکھی اور خود سارا سارا دن گھر سے غائب رہتی۔ ایک دن محارب حسین جلدی گھر آ گئے۔ انہوں نے جو منظر دیکھا تو سر سے پاؤں تک لرز گئے۔ اگر چند لمحے بھی دیر کر دیتے تو اپنے بیٹے کو کھود دیتے۔

گورنس ٹیرس پر کھڑی ہنس، ہنس کر کسی سے باتیں کر رہی تھی اور جاذب حسین نے نیا، نیا چلنا سیکھا تھا۔ وہ گورنس کی بیک سائڈ کی گرل پر لڑکا ہوا تھا اس کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ محارب حسین نے اسے جلدی سے اچک کر تھاما..... اور ایک فیصلہ کر لیا..... وہ اب حیرت زدہ اس بات پر تھے کہ زاریہ نے ماں ہوتے ہوئے.... مروتا بھی منع نہیں کیا تھا۔ اگلے ہفتے وہ جاذب کے ساتھ انا بی کے سامنے تھے۔ وہ جاذب کو انا بی کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ جاذب بہت ہی صابر بچہ تھا۔ بہت آرام سے یہاں ایڈ جسٹ ہو گیا تھا۔ دن گزرتے رہے..... انا بی کا دل تو سنبل کے آنے سے ہی بہل گیا تھا اب جاذب کی آمد نے انہیں اور مصروف کر دیا تھا۔ کچھ وقت اور ہر کا۔ ثاقب اور سنبل بھی

موبائل کی بیپ پر وہ چونکا تھا۔ انا بی کی کال تھی۔
وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔
اب وہ کمرالاکڈ کیے بیٹھی تھی۔ انا بی پریشان
ہو گئی تھیں جبھی جاذب کو کال کی انہوں نے۔ گھر آئے
ہوئے اسے آدھا گھنٹا ہو گیا تھا مگر وہ باہر ہی کھڑا اپنی
سوچوں میں گم تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے محترمہ کا، سیولیس
ڈریس لے رہی تھیں منع کیا تو آپے سے باہر ہو گئیں،
وہیں شاپ پر ایک تماشا کھڑا کر دیا..... اس سے
پوچھ لیں اگر اسے ہمارے رشتے پر اعتراض ہے تو
آپ یہیں اس بات کو ختم کر دیں، وہ جان بوجھ کر
زور زور سے بول رہا تھا..... وہ یک دم دروازہ کھول
کر باہر آئی۔

”ہاں..... ہاں ختم کرو..... آزاد کر دو مجھے ان
پابندیوں سے..... ساری زندگی غلامی میں نہیں گزارنی
چاہیے۔“ وہ سرخ چہرے اور سوچی آنکھوں سے اسے

ایک بیٹی کے والدین بن گئے۔ انا بی نے اس کا نام
واصفہ رکھا..... بچی بہت کمزور تھی اسے ایک ہفتہ
اسپتال میں انکیوبیٹر میں رہنا تھا جبکہ سنبل کی چھٹی
ہو گئی تھی۔ ثاقب حسین، سنبل کو اس کی والدہ کے گھر
چھوڑنے جا رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے
دونوں کو اجل کا نوالہ بنا ڈالا..... انا بی پر یہ غم پہاڑ
کے مانند ٹوٹا تھا۔ جاذب کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ زندگی
کی بازی ہار جاتیں۔ محارب حسین کے پہنچنے تک ان
دونوں کو دفن دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے بھائی سے آخری
ملاقات بھی نہ کر سکے..... بس چند دن ٹھہر کر واپس
اپنے دیس لوٹ گئے۔

انا بی کے لیے ایک بار پھر امتحان تھا انہوں نے
دونوں بچوں کی پرورش شروع کر دی۔ جاذب بہت
سمجھدار تھا جبکہ واصفہ چلبلی سی دونوں میں چند سال کا ہی
فرق تھا یونہی لڑتے جھگڑتے دونوں بڑے ہو گئے۔
جاذب، واصفہ کو اکثر نصیحتیں کرتا کبھی وہ مان جاتی کبھی
کانوں پہ مار دیتی..... لیکن اب جب سے انا بی نے
دونوں کو ایک دوسرے کے نام کیا تھا..... واصفہ اکھڑی،
اکھڑی سی رہنے لگی تھی اور آج تو واصفہ نے حد ہی کر دی
تھی..... انا بی کی اجازت سے وہ اسے شاپنگ پر لے
کر گیا تھا۔ واصفہ جس سوٹ پر ہاتھ رکھتی رہ آستینوں
کے بغیر ہوتا..... جاذب اسے منع کر دیتا..... آخری
شاپ پر وہ جاذب پر چلا آئی.....

”مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ..... ابھی سے شوہر
بننے کی کوشش نہ کرو..... تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ تم
میرے معاملات میں دخل اندازی کرو..... ساری
زندگی انا بی اور تمہاری مرضی کے کپڑے پہنے ہیں، کیا
اتنا بھی حق نہیں میرا کہ میں اپنی مرضی کی شاپنگ
کروں..... کس سے ملنا ہے.....؟ کیا کھانا ہے.....؟
کیا پہننا ہے.....؟“ سب لوگ رک رک کر
انہیں دیکھنے لگے..... جاذب اس کے بولنے کی پروا
کیے بنا اسے گھسیٹا ہوا گاڑی تک لایا اور اندر بیٹھ کر اپنی
سینے پر آ کر فوراً گاڑی اشارت کر دی.....

معروف اور مقبول قلم کار
طاہر جاوید مغل
کی نئی سلسلے وار کہانی

الانگلے

جاسوسی ڈائجسٹ
میں پیش کی جا رہی ہے
زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں
اپنے دامن میں سینے
ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحریک انگیز کہانی
جسے تارنیں ایک ہی نشست میں پڑھنے پر
خود کو مجبور پائیں گے

گھورتی ہوئی بولی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔
”دیکھ لیا آپ نے.....!“ جاذب برداشت کی
منازل سے گزر رہا تھا۔

انابی نے بھی ایک فیصلہ فوری کیا اور اس نام
نہاد منگنی کو ختم کر دیا۔ دونوں ایک ہی گھر میں اجنبی
بن گئے۔

جنید اسی ایریے میں رہتا تھا اس کی والدہ نے
جب پہلے واصفہ کا ہاتھ مانگا تو انابی نے خاموشی اختیار
کر لی تھی اور جاذب اور واصفہ کو ایک دوسرے کے نام
کی انگوشی پہنادی تھی مگر اب ان حالات کے تحت انہوں
نے واصفہ کی رضامندی سے جنید کی والدہ کو ہاں
کر دی..... جاذب نے خود کو پتھر کر لیا..... واصفہ نے
اپنی منگنی کی ساری شاہنگ اپنی دوست ندا کے ساتھ کی
تھی..... اس کے علاوہ گھر میں پہننے کے تمام جوڑے وہ
جان کر سیلوئیس لے کر آئی اور انہیں پہن کر جتنی
نظروں سے جاذب کو دیکھتی..... جاذب لب بھینچ کر رہ
جاتا..... انابی نے اسے جنید سے ملنے کی اجازت تو دی
تھی لیکن کہیں باہر ساتھ جانے کی نہیں..... وہ اکثر گھر
چلا آتا..... جاذب سے اس کی واصفہ پر پڑتی
نظریں برداشت نہ ہوتیں..... گو کہ وہ اس کا ہونے والا
شوہر تھا لیکن ابھی تھا تو نامحرم ہی۔ وہ سر سے پاؤں تک
اسے ایکسرے کے انداز میں دیکھتا تو جاذب کا خون
کھول جاتا وہ اس جگہ سے ہی ہٹ جاتا..... ساتھ
رہتے ہوئے بھی اس نے کبھی واصفہ پر بری نگاہ نہ ڈالی
تھی اور جنید..... اس دن تو حد ہو گئی..... جاذب ٹیرس پر
کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا..... نیچے لان میں واصفہ،
جنید کے ساتھ لان چیر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔
دونوں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ واصفہ کا چہرہ شرم
سے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ جنید اس کے مزید قریب ہوا اور
اس کے پتا آستین کے گورے گورے بازو پر اپنا ہاتھ
رکھ دیا تو واصفہ کے چہرے پر کچھ ناگوار تاثرات
ابھرے تھے۔ جیسے اسے جنید کا یہ عمل پسند نہیں آ رہا
ہو..... وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے فرار کا راستہ ڈھونڈ

رہی ہو..... جاذب سے یہ سب برداشت نہیں ہوا۔ وہ
تیر کی طرح نیچے پہنچا اور اپنے چہرے کے تاثرات کو
بدلتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ جنید جو کسی اور ہی
دنیا میں پہنچا ہوا تھا..... اسے دیکھ کر یک دم سنبھلا، اٹھ
کر اس سے مصافحہ کیا.....

”ایکسپو چل رہے ہو؟ بہت زبردست ایگری
بیشن لگی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے جنید کو آفر کی۔

”تم اس حلیے میں جاؤ گے یا؟“ جنید نے سر
سے پاؤں تک اسے دیکھا..... ڈھیلا، ڈھالا ٹراؤزر اور
کہنی تک فولڈ ہوئی آستینیں اوپر سے بنا استری
شرٹ..... منہ بھی شاید صبح کا دھلا تھا..... ”تم چھینچ کر لو
میں اتنی دیروٹ کر لیتا ہوں۔“ اس کے مزید رکنے کا
سن کر جاذب کو لگا واصفہ گھبرا رہی ہے۔

”نہیں یار، مرد ہر حلیے میں جتتے ہیں تم آؤ تو
میرے ساتھ۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے پورچ
میں آگیا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جاذب نے
جنید کے ناگوار تاثرات کی بھی پروا نہ کی۔ ایکسپو سے
واپسی پر اس نے جنید کو گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ واصفہ کی
مرضی کے بنا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا لیکن جنید کو
آئندہ وہ گھر بھی نہیں بلا سکتا تھا۔ کچھ بھی تھا واصفہ اس
کی عزت تھی۔ اس گھر کا واحد مرد وہی تھا۔ اسی نے
واصفہ کی حفاظت کرنا تھی..... لیکن کوئی حل اس کے
ذہن میں نہیں آ رہا تھا..... وہ گھر آ کر سیدھا اپنے
کمرے میں جا رہا تھا بھی انابی نے کھانے کا پوچھا
اس کی بھوک مرچکی تھی لیکن انہیں نہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ
کھلائے بنا نہ چھوڑتیں۔

”دوست کے ساتھ کھالیا۔“ کہہ کر وہ اپنے روم
میں آگیا..... اور جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا.....
اس کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا
کرے کس طرح اسے روکے..... یک دم دروازے پر
کھٹ کھٹ ہوئی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ آنے والی
واصفہ تھی۔ وہ پوری آستینوں کی قمیص پہنے دوپٹا اچھی
طرح ڈھکے دروازے کے بیچ کھڑی اپنی انگلیاں مروڑ

16 دسمبر یساور کے بچوں کے نام

اپنے ماں باپ کے معصوم سے پیارے بچے
اے وطن! تجھ پر فدا ہو گئے سارے بچے
مائیں روتے ہوئے آپس میں یہ کہتی ہوں گی
ابھی اسکول سے آئیں گے ہمارے بچے
وہ مسلمان کیا، انسان نہیں ہو سکتے
جن درندوں نے بلکتے ہوئے مارے بچے
ارض پاک کی اے میری بہادر ماؤں
قوم کا فخر ہیں، دراصل تمہارے بچے
لاشے ہاتھوں پہ اٹھا کر بھی کہتے ہوں گے
یہ ہمارے تھے بڑھاپے کے سہارے بچے
پیکر صبر وفا ہیں کہ جنہوں نے چپ چاپ
قبر میں اپنے ہی ہاتھوں سے اتارے بچے
کوئی بھی عہد انہیں بھول نہ پائے گا ظہور
مشعل راہ ہیں وہ سب چاند ستارے بچے
شاعر: ظہور چوہان۔ انتخاب: زارا میرانی، لیہ

آنسو صاف کر لو..... اب مجھے یہ دوبارہ نظر نہ آئیں۔
شکر ہے خدا کا کہ تم بھٹکنے سے پہلے لوٹ آئی ہو۔“
”تم نے مجھے معاف کر دیا نا پیا جاذب.....؟“
وہ نم پلکوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کوئی اپنے پیار سے بھی بھلا نا راض رہ سکتا
ہے..... ایسی بات نہیں کہ میں تم سے پیار نہیں کرتا
لیکن میں وقت پر اس کے اظہار کا قائل
ہوں..... تم نادان ہو، ابھی نا سمجھ ہو، سچے پیار اور
بے باکی کے فرق کو نہ سمجھ پائیں“ وہ نرم لہجے میں
اسے سمجھا رہا تھا۔

”نہ جانے کتنی لڑکیاں جنید جیسے بے باک لڑکوں
کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں جو پیار کے بہانے ان کی عزت
تار، تار کرنے میں دیر نہیں لگاتے اور معصوم دل لڑکیاں
اسی سراب کے پیچھے بھاگنے لگتی ہیں۔“ جاذب نے
سوچتے ہوئے اک ٹھنڈی آہ بھری اور انابی کے کمرے
کی جانب بڑھ گیا۔

رہی تھی۔

جاذب کو اتنی ٹینشن میں بھی واصفہ کے طرز پر ہنسی
آنے لگی۔

”اندر آ جاؤ..... وہاں کیوں کھڑی ہو.....؟“
واصفہ اندر آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
”مجھے معاف کر دو جاذب..... میں بہک گئی
تھی۔“ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے
ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی..... جاذب نے
کچھ دیر اسے رونے دیا پھر اس کے کندھے پر اپنا بھاری
مضبوط ہاتھ رکھا تو اس کے آنسوؤں کو جیسے بریک لگ
گیا۔ وہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہیں یہی لگتا تھا ناں کہ ہم تم پر پابندیاں
لگاتے ہیں.....؟ جاذب اب اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک چھوٹی سی مثال ہے..... تم ایک دس
روپے کا نوٹ لے کر نکلتی ہو..... وہ تم ہاتھ میں لے کر
نکل جاؤ گر جائے یا لوگ دیکھیں تمہیں کوئی فرق نہیں
پڑے گا پر تم سوکا لے کر نکلو گی تو اس کی تھوڑی حفاظت کا
بھی سوچو گی۔ پانچ سو، ہزار، پانچ ہزار کے نوٹ چھپا
کر رکھو گی اور سونا لے کر نکلو گی تو بالکل ہی اندرونی
جیب میں رکھو گی اور اگر تمہارے پاس ہیرا ہو..... تو
اسے اپنے ساتھی کو بھی بتانا پسند نہیں کرو گی..... بولو.....
کچھ بات سمجھ آ رہی ہے یا نہیں.....؟“

واصفہ کو دراصل جنید کی محبت کی حقیقت پتا چل گئی
تھی کہ وہ محض وقت گزاری کر رہا تھا..... واصفہ کو ایک
شام نے ہی سبق سکھا دیا تھا۔ انابی نے بھی بعد میں شکر
ادا کیا کہ وقت پر سب کچھ ہی سامنے آ گیا اور واصفہ کو
بھی عقل آ گئی۔

واصفہ سر جھکائے بس اسے سنے جا رہی تھی.....
اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”میرے نزدیک تم سونے، ہیرے سے بھی
زیادہ قیمتی ہو واصفہ.....“ اب وہ اس کے سامنے دوزانو
ہو کر بیٹھا تھا۔

”بہت قیمتی ہو، بہت زیادہ قیمتی..... اب اپنے یہ

آخری امید

قیصرہ حیات

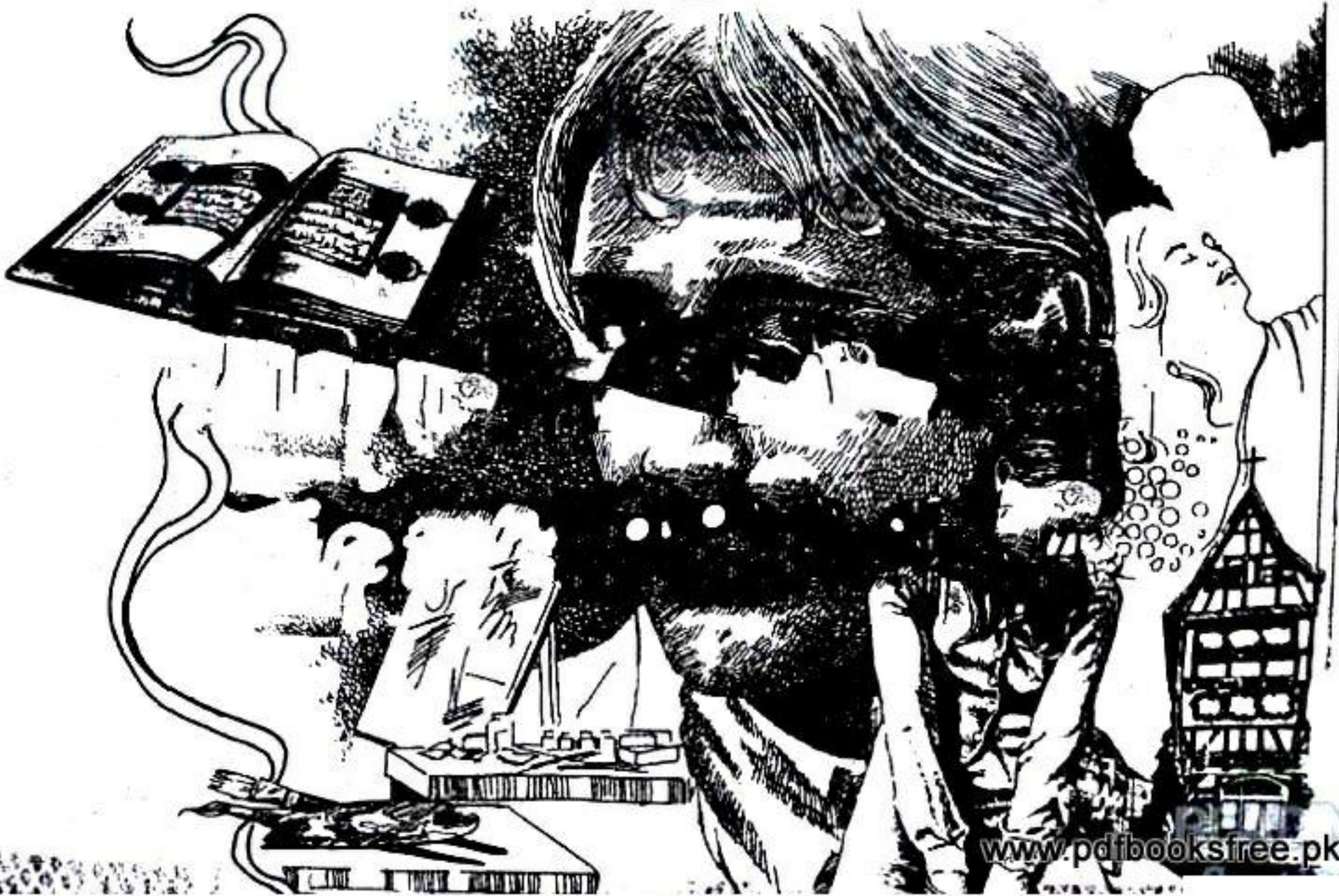
مکان فانی ، مکین آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

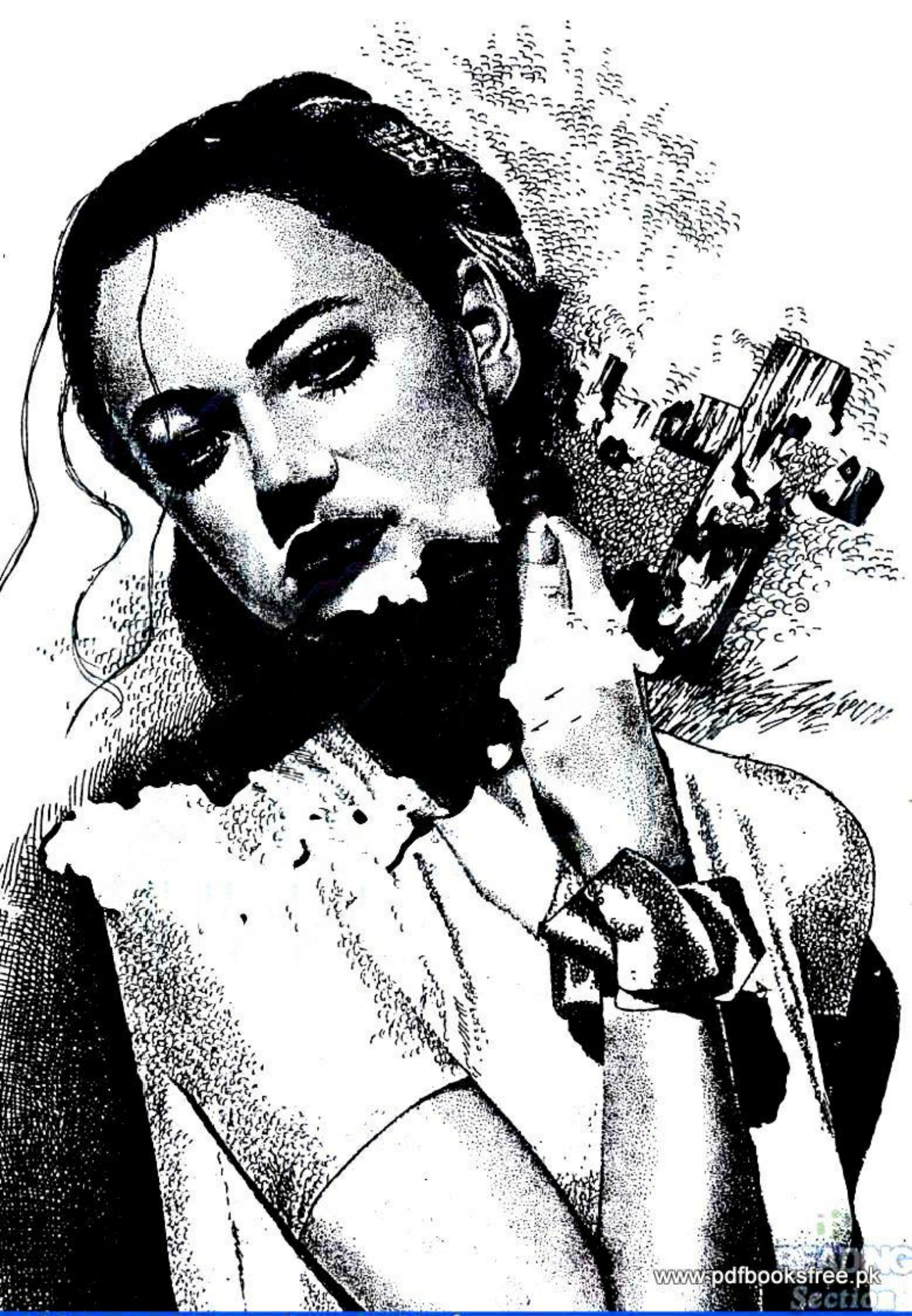
ایک ایسی لڑکی کی کہانی ... جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی
ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن
شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب
صورت اور پُر اثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات
مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایہ ناز مصنفہ کے منظر و اندازِ بیاں کا

ایک اور شاہکار





آمنہ اب گھر کے تھوڑے بہت کام کرنے لگی تھی۔ جمیلہ کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹاتی اور پھر اس کے بعد یا تو اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرتی یا پھر نیٹ پر مصروف رہتی..... اس نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ جرمنی سے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا سوا سے یہاں بھی جاری رکھا۔ نیٹ پر وہ نینب اور دوسری خواتین کے ساتھ رابطے میں رہتی۔ سب خواتین اسے بہت مس کر رہی تھیں اور اس کی واپسی کا بار بار پوچھتیں مگر آمنہ انہیں یہ بتا کر مایوس کر دیتی کہ..... فی الحال اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں..... اسے عبدالرحمن کی فیملی کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سب اس سے کرید کرید کر پوچھتیں کہ اس کی سسرال کیسی ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں یا نہیں.....؟ اور وہ سب کو بہت پُر امید جواب دیتی کہ وہ بہت خوش ہے اور سب لوگ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خاص طور پر..... عبدالرحمن اور اس کی ماں..... وہ سب اس کی باتیں سن کر خوش ہوتیں..... مگر اب آمنہ نیٹ پر بھی باتیں کر کے تھکنے لگی تھی۔ عبدالرحمن اپنے اسکول میں بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ آج کل وہ اسلامک آرٹ سے متعلقہ ایک زبردست سی نمائش پلان کر رہا تھا اور دن رات اسی میں مصروف تھا۔ آمنہ نے بھی اس کا اسکول جوائن کرنے کا سوچا تو عبدالرحمن سے بات کی۔

”ٹھیک ہے، تم کل میرے ساتھ چلنا..... پھر دیکھوں گا تم کیا کر سکتی ہو..... آئی مین..... ہم لوگ تو زیادہ تر Islamic calligraphy (اسلامی خطاطی) کے بارے میں پلان کر رہے ہیں۔“ عبدالرحمن نے بیڈ پر تھکے ہوئے انداز میں لیٹتے ہوئے کہا۔

”اوکے..... میں تو زیادہ اسکیچز بناتی تھی مگر اب اسکیچنگ چھوڑ دی ہے اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے کوئی اسکیچ بنائے ہوئے۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”آمنہ اسکیچنگ..... پورٹریٹس sculptures بنانا تمہارا شوق تھا، جنون تھا اور اب تم سب کچھ چھوڑ چکی ہو..... کبھی دل میں خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہی کام کرو جو مسلم ہونے سے پہلے کرتی تھیں؟“ عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قدرے متحسّس انداز میں پوچھا۔

”عبدالرحمن..... مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری زندگی کا کوئی ایسا دن نہ گزرا ہو..... جب میں نے اسکیچنگ نہ کی ہو..... کوئی ڈرائنگ نہ بنائی ہو..... مجھے کچھ ڈرائنگیں بغیر نیند نہیں آتی تھی اور اب میں اس کے بارے میں سوچتی تو ہوں مگر بہت کم..... صرف یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو میں اپنی خواہش کو دبا لیتی ہوں۔ عبدالرحمن..... میں کبھی اللہ سے اتنی محبت بھی کروں گی، اب مجھے کبھی، کبھی خود پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیتھی جو کرائسٹ سے بہت پیار کرتی تھی مگر اس نے کبھی اس کی محبت میں کچھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کیتھی کی محبت superiecial تھی مگر آمنہ کی محبت کتنی اسٹرائنگ ہے۔ آمنہ اللہ کی محبت میں اب سب کچھ کر سکتی ہے یہاں تک کہ تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہے۔“ آمنہ نے انتہائی صاف گوئی سے کہا تو عبدالرحمن ایک دم چونک گیا۔

”مجھے بھی.....؟“ وہ قدرے ہٹلا کر بولا۔

”ہاں..... تمہیں بھی.....“ اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”کیا..... تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں.....؟“ عبدالرحمن نے گھبرا کر پوچھا۔

”کرتی ہوں، بہت زیادہ..... اس دنیا میں تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر عبدالرحمن، تم ایک انسان ہو..... اللہ کے بنائے ہوئے انسان..... تمہارا اور میرا رشتہ تب تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ اگر وہ تمہیں مجھ سے ابھی چھین لے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ابھی جدا ہو جائیں تو ہم کیا کر سکیں گے..... اللہ نے پہلے مجھے انسانوں کی محبت اور ان سے جدائی کا گہرا تجربہ کرایا اور پھر اپنی محبت میرے دل میں اتنی

شدید ڈال دی کہ اب میرے لیے انسانوں کی محبت اس طرح اہمیت نہیں رکھتی جس طرح اللہ کی رکھتی ہے.....
عبدالرحمن میں نے زندگی میں جتنے کرائسز دیکھے انہوں نے اللہ سے میرا رشتہ بہت مضبوط کر دیا ہے۔ اب مجھے صرف
یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت صرف اور صرف اللہ ہے۔ باقی سب عارضی اور وقتی
رشتے اور باتیں ہیں۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا تو عبدالرحمن پرستائش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
”آمنہ..... really appreciate you اللہ نے تمہیں جس حقیقت سے آشنا کیا ہے۔ تم
پر اللہ کی نظر کرم ہے۔ تم واقعی اللہ کی طرف سے بخشی گئی ہو۔“ عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت بھرے لہجے
میں کہا۔

”yes I think so“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آمنہ..... جس محبت کا تجربہ تم کر رہی ہو..... یہی پکے اور سچے مسلمان کی نشانی ہے اور مسلمانوں کی اسی محبت
سے دنیا ڈرتی ہے اور مسلمانوں کو خواہ مخواہ شدت پسند کہتی ہے مگر حقیقت میں محبت کا یہ عرفان مومنین کے لیے اللہ کا
تحفہ ہے جو کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو کبھی نہیں مل سکتا۔“ عبدالرحمن نے مسکرا کر جواب دیا۔
”کیوں.....؟“ آمنہ نے چونک کر پوچھا۔

”کیونکہ جس مذہب میں خدا قافلے پر ہو..... اور اس کو پانے کے لیے انسان کو بہت سی رسوبات اور اپنے
جیسے مذہبی نمائندوں کا سہارا لینا پڑے تو اس خدا سے تعلق اتنا مضبوط نہیں ہو سکتا بہ نسبت اس خدا کے جو ہر لمحہ انسان
کے ساتھ، ساتھ، اندر اور باہر ہو..... اور پھر انسان کو خود اس کی موجودگی کا انتہائی شدت سے احساس بھی ہو..... اور
اس شدید احساس کی وجہ سے انسان اپنا سب کچھ اپنے اللہ کو سونپ دے۔ جس طرح تم نے سوچا ہے اور حقیقت
میں یہی اسلام کی روح اور سچا اسلام ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اللہ نے مجھے تم جیسی صاحب ایمان بیوی سے نوازا ہے۔“
عبدالرحمن نے فرط جذبات سے لبریز ہو کر اس کی پیشانی کو محبت سے چومتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے ان
کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو آمنہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے
ہاجرہ قدرے غصے میں کھڑی تھی۔

”آپ.....!“ آمنہ نے حیرت سے کہا..... تو ہاجرہ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور منہ بنا کر
اندر داخل ہو گئی۔ عبدالرحمن نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

”بھیا..... مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ ہاجرہ نے قدرے خفگی سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا تو عبدالرحمن اس کا اشارہ سمجھ گیا۔
”آمنہ..... پلیز..... میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔“ عبدالرحمن نے کہا تو وہ خاموشی سے کمرے سے
باہر نکل گئی۔

”جی..... بھابی..... خیریت تو ہے..... آپ بیٹھیں تو سہی.....“ عبدالرحمن نے کہا۔

”خیریت ہوئی تو میں اس وقت تمہارے پاس نہیں آتی۔“ ہاجرہ نے اس کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے
ہوئے کہا۔

”کیوں، کیا ہوا.....؟“ عبدالرحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”میں پوچھنے آئی ہوں..... یہ ہمارے سروں پر اسلام کا ڈنڈا کب تک برستار ہے گا؟“ ہاجرہ غصے سے بولی۔

”کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں.....؟“ عبدالرحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”تم یہ جو اپنی بیوی کی صورت میں ملانی لے آئے ہو..... جو ہر وقت ہمیں فتوے سناتی رہتی ہے اور ہمیں مسلمان کم اور کافر زیادہ سمجھتی ہے۔ کام بعد میں کرو..... اسلام کا کوڑا پہلے برسنے کو تیار ہوتا ہے۔ بھیا ہم نے کیا گناہ کر دیے ہیں کہ ہماری جان بخشی ہی نہیں ہو رہی۔ اس نے تو ہماری زندگیاں مصیبت میں ڈال دی ہیں۔ بچے الگ پریشان ہیں، شوہر، بیویوں سے لڑنے لگے ہیں۔ یہ کون سی فتنہ ہمارے گھر آگئی ہے۔ بھیا ہماری تو جان چھڑاؤ اس مصیبت سے۔“ ہاجرہ انتہائی غصے میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی تو عبدالرحمن حیرت سے بھاوج کی طرف دیکھنے لگا۔

”بھابی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ تو اس گھر میں رحمت بن کر آئی ہے۔ وہ کتنی نیک اور مومن عورت ہے اور آپ اسے فتنہ کہہ رہی ہیں، کچھ تو خدا کا خوف کریں۔“ عبدالرحمن نے خفگی سے جواب دیا۔

”بھیا! وہ رحمت ہوگی تمہارے لیے، ہمارے لیے تو زحمت ہی زحمت ہے۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی رحمت، ہم جیسے پہلے رہ رہے تھے، ٹھیک رہ رہے تھے، بتاؤ بھلا، ہم کوئی کافر تھے جو یہ ہمیں مسلمان بنانے آگئی ہے۔ اپنے اسلام کو تو سنبھال لے۔ خدا معلوم مسلمان ہے بھی یا نہیں..... ہمیں تو سارا ڈھونگ لگا ہے۔“ ہاجرہ غصے سے بولی تو عبدالرحمن کو بھی شدید غصہ آگیا۔

”بھابی! بس اب میں آمنہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا اور جس طرح کی آپ مسلمان ہیں سب جانتے ہیں، صرف کلمہ پڑھ کر اپنے آپ پر مسلمانیت کی مہر لگا لینی کافی نہیں ہوتی۔ اپنے ایمان کو ثابت بھی کرنا پڑتا ہے اور آمنہ کتنی سچی اور سچی مسلمان ہے۔ اسے آپ سے کوئی سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر خدا کی بہت رحمت اور نظر کرم ہے۔ اسے میری اور ہمارے اس گھر کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ملک میں یہاں سے اچھی زندگی گزار سکتی ہے۔“ عبدالرحمن نے خفگی سے کہا۔

”ہاں تو لے جاؤ اسے واپس..... ہم سے اس کا اسلام ہضم نہیں ہوتا۔ بڑی آئی مسلمان ہونہ.....“ ہاجرہ منہ بگاڑ کر بولی جیسی آمنہ ٹرے میں چائے کے دو گگ لیے اندر آنے لگی۔ اس نے ہاجرہ کی ساری بات سن لی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاجرہ غصے سے منہ بتاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آمنہ نے افسوس بھرے انداز میں عبدالرحمن کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندگی سے نظریں چرانے لگا۔ وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آئی۔

”پلیز آپ ٹینشن مت لیں۔ میں نے خود بھی کئی بار آبرو کیا ہے کہ گھر کے لوگ مجھ سے کتنے بیزار ہیں۔ ان کو میرا یہاں رہنا بہت ناگوار گزر رہا ہے۔“ آمنہ نے آہ بھر کر کہا۔

”آئی ایم سوری..... یہ لوگ سمجھ نہیں رہے کہ تم ان سب کے لیے کتنی بڑی رحمت ہو۔“ عبدالرحمن نے بیچارگی سے کہا۔

”عبدالرحمن.....! ایسی سچویشن میں ہمارے پیغمبر ﷺ ہمارے لیے سب سے بڑی inspiration ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں مگر ایک وقت آیا کہ پھر سب کو ماننا ہی پڑا۔ آپ بھی پریشان مت ہوں۔ میں ان کی باتوں سے بالکل نہیں گھبراتی۔“ اس نے عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تھینک یو ویری مچ آمنہ..... تم کتنی کوآپریٹو ہو۔“ عبدالرحمن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

عاصمہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھی اور قدرے مضطرب ہو کر روٹیں بدل رہی تھی۔ کالج جاتے ہوئے

شرٹ پھٹنے کا واقعہ اس کے ذہن میں ایسا بیٹھ گیا تھا کہ دودن گزر گئے تھے مگر وہ ابھی تک اس خوف سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شبینہ کی بات کہ اللہ کے ہر حکم میں انسان کے لیے فائدہ ہے۔“ اس کے ذہن میں بار بار یہ بات گونج رہی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس کے پاس چادر تھی اگر نہ ہوتی تو وہ کیا کرتی؟ اس نے گھر آ کر کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی اور نہ ہی شبینہ نے کسی سے ذکر کیا تھا مگر اس کے اندر اس واقعے نے عجیب سی ہلچل مچادی تھی۔ وہ اپنے اندر کی کیفیت کسی دوسرے سے بیان کرنا چاہتی تھی۔ شبینہ کے ایگزائمز چل رہے تھے۔ وہ ایک دو بار اس کے پاس گئی مگر اسے مصروف دیکھ کر لوٹ آئی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بیڈ سے اٹھی اور آمنہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آمنہ کمرے میں اکیلی بیٹھی ایک آیت قرآنی کے بیک گراؤنڈ کی اسکیچنگ کر رہی تھی۔ عاصمہ نے دستک دی تو آمنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ..... عاصمہ آؤ آ جاؤ.....“ آمنہ نے مسکرا کر کہا تو عاصمہ اندر داخل ہو گئی اور قدرے جھجکتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ کیا بنا رہی ہیں؟“ عاصمہ نے اس کے اسکیچ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”عبدالرحمن کی آرٹ ایگری بیٹشن کے لیے کچھ ڈرا کر رہی ہوں۔“ آمنہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”چاچی، آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ عاصمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں پوچھو کیا بات ہے؟“ آمنہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

”چاچی! آپ مسلمان کیوں ہوئیں؟“ عاصمہ نے اچانک سوال کیا تو آمنہ نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ اتنی پکی مسلمان کیسے بن گئیں؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں آتا ہے۔“ عاصمہ نے صاف گوئی سے پوچھا تو آمنہ نے گہری سانس لی اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”اللہ کی مہربانی ہے۔“ آمنہ نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔“ عاصمہ نے چونک کر کہا۔

”اللہ تعالیٰ جب انسان کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کے دل میں اپنی، اپنے نبی ﷺ کی اور اپنے دین کی محبت ڈال دیتا ہے۔ جب انسان کا دل ان سب محبتوں پر سچے دل سے ایمان لے آتا ہے تو وہ پکا مسلمان بن جاتا ہے۔“ آمنہ نے مسکرا کر جواب دیا تو عاصمہ کی آنکھیں یک دم نم ہونے لگیں۔

”چاچی! ہم آپ کی طرح اچھے اور پکے مسلمان کیوں نہیں ہیں؟“ عاصمہ نے ندامت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”عاصمہ میں نے سارے مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان سب میں مجھے اسلام سب سے ٹھیک مذہب لگا۔ جب اس کو سچ سمجھ کر اسٹڈی کیا تو اس کی ہر بات اور ہر حکم میں مجھے کوئی نہ کوئی لاجک دکھائی دینے لگی۔ میں نے ہر اینگل سے اسے پرکھا، خدا کے تصور کا اچھی طرح تجزیہ کیا۔ جب اتنی سچائیوں کو پایا تو پھر اللہ سے دعا کی کہ اب وہ مجھے اپنے اور اپنے پیارے نبی ﷺ کے راستے پر لے آئے۔ عاصمہ، جب آپ اللہ کے راستے پر چلنے کا اپنے آپ سے وعدہ کرتے ہیں تو وہ خود بخود راستے کھولنا شروع کر دیتا ہے اور ان راستوں کو آسان بھی کر دیتا ہے۔ پھر کچھ بھی مشکل نہیں لگتا۔“ آمنہ نے مسکرا کر بتایا۔

”کیا آپ کو کچھ بھی مشکل نہیں لگا؟“ عاصمہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شروع شروع میں جب صبح صبح گرم گرم بستر سے نماز کے لیے اٹھنا پڑتا تھا تو پرالہم ہوتی تھی لیکن جب یہ بات ذہن میں آتی کہ یہ اس کا حکم ہے جس کو پانے کے لیے میں نے کتنی جدوجہد کی ہے اب میں اس کو جان کر بھی اس کا حکم نہیں مانوں گی تو کتنی گناہ گار ہوں گی۔ میں فوراً بستر سے اٹھتی اور نماز پڑھتی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا کہ اللہ میرے بہت قریب آ گیا ہے۔ بہت قریب اور بہت محبت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ قرب اور محبت کا ایسا احساس مجھے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس محبت اور قرب میں آہستہ آہستہ مجھے بہت لطف محسوس ہونے لگا اور میں باقی نمازوں کا شدت سے انتظار کرتی۔ اب میں نماز میں اتنا لطف محسوس کرتی ہوں کہ کیا بتاؤں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس گھر کے لوگ کس طرح اپنی نمازیں مس کر کے اتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں مگر شاید انہیں اس قرب کا احساس ہے اور نہ ہی محبت کا۔“ آمنہ نے آہ بھر کر افسردہ لہجے میں کہا۔

”چاچی! آپ واقعی بہت اچھی اور سچی مسلمان ہیں۔ ہم سب بہت گناہ گار ہیں جو آپ کو نہیں سمجھے.....“ عاصمہ نے تسکینی بھر کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”ارے..... ارے..... یہ کیا!“ اس نے محبت سے عاصمہ کو اپنے ساتھ لگایا اور اس کا ماتھا چومنے لگی۔ محبت کا یہ والہانہ انداز اسے متاثر کرنے لگا، اس کی اپنی ماں نے کبھی اسے اپنے ساتھ یوں لگا کر محبت سے پیار نہیں کیا تھا۔ بات نہیں کی تھی۔ آمنہ اسے بہت لاڈ سے اپنائیت سے چپ کرانے لگی۔

”تم رو کیوں رہی ہو؟“ آمنہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”شرمندگی سے۔“ عاصمہ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب.....؟“ آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ ہم کیسے مسلمان ہیں جنہوں نے کبھی ان باتوں پر ایسے نہیں سوچا جس طرح آپ سوچتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دین کے لیے ویسی محبت کیوں نہیں جیسی آپ کے دل میں ہے۔ ہم کتنے کمزور انسان ہیں، مجھے بہت افسوس اور دکھ ہو رہا ہے۔“ عاصمہ نے آہ بھر کر کہا۔

”اس میں دکھ کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے اندر شرمندگی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ یہ اچھی بات ہے لیکن تم اپنی اس شرمندگی کو مٹا سکتی ہو۔ اگر تم آج سے ہی اس سچے راستے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لو.....“ آمنہ نے مسکرا کر کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”عاصمہ..... اسلام کا سب سے پازٹیو پوائنٹ جانتی ہو کیا ہے؟ جب انسان کے دل میں شرمندگی کا، ندامت کا، کوئی احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگ کر اس کے راستے پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے معافی کے لیے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اسی وقت ڈائریکٹ اللہ کے سامنے جاتا ہے اور اسے فوراً معافی مل جاتی ہے۔ پھر اسے کوئی شرمندہ نہیں کرتا اس کا گناہ، اس کی معافی، اس کی شرمندگی، اس کی توبہ سب اس کے اور اس کے اللہ کے درمیان ایک راز بن کر رہ جاتے ہیں۔ تم بھی پازٹیو ہو کر سوچو.....“ آمنہ نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا تو عاصمہ نے پُر امید انداز میں اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اپنی آنکھوں کو رگڑنے لگی۔

”تھینک یو چاچی.....! اب میں چلتی ہوں، رات بہت ہو رہی ہے۔ کیا چاچو ابھی تک نہیں آئے؟“ عاصمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ ایگزیکٹویشن کے سلسلے میں بہت مصروف ہیں۔ لیٹ آئیں گے۔ آمنہ نے مسکرا کر بتایا۔

”ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں، اللہ حافظ.....“ عاصمہ دھیمے سے مسکرا کر چلی گئی اور آمنہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ عاصمہ دے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی اور رات بھر آمنہ چاچی کی باتوں پر سوچتی رہی۔

رہی اور بار بار دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بالآخر فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں تو وہ جلدی سے گرم بستر سے اٹھی۔ باہر خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو بخ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ اس نے جھرجھری لی۔ آمنہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

”مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اللہ میرے قریب، بہت قریب آ رہا ہے اور بہت محبت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔“

عاصمہ نے گہری سانس لے کر ارد گرد اندھیرے میں دیکھا اور باہر صحن میں چلی گئی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اس کی نورانیت دیکھ کر اس کے اندر عجیب سا پُر لطف احساس پیدا ہونے لگا۔ اس کے اندر تو اتنی سی بھرپور تھی۔ اس نے تل کھولا تو ٹھنڈے بخ پانی سے اس کے اندر کچپی سی پیدا ہوئی مگر اس نے نظر انداز کر کے وضو کیا۔ وہ وضو کر کے مڑی تو اس کے پیچھے شبینہ کھڑی مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”شبینہ..... تم.....؟“ عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں نماز کے لیے وضو کرنے آئی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”لو..... کر لو.....“ عاصمہ نے کہا اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔ شبینہ مسکرا کر اسے دیکھ کر وضو کرنے لگی۔

”آئے..... ہائے..... یہ کس کمبخت نے پانی کا تل کھول رکھا ہے۔ سارا پانی ضائع ہو گیا ہوگا۔“ شبینہ اپنے کمرے سے پانی کے گرنے کی آواز سن کر بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی تو شبینہ کو دیکھ کر چونکی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ شبینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وضو کرنے آئی ہوں، نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“ شبینہ نے جواب دیا۔

قرض

ہماری زندگی صرف ہمارا ہی حق نہیں بلکہ کچھ لوگوں کا قرض بھی ہوتا ہے جسے اٹھ کر ہی دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے..... آخری صفحات پر **عمر عبداللہ** کی سوغات

خدنگ عثمانی

تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش انداز..... **الیاس سیتاپوری** کے قلم کا سحر

شیش محل

دنیا کو فتح کرنے کے زعم میں خود کو ہار جانے والی ایک دوشیزہ کی دلخراش داستان..... **اسما قادری** کے قلم کی روانی

ماروی

محبت کا پیغام دینے والے محبوب کا ایک دلربا انداز..... **محی الدین نواب** کے خیالات کی بلند پرواز

دسمبر 2015ء جاتے سال کا آخری تحفہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیریس ٹانگسٹ
ماہنامہ



مزید

ملکہ صہر حیات کی تفتیش

محفل شعر و سخن

اور آپ کے خط

طاہر جاوید مغل، تنویر ریاض، کاشف ذبیر، علی اختر،
ڈاکٹر شیر شاہ سید اور سلیم انور کی خوبصورت تحاریر

اس کی عکاسی

”لو اب تمہیں بھی نمازی بننے کا خطبہ ہونے لگا ہے۔“ وہ خفگی سے بڑبڑائی۔

”عاصمہ نماز پڑھ رہی ہے۔ میں پڑھنے جا رہی ہوں۔ آپ بھی وضو کر کے نماز پڑھ لیں تو اچھا ہے۔“ شبینہ نے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے کہا تو شبینم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”لو..... جی..... اب سارے گھر میں اسلام پھیلنے لگا ہے۔ واہ جی کیا کہنے.....“ شبینم نے منہ بنا کر کہا۔

”چاچی! چراغ سے ہی چراغ چلتا ہے۔“ شبینہ نے مسکرا کر کہا۔

”سب جانتی ہوں۔ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں اور کیا ہونے والا ہے۔“ شبینم نے خفگی سے کہا۔

”چاچی صبح صبح اچھا..... اچھا..... سوچیں..... آپ بھی نماز پڑھ کر اللہ سے توبہ کر لیں اور سارے وہم دل و دماغ سے نکال دیں۔“ شبینہ کہہ کر چلی گئی اور وہ منہ بسورتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ واش بیسن کے قریب آئی تو پانی کھول کر چیک کیا۔

”آف اتنا ٹھنڈا پانی..... نہ بابا مجھے تو ٹھنڈے پانی سے ویسے بھی زکام ہو جاتا ہے جو پھر ٹھیک ہی نہیں ہوتا۔ جاؤ تم پڑھتی پھر و نمازیں اور بخشواؤ اپنے اپنے گناہ.....“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور جا کر گہری نیند سو گئی۔

عاصمہ نے آمنہ چاچی کی باتوں کو سوچتے ہوئے نماز ادا کی تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی نماز میں خود بخود خشوع و خضوع پیدا ہو گیا ہو۔ اس کے اندر بھی قرب اور محبت کا وہی احساس پیدا ہونے لگا جو چاچی نے اسے بتایا تھا۔ اسے بھی نماز پڑھنے میں لطف محسوس ہونے لگا اور محبت کے اس احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ اس قدر شدت سے رونے لگی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رو رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اللہ کے بہت قریب ہو رہی ہے۔ وہ کتنی دیر جائے نماز پر یونہی بیٹھی رہی اور اسے بے انتہا سکون ملنے لگا۔ اس کے اندر جو کئی روز سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ شاید آنسوؤں کی صورت میں دل کا غبار قدرے کم ہو چکا تھا۔

صبح وہ کالج جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو بہت اہتمام سے اس نے چادر کو اچھی طرح سر پر اور جسم پر لپیٹا۔ آج چادر لیتے ہوئے اسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خوشی جسم اور سر کو ڈھانپنے سے نہیں بلکہ اس بات سے ہو رہی تھی کہ وہ اپنے رب کا ایک حکم دل سے ماننے جا رہی تھی اور اطاعت کے اس احساس نے اس کے دل کو خوشی اور سکون سے بھر دیا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ آمنہ چاچی سچی اور پکی مسلمان کیوں ہیں! یقیناً وہ بھی ایسا ہی احساس اپنے اندر محسوس کرتی ہوں گی اور فرمانبرداری کا یہ احساس اتنا پُر کیف اور خوش کن ہوتا ہے کہ انسان کو خود بخود اللہ کی فرمانبرداری کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

وہ چادر لے کر باہر نکلی تو ماں نے صحن کے ایک کونے میں واشنگ مشین لگا رکھی تھی اور وہ کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ اس نے عاصمہ کی طرف بغور دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

”شبینہ جلدی باہر آؤ، کالج سے دیر ہو رہی ہے۔“ عاصمہ نے قدرے بلند آواز میں شبینہ کو پکارا۔

”آ رہی ہوں۔“ شبینہ نے اپنے کمرے سے آواز دی۔

آمنہ کچن سے باہر نکلی تو عاصمہ کو یوں چادر لپیٹے دیکھ کر مسکرائی۔

”کتنی اچھی لگ رہی ہو۔“ آمنہ نے مسکرا کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا تو اسی لمحے شبینہ بھی سر پر حجاب

اچھی طرح لپیٹے باہر نکلی۔

”واؤ گڈ.....“ آمنہ نے انتہائی خوش ہو کر کہا اور دونوں کی پیشانیوں کو محبت سے چوما۔ شبینم دور کھڑی منہ

بنانے لگی۔
”کتنی..... اب ہمارے بچوں کو بھی ہم سے دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب تو اس کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“ شبیم نے خفگی سے دل میں سوچا اور پھر کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

عبدالرحمن کی کیلی گرائی انگریزی بیشن بہت کامیاب رہی تھی۔ آمنہ مکمل حجاب میں آرٹ اسکول جاتی تھی اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ مل کر اس نے بہت محنت کی۔ وہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ آیات کا بیک گراؤنڈ ڈسکس کرتی، خاص طور پر عبداللہ کے ساتھ جو عبدالرحمن کا رائٹ ہینڈ تھا اور جس نے آرٹ اسکول کو اسٹیمپلش کرنے میں بہت مدد کی تھی۔ عبداللہ بہت زیادہ ٹیلنٹڈ تھا اور آمنہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ وہ آئندہ کا سوچنے میں زیادہ دیر نہ لگاتی اور جلدی سے اسکیپنگ کر کے انہیں دکھاتی۔ سب بہت حیران ہوتے اور اس کی بہت زیادہ تعریفیں کرتے۔ عبداللہ، عبدالرحمن کی قسمت پر رشک کرتا کہ خدا نے انتہائی قابل قدر اور انمول مگینہ آمنہ کی صورت میں اسے عطا کیا تھا اور عبدالرحمن، آمنہ کی اتنی تعریفیں سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ نیک عورت دنیا میں مرد کے لیے کتنا بڑا تحفہ ہوتی ہے۔ اسے اب اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کی بھابھیاں جس ٹائپ کی عورتیں تھیں ان میں آمنہ کا وجود واقعی قدرت کا انعام تھا۔

عبدالرحمن اور اس کی ساری ٹیم نے دو ماہ کی انتہائی محنت کے بعد آرٹ انگریزی بیشن کا اہتمام کیا تھا جس کا سارے شہر میں خوب چرچا ہوا۔ میڈیا تک بھی یہ خبر پہنچی تو نیوز چینلوں کے نمائندے ان کے انٹرویو کے لیے آئے۔ عبدالرحمن نے خوشی خوشی آمنہ کو بھی بولنے کی اجازت دی۔ اس نے نقاب میں ہی انٹرویو دیا۔ نیوز چینلوں نے سب لوگوں سے زیادہ آمنہ کو کورج دی اور خاص طور پر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک نو مسلم خاتون ہے اور اسلام قبول کر کے پاکستان آئی ہے تو تصویر کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ آرٹ انگریزی بیشن کے علاوہ اس کی پرسنل لائف کو زیادہ ڈسکس کرنے لگے۔ نیوز میں بار بار اس کا انٹرویو دکھایا جانے لگا۔ سارے محلے میں خوب شہرت ہونے لگی۔ ہر طرف جمیلہ کی بہو کے چرچے ہونے لگے۔ کئی ایک عورتیں تو گھر آئیں اور جمیلہ کو مرچ مسالے کے ساتھ مبارک باد دینے لگیں۔ جمیلہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان باتوں پر خوش ہو یا رنجیدہ..... ہاجرہ اور شبیم کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔

”اے اماں ویسے تو تیری بہو بڑی با پردہ بنی پھرتی ہے اب دیکھو کیسے ٹی وی پر گھر گھر میں اس کی شہرت ہو رہی ہے۔ بھلا آج تک ہمارے گھر کی بہو، بیٹیاں یوں اسکرینوں پر آئی ہیں؟ جتنے لوگوں نے اسے دیکھا ہو گا سب یہی کہہ رہے ہوں گے یہ جمیلہ اور شریف الدین کی بہو ہے۔ اوپر سے نئی بات کہ بی بی رانی نے نیا نیا اسلام کا کلمہ پڑھا ہے۔ بھیا خوب نام اور عزت کما رہی ہے تمہاری بہو۔ پورا محلہ چسکے لے رہا ہے۔ اس کا مکھڑا دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہیں لوگ بیچارے۔“ ہاجرہ نے خوب مسالا لگا کر ساس پر طنز کرتے ہوئے کہا جو کچن میں بیٹھی ساگ بنا رہی تھیں۔ شبیم بہانے سے برتن دھونے آئی تھی کہ ہاجرہ بھی پیچھے آگئی اور جمیلہ کے کان بھرنے لگی۔ جمیلہ بھی لوگوں کے منہ سے بھانت بھانت کی باتیں سن کر پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔

”ہاں مجھے خود بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ عبدالرحمن آتا ہے تو اس سے بات کرتی ہوں۔“ جمیلہ نے ناگواری سے کہا تو دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے لگیں۔ ان کا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔ شبیم بھی برتن دھو چھوڑ کر ان کے پاس آگئی۔

”ہاں اماں بڑی سکی ہو رہی ہے۔ پہلے ہر کسی کو کیا خبر تھی کہ عبدالرحمن کسی کافر کو مسلمان بنا کر لایا ہے پر اب تو

ہر طرف یہی باتیں ہو رہی ہیں کہ بھیا ان کو خاندان میں سے کسی نے لڑکی نہ دی۔ اماں جو بھی ہے تم بہو اپنے خاندان سے لائیں تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔“ شبیم نے منہ بنا کر کہا تو اسی لمحے آمنہ جوڑے میں برتن لیے کچن کی طرف آ رہی تھی، ان کی باتیں سن کر ٹھنکی اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

”اماں، اب بھی سوچ لو کچھ نہیں بگڑا۔ بھلا گوری چڑی میں کہاں... وفا ہوتی ہے۔ یہ آج ایک مرد کے ساتھ تو کل دوسرے کے ساتھ..... یہ تو ہمارے ہاں کی عورتیں ہوتی ہیں جو مر کر ہی شوہر کی دلہیز چھوڑتی ہیں۔“ ہاجرہ نے منہ بنا کر کہا تو آمنہ نے افسوس بھری نگاہوں سے کچن کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ عاصمہ کسی کام سے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو آمنہ کو کھڑے دیکھ کر اس کے قریب آئی۔ وہ چاچی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چوکی۔

”چاچی آپ رورہی ہیں؟“ عاصمہ نے حیرت سے پوچھا تو اسی لمحے شبیم کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”اماں میں تو کہتی ہوں اب بھی وقت ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ یہ موقع اچھا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر عبدالرحمن سے کہو کہ آمنہ کو فارغ کرے۔ یہ جائے اپنے ملک اور تم عبدالرحمن کے لیے خاندان سے لڑکی لے آؤ۔ کیوں اس کا مستقبل خراب کرنے پر تلی ہوئی ہو۔“ شبیم نے رائے دی تو جمیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے سسکی بھری اور اپنے کمرے کی طرف واپس جانے لگی۔ عاصمہ کو ماں کی باتیں سن کر انتہائی غصہ آیا تھا۔

”چاچی آپ کو ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ رونے سے کام نہیں چلے گا۔ چلیں میرے ساتھ۔“ عاصمہ نے ٹرے اس کے ہاتھ سے پکڑی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے اپنے ساتھ کچن میں لے گئی۔ تینوں ایک دم بوکھلا گئیں۔

”امی یہ آپ چاچی کے بارے میں کیا فضول باتیں کر رہی ہیں۔ تائی اماں آپ بڑی ہو کر انہیں سمجھانے کے بجائے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں اور دادی آپ بھی ان کی باتیں سن رہی ہیں۔“ عاصمہ نے غصے سے کہا۔

”عاصمہ بکواس بند کرو۔ تمہیں بڑوں کی باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔“ شبیم نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

”بڑے باتیں بھی تو ڈھنگ کی کریں ناں..... کیا قصور ہے چاچی کا جو آپ سب ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ان کا جینا حرام کر رہی ہیں۔ کیا قیامت آگئی ہے جو وہ ٹی وی پر آ گئیں اور وہ بھی نقاب میں باپردہ ہو کر..... تائی اماں کیا آپ کو فریحہ آپا دکھائی نہیں دیتیں جو ننگے سر اور آدھے کپڑوں کے ساتھ کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنے جاتی ہیں۔ تب آپ کو کیوں برا نہیں لگتا۔“ عاصمہ نے غصے سے کہا تو ہاجرہ بری طرح تلملانے لگی۔

”ارے تو بالشت بھر کی لڑکی مجھ سے منہ ماری کرنے لگی ہے۔ ارے مجھ، اپنی تائی کو ذلیل کر رہی ہے؟ ارے لوگو دیکھو یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ ہماری اولادیں ہم پر ہی ڈنڈے برسائے لگی ہیں۔ دہائی ہے دہائی.....“ ہاجرہ نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ شبیم اور فریحہ بھی بھاگتی ہوئی کمرے سے آ گئیں..... فریحہ نے اس وقت سیلولیس شرٹ پہن رکھی تھی۔

”سن مردود، تیری وجہ سے مجھے طعنے سننے کو مل رہے ہیں۔ بوڑھی ماں کو بے عزت کر رہی ہے۔“ ہاجرہ نے جان بوجھ کر فریحہ کو پیٹنا شروع کر دیا اور اس کے ننگے بازوؤں کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کر زخمی کر دیا۔ وہ بلند آواز سے رونے چلانے لگی۔ آمنہ اور عاصمہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گئیں..... سب فریحہ کو چھڑانے لگیں۔

”امی یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“ شبیم نے غصے سے ماں کو پرے دھکیل کر فریحہ کے بازوؤں کو چھڑایا۔ فریحہ

روتی بیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”کبخت نامراد تیری وجہ سے فریحہ بیچاری کو مار پڑی ہے۔“ شبیم نے دانت کچکچا کر عاصمہ کو زور سے تھپڑ لگایا تو وہ ہٹکا ہٹکا کود دیکھنے لگی۔

”اے شبیم اس بیچاری کو کیوں کوس رہی ہے۔ اس تماش بین کو بول جو سارے فساد کی جڑ ہے۔ ارے آج تک ہمارے گھر سے کسی نے اونچی آواز نہیں سنی اور آج اس کی وجہ سے سارا محلہ لٹک لٹک کر ہمارا تماشا دیکھ رہا ہے۔“ ہاجرہ، آمنہ کو گھورتی ہوئی جان بوجھ کر صحن میں جا کر دہائی دینے لگی اور لوگ اس کے رونے چلانے کی آوازیں سن کر اپنی دیواروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ آمنہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”آمنہ چاچی، چلیں آپ اپنے کمرے میں۔“ عاصمہ اس کا بازو پکڑ کر اسے اس کے کمرے میں لے گئی۔

”ہاجرہ اب بس بھی کر دے۔ کیوں سارے زمانے کو اپنا تماشا دکھا رہی ہے۔“ جمیلہ نے اس کے قریب آ کر غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اس کے کمرے کی طرف رخ کیا۔

”ہاں..... ہاں سب مجھے ہی کو سنا..... اس کٹنی کو کچھ نہ کہنا جس نے یہ ساری آگ لگائی ہے۔“ وہ بلند آواز سے چلا رہی تھی کہ عبدالرحمن، عبدالوہاب اور عبدالرب گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کا منظر دیکھ کر تینوں پریشان ہو گئے۔ ہاجرہ ابھی تک بلند آواز سے لعن طعن کر رہی تھی۔ شبیم اسے چپ کر رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ عبدالوہاب نے خفگی سے پوچھا۔

”بات اتنی نہیں جتنی کہ بڑھ گئی۔“ جمیلہ نے اسے ساری بات سنائی تو عبدالرحمن کو شدید افسوس ہوا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آمنہ نے کیا غیر شرعی حرکت کی؟ اس نے تو نقاب میں انٹرویو دیا تھا اور وہ بھی میری اجازت سے اور انٹرویو میں بھی کوئی خاص بات نہیں کہی پھر کس بات کو اتنا بڑا ایٹو بنایا گیا؟“ عبدالرحمن نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ دونوں کھسیا کر منہ بنانے لگیں۔

”ہاں بولو، بتاؤ، کس بات پر تم لوگوں کو اعتراض ہے؟ اور ہاجرہ تم نے جان بوجھ کر گھر کو اکھاڑا کیوں بنایا۔ یہ ساری آگ تم نے ہی لگائی ہے۔ تم سے بھی وہ معصوم برداشت نہیں ہو رہی؟“ عبدالوہاب نے غصے سے بیوی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو اس نے پھر واویلا مچانا شروع کر دیا۔

”بھائی جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ عبدالرحمن نے اسے روکا۔

”پہلے بھائی کو بھڑکالیا اور اب اسے کیوں روک رہے ہو..... سب سے بڑے فساد کی تو تم خود ہو۔ جو اس کٹنی کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ جب سے وہ آئی ہے اس گھر کا سکون برباد ہو گیا ہے۔“ ہاجرہ، عبدالرحمن پر چلاتے ہوئے بولی۔

”افوہ، اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔ یہ تم دونوں کا حسد اور جلن ہے کہ اسے برداشت نہیں کر پار ہیں۔ فساد کی جڑ تو تم دونوں ہو۔“ اب کی بار عبدالرب نے اپنی بیوی اور بھابی کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو شبیم کو طیش آ گیا۔

”ہاں..... ہاں تم تو اس بیچاری کے غور میں ہی بولو گے۔ کیونکہ اس کی گوری چمڑی پر تم بھی تو عاشق ہوئے بیٹھے ہو۔“ شبیم طنز کرتے ہوئے بولی۔

”کیا.....؟“ عبدالرحمن چلاتے ہوئے بھائی کو دیکھنے لگا۔

”بکواس بند کرو، ذلیل گھنیا، عورت.....“ عبدالرب نے زور سے شبیم کو تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں مجھے ہی مارو..... تمہارا بھانڈا جو پھوڑ رہی ہوں۔ دے دو مجھے طلاق اور کرلو اس کٹنی سے شادی۔“ شبیم پھر چلائی۔

”بھائی، بس اب اس سے آگے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔ وہ میری بیوی ہے کوئی مذاق نہیں..... جس کا جودل چاہے اسے کہتا پھرے۔ اب نہ وہ اس گھر میں رہے گی اور نہ ہی میں.....“ عبدالرحمن نے شدید غصے اور صدمے کی حالت میں کہا اور اپنے... کمرے کی طرف چلا گیا۔

”ارے..... ارے بیٹا خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔“ جمیلہ اس کے پیچھے جا کر روتے ہوئے اسے روکنے لگیں۔

”اماں آپ مجھے جواب روک رہی ہیں تو آپ نے اپنی بہوؤں کو اس وقت کیوں نہ روکا۔ جب وہ یہ سارا فساد کھڑا کر رہی تھیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ہاں یہ میری ہی غلطی ہے جو ان کی باتوں میں آگئی۔“ جمیلہ سسکتے ہوئے بولیں۔

”اماں، جب تک میں اور آمنہ اس گھر میں رہیں گے یہ لوگ یونہی فتنے کھڑے کرتے رہیں گے اس لیے اب ہمارا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔“ عبدالرحمن نے حتمی انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا آمنہ بیڈ پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی جبکہ عاصمہ اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دے رہی تھی۔

”آمنہ تمہیں میرے ہوتے ہوئے یوں رونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اب ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔“ عبدالرحمن اس کے قریب آ کر ٹھوس لہجے میں بولا تو آمنہ نے گیلی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا..... جمیلہ بھی روتی ہوئی اندر آگئی تھیں۔

”بہو مجھے معاف کر دو۔ میں ان لوگوں کی باتوں میں آگئی۔ خدا کے لیے تم ہی عبدالرحمن کو سمجھاؤ۔ تم دونوں یہ گھر چھوڑ کر مت جاؤ۔“ جمیلہ نے آمنہ کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر روتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”اماں آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟“ آمنہ نے پاؤں ہٹا کر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

”اماں ہمیں جانے دے۔ سب لوگ سکون میں آجائیں گے۔“ عبدالرحمن خفگی سے بولا۔

”وہ تو سکون میں آجائیں گے مگر ماں کے دل کو سکون کیسے آئے گا؟ عبدالرحمن تم جانتے ہو میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ جس دن تو دکھائی نہ دے تو مجھے چین نہیں آتا۔ جب تو باہر پڑھنے گیا تھا تو میں کتنی بیمار ہو گئی تھی۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی بیٹا..... پھر اگر تجھے کہیں جانا ہے تو میں بھی تیرے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ جمیلہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، میں کل ہی کوئی گھر کرائے پر دیکھتا ہوں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں.....“ عبدالرحمن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جمیلہ نے آہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے چلی گئیں۔ عاصمہ بھی ان کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

”عبدالرحمن، میں سوچ رہی ہوں جرمنی واپس چلی جاؤں۔ میری وجہ سے تمہارے گھر والے بہت پریشان ہیں۔“ کچھ دیر بعد آمنہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”اور میں؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔

”تمہاری ماں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اور تم.....؟“ عبدالرحمن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے نرم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس بات کا کیا مطلب ہے؟“ عبدالرحمن نے چونک کر پوچھا۔

”میں تنہا زندگی گزارنے کی عادی ہوں مگر تمہارے گھر والے تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ پلیز تم مجھے جانے دو۔“ آمنہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”کیا تمہاری زندگی میں میری بس اتنی ہی اہمیت ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔؟“ عبدالرحمن نے افسردگی سے پوچھا۔

”اگر ایسی بات ہوتی تو میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں کیوں آتی لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں مس فٹ ہوں۔ تمہارا ماحول، تمہارے لوگ مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں زبردستی اپنے آپ کو ان پر مسلط نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی ہوں کہ میری وجہ سے سب لوگ تکلیف میں ہیں۔ تمہارے گھر کا سکون میری وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔“ وہ سسکی بھر کر بولی۔

”آمنہ، جب دو اجنبی لوگ میاں بیوی کے رشتے میں بندھتے ہیں تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سب سے اہم ہو جاتے ہیں۔ ان کے دکھ، سکھ، خوشی، غم اور تکلیف سب ایک ہو جاتے ہیں اور جب دونوں ایک دوسرے کو جدا جدا سمجھتے ہیں تو پھر ان کا رشتہ کبھی قائم نہیں رہ پاتا۔ میں نے تمہیں کبھی اپنے سے جدا نہیں سمجھا۔ پھر تم کیوں مجھے اپنے سے علیحدہ دیکھتی ہو؟“ عبدالرحمن نے اس کے قریب آ کر قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

”عبدالرحمن! شاید تم میری نیچر کو نہیں سمجھ پائے کہ جس سے محبت کرتی ہوں اس کے لیے اپنی ہر خوشی قربان کر سکتی ہوں۔ میری خوشی، میری محبت تم ہو لیکن میں جب تمہاری ماں کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ان کی اصل خوشی تم ہو اور میں ان کی خوشی ان سے چھیننا نہیں چاہتی۔ میں ان کی خوشی کے لیے اپنی خوشی قربان کر دوں گی۔“ وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

”ایسا تم سوچنا بھی مت..... میں، تم اور اماں..... ہم سب ساتھ رہیں گے۔“ عبدالرحمن نے اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دینے لگا۔ آمنہ کے دل کو بھی سکون ملنے لگا اور وہ مسکرا کر عبدالرحمن کی طرف دیکھنے لگی۔

”میری محبت کو اتنا کمزور مت سمجھنا۔ میں تمہیں کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔“ عبدالرحمن نے پیار بھری سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

عبدالرب انتہائی غصے میں اپنے کمرے میں کھڑا مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ دانت کچکا کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے چلا رہا تھا۔ پھر کبھی اسے مارنے کو دوڑتا۔ عاصمہ بار، بار باپ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ابو پلیز اب بس کریں۔ چھوڑیں غصہ..... امی سے غلطی ہو گئی ہے انہیں معاف کر دیں۔“ عاصمہ نے مفاہمت کے انداز میں باپ کا بازو پکڑ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔

”کیسی غلطی اور کس بات کی معافی.....؟ میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے۔ پوچھ اپنے باپ سے، کیا وہ اس مبینی پر بری نظر نہیں رکھتا۔“ شبینم غصے سے چلائی۔

”بکواس بند کرو، ذلیل گھٹیا عورت۔ تم نے یہی بکواس کر کے میرے بھائی کے دل میں میرے لیے شک ڈال دیا ہے۔ میں کیا اتنا بے غیرت انسان ہوں کہ اپنے بھائی کی بیوی پر نظر رکھوں گا۔ تمہیں تو شک کرنے کی بیماری ہے۔ میں جس عورت کی طرف بھی دیکھوں تجھے شک پڑ جاتا ہے۔ تیرے دماغ میں خناس ہے، گندگی سے بھرا ہوا ہے تیرا دماغ.....“ عبدالرب نے مزید غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

دو ہنسوں کا جوڑا

ہیٹ اسٹروک نے ہزاروں لوگوں کے پیاروں کی طرح ہم سے بھی ہمارے ماں، باپ چھین لیے..... مرے ابا کی پر سنائی
 بڑی شاندار تھی۔ امی خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھیں۔ ابا، امی میں ایک چیز مشترک تھی اپنے پرانے کی تفریق کے بغیر ہر
 ایک کی مدد کرتے۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی کہ اچانک کالی آندھی نے گھر کے درود یوار گرا دیے۔ ابا نے دو بچوں کی ماں سے اور
 اس دو بچوں کی ماں نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر تین بچوں کے باپ سے شادی کر لی۔ بارہ سالہ ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑ گئی، امی نے
 یہ ستم سہہ لیا۔ جب کچھ وقت گزرا تو ابا کو احساس ہوا کہ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ ابا ہمارا اور امی کا پہلے جیسا خیال رکھنے کی کوشش
 کرتے ہم نے کبھی تنگی کی زندگی نہیں گزاری۔ خدا نے ابا کو امی کے اور ہم تینوں بچوں کے نصیب سے بہت نوازا تھا۔ ابا اکثر کہتے بیٹا
 مجھے معاف کر دینا تم لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ وہ کہتے میں ایسا نہیں چاہتا تھا امی نے کوئی شکایت نہیں کی یہ حقیقت ہے
 میرے ابا بہت اچھے انسان تھے۔ ابا نے امی کو ملکہ بنا کر رکھا تھا۔ ابا کا اکلوتا بیٹا جسے وہ پیار سے چاند میاں کہتے، ہم دو بیٹیاں ابا کی
 جان تھیں۔ اپنی بیوی، بچوں میں نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کو..... پھر جب تبدیلی آئی تو ہر دم خوش رہنے والے ابا اکثر
 خاموش رہنے لگے وہ کبھی، کبھی یہ گنگناتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے تھے دو ہنسوں کا جوڑا پھڑکیو رے..... امی سورہ رحمن اور ابا درود
 تاج کی جب تلاوت کرتے تو جیسے وقت کی رفتار تھم سی جاتی۔ عرش پر فرشتے بھی سبحان اللہ کہتے ہوں گے۔ امی کی سسرال میں بڑی
 عزت تھی۔ چچا کہتے یہ میری ماں ہے، چھوٹی پھوپھی نے ان کا دودھ پیا تھا تو بالکل ماں کی طرح محبت کرتی۔ بڑی پھوپھی کو قرآن
 پڑھایا تو استاد کا درجہ پایا۔ جیٹھ کہتے یعنی میرے تایا کہتے میں نے گودوں میں کھلایا ہے میری تو بیٹی ہے یہ۔ خاندان کے سب بچے
 آج تک امی کی عزت بھی کرتے ہیں اور محبت بھی مگر جیون ساتھی کے رویے سے جو تکلیف پہنچی اس کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ بھائی کی
 چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی۔ امی نے بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا خود کو مصروف رکھنے کے لیے۔ پھر ہم دونوں بہنوں کی بھی
 شادیاں ہو گئیں۔ امی نے فیکٹری میں جاب کر لی وقت بھی تو گزارنا تھا اور پھر کون تھا ان کا خیال کرتا یا وہ کسی کا انتظار کرتیں۔ امی کبھی
 بڑی بیٹی کے پاس رہتیں کبھی اپنے بیٹے کے پاس رہنے چلی جاتیں مگر وہ مستقل میرے پاس رہتی تھیں۔ صبح اٹھ کر فیکٹری جانا رمضان

”آپ لوگوں کو ذرا سا بھی خیال نہیں آ رہا کہ آپ کی جوان بیٹی آپ کے پاس کھڑی ہے اور آپ ایک
 دوسرے کے بارے میں ایسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہیں۔“ عاصمہ نے غصے سے کہا تو دونوں نے چونک کر اس کی
 طرف دیکھا۔

”اگر اس میں شرم، حیا اور ذرا سا احساس ہوتا تو میرے سارے گھر والوں کے سامنے مجھے یوں ذلیل و رسوا
 نہ کرتی۔ اللہ نے میاں، بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے عیب اور برائیوں کو
 چھپاتے ہیں مگر یہ ایسی بیوی ہے جو شوہر کا لباس تار تار کر کے اسے سب کے سامنے خوب رسوا کر رہی تھی۔ اس وقت
 میرا دل چاہ رہا تھا کہ شرم سے کہیں ڈوب مروں مگر اس عورت کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔“ عبدالرب نے
 سسکی بھر کر اپنی غم آنکھوں کو صاف کیا تو عاصمہ بھی افسردہ ہو گئی۔ عبدالرب کمرے سے باہر نکل گیا۔ شبینم اب شرمندہ
 ہونے لگی تھی۔ عاصمہ بھی افسردہ ہو گئی۔ عاصمہ نے قدرے خفگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

”امی آپ نے واقعی بہت برا کیا ہے۔ ابو کو تو میں نے آج تک یوں افسردہ نہیں دیکھا۔ آپ نے صرف ابو کی
 ہی نہیں چاچی کی بھی بے عزتی کی۔ چچا بھی بہت ہرٹ ہوئے ہوں گے۔“ عاصمہ نے ماں سے کہا تو وہ منہ بنا کر
 اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں، اب سب مجھے ہی برا کہو..... میں ہی گناہ گار ہوں۔ باقی تو سب بہت اچھے اور معصوم ہیں۔“ شبینم
 نسوے بہاتے ہوئے بولی۔

”دادی کو بھڑکانے میں آپ سب سے آگے تھیں۔ چاچی اور میں باہر کھڑی آپ کی ساری باتیں سن رہی تھیں.....
 آپ ہی ان کو چچا کی دوسری شادی کے لیے کہہ رہی تھیں ناں.....“ عاصمہ نے خفگی سے کہا تو شبینم بوکھلا گئی۔

میں روزے رکھنا، قرآن ختم کرنا ای نے ساری زندگی کبھی قصد نماز قضا نہیں کی، جاگنے والی راتوں کا اہتمام کرتیں خدا نے انہیں بڑا حوصلہ اور ہمت دی تھی امی کہتی تھیں یہ جو ہوا قسمت میں تھا اور نہ تمہارا باپ ایک شریف اور دردمند دل کا انسان تھا اسے مجھ سے اور اپنے بچوں سے بڑا پیار تھا۔ وہ کہتی تھیں جو وقت گزر گیا کبھی واپس نہیں آئے گا اب ہم سب خدا کے گھر ملیں گے یہ ان کا ایمان تھا امی کو السر تھا اپنی ضرورتیں اپنی سِلری سے پوری کرتیں۔ ہم تینوں کے بچوں کے لیے ایک جیسی چیزیں خریدتیں کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ بڑی غیور اور خوددار تھیں۔ ابا سے کوئی شکایت نہیں کی اور ہمیں بھی ابا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا وہ ہمیں بہت چاہتے تھے میں ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی، چھوٹی تھی ناں..... ایک اسپتال میں ابا ایڈمٹ تھے دوسرے میں امی..... جب میں ابا کو دیکھنے گئی تو وہ زور، زور سے اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ اور بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔ انہیں آکسیجن لگی تھی مجھے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا، میں نے سر جھکایا تو ماتھے پر ہمیشہ کی طرح پیار کیا میں نے بھی ان کا ہاتھ چوما تھا دوسرے دن جب دیکھنے گئی تو وہ کلمہ پڑھتے، پڑھتے خاموش ہو گئے تھے اور 6 جولائی کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے..... 8 جولائی کو وہ عورت جو تمام زندگی ان کے نام پر بیٹھی رہی پاس جانے میں دیر نہ کی۔ امی کا ایمان بھی سچا تھا اور وعدہ بھی جو انسان کسی کو کھو کر پچھتائے جس کی یاد بے چین کرے اصل میں وہی محبت ہے۔ میرے دوسرے بہن، بھائی میری امی کو بڑی امی کہتے ہیں، بہت عزت کرتے ہیں امی بھی ان سے اور ان کے بچوں سے پیار کرتی تھیں۔ مرے سب بہن، بھائی امی کے انتقال میں آئے سوئم میں شرکت کی، قرآن پڑھا ایصالِ ثواب کیا..... اب وہ پاؤں سمٹ گئے ہیں جن کے نیچے ہم تینوں بہن بھائی کی جنت تھی جو ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے تھے سینے پر دھرے ہیں جو آنکھیں ہمیں دیکھ کر چمکتی تھیں بند ہو گئیں ہیں جو لب مسکراتے تھے خاموش ہو گئے ہیں، مرے باپ کو اللہ نے آخر وقت میں کلمہ کی توفیق دی اور ماں کو 21 ویں شب رمضان کی ملی۔ میں تو پہلے بھی کوشش کرتی تھی کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو اب اور خیال رکھوں گی کہ اب ہمارے سروں پر دعاؤں کا آسمان نہیں ہے۔ میرے پیارے والدین کے لیے آپ سب دعا کریں اللہ ان کے درجات بلند کرے اور ہم جب تک زندہ رہیں ان کے لیے صدقہ جاریہ بنے رہیں آپ کی دعاؤں کی طالب۔

نجمنا زا صغر..... کراچی

”اچھا..... تو..... تو..... باہر کھڑی ہو کر ماں کی جاسوسی کر رہی تھی..... بے حیا تجھے ذرا شرم نہیں آئی.....“ شبینم اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”میں نے تو چاچی کو وہاں کھڑے روتے ہوئے دیکھا تو ان کے پاس چلی گئی اور آپ کی باتیں سن کر مجھے بھی غصہ آ گیا۔“ عاصمہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

”شباباش بھئی، سگی ماں کی دشمن اور سوتیلیوں کی ججن..... تجھ جیسی اولاد بھی اللہ کسی کو نہ دے۔“ شبتم اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھی۔

”امی خدا کے لیے اپنا رویہ بدلیں۔ چاچی ہماری مہمان ہیں اور بہت اچھی انسان ہیں۔ وہ اسلام قبول کر کے مسلمان ہو کر یہاں آئی ہیں۔ کیا سوچیں گی کہ مسلمان ایسے فسادی اور جھگڑالو ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو اسلام کو آئیڈیل مذہب سمجھ کر قبول کیا ہے اور ہم جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں، اس پر کتنا عمل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کو کتنا شاک لگتا ہے۔“ عاصمہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اچھا، اچھا مجھے اب سبق نہ پڑھا۔ بہت بے عزتی کرائی ہے۔ اب میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ شبینہ نے سر دوپٹے کی پٹی باندھی اور منہ موڑ کر لیٹ گئی۔ عاصمہ افسوس بھری نظروں سے ماں کو دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور فریج اور شبینہ کے کمرے میں چلی گئی۔ فریجہ کے بازوؤں پر ناخنوں کے رگڑنے سے خون رسنے لگا تھا اور بازوؤں پر سوجن بھی ہو گئی تھی۔ شبینہ نے ان پر ثوب لگائی تھی مگر فریجہ کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

”آپا کے بازوؤں کا اب کیا حال ہے؟“ عاصمہ نے شبینہ کے قریب آ کر پوچھا۔

”جانشی بھر مرچیں لے آ اور وہ ان پر چھڑک دے۔ چڑیل تو نے ہی فساد ڈالا تھا تو نے ہی اماں کو میرا

طعنہ دیا تھا اور انہوں نے میرا یہ حال کر دیا۔“ فریحہ نے روتے اور غصے سے چلاتے ہوئے عاصمہ کو کہا تو وہ شرمندہ ہونے لگی۔

”آپا میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ تائی اماں نے جانے کا کس کا غصہ تم پر نکال دیا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“ عاصمہ نے آگے بڑھ کر فریحہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا پر اس نے زور سے اسے دھکا دیا۔

”کتنی کہیں کی..... جادفع ہو جا یہاں سے۔“ فریحہ چلائی۔

”آپا..... آپا اب بس بھی کرو..... کیا ہو گیا ہے تجھے؟“ شبینہ نے گھبرا کر بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تو عاصمہ روتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔

”عاصمہ..... عاصمہ..... رکو.....“ شبینہ نے اسے پیچھے سے آواز دی مگر وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔

”آپا تم بھی حد کرتی ہو، کیا اس نے امی کو کہا تھا کہ وہ تمہارے بازوؤں کو یوں چھیل ڈالیں؟ امی اور چاچی کو تو خواہ مخواہ آمنہ چاچی سے بیر ہو گیا ہے۔ وہ بیچاری ان سب کو کیا کہتی ہیں مگر دونوں کو کون سمجھائے۔“ شبینہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

”جاؤ تم بھی باہر، چھوڑ دو مجھے اکیلا.....“ فریحہ غصے سے چلائی تو شبینہ بھی منہ بنا کر باہر چلی گئی۔ عاصمہ برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ شبینہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”عاصمہ یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ آج جو کچھ ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں تو ڈر رہی گئی تھی۔ ابھی تک دل سے خوف نہیں جا رہا۔“ شبینہ نے گھبرا کر کہا۔

”انسان کا حسد اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ امی اور تائی امی کے حسد نے انہیں اس قدر باؤلا بنا دیا ہے کہ وہ غصے میں اپنا ذہنی توازن کھونے لگی ہیں۔ کتنے لوگوں کو آج انہوں نے ہرٹ کیا ہے۔“ عاصمہ نے آہ بھر کر رنجیدگی سے کہا۔

”پھر کیا کریں..... فریحہ آپا بھی ان کی طرح ہی ہیں۔“ شبینہ نے ناگواری سے کہا۔

”ہاں اور افسوس بھی اسی بات کا ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ کوئی بھی اپنی غلطی پر شرمندگی محسوس نہیں کر رہا۔“ عاصمہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”چچا اس گھر کو چھوڑنے کی بات کر رہے تھے اگر وہ چاچی کو لے کر یہاں سے چلے گئے تو.....؟“ شبینہ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر بہت برا ہوگا۔ چچا کے ساتھ دادی بھی چلی جائیں گی۔ وہ چاچو کے بغیر ایک دن بھی کہیں نہیں رہیں اور پھر گھر میں صرف ہماری مائیں اور ان کی ہم خیال فریحہ آپا، ہم دونوں کے خلاف محاذ بنالیں گی۔“ عاصمہ نے فکر مندی سے جواب دیا۔

”ہاں یہ تو ہے..... پھر وہ سب ہم سے جھگڑا کریں گی۔ عاصمہ..... جس طرح اللہ نے مجھے سبق سکھایا تو میں سمجھ گئی..... کیا وہ ان کو کوئی سبق نہیں سکھائے گا؟“ شبینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا کہ اس واقعہ کو اپنے لیے سبق بنا کر کچھ سیکھ لے۔ میں ابھی امی کو اتنا سمجھا کر آئی ہوں مگر وہ الٹا مجھ پر برستی رہیں۔ کچھ سننے کو، سوچنے سمجھنے کو تیار ہی نہیں..... کیا، کیا جائے؟“ عاصمہ نے آہ بھر کر کہا اور انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ عبدالوہاب اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا اندھیرے میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ہاجرہ بیڈ پر منہ موڑے خراٹے لے رہی تھی۔ عبدالوہاب نے آہ بھر کر ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پریشانی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”اس گھر کے نظام کو ٹھیک کرنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا اور گھر کا نظام ٹھیک چلے..... اس کی سب سے بڑی ذمہ داری گھر کے سب سے بڑے فرد ہی پر ہوتی ہے یعنی کہ مجھ پر..... ابا جان کی جگہ مجھے ہی اب گھر کا بڑا بن کر فیصلے کرنے چاہئیں۔“ عبدالوہاب نے گہری سانس لے کر سوچا اور بیڈ پر لیٹ کر حالات پر غور و فکر کرنے لگا۔

جمیلہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہیں۔ یہ سوچ، سوچ کر انہیں ہول اٹھتے تھے کہ وہ کیسے یہ آبائی گھر اور دوسرے بیٹوں کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ شریف الدین کے ساتھ انہوں نے پچاس سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس گھر کی ایک، ایک اینٹ سے انہیں پیارت تھی۔ اس کے آنگن میں ان کے بیٹوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اور انہوں نے بیٹوں کے بچوں کو کھلایا تھا۔ سب کو چھوڑ کر چلے جانا کتنا مشکل ہوگا لیکن وہ عبدالرحمن کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھیں اور عبدالرحمن آج جتنا سخی پاہور ہا تھا۔ اس سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ اس گھر میں مزید نہیں رہے گا۔ جمیلہ رات بھر روئیں اور دعائیں کرتی رہیں کہ خدا کوئی سبیل پیدا کر دے اور کوئی بھی کسی سے جدا نہ ہو مگر اب انہیں یہ بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے تھے۔ انہوں نے اتنی زیادہ ٹینشن لی تھی کہ صبح انہیں بخار ہو گیا۔ وہ فجر کی نماز کے لیے نہ اٹھیں تو عاصمہ کو فکر لاحق ہوئی اور وہ دادی کے کمرے میں آئی تو دیکھا انہیں شدید بخار ہے۔ وہ پریشان ہو گئی اور جلدی سے چچا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ دونوں بھی نماز فجر کی تیاری کر رہے تھے۔ عاصمہ نے انہیں دادی کے بخار کا بتایا تو وہ دونوں گھبرائے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جمیلہ کا کمرہ عبدالوہاب کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے عبدالرحمن کو اماں، اماں پکارتے ہوئے سنا تو جلدی سے اٹھ کر ان کے کمرے میں گیا اور انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

جلد ہی گھر کے دوسرے لوگ بھی ان کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ عبدالرحمن انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے پر مصر تھا مگر وہ نہیں مان رہی تھیں۔ عبدالوہاب نے انہیں اپنے کمرے سے دولا کر کھلائی اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا۔ عبدالرحمن ان کے پاؤں دبا رہا تھا جبکہ عبدالرب ان کے پاس بیٹھا پریشانی سے بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ ضرور اماں نے ٹینشن لی ہے۔ اسی وجہ سے بیمار پڑ گئی ہیں۔“ وہ عبدالرحمن کی طرف دیکھنے لگا مگر عبدالرحمن نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔ اس نے ایک بار بھی بڑے بھائی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ عبدالوہاب دونوں کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جمیلہ بیگم کی حالت سنبھلی اور انہوں نے آنکھیں کھولیں تو عبدالوہاب نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔

”عبدالرحمن، تم کان کھول کر سن لو۔ تم اس گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں ابا جان کی جگہ اب اس گھر کا بڑا ہوں اور یہی میرا فیصلہ ہے۔“ عبدالوہاب نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا تو عبدالرحمن نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔ جمیلہ بھی ایک دم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہرگز نہیں بھائی، اب ایسا ممکن نہیں۔ رات کو جو کچھ ہو چکا ہے کیا اب آپ اس سے بڑا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں.....؟ لیکن میں یہ سب کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ عبدالرحمن نے آہ بھر کر کہا۔

”اوپر چھت پر دو کمرے خالی پڑے ہیں..... میں انہیں ٹھیک کر کے تم دونوں کے لیے سیٹ کر دیتا ہوں تم لوگ اوپر کے پورشن میں رہو گے۔ کوئی بھی تم لوگوں کی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ اماں جان کو آزادی ہوگی وہ تمہارے ساتھ رہیں یا ہم سب کے ساتھ..... اس گھر کی مالکں اماں جان ہیں۔ میرا خیال ہے میرے اس فیصلے سے تم دونوں کو کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔“ عبدالوہاب نے چھوٹے بھائی اور بھانج کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔“ جمیلہ جلدی سے بولیں اور ایک دم ان کے چہرے پر اطمینان کا سایہ لہرا گیا۔ عبدالرحمن اور آمنہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ نہ بولے۔

”عبدالوہاب تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، میں اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“ جمیلہ نے غم آنکھوں سے بیٹے کے چہرے کو دیکھا اور پھر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

”آپ فکر نہیں کریں اماں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں کل سے اوپر کا کام شروع کروانا ہوں لیکن تب تک کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں الجھے گا۔ جو کل ہو چکا اب دوبارہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہاجرہ اور شبنم اگر تم دونوں میں سے اب کسی نے بحث کی یا زیادتی کرنے کی کوشش کی تو اس کا اس گھر میں آخری دن ہوگا۔ میں یا عبدالرب..... کوئی بھی اپنی بیوی کو طلاق دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ کیوں عبدالرب کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ عبدالوہاب نے بھائی سے پوچھا۔

”ہاں آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ عبدالرب نے خفگی سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے اب تم سب لوگ یہاں سے جاؤ۔ اماں جان کو آرام کی ضرورت ہے۔“ عبدالوہاب نے اٹھتے ہوئے کہا اور سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔ جمیلہ خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں۔ عبدالوہاب نے مسکراتے ہوئے لڑکیوں کی طرف دیکھا ان دونوں کے چہروں پر بھی اطمینان تھا۔ اس نے کمرے سے جاتے ہوئے عاصمہ کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا تو وہ مسکرانے لگی۔

☆☆☆

عبدالوہاب نے ایک ماہ کے اندر، اندر چھت کے اوپر دو کمرے، کچن، باتھ روم اور لاونج کی سیٹنگ کروا کر... عبدالرحمن اور آمنہ کے لیے بہت اچھا پورشن تیار کروا دیا تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز تھی اور تمام سیٹنگ بھی جدید انداز میں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاجرہ اور شبنم کے سینے میں ابال اٹھتے تھے۔ انہوں نے تو ساری زندگی ایک ایک کمرے میں گزاری تھی۔ بیٹیاں جوان ہوئیں تو ایک ایک کمرہ اور مل گیا مگر وہ کمرے سب پرانی طرز کے تھے۔ فرنیچر بھی پرانا ہو چکا تھا۔ کچھ بھی ڈھنک کا نہیں تھا۔ انہوں نے تو آمنہ کو گھر سے نکالنے کی پلاننگ کی تھی اور خدا نے اسے ان سے بھی بہتر رہائش دے دی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اوپر جا کر بہت پرسکون ہو گئی تھی اور وہ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ جمیلہ نیچے ہی رہتی تھیں کیونکہ ان کا بڑے بیٹوں کے پاس رہنا زیادہ مناسب تھا۔ جب دل چاہے تو وہ اوپر آمنہ کے پاس جا سکتی تھیں اور یوں وہ دن میں کئی بار آمنہ کے پاس جاتیں۔ اس کے کئی کام کر دیتیں اور آمنہ بھی ان سے بہت محبت سے پیش آتی۔ شبینہ اور عاصمہ بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر چاچی سے ملنے جاتیں تو کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہتیں۔ آمنہ انہیں اپنے بچپن کے کالج لائف کے اور مسلمان ہونے سے پہلے کے واقعات سناتی تو وہ بہت توجہ سے مزے لے لے کر سنیں اور اسی میں انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ دونوں کی مائیں نیچے بیٹھ کر انہیں کوسنے دیتیں اور آوازیں لگاتیں جب وہ نیچے جاتیں تو ان کی وہ بے عزتی ہوتی کہ خدا کی پناہ۔ مگر دن میں ایک دو بار جب تک وہ آمنہ کے پاس چکر نہ لگاتیں تو انہیں بھی چین نہ ملتا تھا۔ آمنہ کے کمروں کے آگے ٹیرس بنایا گیا تھا اور وہاں کھڑے ہو کر نیچے گلی میں اور محلے میں جھانکا جاسکتا تھا۔ آمنہ پردے کا بہت خیال رکھتی تھی اس لیے وہ شاذ و نادر ہی ادھر جاتی تھی۔

(جاری ہے) For Next Episodes Stay tuned to

نورِ دیارِ دل

غزالہ عزیز

”تمہارے نزدیک محبت کیا ہے مایا.....؟“
ذویا نے بڑی سنجیدگی سے مایا کی طرف دیکھتے
ہوئے پوچھا تھا۔ مگر شاید وہ غیر سنجیدہ موڈ میں تھی۔ اس
لیے برجستہ بولی۔

”یہی کہ ٹین ایتج کی محبت نادانی ہوتی ہے اور
میچورا ایتج کی کہانی!“

اور ذویا جو اس کی طرف سے کسی سنجیدہ رویے کی
توقع کر رہی تھی۔ اس کے مان سیریس ایٹی ٹیوڈ اور



ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ دیکھ کر اسے گھورے بنا نہیں رہ سکی۔

”واٹ.....! میں تم سے محبت کے بارے میں تمہارے خیال اور سوچ کی بات کر رہی ہوں..... اور تم مجھے محبت کے سائڈ ایفیکٹس بتا رہی ہو۔ مذاق مت کرو مایا..... میں بہت سیریس ہوں، کسی کی زندگی کا سوال ہے، سو پلیز..... بی سیریس.....“

ذویا کی جھاڑ پر مایا بے ساختہ ہنسنے لگی۔ جانتی تھی محبت کے بارے میں اس کے نادور خیالات جان کر ذویا کو ایسے ہی شاک لگتا تھا..... مگر ذویا واقعی سیریس موڈ میں تھی اور شاید تھوڑی سی پریشان بھی..... لہذا مایا کو بھی سیریس ہونا پڑا اور اگلے لمحے وہ سچ سچ کسی اسٹیکچرل کی طرح جیسے ٹرانس کی کیفیت میں چلی گئی۔

”محبت ایک سمت میں سفر کرنے کا نام ہے۔ ایک جگہ ٹھہر جانا، پڑاؤ ڈال لینا..... صرف ایک کو دیکھنا، ایک ہی کو سوچنا..... محبت واحد اور یکتا ہوتی ہے۔ یہی محبت کا اصل فلسفہ ہے۔ محبت کبھی اپنی سمت نہیں بدلتی..... اور اگر محبت اپنی سمت بدل لے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔“

ذویا نے اسے سیریس ہونے کے لیے کہا تھا اور مایا نے خود پر سنجیدگی طاری کرنے کی پوری کوشش بھی کی تھی..... لیکن جب مایا بولی تو اس کی سنجیدگی پر ذویا حیران ہوئے بغیر نہیں رہی..... محبت کے بارے میں مایا کی سوچ اتنی گہرائی رکھتی ہوگی اسے ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا۔

”امیزنگ یار..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہر بات کو مذاق میں اڑانے والی مایا محبت کے بارے میں اتنا گہرا دل پزیر اور راست فلسفہ نظر رکھتی ہوگی۔“

ذویا نے خوشگوار تاثر کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

”شاید اس لیے کہ میں بھی ایک لڑکی، یعنی عورت ہی ہوں۔ اور محبت کے بارے میں ہر عورت کا یہی نظریہ اور سوچ ہوتی ہے۔ عورت کی محبت اکثر ایک ہی سمت اور ایک دائرے میں ہی گھومتی ہے۔ اس لیے وہ مرد سے بھی یہی توقع رکھتی ہے مگر افسوس..... مرد کی فطرت

میں ٹھہراؤ اور پڑاؤ نام کی شے مشکل سے ہی ملتی ہے۔ اس لیے میرا تمہارے لیے مشورہ ہے۔ تم بھی زین سے زیادہ توقعات کے پل مت باندھ لینا..... کہیں ایسا نہ ہو کہ آخر میں نتیجہ اس کی فطرت کے مطابق نکلے۔“

اور مایا کے حقیقت پسندانہ تجزیے نے ذویا کے چہرے پر ہر اس پھیلا یا تھا۔ وہ زین کی محبت کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ زین کے لیے ایک سمت، ایک دائرہ نہیں ہوگی۔ جس کے گرد ہمیشہ سفر کرتے کرتے کوئی اپنی زندگی تمام کر دے۔

”تم مجھے ڈرا رہی ہو مایا۔“

اس نے برجستہ شکایتی لہجے میں کہا۔

”نہیں..... زندگی کی حقیقی سچائی بیان کر رہی ہوں..... ہم لڑکیوں کی مخلوق بہت خوش فہم ہوتی ہے۔ مگر انسانی فطرت کے اسرار و رموز تو زندگی سے بھی زیادہ پیچیدہ اور الجھاؤ کے حامل ہوتے ہیں اور مرد کی فطرت اس سے بھی کہیں زیادہ پیچیدگی اور گہرائی کی حامل ہوتی ہے۔“ مایا نے رسائیت سے کہا۔

”مگر میں تم سے مشورہ مانگ رہی ہوں مایا..... کیونکہ تم میری بیسٹ فرینڈ ہو..... اور تم سے زیادہ میری بہتری کے بارے میں کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔“

ذویا نے معصوم لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لیے مایا کو اس پر پیار آیا۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے صرف یہی کہہ سکی۔

”ایک بیسٹ فرینڈ کا مشورہ میں تمہیں پہلے ہی دے چکی ہوں۔“

مایا نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ذویا بے اختیار ملتی لہجے میں بولی تھی۔

”تو پھر تم میرے لیے دعا کرنا..... میرا فیصلہ کبھی غلط ثابت نہ ہو۔ تم میرے لیے دعا کرو گی ناں مایا؟“

ذویا کے لہجے میں التجا کے ساتھ امید بھی تھی۔

”ٹھیک ہے، پھر میں تمہارے لیے یہی دعا کروں گی کہ خدا کرے..... تمہیں تمہاری محبت کبھی نہ ملے..... کیونکہ محبت مل جائے تو قدر کھودیتی ہے۔

ہوں۔ اور ایسی غلطی انجام دینے میں بھی نہیں کروں گی۔“
مایا نے قطعی لہجے میں کہا تھا..... جیسے وہ ناقابلِ تسخیر ہستی ہو۔

”ایسے مت کہو مایا..... محبت کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی..... نہ ہی اس کے ہونے یا نہ ہونے میں انسانی خواہش کا دخل ہوتا ہے۔ یہ تو بس ایک نرم و نازک سا احساس ہوتا ہے۔ ایک کول جذبہ جو اچانک ہی دل کی سر زمین سے سرابھارتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ گویا دل کی زمین کو جکڑ لیتا ہے پھر نہ ہم اسے اکھاڑنے پر قادر ہوتے ہیں اور نہ اجاڑنے پر.....“ ذویا کے جواب نے مایا کو خاموش کر دیا تھا۔ شاید اس کے دلائل میں زیادہ وزن تھا مگر وہ ذویا کے ساتھ بحث کرنے نہیں بیٹھی تھی۔
”اگر تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوگئی تو تم کیا کرو گی مایا؟“ اور ذویا کے اگلے سوال نے مایا کو چونک کر اپنی خاموشی توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اگر ایسا ہو گیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے دل کا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیونکہ یہ کم بخت محبت سب سے پہلے دل پر ہی وار کرتی ہے۔ سونہرے گادل اور نہ بجے گی محبت کی بانسری.....“ مایا نے ہنستے ہوئے بڑے بے سُرے انداز میں کہا تھا۔ اور ذویا ایک بار پھر سے اسے گھورنے لگی تھی۔
”آخر کس مٹی سے بنی تھی یہ لڑکی.....“ ذویا نے خفگی سے سوچا تھا۔

”اب گھر چلو ذویا..... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اور تم جانتی ہو مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی ہے۔“ اگلے لمحے مایا ہنستے ہوئے آڈیٹوریم ہال کی بیرونی سیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر سے اپنے نان سیریس موڈ میں واپس آ چکی تھی۔ اس لیے مجبوراً ذویا کو بھی اٹھنا پڑا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب مایا سے اس بارے میں سنجیدگی کی توقع کرنا عبث ہوگا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب مایا کو کسی بارے میں مزید بات نہ کرنی ہو تو وہ اسی طرح بات کو مزاح کا

رول دیتی ہے۔“

مایا نے بڑی بے رحمی سے کہا تو ذویا کی آنکھیں صدمے سے چھلکنے کو بے تاب ہوئیں اور ذویا کی رونی شکل دیکھ کر مایا کو بے ساختہ ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔
”میں تمہیں جان سے مار دوں گی مایا..... تم مجھے

دعا دے رہی ہو یا بد دعا.....؟“

ذویا نے خفگی سے گھورتے ہوئے مایا کی طرف دیکھا۔ ذویا کے چہرے کے تاثرات ایسے ہی تھے کہ جیسے واقعی اسے مایا کے لفظوں سے شدید صدمہ پہنچا ہو..... لیکن مایا کے چہرے پر کوئی افسوس یا شرمندگی کا تاثر نہیں تھا..... اور اس کے اسی تاثر نے ذویا کو ناراض کر دیا تھا۔ اور وہ اٹھ کر جانے لگی تو مایا نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کے روکا تھا۔

”پلیز ذویا..... مجھے غلط مت سمجھو..... میں مذاق نہیں کر رہی، میں سیریس ہوں، میں نے محبت میں لوگوں کے بھرم ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں نے محبت کو محبت کے ہاتھوں مٹی ہوتے دیکھا ہے۔ یہ محبت صرف انسان کو اپنے پیچھے خوار کر داتی ہے۔ نہ ملے تو سدا سک بن کر دل میں چبھتی ہے اور اگر مل جائے تو عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔“ ذویا اسے ملامت کرنے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور مایا اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ذویا کے دل کو دکھی اور ڈپریشن میں مبتلا ضرور کر گئی تھی۔ ذویا پھر بھی خاموش رہی تھی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے..... پہلی بار دیکھ رہی ہو اور شاید مایا کو ذویا کی خاموش نگاہوں کا مفہوم سمجھ آ گیا تھا۔ اسی لیے برجستہ بولی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو ذویا! بے فکر رہو..... مجھے محبت کرنے کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف آیزرویشن ہے اور پلیز..... اب یہ مت کہنا کہ خدا کرے..... مجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی گیا ناں تو میں کبھی محبت کا ہاتھ نہیں تھاموں گی۔ میں تجربہ کرنے کے بجائے مشاہدے سے سیکھتی

رنگ دے کر ادھورا چھوڑ دیا کرتی تھی۔ شاید بروکن فیملی کے بچے ایسے ہی روتیوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ جہاں زندگی میں سب کچھ ادھورا رہ جاتا ہے پھر ان کی اپنی ذات بھی ادھورے پن کا حصہ بن جاتی ہے۔

مایا، کیمپس کے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھنے لگی اور ذویا نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا تھا کہ وہ مایا کو کبھی محبت ہو جانے کی دعا نہیں دے گی۔ کیونکہ محبت نصیب سے ہوتی ہے اور نصیب سے ملتی ہے اگر خدا نے اس کی قسمت میں محبت نام کا ستارہ لکھا ہوگا تو وہ مایا کے دل کے آسمان پر ایک دن ضرور چمکے گا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک دوسرے کی بہتر بن دوست ہی نہیں ایک دوسرے کی اچھی پڑوسی بھی تھیں۔ اسلام آباد کے ایک پوش علاقے کی رہائشی کالونی میں ان کے گھر کی دیواریں ساتھ ساتھ ملی تھیں..... ذویا اور زوار صرف دو بہن بھائی تھے..... ذویا سے بڑا زوار اپنے ایم بی اے کے لیے لندن بزنس اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ جبکہ ذویا اسلام آباد کی مقامی یونیورسٹی سے مایا کے ساتھ ماسٹرز کر رہی تھی۔ ذویا کے والد پرائیویٹ سیکٹر میں جاب کرتے تھے جبکہ مایا نانی کے انتقال کے بعد اپنے نانا حشام حسن کے ساتھ رہتی تھی۔ حشام حسن ایک سرکاری آفیسر رہ چکے تھے۔ انہوں نے بڑی diciplened لائف گزاری تھی لیکن مایا کو بڑی محبت اور پیار سے پالا تھا اور اسے ہر طرح کی جائز آزادی دے رکھی تھی۔ ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے باعث دونوں گھرانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔

ذویا کیمپس کے بزنس ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے زین ملک کو پسند کرتی تھی..... اور یہ پسندیدگی پچھلے چند سالوں کی دوستی کے ساتھ اب محبت میں بدل چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا..... جو کہ ان دونوں کی اسٹڈیز کے مکمل ہونے پر طے کی جانی تھی.....

البتہ زین اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کرنے سے پہلے ذویا کے گھر اپنا پروپوزل بھجوانا چاہتا تھا کیونکہ وہ کسی بھی صورت ذویا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے زین نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اگلے ہفتے اپنے پرنس کو اس کے گھر بھیج رہا ہے..... لیکن ذویا نے ابھی اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ ذویا کو اس بارے میں اپنی بیسٹ فرینڈ مایا سے ضروری بات کرنی تھی۔ وہ مایا سے شیئر کیے بغیر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا مایا سے بہتر مشورہ اسے کوئی دوسرا نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے آج دن کی تمام کلاسز آف ہونے کے بعد آڈیٹوریم کا رخ کیا تھا۔

وہ دونوں اکثر کیمپس کے آڈیٹوریم ہال کی بیرونی سیڑھیوں پر سر جوڑے بیٹھی پائی جاتی تھیں۔ پورے کیمپس میں یہ ان کی فیورٹ پلیس تھی اور ذویا کے بات کرنے پر مایا نے اس کی زندگی کے اتنے اہم فیصلے سے متعلق کوئی بہت اہم مشورہ دینے کے بجائے انتہائی غیر سنجیدہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ سے محبت نامی خناس کو نکالنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ محبت کے ذکر پر ایسے ہی نان سیریس رویہ اختیار کر لیتی تھی۔

ذویا یہ بھی جانتی تھی وہ محبت کے منکرین میں سے نہیں تھی مگر محبت کو وقت کا زیاں ضرور قرار دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ محبت پر سے اس کا اعتبار بہت پہلے اٹھ چکا تھا۔ وہ ایک بروکن فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں اس نے آپس میں محبت کی شادی کرنے والے والدین کا حشر دیکھ لیا تھا، ان میں ڈائورس ہو چکی تھی۔ جب وہ کلاس فور تھ یا ففٹھ میں تھی۔ اس لو میرج کے دس سال بعد مایا کے پاپا منصور خان کی زندگی میں ایک دوسری عورت آگئی جس کی محبت میں جتلا ہو کر انہوں نے اپنی بیوی مائرہ کو طلاق دے دی۔ منصور نے مائرہ کو چھوڑ کر سارہ نامی حسین بلا سے شادی کر لی..... اور سارہ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امریکا سیتل ہو گئے۔

اگرچہ مائرہ نے منصور خان سے اپنی فیملی کی مخالفت کے باوجود پسند کی شادی کی تھی مگر منصور کے

سچائی: ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر
شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔
ذہانت: ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔
خوش اخلاقی: ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے
محسوس ہو جاتی ہے۔
گناہ: ایسی لعنت ہے جو قلب کو سیاہ کر دیتی ہے۔
دعا: ایسا عمل ہے جو تقدیر کو مات دے لیتا ہے۔
توبہ: ایسا دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا
رہے گا۔

مرسلہ: عذرارضوی، کراچی

ڈائورس دینے کے بعد مائرہ کی فیملی نے اسے معاف
کر کے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس کی فیملی اتنی گنتی گزری
نہیں تھی کہ بیٹی اور نواسی کو سپورٹ نہ کرتی..... البتہ
مائرہ کے دل سے منصور کی بے وفائی کے باعث محبت کا
خمار اتر جانے کے بعد اس کے والدین نے اسے زندگی
کی تلخ سچائیوں کا آئینہ ضرور دکھا کر اتنا سمجھایا کہ منصور
خان کی بے وفائی کو روگ بنانے کے بجائے اسے
زندگی سے اپنے حصے کی باقی خوشیاں پانے اور سب کچھ
بھول کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنے کا پورا
حق حاصل ہے۔ مائرہ نے اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے اس
کا انجام دیکھ لیا تھا۔ سو اس بار اس نے ماں، باپ کے
فیصلے پر خاموشی سے رضامندی کی مہر ثبت کر دی تھی۔
جس کے بعد اس کے بابا حشام حسن نے اس کی دوسری
شادی کر دی۔ مایا کو انہوں نے اپنے پاس ہی رکھنے کا
فیصلہ کیا تھا۔ جسے مایا کی بھلائی کے پیش نظر مائرہ نے
مان لیا تھا اور منصور کی طرح مائرہ بھی اپنے کزن کے
ساتھ بیاہ کر انگلینڈ سیٹل ہو گئی۔ حالانکہ مائرہ بیٹی کو اپنے
ساتھ انگلینڈ لے کر جانا چاہتی تھی لیکن حشام حسن نے یہ
کہہ کر بیٹی کو سمجھایا کہ دس سالہ بیٹی کو کسی دوسرے شخص
کو باپ کی حیثیت سے قبول کرنے میں وقت لگنے کے
ساتھ بہت سی دیگر مشکلات بھی پیش آ سکتی ہیں۔

یوں مائرہ ماں، باپ کے سمجھانے اور تسلی دلانے
پر منصور خان کی بے وفائی کا داغ دل میں چھپا کر عون
رضوی کے ساتھ انگلینڈ رخصت ہو گئی۔ اور تب سے مایا
کی پرورش اس کے نانا، نانی نے کی تھی جنہیں وہ ماں کی
طرح بابا، اماں کہتی تھی۔

یونہی ماہ و سال کی گردش میں گم ہو کر مائرہ اور
منصور خان اپنی اپنی نئی زندگیوں میں مگن ہو کر معصوم
بیٹی کو فراموش کر بیٹھے۔ مائرہ کے تو اکثر لندن سے فون
آتے رہتے لیکن منصور نے سارہ کے ساتھ اپنی نئی
زندگی شروع کر کے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ جیسے
انہیں خوف ہو کہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے والے پتھر کے
ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب مایا کی تعلیم و پرورش کی

ذمے داری اس کے نانا حشام حسن نے بخیر و خوبی
اٹھائی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے خوش
اسلوبی سے نبھایا تھا مگر افسوس کہ اس سفر میں ان کی
شریک سفر زیادہ عرصے ساتھ نہیں رہ سکیں..... اور طبعی
موت کے باعث انہیں تنہا چھوڑ گئیں..... لیکن مایا کے
ساتھ نے انہیں تنہا رہنے نہیں دیا۔ وقت گزرنے کے
ساتھ مایا کی محبت اور ذمے داری کے احساس نے حشام
حسن کو کمزور نہیں ہونے دیا تھا۔

ان دنوں وہ اسلام آباد میں ریٹائرڈ... زندگی
گزار رہے تھے۔ اگرچہ نواسی کی پرورش میں انہوں نے
کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ماں، باپ کی فطری محبت
اور حیثیت کا خلا وہ اس کی زندگی میں کبھی پُر نہیں کر سکتے
تھے۔ اور مایا کی زندگی میں ماں، باپ کے یوں چھوڑ کر
چلے جانے سے محبت پر اعتبار کرنے کا خانہ ہمیشہ کے
لیے خالی رہ گیا۔ جس کو وہ چاہ کر بھی پُر نہیں کر سکے تھے۔
اگرچہ وہ بے حد ذہین اور خود اعتماد لڑکی تھی لیکن شفقت
پداری اور ممتا کی محبت پر اس کا اعتماد کبھی بحال نہیں ہو سکا۔
اس نے اس چھوٹی عمر میں ماں، باپ کا ساتھ ہی
نہیں کھویا..... بلکہ مقدس محبت کے ان رشتوں پر سے اپنا
اعتماد بھی ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

اگرچہ وہ محبت کی انکاری نہیں تھی مگر اسے محبت میں بننے
والے رشتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ

”آئی ایم سوری زین..... ایکچو نیلی وہ میں نے مایا سے.....“

”او کم آن ذویا..... پلیز اب یہ مت کہنا کہ تم اس بارے میں مایا سے مشورہ لے کر فیصلہ کرو گی۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو یاد رکھنا ہماری لو اسٹوری کا دی اینڈ یہیں پر ہو جائے گا اور میں کنوارہ مرنا نہیں چاہتا۔“ اس نے بڑے جذباتی انداز میں آخری جملہ ادا کیا۔ اس بار ذویا نے خفگی سے گھور کے زین کی طرف دیکھا۔

”اسٹاپ اٹ زین..... آئندہ کبھی مرنے مارنے کی بات مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ خفا ہوتے ہوئے ذویا کے لہجے میں کپکپاہٹ کے ساتھ آنکھیں بھی تھلکنے کو بے تاب تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ زین کی مرنے والی بات پر آنسو بہانے بیٹھ جاتی زین نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔ ذویا اس کی بے ساختہ حرکت پر روتے روتے ہنس پڑی پھر چند لمحوں بعد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”آئی ایم سوری زین..... مگر مایا میری دوست ہے، مجھے بہت عزیز بھی ہے۔ وہ جانتی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں..... وہ محبت کے منکرین میں سے نہیں ہے زین..... بس محبت میں بننے والے رشتوں پر اسے اعتبار نہیں ہے۔ اور ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو..... وہ ہماری محبت کے خلاف بھی نہیں ہے۔ تم بے فکر رہو۔ اس نے مجھے کوئی غلط مشورہ بھی نہیں دیا ہے۔ بس وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے... میری بہت پروا ہے اسے.....“ ذویا نے نرمی سے مایا کی پوزیشن کلیئر کی۔

”میں مایا سے بدگمان نہیں ہوں ذویا..... مگر اتنا ضرور جانتا ہوں۔ اگر تم اپنی دوست کو خوش اور ایک نارمل زندگی جیتے دیکھنا چاہتی ہو تو مایا کا محبت کے رشتوں پر اعتماد ایک ہی صورت میں بحال ہو سکتا ہے۔ جب وہ کسی کی محبت پر اعتبار کرے..... اسے کسی سے

جانتے ہوئے بھی ذویا کو مایا سے شکایت نہیں تھی۔ وہ اس سے ناراض بھی نہیں تھی۔ وہ مایا سے ناراض رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہ مایا کو بچپن سے جانتی تھی اور اسے مایا سے ہمدردی نہیں محبت تھی..... اور کیا ہوا جو مایا کو محبت میں بننے والے رشتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اسے اپنی اور ذویا کی دوستی پر تو اعتبار تھا ناں..... اور ذویا کے لیے یہی اعتماد کافی تھا.....

☆☆☆

”تو پھر کیا سوچا تم نے ذویا.....؟“

”کس بارے میں.....؟“ ذویا نے چونک کر زین کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں جواب کے بجائے خفگی کا ہلکا سا تاثر جھلک رہا تھا۔ آج وہ بہت دنوں بعد زین کے اصرار پر مارگلہ ہلز کے دامن میں نئے کھلنے والے شاندار سے ریسٹورنٹ کے کافی ہال میں بیٹھے تھے۔ موسم بھی بارش کے بعد بہت خوب صورت ہو رہا تھا اور زین نے ٹیکسٹ کر کے اسے یہیں بلایا تھا۔ ورنہ زین کے ساتھ ہوٹلنگ کرنے کی وہ بالکل عادی نہیں تھی۔ اس نے ماں، باپ کی دی ہوئی آزادی اور اعتماد کا کبھی نا جائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا..... مسئلہ چونکہ بہت سیریس تھا سو اس کا آنا بنتا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ زین کی آنکھوں سے جھلکتی خفگی کا تاثر مزید گہرا پڑتا۔ ذویا نے فوراً سے بیشتر اس سے معذرت کر لی۔ لہذا زین نے سنجیدگی سے نئے سرے سے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

”میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہا تھا ذویا..... اپنا پروپوزل لے کر میں اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے سے پہلے کم از کم ہمارا رشتہ طے ہو جائے اسی لیے پچھلے ایک ہفتے سے تم سے ملاقات کے لیے وقت مانگ رہا ہوں اور تم اب تک فیصلہ ہی نہیں کر پائی ہو کہ اکل، آنٹی سے اس بارے میں کب بات کرو گی۔“

شرمندگی کا تاثر اب ذویا کے چہرے پر تھا۔

وعدہ کیا تھا کہ وہ آج ہی اپنے پیرنٹس سے اس پروپوزل کے بارے میں بات کرے گی اور ذویا کو یقین تھا کہ اس کے پیرنٹس زین کے گھر والوں کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔

”حقی محبت ہو جائے۔“
”مگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے زین۔“

ذویا نے بر جستہ کہا۔
”تو پھر میں دعا کروں گا کہ مایا سے کسی شخص کو حقی محبت ہو جائے۔ اسے واقعی کسی محبت کرنے والے شخص کا ساتھ مل جائے جو اس کے ٹوٹے ہوئے اعتبار کو پھر سے جوڑ دے، کبھی نہ ٹوٹنے کے لیے۔“ زین نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

”اللہ کرے..... ایسا ہو جائے۔“ ذویا نے اس کی بات پر دعائیہ انداز میں کہا۔

”ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں ہے ذویا.....“

”ہاں..... اور باری بھی لو میرج ہوگی..... ہمارے ساتھ تو مایا کے پیرنٹس کی طرح نہیں ہوگا ناں زین.....؟ تم کبھی میرا ساتھ تو نہیں چھوڑو گے..... میرا اعتماد تو نہیں توڑو گے؟“ یہ شاید مایا کی باتوں کا اثر تھا۔ ذویا کے لہجے میں مستقبل کے حوالے سے ہر اس در آیا تھا۔ اس کے لہجے میں یاسیت دیکھ کر زین نے پورے خلوص کے ساتھ اپنا ہاتھ ذویا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ہر شخص منصور خان جیسا نہیں ہوتا ذویا..... اور ضروری نہیں ہے کہ ہر لو اسٹوری یا لو میرج کا انجام ناکامی ہی ہو..... محبت آسانی سے ختم ہونے والی چیز تو نہیں ہوتی..... اور نہ ہی محبت کا جذبہ اتنا کمزور ہوتا ہے، میرا یقین کرو ذویا..... میری محبت تمہارے لیے کبھی کمزور نہیں پڑے گی۔ میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔“ ذویا کی آنکھیں تشکر سے چھلک پڑیں اور اس بار اس کی آنکھوں میں خوشی کا تاثر ہلکورے لے رہا تھا، زین کی محبت کے یقین کا گہرا تاثر..... اب شاید ذویا کو کسی یقین دہانی کی ضرورت نہیں پڑنے والی تھی۔ وہ دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں کافی پی کر وہاں سے اٹھے تھے۔ واپسی پر ذویا نے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

تحریر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنسنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیز 11 - یکمیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

حصہ جو پرنٹنگ میکانزم پر مبنی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

☆☆☆

اور کچھ دن بعد ایسا ہی ہوا تھا۔ زین اپنے پیرنٹس کے ساتھ ذویا کے گھر آیا تھا۔ جہاں زین کے ماں، باپ نے بڑی محبت و انکساری سے ذویا کے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل پیش کیا تھا۔ ذویا کے پیرنٹس کو زین اور اس کی فیملی پسند آئی تھی۔ اس کے اسٹرائنگ فیملی بیک گراؤنڈ اور براہمیت فوج نے ذویا کے پیرنٹس کو اس پروپوزل پر غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ زین کے پاپا کا اپنا لیدر کار منٹس کا بزنس تھا جسے آگے جا کر زین نے ہی سنبھالنا تھا۔ لہذا انہوں نے جواب دینے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔

اور یوں ٹھیک ایک ماہ بعد ذویا اور زین کی منگنی کی رسم طے کر دی گئی۔ شادی دونوں کی اسٹڈیز مکمل ہونے پر رکھی گئی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے اور مایا اپنی دوست کی خوشی میں واقعی خوش تھی۔

☆☆☆

آج ذویا اور زین کی زندگی کا بہت بڑا دن تھا۔ ان کی منگنی کی رسم ادا کی گئی تھی اور اس خوشی کے موقع پر ان دونوں کے ساتھ، ساتھ ان کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہر شخص اس خوشی میں خوش تھا۔ چاہے وہ مایا اور اس کے نانا حشام حسن ہوں یا ذویا کی فیملی اور دیگر دوست..... سوائے ایک شخص کے جو اس خوشی کے موقع پر ادا اس نظر آیا تھا۔ آج پہلی بار مایا نے اس شخص کی آنکھوں میں محبت کی جگہ گہری اداسی کی دبیز دھند کو اترتے دیکھا تھا۔

عالیان، زین کا جگری دوست ہی نہیں کلاس فیلو بھی تھا اور ان دونوں کا یونیورسٹی فیلو بھی تھا۔ اس لیے آج وہ بھی ان دونوں کی خوشی میں شریک تھا..... لیکن مایا کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نظر آنے والی مایا کی محبت کی جگہ اداسی کے رنگوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ مایا نے دانستہ طور پر ہمیشہ کی طرح آج بھی عالیان کی ذات کو انور کیا تھا۔ اور اسی بات نے شاید اسے ہرٹ کیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی داستان کا مفہوم جانتے ہوئے

بھی انجان بنی رہتی..... اسی لیے ذویا اور زین کے اصرار کے باوجود وہ مزید وہاں نہیں رکا۔ رات گئے جا کر پارٹی کا اختتام ہوا تھا۔ مایا نے بینکویٹ ہال سے واپسی پر رات کو اپنے نانا کو انجیٹ پارٹی کا احوال بتانے کے بجائے اپنے روم کا رخ کیا۔ کیونکہ حشام حسن اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور انہوں نے پہلے ہی معذرت کر لی تھی۔

اس وقت نیند مایا کی آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ چنچ کر کے آکر درتچے کے پاس کھڑی ہو گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچوں کا رخ عالیان کی طرف خود بخود ہو گیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کی گہری اداسی نے مایا کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عالیان کی آنکھوں کے رنگوں سے واقف تھی بلکہ اس میں لکھی تحریر کو بھی بخوبی پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ کیونکہ عورت فطری طور پر اپنے اوپر پڑنے والی مرد کی ہر نظر کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مایا بھی عالیان کے دل کے احوال سے بے خبر نہیں تھی مگر انجان ضرور بن جاتی تھی۔ اس کی زندگی میں اس محبت نامی جذبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ محبت میں کوئی نیا رشتہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سالوں بعد محبت کی پھر ایک نئی کہانی شروع ہو جائے۔ جس کا انجام بالآخر اس کے والدین کی محبت جیسا ہو اور ایک نئی مایا پھر سے جنم لے۔ وہ اس اذیت میں کسی اور کو مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جس اذیت میں وہ خود مبتلا تھی۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ اس اذیت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اسی لیے عالیان کے اپنے لیے جذبات کی آنچ سے لودیتی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز برتی آئی تھی۔ وہ اس راستے پر قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ جس پر چل کر سفر کے اختتام پر ٹھکن وجود پر ہی نہیں دل و دماغ پر بھی اتر آتی ہے۔

اور شکر تھا کہ ذویا اس سچائی سے بے خبر تھی۔ شاید عالیان نے بھی زین کو اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ ذویا نے تو عالیان کی وکالت میں مایا کے دل

تھک کر آ کر سو گئی۔ بے خوابی سے زیادہ سوچوں کی
تھکن نے نڈھال کر دیا تھا۔

اگلی صبح زین اپنی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے
لیے اپنے جگری یار عالیان کو ٹریٹ دینے کا فی سہاپ
میں موجود تھا۔ پچھلی رات شہر میں خوب بارش ہوئی
تھی۔ جس کے باعث موسم کسی حد تک خوشگوار ہو گیا
تھا۔ اور آج کی صبح بہت نکھری ستھری اور خوش رنگ نظر
آ رہی تھی۔ یا پھر زین کو ہی اپنے دل کے خوش رنگ
موسم کی طرح باہر کے سارے منظر بھی خوش رنگ نظر
آ رہے تھے۔ ورنہ بارشوں کے موسم ہمیشہ اداس
کر دینے والے ہوتے ہیں۔ اور اس وقت عالیان کے
چہرے پر بھی خزاں کا زرد اداس موسم اتر ا ہوا تھا۔ وہ
اپنی محبت کا اظہار زین کے سامنے اس طرح کر رہا تھا
جیسے میدان کارزار میں ہارنے والا کھلاڑی اپنی شکست
کا اعتراف کرتا ہے۔

”میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گیا ہوں

کی چوکھٹ پکڑ لینی تھی۔ اور وہ تب تک ہار نہیں
مانتی..... جب تک مایا، عالیان کی محبت کو اعزاز و
احترام کے ساتھ قبول نہیں کر لیتی۔ سو اب وہ ہر سکون
تھی کہ عالیان نے اپنی واردات قلبی کی ہوا کسی کو بھی
لگنے نہیں دی تھی۔ مایا کے لیے یہ اطمینان کافی تھا اور
اسے یقین تھا کہ ایک دن عالیان اس کی طرف سے
مایوس ہو کر تھک کر اپنی سمت بدل لے گا۔ کیونکہ مایا کے
نزدیک مرد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سمت بدلنے
والی، پڑاؤ دوسری جگہ ڈال لینے والی۔ البتہ ذویا اور
زین کو اس نے خلوص دل سے دعائیں دی تھیں۔

وہ جانے کب سے درتے کے ساتھ لگی کھڑی اپنی
سوچوں میں گم تھی۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ یک دم
تیز ہوا کے ساتھ پھوار نے مایا کے رخسار کو بھگوا تو وہ
چونک کر درتے کے پار لان میں برستی بارش میں بھیگتے
پودوں کو دیکھنے لگی۔ جولان میں جگہ جگہ لگے پوسٹ
لیمپ کی روشنی میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔
وہ رات دیر تک کھڑی بارش دیکھتی رہی تھی پھر



Advertisement
Through

JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide



JASOOSI DIGEST · SUSPENSE DIGEST · MONTHLY PAKIZA · MONTHLY SAROJASHY

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.

PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551

Email : jdpgroup@hotmail.com

زین..... اور محبت مجھ سے جیت گئی ہے مگر میں جانتا ہوں میں تمہاری طرح خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھے میری محبت کبھی نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ محبت کے منکرین میں شامل ہے۔ وہ کبھی میری محبت کو قبول نہیں کرے گی۔ وہ کبھی میری محبت پر بھروسہ نہیں کرے گی۔“ اور زین حیرت و استعجاب سے شکست خوردہ جذبات سے نڈھال سامنے بیٹھے عالیان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت واقعی ہارا ہوا لگ رہا تھا۔ زین کو اب اس کی حالت پر دکھ ہو رہا تھا۔

”محبت.....؟ تم کس سے محبت کرتے ہو عالیان؟“ زین کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

اور عالیان نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھ کر ایسے سر جھکا لیا جیسے اب اس میں کچھ بھی کہنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا ہو۔

”کون ہے وہ؟ تم نے پہلے کبھی بتایا کیوں نہیں عالیان.....؟ تم کسی سے محبت کرتے ہو.....؟ میں تو تمہارا بیسٹ فرینڈ ہوں..... مگر تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے شیر نہیں کی؟“

زین کے لہجے میں اب حیرت کی جگہ شکوے نے لے لی تھی۔

”میں تو اس کے سامنے ہی اس سچائی کا اعتراف نہیں کر سکا زین.....! پھر تمہیں کس حوصلے کے ساتھ بتاتا..... میں جس سے محبت کرتا ہوں، وہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی..... حالانکہ میں اسے بتانا چاہتا تھا مگر شاید وہ آنکھوں کی زبان پڑھنے کی ماہر نکلی..... اس نے میری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر مجھے اتنی بری طرح اگنور کیا ہے کہ میں دوبارہ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ تک کھو بیٹھا ہوں۔“ زین افسردگی اور پرتاسف انداز میں عالیان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں، میں اس کے بغیر زندگی جی نہیں سکوں گا پر میں اسے کبھی یہ نہیں کہہ سکوں گا زین..... کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

اور زین کا دل اپنے بے حد وجیہہ، خورو اور مضبوط اعصاب کے مالک، جگری دوست کو اس

شکستہ حالت میں دیکھ کر دکھ سے رو رہا تھا۔

”کون ہے وہ.....؟ پلیز..... یہ مت کہنا کہ وہ ہمارے ہی کیمپس میں پڑھتی ہے۔“ اور اس نے ڈرتے ڈرتے عالیان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

زین نے واقعی خوف زدہ لہجے میں عالیان کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمارے ہی کیمپس میں پڑھتی ہے اور تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔“

اور اب کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ عالیان کے لبوں سے نکلے لفظوں نے زین کے دل کے سارے خدشوں کی لچوں میں تصدیق کر دی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ کسی کا نام ادا ہوا تھا۔

”مایا.....؟ تم مایا سے محبت کرتے ہو عالیان.....؟“

زین نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ جیسے عالیان ابھی کہہ دے گا کہ نہیں وہ لڑکی مایا نہیں ہے مگر عالیان نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور عالیان کی خاموشی سے جواب اخذ کر کے زین چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا مگر جب بولا تو عالیان کو لگا کہ زین کہہ رہا ہو۔

”اب تم کیا کرو گے عالیان.....؟“ اور عالیان کو لگا جیسے زین کہہ رہا ہو کہ اب تم زندہ کیسے رہو گے۔ عالیان اب بھی خاموش رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد خود کو کمپوز ڈ کرنے کے بعد بولا تھا۔

”اگر آنکھوں کی زبان پڑھنے والے دل کا حال جان کر بھی انجان بنے اپنے قدم آپ کی جانب سے موڑ لیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی زندگی اور دل میں آپ کی کوئی وقعت نہیں اور مایا کی آنکھوں کے سردی اثر اور رویے نے مجھے اسی وقت باور کرا دیا تھا کہ میں واقعی ہار گیا ہوں۔ میں کبھی اس سے جیت نہیں سکوں گا۔“

اور اپنے عزیز ترین دوست کو مایوسی و شکستگی کی آخری حدوں پر دیکھ کر زین کا دل گر لایا تھا۔

”تم ہاری ہوئی بازی جیت بھی سکتے ہو عالیان.....!“ عالیان کے مایوس، شکستہ جھکے ہوئے

سیاست

ایک برطانوی طالب علم اپنی دوست طالبہ سے کہہ رہا تھا۔ ”میں پہلے جا کر اپنا بیروزگاری الاؤنس کا چیک لوں گا پھر یونیورسٹی جا کر دیکھوں گا کہ میرا تعلیمی وظیفے کا چیک ابھی تک کیوں نہیں پہنچا..... اس دوران میں تم اسپتال سے اپنا فری چیک اپ کرا لیتا اور واپس آتے ہوئے فری ہیلتھ سینٹر سے میرا چشمہ بھی لیتی آنا۔ وہاں سے تم فوڈ اسٹیمپ لینے چلی جانا اور کوآپریٹو اسٹور سے مفت کھانے پینے کی چیزیں لیتی آنا..... ٹھیک تین بجے تم مجھے 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ کے سامنے ملنا..... وہاں ہم حکومت کے خلاف جلوس میں شریک ہوں گے۔“

رونے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غدودوں سے اک خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیائی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض اور بالخصوص السرکاشکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السرکے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیمیائی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: فاطمہ حسن، اسلام آباد

چہرے نے بے ساختہ غیر یقینی انداز میں سامنے بیٹھے زین کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھا۔

وہ مایوسی کی جس انتہا پر تھا وہاں کچھ بولنے سے زیادہ امید کی چھوٹی سی کرن کو بھی تھا مناجا ہوتا تھا۔ اسی لیے خاموش رہا تھا۔

”اگر تم ہاری ہوئی بازی جیتنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔“ زین نے سنجیدہ اور بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

”وہ کیا ہے زین.....؟ تم بتاؤ..... میں ہر راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔“

عالیان نے بے ساختہ کہا تھا۔
”تم مایا سے اپنی محبت کا اظہار ہرگز مت کرنا..... اسے مت بتانا کہ تم اس سے کتنی محبت کرتے ہو۔“

”کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو زین؟“ عالیان نے حیرت و استعجاب بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر تم مایا کو پانا چاہتے ہو تو سیدھے طریقے سے اس کے گھر اپنا پروپوزل بھیج دو۔ وہ چاہے محبت نہ کرے مگر شادی تو اسے کرنی ہی پڑے گی پھر چاہے وہ تم ہو یا کوئی اور شخص..... اور اس کے بعد سب کچھ قسمت پر چھوڑ دو کیونکہ ہم انسانوں سے لڑ سکتے ہیں مگر اپنی قسمت سے نہیں۔“

اور عالیان خاموش ہو گیا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں اداسی اور مایوسی کی جگہ امید نے لے لی تھی۔ وہ خوش نما آس جس نے عالیان کے دل کے ساتھ اس کے وجود کو بھی ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ زین نے صدیق دل سے اپنے عزیز از جان دوست کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

☆☆☆

لندن سے مارہ کا فون آیا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر حشام حسن بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ مایا خاموشی سے ناشتا کرنے میں مگن تھی۔

”مایا..... آج صبح لندن سے تمہاری ماما کا فون آیا تھا۔“ حشام حسن نے بڑی سنجیدگی سے جملہ کہا تھا۔
اور فوک میں فراڈ ایگ کا پس پھنساتے ہوئے

مایا نے چونک کر سیاٹ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں تعجب ضرور تھا۔ انہیں بھی اس کے سر در عمل کا اندازہ تھا۔ اسی لیے بات کو خود ہی آگے بڑھایا تھا۔

”وہ تمہیں اپنے پاس لندن بلوانا چاہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں..... اس نے تم سے وعدہ کیا تھا۔“

”اور اتنے سالوں بعد انہیں اپنے وعدے کی پاسداری کا خیال آیا ہے؟“ مایا کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ شکایت بھی نہیں تھی البتہ لہجے میں بے پروائی ضرور تھی۔ جیسے اب اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حشام حسن خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”اس وقت تمہارے لیے یہی مناسب تھا مایا..... کیا میں نے اپنی پرورش اور محبت میں کوئی کمی رکھی؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”نہیں بابا..... آپ نے کہیں کوئی کمی نہیں رکھی۔ اسی لیے میری زندگی میں کسی اور محبت کی ضرورت نہیں ہے..... اور پھر اب میں وہاں جا کر کیا کروں گی..... میری وجہ سے خواہ مخواہ ان کی پرسنل فیملی لائف ڈسٹرب ہوگی۔ آپ انہیں منع کر دیں بابا..... میں وہاں نہیں جانا چاہتی..... میں آپ کے پاس ہی خوش ہوں۔“ وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھنا چاہتی تھی۔ تب حشام حسن نے برجستہ کہا۔

”تو پھر تمہیں کہیں اور جانا پڑے گا مایا..... کیونکہ اب میں تمہیں اس گھر میں زیادہ دن نہیں رکھ سکتا۔“

اور مایا شاکڈ کھڑی بابا کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور تب اسے ہونقوں کی طرح سراسیمہ دیکھ کر حشام حسن کو اس پر ترس آگیا۔ وہ شگفتگی سے مسکرانے لگے۔

”ارے بھئی..... میں نے ساری زندگی تمہیں اس گھر میں بٹھا کر تھوڑی رکھنا ہے۔ تمہاری اسٹڈیز کمپلیٹ ہو رہی ہیں، میں تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور ایک بہت اچھا پروپوزل بھی تمہارے لیے آیا ہوا ہے۔“ اس بار واپس چیئر پر..... بیٹھتے ہوئے مایا نے

شکایتی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہیں بابا؟“ مایا کی آنکھوں میں افسردگی بھرا شکوہ تھا۔

”بوجھ نہیں بیٹا..... ذمے داری.....! تم میری ذمے داری ہو بیٹا..... اور بیٹیوں کی ذمے داری سے جتنی جلدی ہو سکے فارغ ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ تم چاہو تو لڑکے سے مل سکتی ہو..... مجھے تو وہ لڑکا اور اس کی فیملی بہت پسند آئے ہیں مگر تمہاری رضا مندی پہلے ضروری ہے پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

”آپ میری مرضی کے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہیں بابا؟“

”پلیز مایا..... اب یہ مت کہنا کہ تم شادی کرنا نہیں چاہتی ہو..... بھئی میرے نزدیک اس دنیا میں خود کشی کرنے والے اور شادی نہ کرنے والے دونوں ہی بزدل اور اینارمل ہوتے ہیں اور میں جانتا ہوں میری بیٹی بہت بہادر ہے۔“

حشام حسن نے محبت اور یمان سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت کرے نہ کرے مگر شادی تو اسے کرنا ہی پڑے گی۔ وہ بابا کا دل نہیں توڑ سکتی تھی پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، پاپا کے پاس ہزار دلائل ہوتے اسے قائل کرنے کے لیے..... مگر انہیں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کی خاموشی نے انہیں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ مایا نے ان سے لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ تصویر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ذویا اور زین کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مایا اتنی آسانی سے شادی کے لیے مان جانے لگے۔ دوسرے زین نے عالیان کی سچائی بتا کر ذویا کو اس بارے میں مایا سے کوئی بھی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ لہذا ذویا نے بھی خوشی کے اظہار کے سوا کوئی سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اور یہ یقین حقیقت میں جلد ہی بدل گیا۔ جب چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق مایا بیاہ کر ان دونوں کی شادی سے پہلے سسرال سدھار گئی۔

مایا نے دل میں سوچا تھا۔ جبکہ عالیان نے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے نازک ہاتھ کی مخروطی انگلیوں کو تھام لیا تھا۔

”زین نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرا یقین کرو مایا..... میں اس کے بعد سے تمہیں پہلے سے زیادہ چاہنے لگا ہوں۔“ مایا جو عالیان کے پہلے جملے پر ساکت ہوئی تھی اگلے جملے پر سپاٹ تاثر کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ جہاں ہمیشہ کی طرح آج بھی صرف محبت نظر آرہی تھی اور اس محبت میں مایا کے وجود کا ہی عکس تھا۔

”تم چاہے میری بات کا یقین مت کرو..... مگر مجھے یقین ہے۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب میں محبت سے بنے اپنے اور تمہارے اس رشتے کو اتنا مضبوط بنا دوں گا اور محبت میں بنے رشتوں پر تمہارا اعتماد بحال کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“ مایا کی آنکھوں میں سے سپاٹ تاثر غائب ہوا تھا۔ اس کی جگہ بے پروائی نے لے لی تھی۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی تھی مگر عالیان اس کا ہاتھ تھامے جانے محبت کی کن خوش نما وادیوں کی سیر کروا رہا تھا۔ وہ تو بس خاموشی سے سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر یقین کی روشنی کو دیکھے جارہی تھی۔

نور دیا ردل اصل میں محبت ہی ہے، محبت دل کا نور ہے اور اب یہ وقت ہی بتاتا کہ عالیان اپنے اس یقین کو کس طرح ثابت کرتا ہے۔

☆☆☆

حشام حسن نے فون کر کے مارہ کو مایا کے لندن جانے کے سلسلے میں صاف انکار کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور تب مارہ نے مایا کی شادی میں پاکستان آ کر اسے ڈھیروں دعاؤں کی چھاؤں میں اور ڈھیروں تحائف کے ساتھ عالیان کی ہمراہی میں رخصت کیا تھا۔ اس یقین اور امید کے ساتھ کہ ایک دن مایا کا اپنے ان کھوئے ہوئے رشتوں پر اعتماد بھی بحال ہو جائے گا۔

ذویا اور زین سے زیادہ آج حشام حسن خوش تھے۔ انہوں نے بہت بڑی ذمے داری ادا کر دی تھی۔ اور پھر سب نے مایا کی دانگی خوشیوں کی دعا کے ساتھ اسے رخصت کیا تھا۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے فریش پھولوں سے ڈیکوریٹ کیے گئے ماسٹر بیڈروم کے لکڑی بیڈ پر بیڈ کراؤن کے ساتھ رکھے گاؤٹیکے سے ٹیک لگائے ایزی ہو کر بیٹھی تھی اور اس شخص کی آمد کی منتظر تھی جسے بابا نے اس کے لیے زندگی بھر کا ساتھی چنا تھا۔ مگر آنے والے کا اب تک کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ وہ تھکنے لگی تھی جب بائیں جانب سے کسی کے گھبر اور مانوس لہجے نے مایا کو چونک کر اسی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”محبت ایک سمت میں سفر کرنے کا نام ہے، ایک جگہ ٹھہر جانا، ایک جگہ پڑاؤ ڈال لینا۔ صرف ایک کو دیکھنا، صرف ایک ہی کو سوچنا..... محبت صرف واحد اور یکتا ہی ہوتی ہے۔ محبت کبھی اپنی سمت نہیں بدلتی۔ اگر محبت ہو تو..... اگر محبت کی سمت بدل جائے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔ اور میں محبت میں سمت بدلنے والوں میں سے نہیں ہوں مایا.....“ یہ الفاظ اور یہ سوچ مایا کو حیرانی ہوئی تھی۔ بھلا کوئی دوسرا شخص مایا کی طرح ہی محبت کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ مایا حیرت و تعجب سے عالیان کی طرف دیکھ رہی تھی جو بیڈ کی بائیں جانب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

نکاح کے وقت وہ اپنی سوچوں میں اس حد تک نکل گئی تھی کہ اسے عالیان کے نام تک کی گردان کا احساس بھی نہیں ہوا۔ مگر محبت کے بارے میں جس سوچ کو لفظوں کا اظہار عالیان نے دیا تھا وہ تو اس کی اپنی سوچ تھی۔ پھر عالیان نے کیسے اس کی سوچوں تک رسائی پائی تھی۔ وہ حیرت و تعجب کی کیفیت میں گہری اسی کی طرف دیکھے جارہی تھی۔

”تو کیا عالیان کی محبت میں اتنی طاقت اور صداقت تھی کہ اس نے اسے پا کر اپنا آپ منوالیا تھا؟“

منی ناول
چھٹا اور آخری حصہ



زندگی خاک نہ تھی

شیریں حیدر



کھڑی ہوں، اس کے بارے میں میں نے کبھی خواب
میں بھی نہ سوچا تھا..... کم از کم اس وقت تو ہرگز نہیں سوچا
ہوگا جب میں کم سن اور حسین تھی، اپنے چہرے کی
خوب صورتی اور اپنی ذہانت کو اپنا بہترین سرمایہ سمجھتی تھی

میرا نام حنا ہے..... اس وقت میں عمر کی
پانچویں دہائی کے وسطی سالوں میں ہوں، میری چار
بیٹیاں ہیں جو سب شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں
آباد ہیں۔ آج میں زندگی میں فیصلے کے جس مقام پر



اور معصوم عمر میں بھی اسے برتنا جانتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ خوب صورت عورت عمر بھر مرد کے دل پر راج کرتی ہے..... میں نے اٹھارہ برس کی معصوم عمر میں اپنے حسن کا جادو اپنی سہیلی کے منگیتر کے سر چڑھ کر بولتا ہوا دیکھا، جسے دیکھ کر میرے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ کرن کی منگنی ٹوٹی اور میرا نام دانیال سے جڑ گیا۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمی ترین لڑکی سمجھنے لگی جو انیس برس کی عمر میں خوشیوں کے ہنڈولے میں سوار ہو گئی تھی۔

میں نے دانیال کو پالیا تو سمجھا کہ ہفت اقلیم کی دولت میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں خود کو اپنی ہم جماعتوں سے ممتاز سمجھنے لگی جو ابھی تک کالج جانے کے لیے جوتیاں چٹھا رہی تھیں۔ کیا مقصد ہوتا ہے اتنا پڑھنے کا بھلا؟ اچھی جگہ شادی ہو جانا بس! تو میں نے اپنا مقصد دوسروں سے بہت جلد پالیا تھا۔

زندگی میں پہلا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں اپنی پہلی بیٹی کی پیدائش کے وقت اسپتال میں تھی، میں نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا۔ دانیال اور میں دونوں ہی خوش تھے۔ بچی میرا پر تو تھی اور گلابی گل گوٹھنی سی بچی نرسوں کی خصوصی توجہ کی حقدار ٹھہری، جو نرس بھی ڈیوٹی پر آتی وہ خاص طور پر میری بیٹی کو دیکھنے آتی اور میں دانیال کی نظروں کے زاویے دیکھتی جو نرسوں کو تول رہے ہوتے۔ مجھے کرن کی بددعا یاد آئی کہ دانیال جس حسین چہرے کو دیکھے، اسی کی طرف لپکے۔ میں نے خود کو برا کہا کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں رہ کر ایک زندگی کو جنم دیا تھا، خود ابھی تک اسپتال میں پڑی تھی اور دانیال پر شک شروع کر دیا تھا مگر اس سوچ کے باوجود بھی میں خود کو دانیال کی نظروں پر پہرہ دینے سے نہ روک سکی۔

پھر یہ ہوا کہ دانیال مجھے خود بتاتے کہ فلاں پارٹی میں فلاں عورت نے انہیں غیر شادی شدہ سمجھا اور ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی، فلاں لڑکی نے فلاں حرکت کی، تو میں نے دانیال کو ایک معصوم مرد سمجھنا

شروع کر دیا کہ میں بھی تو اسے دیکھ کر پہلی نظر میں محبت کا شکار ہو گئی تھی..... ایک تو مردوں کو یہ فائدہ ہے کہ ان کی شخصیت اور جسم پر شادی یا بچوں کی پیدائش کوئی اثرات مرتب نہیں کرتی، ساری جسمانی و ذہنی تبدیلیاں اور مسائل عورتوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ میں ابھی پہلی بچی کی پیدائش کی کمزوری سے سنبھلی بھی نہ تھی کہ دوسرے بچے کی آمد کی خبر سن لی، میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، دانیال اور میں سر جوڑ کر بیٹھے مگر فیصلہ وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔ میں اب کی بار اماں کی طرف چلی گئی کہ ایک چند ماہ کی بچی اور دوسرے بچے کی آمد کو اکیلے نہیں سنبھال سکتی تھی، اماں کی مدد سے میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ دانیال تھے جو میری اماں کی بھی عزت کرتے تھے اور مجھ سے کافی چھوٹی بہن تانیہ کو اپنی بیٹی جیسا سمجھتے تھے۔ اماں میری اور میرے بچوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف ہوتیں اور تانیہ کو وقت نہ دے پاتیں تو دانیال اسے اپنی بیٹی کی طرح سنبھالتے بلکہ وہ دانیال سے اتنی مانوس ہو گئی کہ انہی کے پاس زیادہ وقت رہتی اور کبھی سو بھی جاتی۔ اماں کو اس رس رس کرتے رہنے والی بچی کے مسئلے سے بھی نجات مل گئی تھی جو پانچ چھ برس تک بھی اماں کی توجہ حاصل کرنے اور اپنا وجود اس گھر میں منوانے سے محروم رہی تھی۔ جانے اماں کو اس بیسپاری سے کیا بغض تھا، اس کی آمد کو وہ اپنے لیے شرمندگی سمجھتیں..... شاید وہ ان چاہی بچی تھی مگر میں سوچتی کہ یہ اُن چاہا بچہ ایک لڑکا ہوتا تو اماں کے انداز مختلف ہوتے۔ اسی لیے میں تانیہ سے شروع دن سے ہی پیار کرتی تھی۔ مجھے خود سے سالوں چھوٹی بہن ملی تھی جو بڑی ہو کر میرے لیے دکھ سکھ بانٹنے والی سہیلی بن جاتی.....

پھر بھائی کی شادی ہو گئی اور اس کے ہاں بچوں کی پیدائش کا سلسلہ چل پڑا تو میرے لیے اماں کی طرف جانا اور رہنا ممکن نہ رہا۔ بھابیوں کی آمد پر بیٹیوں کا میکے میں مان اسی طرح کم ہو جاتا ہے، سو بانی دو بیٹیوں کی پیدائش اپنے گھر پر رہ کر ہی ہوئی مگر بھلا ہو

والے کپڑوں کی تفصیل، کام کرنے والیوں کے مسائل، لان میں کون سے پودے لگنے ہیں اور سبزیوں والے حصے میں کون سی سبزیاں، خاندان میں کس موقع پر کس طرح لین دین کرنا ہوگا، بچیوں کی صحت کے مسائل اور تعلیم سے متعلق تمام فیصلے..... میں نے دانیال سے وضاحت کی کہ مجھ پر کیا کیا ذمے داریاں تھیں اور میں انہیں کس طرح نبھاتی ہوں۔

”اور مزید کیا چاہتے ہیں آپ دانیال؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یار مجھے تو وہی اسٹائلش سی، چست لڑکی چاہیے جس پر میں پہلی نظر میں مر مٹا تھا، جسے صرف اپنا خیال رکھنا آتا تھا، جس کے انداز دوسروں سے جدا تھے.....“

”لڑکی سے عورت اور عورت سے ماں بننے کا سفر کر کے کوئی عورت ماضی کی بے پروا لڑکی نہیں بن سکتی دانیال! مجھ پر گھر کی، آپ کی اور بچیوں کی ذمے داریاں ہیں اور ان کو پس پشت ڈال کر میں بے پروا سی لڑکی نہیں بن سکتی۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تمہیں بے پروا ہونے کو کس نے کہا ہے..... میں نے اسٹائلش کہا ہے حنا!“ دانیال نے چڑ کر کہا۔

”مجھے جیسے لوگوں کی بیویاں گھرداری کو جانتی تک نہیں، اگر جانتی بھی ہیں تو ان کاموں میں نہیں الجھتیں جن کے لیے ملازم گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔ تم چاہو تو کوئی سیکرٹری نما بندی رکھ لو جو گھر کے معاملات کو سنبھال سکے اور تم وہ کام کرو جیسے بڑے آدمیوں کی بیویاں کرتی ہیں..... کوئی ادارہ چلاؤ، کوئی چیریٹی..... تقریبات میں فیتے کاٹو، ساڑیاں باندھ کر تقریبات کی جان نظر آؤ، سماجی شخصیت بنو، کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرو جس سے تمہاری لوگوں سے جان پہچان ہو، نت نئے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو، اخبارات میں تمہاری کوریج ہو.....“

”مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے دانیال، میں اپنی ہستی میں خوش ہوں اور میرا گھر میری جنت ہے۔“

تانیہ کا جواب بڑی ہو گئی تھی اور دانیال اسے جا کر لے آتے، اماں کو بھی اسے میری طرف بھجوانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، تانیہ نے میری سب بیٹیوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا، اسے اللہ نے کوئی اولاد نہ دی اس لیے مجھے اس کے بچوں سے پیار کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

میں بچوں کی مصروفیات میں ایسی الجھی کہ دانیال کی طرف سے غافل ہوتی گئی۔ یہ ہر عورت کے لیے بالکل نارمل ہے اور میرے ساتھ کچھ انوکھا نہ ہو رہا تھا۔ میں ہر بچے کی پیدائش کے بعد خود کو نئے سرے سے فٹ کرنے کی کوشش کرتی تو علم ہوتا کہ اگلے بچے کی آمد کی نوید ہے..... چار بیٹیوں کی پیدائش کو کافی جان کر ہم نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ اب ہمیں مزید بچے نہیں چاہئیں۔ دانیال میرے ساتھ اچھے تھے اور بیٹیوں میں تو ان کی جان تھی۔ کبھی انہوں نے مجھے بیٹا پیدا نہ کرنے کا طعنہ نہ دیا۔ میں اول روز کی طرح دانیال سے محبت کرتی رہی اور یہی سمجھتی رہی کہ میرے بعد ان کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آ سکتی، جس کو بھی دانیال کے ساتھ جتلا پایا..... میں اسی کو غلط سمجھتی رہی۔ مجھ سے ذرا سا بھی رشتہ یا تعلق رکھنے والی جو لڑکی یا عورت مجھے دانیال کے ساتھ مشکوک تعلق سے بندھی نظر آتی، میں اسے اپنی زندگی سے ہی نکال باہر کر دیتی مگر..... یہی میری بھول تھی، وہ سب صرف میری زندگی سے نکلیں پر دانیال کی زندگی میں وہ جوں کی توں رہیں..... میں انہیں غلط سمجھتی رہی اور جو غلط تھا اس کے ساتھ میں پھر بھی زندگی کی گاڑی کو کھینچتی رہی۔

☆☆☆

”تم نے خود کو بہت ڈل کر لیا ہے حنا.....“ دانیال نے ایک دن مجھ سے کہا۔

میں سمجھی نہیں تھی کہ وہ مجھے ڈل کیوں کہہ رہے تھے۔ میں تو ہمہ وقت کام میں مصروف رہتی، دانیال، بچیاں اور گھر، میں کسی طرف سے غافل نہ تھی، گھر میں کچنا کیا ہے، سودا سلف کیا آئے گا، دھوبی کو بھیجے جانے

”کم آن ڈارلنگ، تم نے تو میری تیلی جیسی حنا کو قتل ہی کر دیا ہے۔“ دانیال کے لہجے میں ناراضی تھی۔
بعد میں میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کیا دانیال اس لیے دائیں بائیں منہ مارتے تھے کہ میں نے خود کو نظر انداز کر دیا تھا، یا مجھ سے شادی کرتے وقت ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ میں ہمیشہ ویسی ہی کم سن رہوں گی۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ساری بچیاں اسکول جاتی ہیں تو میں بھی اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈوں، میرا ذہن بھی بٹے گا اور دانیال کو بھی لگے گا کہ ان کی بیوی میں کوئی مثبت تبدیلی آ رہی ہے۔ دانیال سے میں نے کہا کہ میں بوتیک کا کام شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور اس کے لیے ابھی بات میں نے پوری بھی نہ کی تھی کہ دانیال کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور انہوں نے کہا کہ وہ فوراً میری ضرورت سے بہت زیادہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیں گے.....

”پیسے کی پروا نہ کرو حنا، چاہے تمہیں لاکھوں کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑ جائے، بس میں چاہتا ہوں کہ اچھی سی سویرے، سویرے اٹھ کر تیار ہو کر گھر سے نکلو، کام پر جاؤ، اپنے ہنر کو آزمادو، کسی بھی فیلڈ میں.....“
میں مسکرا دی، اتنے میں ہی دل خوش ہو گیا کہ دانیال میرے لیے کتنا اچھا سوچتے تھے۔

☆☆☆

میں نے شوقیہ بوتیک کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے دو درزی، دو کڑھائی کا کام کرنے والے، ایک ماسٹر صاحب کو بھرتی کیا تھا۔ گھر میں پچھلے حصے میں ملازمین کے کوارٹرز تھے، وہیں پر دانیال نے فوری طور پر اوپر میچے چار کمروں کی تعمیر شروع کر وادی تھی کیونکہ میں کام کرنے پر تو تیار تھی مگر گھر چھوڑنے پر نہیں۔

اس سارے کام کی نگرانی کے لیے میں نے انڈویو کے ذریعے ایک چُست سی لڑکی کا انتخاب کیا۔ اس کا

نام تھا ”توجہ“ جو کافی مختلف تھا اور دوسرے اسے اس کام کا تجربہ بھی تھا۔ وہ سب کی نگرانی کرتی، گاہکوں سے کام لیتی، ڈیزائننگ کرتی اور اس کے بعد مجھ سے منظوری کروا کر کام شروع کرواتی۔ کام کے معاملے میں توجہ ایک ماہر لڑکی تھی، میں اس پر پورا اعتماد کرتی تھی کیونکہ کام اچھا چل رہا تھا۔ کام کے علاوہ میں اس کا خیال اپنی بیٹیوں کی طرح ہی کرتی تھی۔ جب وہ فارغ ہوتی تو وہ گھر کے اندر آ جاتی، کبھی کھانے کا وقت ہوتا یا چائے کا تو ہم اسے اپنے ساتھ شامل کر لیتے..... مجھے اس کام میں مزہ آنے لگا اور میں سوچتی کہ عمر کا کتنا حصہ میں نے سیکارہ کر گزار دیا تھا۔ دانیال شام کو یا ببا اوقات رات کو دیر سے بھی گھر آتے تھے اس لیے مجھے توجہ پر کسی قسم کی پابندی لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یوں بھی رات کو نو بجے وہ اپنے گھر چلی جاتی تھی، ڈرائیور اسے نزدیکی اسٹاپ سے ویکن پر سوار کرواتا تھا۔

اس روز میں اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس معمول کے معائنے کے لیے گئی تو میں نے توجہ کو وہاں دیکھا، میں حیرت زدہ رہ گئی کہ میرے پاس چند ہزار کی ملازمت کرنے والی ملازمہ کیونکر ڈاکٹر یا سمین کے پاس جانے کی سکت رکھتی ہے..... اس نے غالباً مجھے نہیں دیکھا کیونکہ وہ ڈاکٹر یا سمین کی اوٹ میں تھی..... اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ پوچھتی ڈاکٹر اسے معائنے کے لیے پردے کے عقب میں لے گئیں۔

”تو پھر آپ نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ آپ کو یہ بچہ نہیں چاہیے؟“ ڈاکٹر یا سمین نے سوال کیا تھا۔
”جی جی.....“ اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“ ڈاکٹر یا سمین نے سوال کیا تھا۔

”چھ ماہ!“ اس کا جواب ہونے لگا۔
”شادی کے تین چار ماہ کے بعد امید سے ہو جانا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں..... اچھا ہے کہ ایک

ہے اور اس کا بچہ..... میرا مطلب ہے کہ یہ اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔“ میں ڈاکٹر کی بات سن کر خاموش رہی، تبھی توجہ بھی باہر نکل آئی تھی۔ میری آواز تو وہ سن ہی چکی تھی اور ڈاکٹر کے الفاظ بھی اس لیے اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

”کس کا بچہ ہے یہ توجہ؟“ میں نے کنویں کی گہرائی میں گر کر اس سے سوال کیا تھا، جواب میں اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”کیا یہ لڑکی شادی شدہ نہیں ہے؟“ ڈاکٹر یاسمین نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”نہ یہ شادی شدہ ہے اور نہ ہی میری رشتے دار..... یہ میرے بوتیک پر ملازمہ ہے۔“ میں نے انکشاف کیا تھا۔

”تو کیا اسے آپ نے نہیں بھیجا تھا میرے پاس؟“

”ہرگز نہیں.....“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اشو بی بی جاؤ یہاں سے.....“ ڈاکٹر یاسمین نے غصے سے اس سے کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ”مگر دانیال صاحب نے جھوٹ کیوں بولا اور وہ اس کو کیوں ساتھ لے کر آئے؟“

”مرد کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس یا شریک حیات کے ساتھ جاتا ہے ڈاکٹر یاسمین یا شریک جرم کے ساتھ!“ اتنا کہہ کر میں ڈاکٹر یاسمین کے چہرے پر ہر سوال کو بے جواب چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

چند دن کے بعد وہ آئی تو روڈرو کر اپنی معصومیت کی کہانی سنانے لگی مگر مجھے اب کسی کے آنسو متاثر نہیں کرتے تھے..... میں نے اسے نکال دیا، اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے اور میں سمجھی کہ اس طرح شاید وہ دانیال کی زندگی سے بھی نکل گئی ہوگی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ دانیال اس کے بعد بھی اسے کہیں نہ کہیں ملتے رہے ہوں گے، مجھے تو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ وہ اس سے پہلے

بچے کے بعد آپ لوگ وقفہ دے لیتا۔“

”نہیں ہم پہلا بچہ ہی ابھی نہیں چاہتے۔“ اس نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

”کوئی خاص وجہ اس کی؟“ ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ”سسرال کی طرف سے کوئی پریشر ہے کیا؟“

”نہیں..... میرے شوہر ہی نہیں چاہتے۔“ اس نے اپنا جواب مکمل کیا تو میں حیران ہو گئی تھی، میں نے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی پوچھا ہی نہ تھا۔ یہ تک نہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کب ہو گئی تھی، جب میں نے اسے کام پر رکھتے ہوئے انٹرویو کیا تھا۔ اس وقت تو وہ غیر شادی شدہ تھی۔

”شوہر کہاں ہیں آپ کے؟“ ڈاکٹر نے اس سے سوال کیا تھا۔

”جی وہ بھی ساتھ ہی آئے تھے مگر انہیں کہیں کام سے جانا تھا اس لیے وہ جلدی میں تھے، واپسی پر وہی مجھے لینے آئیں گے۔“

”اگرچہ میں ایسے کاموں میں ہرگز نہیں پڑتی مگر جس حوالے سے آپ آئی ہیں، میں انہیں نہ نہیں کر سکتی، اب وہ خود بھی باہر آئی بیٹھی ہیں۔“ ڈاکٹر یاسمین کہہ رہی تھیں اور میں حیرت سے ان کی بات کا مطلب جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے حوالے سے؟ ان کے کمرے میں تو میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

”کیسی ہیں آپ مسز دانیال؟“ ڈاکٹر نے باہر نکل کر پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں.....“ میں نے کمزوری آواز میں کہا تھا۔ میں ان کی بات کا مطلب پوچھنا چاہ رہی تھی۔

”آپ کو خود آنا تھا تو پھر دانیال صاحب کو کیوں زحمت دی آپ نے؟“ اس نے سوال کیا۔

”کس بات کی زحمت؟“ میں کچھ نہ سمجھی تھی۔

”ارے بھئی وہی تو اس لڑکی کو لے کر آئے ہیں..... ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر نکلے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ آپ کی دور پار کی رشتے دار

کہاں ملتے تھے۔

☆☆☆

میں نے جان لیا کہ دانیال کے اندر ایک ایسا حریص جانور ہے جو دنیا کی ہر عورت کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ وہ عورتیں رشتوں کی پہچان بھول جاتی ہیں، دوستیوں کے تعلق ہوں یا احسان کرنے والی ہستیاں..... جب انہیں اپنی ہوس پوری کرنا ہوتی ہے تو باقی سب پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ کوئی پیسے کے لیے مائل ہوتی ہے، کوئی اپنے پیاروں کو دھوکا دیتی ہے، کسی کی حریص فطرت کو دوسری جگہ منہ مارے بغیر قرار نہیں آتا۔ ہاں اپنے شوہروں اور بیویوں کو دھوکا دینے والے..... ایک جیسی فطرت کے لوگ ایک دوسرے کو ڈھونڈ ہی لیتے ہیں، جانے کیوں دنیا کی ہر ”ضرورت مند“ عورت کا پالا دانیال سے پڑ جاتا تھا۔

میں عمر بھر اس کام میں مصروف رہی کہ جو عورت دانیال کے منہ کو لگ جائے اسے اپنی زندگی سے نکال دوں۔ کئی بار میں نے دانیال کا سامنا کیا، انہیں بتایا کہ میں ان کے سارے ”کارنامے“ جانتی ہوں۔ انہیں جوان بچیوں کے وجود سے بھی ڈرایا، کہ کبھی کوئی بیٹی ان کے کردار کے بارے میں جان لے گی تو ان کے لیے ان پیار کرنے والی بیٹیوں کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ شاید یہی میری غلطی تھی کہ جو کام وہ چھپ چھپ کر کرتے تھے اب انہیں چھپانے کی ضرورت نہ رہی تھی، کئی بار وہ مجھے خود ہی بتا دیتے کہ وہ فلاں عورت کے ساتھ تھے..... ”کیا کروں، اس کا شوہر گھر پر نہیں تھا اور وہ اکیلی پریشان ہو رہی تھی۔“ وہ بولے سے وہ ایسی فضول بات کہہ دیتے جس پر میں عموماً یقین نہ کرتی تھی، میں سمجھتی کہ وہ طنز سے ایسا کہہ رہے ہیں..... جب تک انہیں پکڑے جانے کا خوف تھا وہ کسی حد میں تھے مگر اب کھل کر کھلتے تھے۔

پہلی بار جب رانیہ نے مجھے وضاحت سے بتایا کہ اس نے پایا اور آنٹی راحیلہ کو ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں کس حالت میں دیکھا تھا تو میں نے

دانیال سے پہلے راحیلہ کا سامنا کیا تھا۔
”کوئی شرم و حیا نہ آئی تمہیں، اپنے سادہ سے شوہر کو دھوکا دیتے ہوئے، بے غیرت عورت!“
”مجھے کیا کہہ رہی ہو..... اپنے شوہر سے بات کرو جو جگہ جگہ منہ مارتا پھرتا ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

”وہ کیا تمہیں تمہارے گھر سے جا کر لایا تھا؟“
میں نے غصے سے پوچھا۔ ”میری غیر موجودگی میں تم میرے گھر پر آئیں کیوں؟“
”اس نے فون کر کے اس روز بلایا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس نے کندھے اچکا کر کہا۔
”تو تم کیا ڈاکٹر ہو جو تمہیں کال کر کے بلایا جاتا اور تم بھاگی بھاگی چلی آتیں؟“

”مجھ پر چیخنے کی ضرورت نہیں حنا جان!“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا جسے میں نے غصے سے جھٹک دیا۔ ”اس دنیا میں سب اسی طرح چلتا ہے، دوستوں میں چھوٹی موٹی خوشیاں شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں..... میری دانیال سے دوستی ہے تو تم ثقلین سے دوستی کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا! تم کچھ زیادہ ہی شدید رد عمل کا اظہار کر رہی ہو۔“

”ڈوب مرنے کا مقام ہے تمہارے لیے راحیلہ..... اس کے بعد میں زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور نہ ہی تم کبھی پلٹ کر دانیال سے رابطہ کرنا۔“ مجھے اس کی بات سن کر اس قدر گھن آئی کہ میں کرسی کو ٹھوکر مار کر اس ریسٹوران سے نکل آئی۔ بعد ازاں مجھے دانیال سے علم ہوا کہ راحیلہ کے ہاں بیٹی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے دانیال سے پوچھا کہ ان کا اس سے کہاں رابطہ ہوا، انہوں نے بہانہ تو اس کے شوہر ثقلین سے ملاقات کا کیا مگر میرے دل میں پھانس سی چبھ گئی کہ یقیناً ان کا رابطہ راحیلہ سے قائم تھا۔

”ثقلین بھائی بیٹی کی مبارک ہو آپ کو۔“ میں نے اپنا شک رفع کرنے کو انہیں کال کی تھی۔
”بہت شکریہ بہن کہ آپ کو چھ ماہ کے بعد

دل ہی دل میں خود سے شرمندہ تھی کہ ان پر ایسی نوبت میری تفتیش کی وجہ سے آئی تھی۔

☆☆☆

پائل نام کی چست سی ملازمہ جو گھر پر صفائی کے کام پر مامور تھی، اپنا کام اتنی صفائی اور قرینے سے کرتی کہ مجھے اس نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ کام کار سے فارغ ہو کر وہ بچیوں کے ساتھ بیٹھ جاتی اور ان کی کتابوں میں سے تصاویر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی، غالباً اس نے کبھی اسکول کی شکل دیکھی ہوگی جو وہ ان کی اردو کی کتابوں میں سے کوئی لفظ پہچان لیتی تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔

میں نے بچیوں سے کہا کہ اگر اسے شوق ہے تو اسے کچھ نہ کچھ پڑھا دیا کریں۔ اس مقصد کے لیے میں نے اردو کی ابتدائی کتب اور کتابیں وغیرہ بھی اسے لا کر دی تھیں۔ بچوں کے اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں تو ہم سہیلیوں نے مل کر ایک فلاحی ادارے کی بنیاد ڈالی اور غریب بچوں کے لیے تعلیم کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ کا شکر تھا کہ میری بیٹیاں اب خود کو سنبھال لیتی تھیں اور بتا کہ اپنا اسکول کا کام بھی کر لیتی تھیں۔ میں صبح سویرے نکل جاتی، اس کے بعد دانیال بھی ناشتا کر کے کام پر نکل جاتے تھے۔ پائل کے وہاں رہنے سے مجھے تسلی تھی کہ بچیاں گھر پر اگلی نہیں ہوتی تھیں، میرے گھر لوٹنے تک وہ وہیں رہتی تھی۔

”مما..... آپ پائل کو نکال دیں۔“ نیلم نے مجھ سے کہا تو میں اس کا منہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

”کیوں بیٹا..... وہ تو اچھی ہے اور کام بھی اتنا اچھا کرتی ہے..... میں اور پاپا گھر پر نہیں ہوتے تو وہ آپ لوگوں کے پاس ہوتی ہے جس سے مجھے تسلی رہتی ہے۔“ میں نے اسے اسے ساتھ لگا کر کہا۔

”مگر مجھے وہ اچھی نہیں لگتی۔“ اس نے منہ بسورا۔ ”وہ بہت گندی ہے.....“

”مگر کیوں بیٹا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”کیا کیا اس نے جو وہ آپ کو گندی لگتی ہے؟“

سارک باد کا خیال آ گیا۔ ”انہوں نے کہا تو میں حیران رہ گئی۔“

”سو سوری..... مگر ہمیں تو علم ہی اب ہوا ہے، آپ نے دانیال کو بتایا ہی اب ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے دانیال کو بتایا ہے؟“ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”میں نے دانیال کو کیسے بتانا ہے، میری تو اس سے جانے کب ملاقات ہوئی تھی، ہاں مجھے راحیلہ بتاتی رہتی ہے کہ اس کی ملاقات تم لوگوں سے ہوتی رہتی ہے۔“ سو میرا اندیشہ درست تھا۔

”راحیلہ آپ کو آدھا سچ بتاتی ہے ثقلین بھائی۔“ میری بھی اس سے ملاقات عرصہ ہوا نہیں ہوئی۔

”کیا بات ہے، کس وجہ سے آپ دونوں سہیلیاں اب آپس میں نہیں ملتیں؟ اگر نہیں ملتیں تو راحیلہ مجھ سے جھوٹ کیوں کہتی ہے؟“

”وہ مجھ سے تو نہیں البتہ دانیال سے ملتی رہتی ہے..... ابھی تک مل رہی ہے حالانکہ جب میں نے ان کے آپس میں غلط تعلقات کے بارے میں جان کر

اسے اپنی زندگی سے نکالا تھا تو میں سمجھی تھی کہ اسے عقل آگئی ہوگی مگر بے حیا لوگوں کو عقل کم ہی آتی ہے.....

ویسے آپ ڈی این اے ٹسٹ کروا کر اپنی بیٹی کی ولدیت ضرور چیک کر لیجئے گا، آپ کے لیے اچھا ہو گا۔“ میں نے غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ اگر ابھی

تک راحیلہ نے اپنی روش نہیں بدلی تھی تو اس کے شوہر کو ایک دھوکے باز عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کی سزا

سے تو آزاد کر دیا تھا میں نے۔ اس دن کے بعد مجھے یقین ہے کہ راحیلہ نہ دانیال کی زندگی میں رہی ہوگی نہ

ثقلین بھائی کی۔

”آپ اب بھی راحیلہ سے ملتے رہتے ہیں نا؟“ میں نے دانیال سے پوچھا تھا۔

”مجھے معاف کر دو حنا..... اب میں آج کے بعد وعدہ کرتا ہوں کہ اس سے نہیں ملوں گا۔“ انہوں نے

دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگی، میں نے تو اس شخص کو خود سے بڑھ کر چاہا تھا، معاف کیسے نہ کرتی، الٹا

www.pdfbooksfree.pk

”وہ جب پاپا کی اسٹڈی کو صاف کر کے نکلتی ہے تو میں غور کرتی ہوں ماما کہ اس کے گریبان میں سے لال نوٹ جھانک رہے ہوتے ہیں۔“ اس نے الجھے سے لہجہ میں کہا۔

”اچھا میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ آئندہ سے اسٹڈی میں اپنے پیسے نہ چھوڑ کر جایا کریں..... ہم کسی کو موقع دیتے ہیں تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ناں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کہ جب وہ پاپا کی اسٹڈی کو صاف کرنے جائے تو آپ بہنوں میں سے کوئی اس کے ساتھ وہاں رہے.....“

”مگر اس کے اسٹڈی میں جاتے ہی پاپا دروازہ اندر سے بند کر لیتے ہیں ماما.....“ اس نے لرزتی ہوئے آواز میں کہا۔ ”اور میں نے ایک دفعہ اندر جھانک کر بھی دیکھا تھا ماما.....“ اس کا چھوٹا سا وجود لرز رہا تھا، میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ”پاپا نے.....“ اس نے مزید وضاحت کی۔ ”اور پھر پاپا نے اسے خود پیسے دیے تھے ماما!“

دانیال کا معیار اس قدر گر گیا تھا۔ میری ٹاک کے نیچے، گھر میں بچپن کی حدود نہ نکلتی ہوئی چار بچیوں کی موجودگی میں وہ اپنے گھٹیا رازوں کے افشا ہو جانے کے خوف سے بھی بے نیاز تھے اور میں کیسی بے فکر تھی کہ بچیاں محفوظ ہیں، کبھی سوچ بھی نہ آئی کہ کیا اور غیر محفوظ ہو سکتا تھا۔

میں نے دانیال کو نیلم کے روبرو بٹھانے کا سوچا مگر بیٹی اور باپ کے بیچ عزت اور احترام ختم نہ ہو..... سوچ کر خاموش رہی اور پائل کو ملازمت سے فارغ کرنے کے لیے میں نے اگلے دن کا بھی انتظار نہ کیا۔ اپنی زندگی کے ایک اور غلط باب کے اوراق کو اپنے ہاتھوں سے پھاڑ کر میں پھر فکر سے آزاد ہو گئی کہ شاید اس کے بعد اس دنیا میں کوئی اور عورت ایسی نہیں رہی جس کے ساتھ دانیال کا تعلق قائم ہو سکتا ہے۔

دوسروں کے بچوں کو تعلیم دینے کا ارادہ ختم کیا اور میں نے گھر پر رہنے کا عزم کیا، چاہے اب دانیال

کچھ بھی کہیں، میں ان کی باتوں میں نہیں آنے والی۔ ”ارے حنا، تم اب تک گھر پر ہو؟“ دانیال تیار ہو کر کافی دیر اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر غالباً پائل کا انتظار کرتے رہے تھے اور اس کے نہ آنے پر نیچے اترے تو مجھے اس ”بے وقت“ گھر پر بیٹھے دیکھ کر بولے تھے۔

”جی!“ میں نے یہ شکل تھوک نکل کر کہا۔ ”اچھا وہ پائل کہاں ہے.....؟“ انہوں نے بے پروائی سے پوچھا، میرے تو سر سے لگی اور تلوؤں پر بجھی۔ ”کیا کام ہے آپ کو پائل سے؟“

”میرے اسٹڈی روم کی صفائی کرنا تھی اسے.....“ انہوں نے بے نیازی سے ناشتے کا آغاز کیا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ وہ میری غیر موجودگی میں صفائی کرے اور میرا کوئی کاغذ ادھر سے ادھر ہو۔“

”اب پائل نہیں آئے گی دانیال!“ میں نے دانت پیس کر کہا، بچیاں ابھی تک اپنے کمروں میں تھیں، میں نے خود ہی انہیں ان کے کمروں کی صفائی کا کام دیا تھا۔ ”آپ اپنی اسٹڈی روم کی صفائی مجھ سے ہی کروالیا کریں، اور ہاں اس کے لیے آپ کو لال نوٹ بھی نہیں دینے پڑیں گے۔“

دانیال کے حلق میں نوالہ پھنس گیا..... انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا، کھانسی کھانسی کر اور پانی پی پی کر ان کی حالت سنبھلی۔ ”اس بات کا کیا مطلب ہے؟“

”اس بات کا مطلب آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں دانیال!“ میں نے غصے سے کہا۔ ”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں کتنی ہی تو جاہیں اور کتنی ہی پائلیں اپنے گھر سے نکال کر باہر پھینک دوں، اپنی کتنی ہی سہیلیوں کو دھتکار دوں مگر آپ کے منہ کو لگا ہوا نشہ..... کہیں نہ کہیں۔ بلکہ ہر جگہ مل جاتا ہے، آپ کا معیار کس قدر گر گیا ہے دانیال، شرم بھی نہیں آتی آپ کو اس طرح کی حرکتیں کرتے ہوئے، اس گھر میں، اسی چھت کے نیچے، بچیاں آپ کی چوریاں پکڑتی ہیں اور مجھے بتاتی ہیں، آپ کی حرکتوں نے انہیں وقت سے بہت پہلے سمجھا کر دیا ہے، خدا کے لیے کچھ حیا کریں، بند کر دیں اپنی یہ

دانیال نے تو اس "لفٹکے" کو پھوٹی کوڑی بھی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا بھی تو خود فاطش نے کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"عورت کے پاس اپنی ذات کا بھرم ہی تو ہوتا ہے مگر جو اسے گھر والوں سے ٹکر لینے پر آمادہ کر دیتا ہے..... میں نے آپ لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس سے اس لیے شادی کی کہ مجھے اس کی محبت سچی لگی تھی، مگر جلد ہی اس کے چہرے سے نقاب اتر گئی..... میں جان گئی ہوں کہ میری ذات بے وقعت ہے، اس کی نظر ستاروں پر تھی جن پر وہ میری مدد سے ہی کمند ڈال سکتا تھا۔ میں اس کے کسی مطالبے کو ماننے پر تیار نہیں تھا کیونکہ اس کے یہ مطالبات آخری ثابت نہیں ہوں گے، ایک مطالبے کی منظوری اس کے اور آپ کے درمیان کا حجاب ختم کر دے گی اور وہ آئے روز کوئی نہ کوئی اور مطالبہ لے کر آ جائے گا..... میں نے اسے جاننے اور سمجھنے میں غلطی کی مگر تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عمر بھر اس کی سزا بھگتتے رہیں۔" فاطش نے واضح الفاظ میں کہا تو میری تجویز رد ہو گئی اور یوں ایک گھر ٹوٹ گیا، ایک خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسود جیسا پیارا بچہ اپنی شناخت کا حوالہ کھو بیٹھا، میرا دل تو اسی میں اٹک گیا، میں اسود کے ساتھ مصروف ہو گئی اور دانیال سے دور ہوتی چلی گئی۔

دانیال میرے پاس ہوتے بھی تو مجھے لگتا کہ وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھ سے ان کا تعلق اتنا پھیکا اور سرد سا ہو گیا کہ مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں اگر اپنے ساتھ کچھ یہ سوچ کر کرتی تھی کہ یہ دانیال کو اچھا لگتا ہے تو مجھے اس کی پروا ختم ہو گئی..... مجھے صاف لگتا تھا کہ دانیال کے پاس میرے لیے جو کچھ ہے وہ فقط بچا کچھا ہے، دوسری عورتوں کے پاس جانے والے مرد کے اطوار ہی اور ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان سے گھن آنے لگی۔

☆☆☆

میں تین بیٹیوں کی شادیوں کے بعد صدف کے بارے میں بالکل بے فکر تھی کہ اس کا رشتہ دانیال کی بہن

غلیظ حرکتیں، اگر آپ کو بہت زیادہ مسئلہ ہے تو تین اور شادیاں کر لیں مگر بے حیائی کا یہ سلسلہ بند کر دیں اب۔" میں نے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ میں بچیوں اور ان کے مسائل میں الجھتی چلی گئی، دانیال نے اپنے کاروبار کی جڑیں کئی دوسرے شہروں میں پھیلا لیں اور اس سلسلے میں وہ کبھی کہیں اور کبھی کہیں ہوتے، بچیوں کی تعلیم کے بعد ان کے رشتے طے کرنے کے مراحل میں بھی میں خود کو تنہا ہی پاتی تھی، دانیال کی طرف سے مجھے مکمل مالی تعاون تو حاصل تھا مگر اس سے زیادہ سے وہ ہمیشہ معذوری کا اظہار کر دیتے کہ انہیں عورتوں کے ان معاملات کا علم نہیں۔ بات جب کسی حتمی مرحلے میں پہنچتی تو اس وقت دانیال لڑکے اور اس کے والدین سے ملنے پر تیار ہوتے، رانیہ، نیلم اور فاطش کی شادیاں باہر طے ہوئیں، سارے معاملات مجھے ہی نمٹانا پڑے..... ہاں فاطش کی شادی کے معاملے میں دانیال نے مخالفت کی، وہ بھی اس لیے کہ انہیں کسی حوالے سے لڑکے کے مشکوک کردار کے بارے میں سن گن مل گئی تھی، جسے فاطش نے بری طرح رد کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر اس کی شادی اشعر سے نہ ہوئی تو وہ کسی اور سے بھی نہیں کرے گی۔

میں نے دانیال کو کافی سمجھایا مگر انہوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی، تب فاطش نے خود اکیلے میں دانیال سے بات کی اور جانے کس طرح بات کی کہ وہ مان گئے، دل سے انہیں یہ رشتہ پسند نہ تھا نہ ہی مجھے مگر جہاں جوان خون سرکشی پر اتر آئے وہاں ہار ماننا پڑتی ہے۔ وقت نے جلد ہی فاطش کے فیصلے کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ میں اب کئی بار سوچتی ہوں کہ ہم نے دل سے اس شادی کو قبول ہی نہ کیا تھا اس لیے ہم نے اس شادی کو ٹوٹنے سے بچانے کی کوئی کوشش بھی نہ کی..... کیا تھا کہ اگر اشعر لالچی تھا، جائیداد چاہتا تھا یا رقم تو ہم اسے دے دیتے، علیحدہ گھر یا اپارٹمنٹ لے دیتے..... ہمارے بعد بھی تو یہ سب کچھ انہی بیٹیوں کا ہی تھا۔

نے بہت پہلے مانگ لیا تھا۔ ان کا بیٹا احمد ہمارا داماد بننے والا تھا، بہت پیارا اور سمجھ دار بچہ..... کہ میں صدف کے نصیب پر نازاں تھی۔ صدف میری بہت پیاری بیٹی، مجھے اس سے جتنا زیادہ پیار تھا وہ اتنا ہی دانیال سے قریب تھی، اس کا دلی لگاؤ باپ کی طرف زیادہ تھا۔ کبھی جو بچیوں کے ساتھ مل کر کسی کھیل یا مقابلے میں گروپ بندی ہوتی تو تینوں بڑی میرے ساتھ اور وہ تنہا دانیال کے ساتھ ہوتی مگر ہم پھر بھی انہیں جتا کر خود ہار مان لیتے۔ مجھے صدف کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عجیب سا دکھ ہوتا تھا، مجھے یقین تھا کہ احمد اسے خوش رکھے گا۔

احمد ایک بار میرے پاس عجیب سی درخواست لے کر آیا تھا کہ اسے مجھ سے تنہائی میں ملنا تھا مگر میں نے تو یہی جانا کہ تنہائی میں دو مرد وزن کے بیچ تیسرا شیطان ہوتا ہے، چاہے وہ میرے بیٹے کی عمر کا تھا مگر پھر بھی ملازمین کے منہ کون بند کر سکتا ہے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ میں نے اسے صاف الفاظ میں کہا کہ میں اس کے ساتھ تنہائی میں نہیں مل سکتی..... ”ٹھیک ہے، آپ دروازے بند نہ کریں!“ اس نے کہا تھا۔ ”مگر جب ہم بات کر رہے ہوں تو کوئی مداخلت نہ کرے.....“ میں نے اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا، اس نے لیپ ٹاپ پر مجھے سی ڈی لگا کر آن کر کے دی اور خود باہر لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا، باہر ملازمین اپنے کام کار میں مصروف تھے۔

اس کے بعد تو کوئی شک رہا تھا نہ شبہ..... میری آنکھوں کے پردے ایک ایک کر کے چھٹ چکے تھے۔ میں اگر دانیال کی کسی ایک بھی بات پر یقین کرتی تھی تو اب وہ یقین بھی نہ رہا تھا۔ وہ میری نظروں سے ہی نہیں گرے تھے بلکہ میرے دل سے بھی نکل چکے تھے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اب مزید دانیال کی زندگی میں نہیں رہ سکتی تھی مگر.....

☆☆☆

احمد کے جانے کے بعد میں نے اپنے وجود کی لاش کو بمشکل کھینچا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر

گئی، وہ سارے آنسو جو میری آنکھوں کے بند کے پیچھے تھے، وہ بند توڑ کر باہر نکل آئے اور میں نے پہلی اور آخری بار اپنی شکست پر آنسو بہائے..... وہ شکست جس کا ذمے دار میں نے کرن کی بددعاؤں کو ٹھہرایا تھا۔ میں نے دانیال کو کرن سے چھینا تھا، اس نے اس شخص کے چھینے جانے پر آنسو بہائے تھے اور منتیں کر کے مجھ کے مجھ سے مانگا تھا، یہاں تک کہ اس نے کہا کہ مجھے چاہے نہ لوٹاؤ مگر اس کی خاطر ہماری برسوں کی دوستی سے منہ نہ موڑو۔ میں نے اپنے زعم میں اس وقت اس کی ایک نہ سنی اور اب اس وقت میں اس لیے آنسوؤں کا سیلاب بہا رہی تھی کہ میرے نصیب میں ایسا برا شخص کیوں لکھا گیا تھا؟ میرے کس گناہ کی سزا تھا وہ شخص؟

کاش..... میں نے اس کی بد منتی کو محبت نہ سمجھا ہوتا! اتنے سارے کاش تھے جو قطار در قطار میرے سامنے کھڑے تھے، کاش میں اس سے شادی نہ کرتی، کاش اس کا اصلی رنگ مجھے شادی سے پہلے نظر آ جاتا، کاش کسی اولاد کی پیدائش سے پہلے اس کی اصلیت مجھ پر کھل جاتی..... میں نے روڑو کر آنکھیں سو جالی تھیں۔ اس روز میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی اس لیے سر درد کا بہانہ کر کے منہ سر پلیٹ کر سو گئی حالانکہ سر ہی نہیں پورا جسم اور روح دکھ رہے تھے.....

ان شبوتوں کو کہیں تو چھپانا تھا..... اس گندگی کو سب کی نظروں سے دور رکھنا تھا، حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ اسے ساری بیٹیوں کو کاپی کر کے بھجواؤں مگر پھر بھی مجھے ہی شرم آئی کہ ان کا باپ ہے، اس کا کیا بھرم رہ جائے گا بیٹیوں کے سامنے۔ اپنی الماری کی چابی میں دانیال کی دراز میں رکھتی ہوں، وہاں سے چابی نکالنے کے لیے دراز کھولی تو میں دھک سے رہ گئی..... احمد کے ہاتھ سے جو انگٹھی غائب تھی وہ وہاں پڑی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ اسے کھلی ہے اور اسی کے پاس ہے۔ میں نے وہ انگٹھی اٹھالی۔ اب میں نے اپنی دراز کی چابی کا ٹھکانا بدل لیا تھا کیونکہ میں دانیال کا سامنا پوری تیاری کے ساتھ اور کسی مناسب وقت پر کرنا چاہ رہی تھی۔

طرح آ کر بیٹھ جاتی ساتھ کوئی اور اسود جیسا لیے تو وہ زیادہ تکلیف دہ ہوتا، ہمارے لئے بھی اور صدف کے لیے بھی۔“

”پلیز ممانی جان!“ اس نے شرمندگی سے کہا ”میں کہہ رہا ہوں ناں کہ میرا ہرگز مقصد وہ نہ تھا جو میں نے کیا، ماموں جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس سے ان کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو رہی ہیں..... میں صدف کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، اس سے شادی کی خواہش میں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ ماموں کی بیٹی ہے..... اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے ممانی جان، ہمارے خاندان کی بہترین ماں کی اولاد.....“

”تم پر کوئی زور بردستی نہیں ہے بیٹا!“

”میں اپنی انگلی داپس لینے ابھی آ رہا ہوں ممانی جان!“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔“ اس سے پہلے کہ صدف اس انگلی کی غیر موجودگی کو محسوس کرے۔“ میں نے فون بند کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

صدف کی شادی ہو گئی تو میں نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا، میری ساری ذمے داریاں اب پوری ہو چکی تھیں۔ اب میرے پاس کوئی جواز نہ رہا تھا کہ میں اس زنجیر میں بندھی رہتی..... میں نے اس زنجیر کو توڑنے کا ارادہ کر لیا، سب سے پہلے مجھے اپنی بیٹیوں کو اعتماد میں لینا تھا، پھر اس کے بعد میں دانیال کو صرف اطلاع کرتی اور انہیں اپنے گھر کی جنت سے بے دخل کر دیتی تاکہ وہ آزاد ہوں، جو کچھ کرنا چاہیں کریں، جس سے چاہے تعلق رکھیں، جس سے چاہیں توڑیں، مجھے ان کی کسی حرکت سے کوئی تکلیف نہ ہونی۔ میں ان کے غلط سلسلہ کاموں کی فکر سے پہلے ہی آزاد تھی، اب مجھے مزید بے فکری ہو جاتی۔ اپنے ساتھ میں نے برا کیا جو اس شخص کی فطرت کو سمجھ نہ سکی اور اس کے جال میں پھنس گئی مگر اب مزید نہیں، مجبوریوں کی ڈور میں بندھا ہوا یہ بندھن اب توڑنا ہی ہے۔ میں

”احمد بیٹا.....“ میں نے اسے کال کی۔“ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔“

”جی ممانی جان.....“ اس نے انتہائی موڈ لبج میں کہا۔

”آپ اپنی انگلی مجھے ابھی دے کر جاسکتے ہیں، میں بازار جا رہی ہوں اور اسے آپ کے ناپ کے مطابق کروا دیتی ہوں۔“

”وہ..... وہ!“ وہ ہکھلایا۔

”کہیں وہ انگلی گم تو نہیں ہو گئی بیٹا.....؟“ میں نے اندازہ لگایا۔“ اگر ایسا ہی ہے تو میں چپکے سے اور بنوا دیتی ہوں بیٹا۔“

”ارے نہیں ممانی جان!“ اس نے فوراً کہا۔

”وہ میں نے ماموں کو دی تھی۔“

”ماموں کو..... وہ کیوں بیٹا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”اصل میں.....“ اس نے مجھے ساری بات کہہ سنائی، میں اپنے سن ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ ہمہ تن گوش اس کی بات سن رہی تھی۔

”ٹھیک کہتے ہو بیٹا.....“ میں نے رسان سے کہا۔“ کوئی بھی لڑکا ایسے آدمی کا داماد بننا پسند نہیں کرے گا..... بلکہ جو بن بھی چکے ہیں انہیں بھی اگر کسی روز علم ہو گیا کہ وہ کس شخص کے داماد ہیں تو وہ بھی میری بیٹیوں کو سزا کے طور پر گھر واپس بھیج دیں گے.....“

میرے دل میں درد اٹھا۔“ کرے کوئی اور بھرے کوئی، اسی کو تو کہتے ہیں۔“

”بخدا ممانی جان..... میں نے تو یہ سب ڈراما اس لیے کیا تھا کہ شاید ماموں کو اپنی بیٹیوں کے مستقبل کا سوچ کر ہی کچھ.....“ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ ”کچھ شرم آ جائے۔“

”چلو بیٹا، کوئی بات نہیں..... تمہیں فیصلے کا پورا حق ہے، بعد میں کوئی فیصلہ کرنے سے بہتر ہے کہ تم نے ابھی سوچ لیا، میری بیٹی بہت حساس ہے، ابھی تو اسے کسی نہ کسی طرح سمجھالوں گی مگر بعد میں وہ فاطش کی

نے راتیں، نیلم اور صدف کو بھی اپنے ارادے سے مطلع کر دیا اور گھر میں فاطش سے بھی بات کی۔

”آپ پریشان نہ ہوں ماما..... ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، آپ کے ہر فیصلے کی تائید کریں گی، پاپا اگر آپ کے ساتھ زیادتی کرتے رہے ہیں اور ابھی تک کر رہے ہیں تو پھر انہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔“ فاطش نے میرے ارادے کی تائید کی۔

”بس یہ دکھ کا ثناء ہے میری جان کہ تم میں سے کسی کا گھر میری وجہ سے خراب نہ ہو.....“ میں نے اس کے بال سہلائے۔

”فکر نہ کریں ماما، سب بہنوں کے قدم اپنے گھروں میں مضبوط ہیں، اللہ کا کرم ہے۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”رہی میں..... تو میں شاید اسی لیے واپس آ گئی ہوں کہ آپ تنہا نہ رہیں، میں آپ کے ساتھ رہوں گی ماما!“

”تمہارے پاپا اب بھی کئی عورتوں سے دوستی اور تعلق رکھے ہوئے ہیں، ٹیلی فون اور دیگر ذرائع سے بخش گفتگو ہوتی ہے، ان سے ملتے ہیں، دکھ تو یہ ہے کہ ان عورتوں کو بھی احساس گناہ نہیں ہے اور تمہارے پاپا تو اس قسم کے ہر احساس سے عاری ہیں..... میں سوچتی ہوں کہ اس طرح کے شخص سے میرا کیوں پالا پڑا۔ میں نے تو عمر بھر ان کے علاوہ کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے کہ جیسے مرد ہوں گے ویسی انہیں بیویاں ملیں گی..... میں تو ویسی نہیں ہوں..... مجھے کیوں ایسا شوہر ملا ہے؟“ میری خالی نظروں میں وہ سوال تھا اور میں جس کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس کا منہ تک رہی تھی۔

”ایسا نہیں ہے ماما جو آپ سوچ رہی ہیں، پاپا کو ویسی ہی عورتیں ملتی رہی ہیں جیسے وہ خود ہیں، ہاں آپ کے لیے آزمائش ہے..... بعض اوقات اللہ کے احکامات کو سمجھنے میں ہم غلطی کر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے آپ ایک دفعہ دوبارہ تفصیل سے پڑھیں! خود سوچیں اور سوچ سمجھ کر

فیصلہ کریں، مجھے علم ہے کہ آپ جس فیصلے پر پہنچی ہیں بہت سوچ سمجھ کر ہی پہنچی ہوں گی کم از کم ہم سب بہنوں کو بتانے سے پہلے آپ نے بار بار اس پر نظر ثانی کی ہو گی..... آپ اپنے فیصلے میں خود کو کبھی تنہا نہیں پائیں گی۔ میں سب بہنوں سے بات کروں گی، آپ جو بھی کرنا چاہیں گی ہم اس میں آپ کی تائید کریں گی۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”اس بات کی شرم مجھے کھائے جاتی ہے بیٹا کہ میں نے تمہارے باپ کے راز تمہارے سامنے آشکار کر دیے ہیں، خود کو جہنم کا ایندھن بنا رہی ہوں..... میں نے خود جب تک ان کے بارے میں جانا نہیں تھا تب تک پوجا کی طرح ان سے محبت کی، قسم کھا کر کہتی ہوں کہ خود سے بڑھ کر ان سے محبت کی، ان کی کئی غلطیوں کو معاف کرتی رہی..... جب وہ معافی مانگتے تو میں خود کو زمین میں گڑتا ہوا محسوس کرتی کہ انہیں شرمندگی ہوئی اور اب میں نے تمہارے باپ کو تم سب کی نظروں میں بے پردہ کر دیا ہے۔ مجھے ان سے محبت رہی ہے نہ دل میں ان کا احترام..... اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا، مجھے کھن آنا شروع ہو گئی ہے یہ سوچ کر کہ میں کس طرح کے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں، مجھے مجبوری کیا ہے بھلا؟“ میں سسک رہی تھی، دل سے ندامت محسوس کر رہی تھی۔ ”سوچتی ہوں کہ تم نے اچھا ہی کیا کہ اشعر کے ساتھ اپنی ساری زندگی کو سزا کی طرح نہیں گزارا، اپنے لیے جو مناسب سمجھا کیا اور جس تکلیف میں بھی ہو کم از کم اپنی نارسائی کا دکھ تو تمہیں نہیں مارتا نا..... وہ ایک رنج باب تھا جس کے انجام میں تم نے اپنے لیے بہترین انتخاب کر لیا، میں بھی اسے غلط سمجھتی رہی اور دنیا نے بھی غلط کہا مگر تم ہی عاقل ٹھہریں کہ تم نے اپنے لیے مناسب فیصلہ کیا۔ میں تو اتنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت ہوں کہ اس کینسر جیسے شخص کو بھی اپنی زندگی سے علیحدہ کرتے وقت سو بار سوچتا پڑا ہے.....“

”آپ کو بھی کوئی مجبوری نہیں اور نہ ہی آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے ماما.....“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا ہم اتنی بے خبر ہیں کہ ہمارے بچپن سے لے کر ہماری جوانی تک اس گھر میں بھانت بھانت کی عورتوں کے ساتھ پایا.....“ اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ لیا..... ”ہم تینوں کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہے ماما، صرف صدف کو پایا کے بارے میں کچھ علم نہیں۔“

”اسے نہ ہی معلوم ہو تو اچھا ہے.....“ میں نے التجا کی۔

☆☆☆

تانیہ کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا، دانیال بھی بکھرے بکھرے سے تھے، انہوں نے تانیہ کو بیٹیوں کی طرح سمجھا تھا ہمیشہ، کبھی میرا دل چاہتا کہ انہیں سمیٹ لوں، انہوں نے مجھ سے تانیہ کی موت کا افسوس بھی کیا.....

”مجھے تو آپ سے افسوس کرنا چاہیے دانیال!“

”وہ کیوں ماما؟“ فاطش نے سوال کیا تھا، مجھے لگا کہ وہ کچھ ابھی ابھی سی تھی۔

”کیونکہ وہ دانیال کی پانچویں بیٹی جیسی تھی، انہوں نے اس کو بچپن سے.....“ میں ہچکچوں سے رونے لگی۔ فاطش میرے چہرے کو گھور رہی تھی۔

”ہاں ماما..... بچپن سے!“ فاطش کہہ کر سسکنے لگی، میں نے اس کے بال سہلائے، میں جانتی تھی کہ اسے تانیہ سے اور تانیہ کو اس سے بہت پیار تھا۔ فاطش کی زندگی کے لیے تانیہ کو بہت پریشان کر دیا تھا، وہ کہتی تھی کہ ہمیں اس کا گھر بچانے کے لیے کاوش کرنا چاہیے تھی..... اس کے بے جالاؤ اور پیار کا ہی شاخسانہ تھا کہ میں نے فاطش کو بار بار اس کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرتے اور جواب میں کمال برداشت سے تانیہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ تانیہ نے خودکشی سے پہلے بھی خاص طور پر فاطش کو بلایا تھا اور مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ اس کی خودکشی کے اسباب سے کچھ نہ کچھ واقف تھی مگر پرسش کے باوجود اس نے مجھے

کچھ نہیں بتایا۔ میں تانیہ کے سرال والوں پر مقدمہ کرنا چاہتی تھی مگر فاطش نے ہی مجھے منع کر دیا کہ جب ان کے سارے خاندان کو خودکشی کا علم ہو گا تو خالہ کی روح کو تکلیف ہوگی۔ وہ خبر جسے سب سے چھپایا گیا تھا اسے سب جان جاتے، اس کی مری ہوئی خالہ پر تھو تھو کرتے اور کئی قیافے اور قیاس آرائیاں کرتے۔

”اگر آپ ان کے خاندان کے جائیداد کے لالچ کی بات کرتی ہیں ماما تو پھر تو مجھے خالہ کی سب سے قیمتی جائیداد ملی ہے، جو شہر میں ہے اور اس کی مالیت کئی کروڑ ہے، اتنی کہ ان لوگوں کو اتنی رقم گنتا بھی نہیں آتی ہوگی.....“ جب میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کے خاندان والوں نے جائیداد کے لالچ میں اسے خود قتل کر کے خودکشی کا ڈراما بنا دیا ہے تو اس نے کہا۔

”مجھے کچھ بتاؤ تو سہی اس کے راز کے بارے میں فاطمی بیٹا!“ میں نے اصرار کیا۔

”کوئی ایسی بات نہیں ہے ماما جو آپ کو بتانے والی ہوتی اور میں نے نہیں بتائی..... باقی جو اللہ نے راز میں رکھا ماما..... خالہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا، وہ زندہ ہوتیں تو یقین کریں کہ میں ان سے پوچھ کر آپ کو بتا دیتی مگر اب اسے میں آشکار کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتی، اگر اس ستار العیوب نے ان کے کئی بھید رکھ لیے تو میں کون ہوں جو ان کا ڈنکا بجاتی پھروں۔“ اس کے کہنے پر میں خوف زدہ ہو گئی، شاید..... نہیں یقیناً تانیہ کا کوئی ایسا بھید تھا جس کا تعلق اس کی خودکشی سے تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی ناپسندیدہ شادی کو نبھاتے نبھاتے کسی اور کے ساتھ.....“ میں اپنی مری ہوئی بہن کے بارے میں ایسا سوچنے پر خود ہی شرمندہ تھی مگر اس سے زیادہ کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، سو اس کے حق میں صدق دل سے دعا کی۔

☆☆☆

احمد کے بتانے کے بعد میں نے دانیال پر خاص نظر رکھنا شروع کر دی تھی اور مجھے احساس ہوا کہ کہیں

جاتے ہوئے ان کی تیاری اور تیور ہی اور ہوتے تھے..... جتنے دن وہ گھر سے باہر رہتے، میں گھر میں کسی انجانی آگ میں جلتی رہتی۔ میں ان کے فون، کمپیوٹر اور کاغذات کو بھی چیک کرنے لگی، میں نے احمد کے کہنے پر داخلہ لے کر خاص طور پر کمپیوٹر کو استعمال کرنا سیکھا تا کہ جس طرح اس نے بتایا تھا میں دانیال کو چیک کر سکتی۔ دانیال کو اس بات کی بھنک بھی نہ مل سکی اور نہ ہی انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کس طریقے سے چیک ہو رہے تھے اور ان کی زندگی کی بازی مات کی طرف بڑھ رہی تھی..... اسی دوران مجھے ان کی کمپیوٹر چیٹ میں ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے میں نے کہیں دیکھا تھا..... کافی غور و خوض کے بعد مجھے یاد آ گیا۔

”عفت کو کیسے جانتے ہیں آپ دانیال؟“ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”کون عفت؟“ زمانے بھر کی معصومیت لہجے میں سموئے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”وہی عفت..... جس کے ساتھ آپ نے چند دن مری میں گزارے تھے..... فاطش کی شادی کے بعد!“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”جسے آپ واپس آ کر بھی نہیں بھولے..... فاطش کی خلع ہو جانے کے بعد بھی آپ اسے اس کے گھر جا کر ملتے رہے ہیں کیونکہ اس کا شوہر ملک سے باہر ہے اور وہ گھر میں تھا اور اس رہتی ہے..... وہ جسے آپ کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے باکمال عورت ہے۔“

”میں کسی عفت کو نہیں جانتا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولے۔

”ہونہہ.....“ میں نے طنز سے کہا۔ ”آپ کہیں اور میں مان لوں..... دانیال؟ وہ عفت دراصل اشعر کی پھوپھی کی نند ہے..... آپ کو علم ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی کی شادی اس گھر میں، اس خاندان میں ہوئی اور پھر اس نے اتنے برے حالات دیکھے..... جس وقت میری بیٹی اپنی شادی شدہ زندگی کی بقا کی جنگ ہار کر گھر میں آئی، اس روز آپ اشعر کے خاندان کی ایک عورت

کے ساتھ اپنے گھر سے دور رنگ رلیاں منار ہے تھے۔“ میں سسکی۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جان۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھایا جسے میں نے جھٹک دیا۔

”مت چھوئیں مجھے ان غلیظ ہاتھوں سے.....“

”تم حد سے بڑھ رہی ہو حنا!“ انہوں نے الٹا مجھ پر غصہ کیا۔

”حد.....؟“ میں نے گہری سانس لی۔ ”حد تو تم نے کر دی ہے دانیال!“ غصے کی انتہا پر پہنچ کر میرا اس شخص کی عزت کرنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔ اس دن کے بعد سے میرے اور ان کے درمیان سے لفظ ”آپ“ کسی رسوا ہونے والے محبوب کی طرح اٹھ گیا۔

”بہت ہو چکی..... میں نے بہت برداشت کر لیا، تمہیں تو یہ شرم بھی نہیں رہی کہ تمہارے کرتوتوں کی سزا تمہاری بیٹیوں کو مل رہی ہے..... ایک کو طلاق ہو گئی ہے، ایک کا بیٹا مستقل مریض ہے اور ہر وقت اس کی جان خطرے میں رہتی ہے..... ایک کی شادی ہوئی ہے تو اولاد کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں..... کیوں نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں.....“ وہ جواب میں چیخے۔ ”تم یہ کیوں بھول گئی ہو کہ اس دنیا میں ہونے والی ساری جنگیں، ساری دہشت گردی، قحط، سیلاب اور زلزلے، حادثات اور اموات بھی سب میری وجہ سے آرہے ہیں۔“

”جس پر جو قیامت ٹوٹی ہے اسے سب سے بڑی وہی لگتی ہے دانیال..... میرے لیے یہی حادثات ہیں اور یہی زلزلے جنہوں نے ہماری زندگی کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔“

”تم ضرورت سے زیادہ تصوراتی دنیا میں رہنے لگی ہو حنا! انہوں نے دھیمالہجہ کر کے اپنے لہجے کی تختی کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔

”ساری عمر تصورات کی حسین دنیا میں رہتے گزر گئی، اب آنکھ کھلی ہے تو اندازہ ہوا کہ میں نے کس دھوکے میں رہ کر عمر بتادی۔“

”ہیلنگ“ کے لیے مجھے اس کے کمپیوٹر یا لپ ٹاپ کی ضرورت بھی نہ تھی، اس کی سوچ یہیں تک محدود تھی جو وہ ہر بات کے جواب میں کہتا: ”جانے کون تمہارے کان بھرتا رہتا ہے..... جانے کسے تم نے میری جاسوسی پر لگا رکھا ہے جو تمہیں اُلا بلا بتاتا رہتا ہے۔“ اس سے آگے اس کی سوچ نہ جاتی۔

☆☆☆

صدف کی شادی میرا آخری فرض تھا جسے میں نے نبھانا تھا اور اس کے بعد میں اپنے لیے فیصلہ کرنے کو آزاد ہوتی، مجھے ایسے بدکردار شخص کے ساتھ رہنے کی کوئی مجبوری نہ تھی، مجھے دنیا کی پروا بھی نہ رہی تھی، دنیا کا کیا ہے، لوگوں کے منہ بند رکھنے کو ہم کتنا کچھ کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی بات پر کھلے رہتے ہیں۔ صدف کی شادی سے پہلے میں نے احمد سے وعدہ لیا تھا کہ وہ صدف کو کچھ نہیں بتائے گا کیونکہ وہ اپنے باپ کو بہت چاہتی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا دل یہ سب جان کر دکھی ہو، وہ بہت حساس تھی اور باپ کی ذرا سی تکلیف یا بیماری پر رٹ پڑ اٹھتی تھی۔

کبھی میں نے بھی اس شخص کو۔۔۔ یونہی چاہا تھا، اس کی خوشی اور ناخوشی کا خیال رکھا تھا، اس کی کسی امانت میں خیانت نہ کی تھی تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ کیا کمی واقع ہو گئی تھی مجھ میں، میرے پیار میں، میری وفاداری میں؟ عمر بھر تو بیویاں شوہروں کی دلداری میں نہیں رہ سکتیں، ان کے کاندھوں پر وقت کے ساتھ ساتھ کئی مصروفیات پڑ جاتی ہیں جن کا بار وہ تنہا اٹھاتی ہیں اور شوہر بجائے ان کا ساتھ دینے کے، کیا اپنے لیے نئی دلداریاں ڈھونڈ لیں.....؟ ان کی محبت کا صلہ انہیں بے وفائی کی صورت میں دیں؟

میں نے سال بھر اسے طعنے دے دے کر اور جتلا جتلا کر بھی دیکھ لیا مگر اس کے اس گھٹیا معمول میں کوئی فرق نہ آیا، میں نے کافی سوچ سمجھ کر اس سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے اب اس کی زندگی میں نہ رہنا تھا اور اس کے لیے اسے یہ گھر چھوڑنا پڑتا کیونکہ یہ

”میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا تمہیں حنا..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس عمر میں تمہیں کیا دھوکا دوں گا؟“ اپنی غلطی کو ماننے پر وہ تیار ہی نہ تھے میں ضبط و کرب کی کتنی ہی منزلوں سے گزر کر ان سے بات بھی کرتی، کوشش کرتی کہ..... جب بھی موقع ملے سمجھاؤں مگر جونہی میں اس موضوع کی طرف آتی وہ پلٹا کھا کر الٹا مجھ سے الجھ پڑتے جیسے میں جھوٹی اور وہ سچے ہوں میں نے کس سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنا آپ گنوا دیا تھا، احساسِ زیاں جاتا ہی نہ تھا، اپنا وجود ارزاں لگنے لگا، جی چاہتا کہ وہی کروں جو تانیہ نے کیا تھا۔ اب تو اور بھی وثاق یقین ہو چلا تھا کہ تانیہ نے کسی مرد کے ہاتھوں دھوکا ہی کھایا ہوگا..... مگر میرے ہاتھ میں صرف پچھتاؤں کے مسئلے ہوئے نوٹ تھے۔

کاش میں نے کرن کے ساتھ وہ سب نہ کیا ہوتا، اے کاش! مجھے کہیں کرن مل جائے تو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کرن کی بددعاؤں نے میری زندگی کو یوں بد نصیبی کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اسے بتاتی کہ دانیال کو کھونا اس کی۔۔۔ بد نصیبی نہ تھی بلکہ اس کی کوئی نیکی کام آگئی تھی جو اسے دانیال سے نجات مل گئی تھی..... اگر اس کی بددعائیں طاقت ور تھیں تو کیا میری دعائیں اللہ تعالیٰ رد کر دیتا، میں نے باقاعدگی سے نماز پڑھ کر اُس (دانیال) کے لیے ہدایت کی دعا کرنا شروع کر دی۔ ”یا اسے ہدایت کا راستہ دکھا میرے مولا، یا مجھے اس سے نجات دلا!“ اُس کا میری زندگی میں ہونا میرے لیے اتنا کرب ناک تھا کہ میں اٹھتے بیٹھتے اسے ان لڑکیوں اور عورتوں کے ناموں کے طعنے دینے لگی جن سے اس کا واسطہ رہ چکا تھا یا اس وقت تھا۔

وہ بھی مجھے الجھ کر دیکھتا، میری باتیں سن کر حیرانی سے ٹکر ٹکر مجھے گھورتا مگر اسے کہاں سمجھ تھی کہ میں یہ سب کیوں کر جان لیتی تھی۔ اپنا فون بھی وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا، اپنا کمپیوٹر، لپ ٹاپ اس نے مستقل دفتر ساتھ لے جانا شروع کر دیا مگر اسے غالباً علم نہ تھا کہ

گھر میرا تھا، وہ نہ صرف گھر سے نکلتا بلکہ میری زندگی سے بھی نکل جاتا اور آزاد ہوتا کہ جہاں چاہے اور جیسے چاہے جھک مارے، جب اسے ہی احساسِ عذاب و سزا نہ رہا تھا تو میرا کیا بگڑتا تھا، اسے نہ دنیا میں بدنامی کا ڈر رہا تھا نہ آخرت میں عذاب کا..... جتنے دھڑلے سے وہ شہر شہر میں عورتوں سے تعلقات رکھے ہوئے تھا اور ان سے ملتا تھا، مجھے سوچ کر حیرت ہوتی کہ وہ اب تک کسی کے ہاتھوں پکڑا کیوں نہ گیا تھا۔

میں نے بہت سوچ سمجھ کر خلع کا فیصلہ کیا تھا، اس عمر میں اور شادی شدہ بیٹیوں کے ساتھ مجھے طلاق ملتی تو میں لوگوں کے منہ نہ روک سکتی، لوگ مجھ پر شک کرتے اس لیے میں نے خلع لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی ساری بیٹیوں کو بتا دیا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ رانیہ کو میں نے پیغام بھیجا، فاطش اور نیلم سے روبرو بات کی اور صدف کو اسکا پ پر..... کئی دن تک میں ان سب کی طرف سے ردِ عمل کا انتظار کرتی رہی، فاطش تو گھر میں تھی اس لیے اس نے اگلے ہی روز مجھ سے بات کی اور کہا کہ وہ میرے ہر فیصلے میں میرے ساتھ ہے اور تائید کرے گی۔ صدف کی طرف سے مجھے توقع تھی کہ وہ چیخے گی، چلائے گی، وضاحتیں مانگے گی مگر اس کی طرف سے ایسا کچھ نہ ہوا، الٹا احمد نے مجھے بتایا کہ وہ شک میں چلی گئی تھی۔

”آپ نے اسے کیا کہا ممائی جان؟“ احمد نے مجھ سے فون پر پوچھا۔

”وہ ہے کہاں؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”میری اس سے بات کرواؤ بیٹا!“

”اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے ممائی جان اور وہ اسپتال میں ہے۔ اسپتال کے اندر فون کی سروس نہیں ہے، گھر پر جائیں گے تو اس سے بات کروادوں گا۔“

”اسے فوراً بھجواؤ پاکستان بیٹا، ورنہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”آپ نے اسے کیا بتایا ہے ممائی جان؟“ اس

نے سوال دہرایا۔

”میں نے اسے بھی بتایا ہے اور باقی سب بیٹیوں کو بھی کہ میں نے دانیال سے خلع لینے کا فیصلہ کیا ہے.....“ میں نے تھوک نکل کر یہ مشکل فقرہ ادا کیا۔ احمد بھی اس بات پر ساکت رہ گیا، کافی دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ ”ہیلو!“ میں نے تصدیق کی کہ وہ فون کے دوسری طرف موجود تھا۔

”بہت برا ہو گا یہ تو.....“ اس نے ہولے سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ماموں وعدہ کرنے کے باوجود اپنا وہی معمول جاری رکھے ہوئے ہیں؟“

”ہوں!“ میں نے فقط ہوں پر اکتفا کیا۔

”کیا آپ نے صدف کو بتایا ہے کہ آپ کس وجہ سے خلع لے رہی ہیں ماموں سے؟“

”نہیں..... اس کا موقع ہی نہیں ملا بیٹا!“

”فقط یہ کہہ دینا کہ آپ ماموں سے خلع حاصل کرنا چاہتی ہیں، کافی نہیں ممائی جان، آپ کو وجہ بتانی

چاہیے تھی صدف کو تاکہ اسے اندازہ ہوتا کہ آپ کا فیصلہ درست ہے اور وہ شک میں نہ جاتی۔“

”میں کس طرح اسے یہ سب بتاتی بیٹا.....“

میں نے بے بسی سے کہا۔ ”وہ اپنے باپ کی دیوانی ہے،

اس کے سامنے اپنے باپ کا بت پاش پاش ہوا تو وہ دنیا

کے ہر مرد سے متنفر ہو جائے گی۔“

”میں کوشش کرتا ہوں صدف کو سمجھنے کی، ہو سکا

تو خود بھی ساتھ آؤں گا۔“ اس نے جانے کس کیفیت

میں فون بند کیا کہ خدا حافظ بھی نہ کہا، میں فون بند کر کے

سسک پڑی، مجھے یوں لگا کہ میں کسی بازار میں ننگے سر

کھڑی ہوں۔ میرے ذاتی بھید میری اپنی بیٹیوں پر اور

پھر دامادوں پر آشکار ہونے والے تھے۔

☆☆☆

تانیہ کی موت نے مجھے توڑ دیا تھا تو فاطش کی

حالت اس سے بھی ابتر تھی، میں نے ان دنوں اسے اتنا

پریشان دیکھا تھا کہ شاید اس سے قبل کبھی نہیں۔ وہ گم مسم

پہروں کمرے میں پڑی رہتی، کالج سے لوٹی تو اس کے

گھر کے ہر فرد کے لیے
بے مثال تحریروں کا مجموعہ

پاکستان

میں نیا دل گداز سلسلے وار ناول

گم شدہ محبت

آپ کی ہر دلعزیز اور مایہ ناز مصنفہ

انجم انصار

کے ماہرانہ قلم کا شاہکار..... شوخ و چنچل..... جملوں
سے سجا..... معاشرتی و نفسیاتی گرہیں کھولتا یہ ناول
محبت کے ایک نئے اور بے حد خوب صورت رنگ سے
بھی روشناس کرائے گا

بہت جلد صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

بعد کمرے سے نہ نکلتی۔ صدف کے ساتھ وہ کچھ بہل
گئی اور پھر میں نے نیلم سے بات کی تو اس نے وعدہ کیا
کہ وہ کچھ کرے گی تاکہ فاطش کو اس شاک سے نکالا جا
سکے..... ”فاطش کی شادی کرنا اہم ہے بیٹا!“

”شادی کے لیے اس سے بات کرنے سے
پہلے اہم یہ ہے کہ وہ اس کیفیت سے نکلے ماما جو خالہ کی
موت سے اس پر طاری ہو گئی ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ
ڈپریشن میں چلی گئی ہے۔“

”ایسا کیوں ہوا بیٹا.....؟“

”اسے عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا ہے ماما، نہ
صرف خالہ کی موت بلکہ آپ کے حالیہ فیصلے نے بھی
اس پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اسے خوف پڑ
جائے گا کہ دنیا کے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
”تم کہنا چاہتی ہو بیٹا کہ اس کی اس ذہنی کیفیت
کی وجہ میں ہوں؟“ میں نے دکھ سے سوال کیا۔

”میں نے یہ قطعی نہیں کہا ماما.....“ اس نے فوراً
کہا۔ ”لیکن کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کا یہ فیصلہ اپنی جگہ
درست سہی مگر آپ اپنی بیٹیوں کے ذہنوں اور ان کی
زندگیوں پر اس کے اثرات کو وقوع پذیر ہونے سے
نہیں روک سکتیں۔“ اس کے کہنے کا مطلب تو یہی تھا
کہ مجھے اس بڑے فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے اپنی
بیٹیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ ان کے گھروں
کے حالات کو مد نظر رکھنا چاہیے تھا، دنیا میں کسی اور کی
نہیں مگر اپنی بیٹیوں کی پروا کرنا چاہیے تھی۔ میں
خاموش ہو گئی..... ”ماما آپ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کو
اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہوں، ہم سب اپنے
اپنے گھروں میں مطمئن اور خوش ہیں..... مگر..... ایسا
ہوا تو.....“ وہ رکی۔ ”دیکھیں ناں، جیسے مجھے عمر کو اس کی
کوئی نہ کوئی وجہ تو بتانا ہوگی اسی طرح صدف اور رانیہ
آپ کو بھی اپنے شوہروں کو کچھ نہ کچھ بتانا ہو گا ناں؟“
اس نے نظر چرا کر کہا۔

”ہونہہ.....“ میں نے گہری سانس لی تھی، میں
اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ صدف کے شوہر احمد کو نہ

صرف علم ہے بلکہ اسی نے تو مجھے اس سارے خطرے سے آگاہ کیا تھا بہت عرصہ پہلے۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے اس فیصلے تک پہنچنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا تھا مگر نیلم کی بات کے جواب میں خاموشی اس لیے اختیار کی تھی کہ میں اسے واضح الفاظ میں یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ اب مجھے کسی کی پروا نہ رہی تھی نہ ہی میں اپنی بیٹیوں کو اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی تھی.....

☆☆☆

نیلم کا پیغام آیا تھا کہ اسے فاطش کو خریداری کے لیے ساتھ لے کر جانا تھا۔ ان دنوں نیلم دن رات گھن چکر بنی ہوئی تھی اس کے شوہر کی پہلی بیوی سے بیٹی بلی کی شادی طے ہو گئی تھی۔

”مگر تمہیں تو علم ہے نیلم کہ وہ کتنی چور ہے خریداری کی، جان جاتی ہے اس کی بازار کا نام سن کر۔“ میں نے اس سے کہا، جانتی تھی کہ فاطش کو خریداری کا کبھی شوق نہ رہا تھا، وہ اس معاملے میں چور تھی، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کوئی اس کے لیے سب کچھ خرید کر لے آئے، اسے گھر بیٹھے ضرورت کی ہر چیز مل جائے۔

”میں تو پہلے ہی آپ سے اجازت لینے والی تھی ماما کہ اسے میرے حوالے کر دیں چند دن کے لیے.....“ نیلم نے کہا تھا۔ ”اسے کہیں کہ میں اس کی منت کرتی ہوں کہ میرے ساتھ چلے، ماما مجھے اپنے لیے خریداری کرنا ہے، کم از کم مجھے مشورہ تو دے دے گی، بہن ہے وہ میری.....“

”صدف کو لے جاؤ بیٹا، وہ بھی ذرا بہل جائے گی۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”نہیں ماما.....“ اس نے فوراً کہا۔ ”صدف کا انتخاب بہت مختلف ہوتا ہے اور پھر اس کے ساتھ احمد ہے، اس کی اپنی سسرال کی کوئی نہ کوئی مصروفیت بھی ہو گی۔“ اس کے پاس جواب موجود تھا سو میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں فاطش کو منالوں گی۔

”کسی وقت آؤں گی آپ کی طرف، آپ سے

ایک اور اہم بات بھی کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کون سی اہم بات بیٹا؟“ میں نے فوراً پوچھا تھا۔

”وقت آنے پر بتاؤں گی۔“ اس کے اتنا کہہ کر فون بند کر دینے سے میں قیافوں میں الجھ گئی، ممکن ہے کہ اس نے عمر سے میرے بارے میں بات کی ہو اور اس کا رد عمل مجھے بتانا چاہتی ہو، ان دنوں میری سوچ اس سے آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔ جلد ہی ملی تھیلے سے باہر آگئی اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نندنا ہید کا دیور سجاد..... فاطش سے شادی کا خواہاں تھا۔ نیلم کی طرف سے آنے والے رشتے نے میرے اندر امید کی ایک نئی رمت جگادی تھی، میں جی جان سے فاطش کو اس پر منانے میں جُت گئی۔

”پہلے آپ اس سے مل لیں ایک بار ماما!“

”میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی بیٹا مگر صرف اس صورت میں اگر تمہارا دل مانتا ہو، خواہ مخواہ..... میں اس سے کیا ملوں گی۔“

”میرے اپنے خدشات ہیں ماما میں چاہتی ہوں کہ ایک ماں کی حیثیت سے آپ اسے جانچیں، میں اب کے کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی، جانے کیسے کیسے سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں مگر مجھے علم ہے کہ میں ان سے پوچھ نہ پاؤں گی مگر آپ ان سے بات کریں گی تو کھل کر ساری وضاحتیں بھی کریں اور یقین دہانی بھی کہ میں دوبارہ دھوکا نہیں کھانا چاہتی۔“ وہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے کہہ رہی تھی جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ اسے سجاد سے شادی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر میں اس کے کہنے کے مطابق اس سے مل کر کچھ باتوں کی وضاحت کر دوں۔ میں نے نیلم سے کہا کہ جب سہولت ہو تو سجاد سے کہے کہ وہ آکر مجھ سے مل لے، مجھے اس معاملے میں دانیال سے مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میرے اور اس کے درمیان تعلق کی وہ نوعیت رہ گئی تھی کہ مجھے اس حوالے سے کوئی پروا ہوتی۔

☆☆☆

باتیں جو مہکائیں

☆ سوچ گہری ہو جائے تو کیے جانے والے فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

☆ برائی کرنے والے سے نہیں بلکہ برائی سے نفرت کرو۔

☆ رونے سے زندگی نہیں گزرتی بلکہ لگ جاتی ہے۔

☆ اتنا اونچا نہ اڑو کہ تمہیں سورج کی کرنیں پگھلا دیں۔

☆ جس محبت پر آپ فخر نہ کر سکیں وہ صرف موت ہے۔

☆ دعا میں بڑی طاقت ہے، جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے۔

مرسلہ: غبر و سیم، گوجرانوالہ

بڑے شخص کے ساتھ کی، بلکہ اس کے تو پہلی بیوی سے چار بچے بھی تھے۔“

”وہ تو ایک مجبوری بن گئی تھی مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔“

”نیلیم بھابی کو دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ وہ ایک سمجھ دار ماں کی بیٹی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فاطش بھی ایسی ہی ہوگی، بد قسمت تھا وہ شخص جو اس کی قدر نہ کر سکا ہو۔“

اس نے پورے خلوص سے کہا تھا۔

”جن لڑکیوں کی دوسری شادی ہوتی ہے۔“

ان کے شوہر انہیں عموماً پہلی شادی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہتے ہیں، اگر ایسی کوئی صورت حال ہوئی تو؟“

”آج میں نے پہلی اور آخری بار فاطش کی

پہلی شادی کا حوالہ دیا ہے آنٹی، میرا وعدہ ہے آپ سے کہ اس کے بعد یہ بھی نہیں کہوں گا کہ بد قسمت تھا وہ شخص!“ اس نے کہا۔

”میں خود بھی شادی شدہ رہ چکا ہوں اور ایک بیٹی کا باپ ہوں، میں سمجھ سکتا ہوں کہ

جب زخموں پر کھرٹا آ جائے تو انہیں چھیلنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری

”اگرچہ تم عمر میں مجھ سے اتنے چھوٹے نہیں ہو مگر اس کے سوا کوئی اور طرزِ خطاب سوچا نہیں بیٹا کہ تم نیلم کے تعلق کے حوالے سے بھی آتے تو میں بیٹا کہہ کر ہی بات کرتی.....“

”ذرا نوازی ہے آنٹی آپ کی۔“ اس نے احترام سے کہا۔

”میں بات کو گھما پھرا کر کروں گی اور نہ ہی طوالت اختیار کروں گی، پوچھنا چاہتی ہوں کہ فاطش کے ساتھ شادی کرنے میں کون سا جذبہ کارفرما ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں اسے محبت ہی کہوں گا۔“

اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”کسی کو جانے بغیر محبت کیسے ہو سکتی ہے، تم تو اس سے ملے بھی نہیں تھے جب تم نے نیلم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہ میں ایک نوجوان ہوں اور نہ ہی فاطش ایک کم سن لڑکی آنٹی۔ مگر یقین کریں کہ میں نے اسے آپ کے گھر میں پہلی بار دیکھا تو وہ مجھے اچھی لگی تھی،

جانتا بھی نہ تھا کہ اس کا نام فاطش ہے، اس کی شادی بھی ہوئی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔“

”تو یہ سب جان کر بھی تمہارے جذبات وہی کیونکر رہے؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”آنٹی میں خود بھی اسی طرح کے حالات کا

شکار رہا ہوں، میری امی تو اب بھی کنواری لڑکیوں کے رشتے ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بیٹیوں کے

والدین اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں جیسا تیسرا بھی رشتہ ملے کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، میں نے ہی مان کر

نہیں دیا میں سمجھتا تھا کہ یہ مناسب جوڑ نہ ہوگا، میں کنواری اور کم سن لڑکیوں کے ساتھ خود کو کبھی سیٹ نہ

کر پاتا.....“ وہ رکا۔ ”فاطش مجھے دیکھنے میں اچھی لگی، پھر اس کے حالات جانے تو مجھے یہ جوڑ بالکل مناسب

لگا، ممکن ہے کہ ہماری عمروں میں تفاوت پر آپ کو یا انکل کو اعتراض ہو۔ مگر امید اس لیے بندھ گئی کہ آپ

نے اپنی ایک کنواری بیٹی کی شادی اس سے عمر میں کافی

طرف سے ماضی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں آپ کی بیٹی کو خوش رکھوں گا، میرے پاس اپنا ذاتی گھر ہے، میرا کاروبار بھی اچھا ہے اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کی بیٹی کی ہر خواہش پوری کروں، جیسا وہ رہنا چاہے اسے ویسا رکھوں، آپ بے شک امریکا آ کر میری ان سب باتوں کی تصدیق کر لیں۔“

”زندگی میں ایک مرد کے ہاتھوں دھوکا کھانے والی عورت..... دودھ کے جلے جیسی ہو جاتی ہے بیٹا، اسے دوسرے مرد پر اعتبار بڑی مشکل سے آتا ہے، میری بیٹی بڑی برداشت والی ہے مگر شادی شدہ زندگیوں میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہیں کہ اچھے اچھوں کے قدم لرز جاتے ہیں.....“

”میں سمجھتا ہوں ان باتوں کو آنٹی، میں نے اپنی بیٹی کی خاطر بہت مصالحت کی کوشش بھی کی تھی مگر میری بیوی..... اسے میرا اور میرے خاندان کا کچھ بھی پسند نہ تھا، مرد کی برداشت کی بھی حد ہوتی ہے، میں اس حد سے بڑھ کر اسے برداشت کرتا رہا مگر وہ کسی بات پر مطمئن نہ ہوتی اور پھر وہ خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی..... اس نے عدالت میں خلع کا کیس کر دیا تو میں نے اسے طلاق دے دی۔“ وہ رکا، گہری سانس لی۔ ”میں یہ تمام باتیں فاطش کے سامنے قطعی نہیں دہرانا چاہتا، بس چاہتا ہوں کہ میری ہونے والی بیوی یہ سمجھتی ہو کہ شادی دو افراد کے تعلق کا نام نہیں ہے۔ اگرچہ میرے خاندان کی طرف سے نہ کوئی بوجھ ہو گا نہ دباؤ۔ مگر بیوی کی طرف سے یہ مطالبہ کہ اس سے تعلق قائم ہو تو باقی سب سے قطع تعلق کر لیا جائے..... یہ تو ٹھیک نہیں ہے ناں آنٹی!“

”ہوں.....“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد شادی اس لیے نہیں کرتا کہ وہ باقی خاندان سے کٹ جائے، میری کسی بیٹی میں ایسا وصف نہیں ہے بیٹا!“

”باقی جس طرح آپ مناسب سمجھیں، اگر آپ، انکل اور فاطش مجھے اس قابل سمجھیں تو مجھے خوشی

ہوگی، میری ایک بہت بڑی خواہش کی تکمیل ہوگی..... اسوڈ فاطش کا حصہ ہے اور اس حوالے سے مجھے اس کے فاطش کے ساتھ ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا..... میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں اسے اس کے گئے باپ سے بڑھ کر چاہوں گا۔ مگر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کا بہترین دوست ثابت ہوں گا۔“ اس نے وعدہ کیا، اسے تو علم بھی نہ تھا مگر ساتھ کے کمرے میں بیٹھی فاطش ہم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی..... ”آپ کو کسی بات پر ذرا سا بھی شک ہو تو آپ اپنے طور پر جانچ پڑتال کروالیں، میں چاہتا تھا کہ اسی دفعہ کچھ طے ہو جاتا تو میں..... میرا مطلب ہے کہ اگر آپ میرا رشتہ قبول کر لیں تو میں سادگی سے نکاح کر کے فاطش کے ویزے کے لیے اپلائی کر دوں اور جب اس کا ویزا آ جائے تو میں اسے لینے آ جاؤں اور اگر آپ چاہیں تو اپنی تسلی کر لیں، جب آپ مطمئن ہوں تو میں پھر بھی آ سکتا ہوں۔“ اس نے اپنا مذاں ڈرے ڈرے انداز میں بیان کیا تو میں خود کو مسکراتے سے نہ روک سکی۔

”میں فاطش کے پاپا سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گی بیٹا!“

”آپ پہلے فاطش سے بات کر لیں آنٹی، اس کی رائے اور اس کا فیصلہ سب سے اہم ہے میرے لیے۔“ ”فاطش کی رائے بھی کے لیے سب سے اہم ہے بیٹا، اس لیے کہ اب وہ ایک کم عمر اور نادان لڑکی نہیں ہے جو کسی کی باتوں میں آ جائے، وقت اور حالات نے اسے بہت کچھ سکھایا ہے اور اب وہ یقیناً اپنے لیے بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہے۔“

”میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا آنٹی!“ اس نے انتہائی احترام سے میرے سامنے سر جھکایا، میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”بہت شکریہ اس عزت افزائی کا..... آپ نے اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھا ہے تو اسے رکھا رہنے دیجئے گا۔“ وہ سلام کر کے چلا گیا اور دو منٹ کے بعد میں فاطش کے

نہ چھوڑ دیتی تھی جیسے کہ صدف..... بیٹے کی طرف سے بھی اسے پریشانی رہتی تھی اور اپنی ملازمت میں مصروف بھی رہتی تھی، سسرال کے بھرے پڑے خاندان کی ذمے داریاں بھی تھیں۔ عابد بیٹا اس کے ساتھ بہت اچھا تھا اور اپنی ماں جیسی عزت مجھے بھی دیتا تھا، مجھے امید تھی کہ وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ لے گا، ممکن ہے کہ رانیہ نے اپنے طریقے سے اسے سمجھا بھی دیا ہو۔ میں رانیہ کے بارے میں سوچ سوچ کر متفکر تھی اور وہ اس روز یوں اچانک پہنچ گئی مصطفیٰ کے ہمراہ، عین اس وقت جب ہمارے گھر کی فضا ایک فائر کی آواز سے گونج اٹھی تھی! صدف، فاطش اور رانیہ چیختی ہوئی باپ کی اسٹڈی کی طرف بھاگیں جبکہ میں نے ملازمہ کوثر سے مصطفیٰ کا خیال رکھنے کو کہا جسے اس کی ماں چھوڑ کر بھاگی تھی تو وہ منہ بسور رہا تھا۔ میں بیٹیوں کے تعاقب میں بھاگی تو میرے قدم کئی کئی من کے ہو

پاس تھی۔
”باتوں کا استاد ہے ماما!“ اس نے ہنس کر کہا،
اس کی ایسی ہنسی میں نے سالوں سے نہ سنی تھی۔
”چلو اچھا ہے، تمہیں بور نہیں ہونے دے گا۔“
میں نے ہنس کر کہا۔

”مجھے کیوں؟“ اس نے مصنوعی ناراضی سے پوچھا۔
”کیونکہ اب باقی زندگی تم نے اسی کی باتیں تو سننا ہیں۔“ میں نے اس کی لال ہوتی ہوئی ناک کو چھوا۔
”یہ کس نے کہہ دیا؟“ اس کی آنکھوں میں ہنسی سے آنسو آگئے تھے۔

”تمہاری آنکھوں کی نمی نے..... تمہارے ہونٹوں کی ہنسی نے.....“

”آپ کو تو شاعرہ ہونا چاہیے تھا ماما!“ وہ اپنے چہرے پر بکھرنے والے رنگ چھپانے کے لیے مجھ سے لپٹ گئی، میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اسے خوش رہنے کی دعا دی، نیلم کو کال کر کے بتانا بھی تھا اور اس سے یہ..... بھی کہنا تھا کہ وہ اور عمر دانیال سے خود ہی بات کر لیں اور انہیں بتا بھی دیں کہ فاطش کو بھی اس پر اعتراض نہ تھا، جب یہ شادی کرنا ہی تھی تو اس میں مزید دیر کا کیا جواز۔

☆☆☆

سب سے بڑھ کر حیرت تو مجھے یہ تھی کہ رانیہ کی طرف سے مجھے کسی قسم کے رد عمل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا، یا تو اسے موقع نہ مل رہا تھا یا پھر وہ اپنی زندگی میں مصروف اتنی تھی کہ اس طرف اس کا دھیان نہ تھا۔ مگر یہ کوئی ایسی معمولی اور چھوٹی بات تو نہ تھی۔ میرا دھیان مصطفیٰ کی طرف چلا گیا، اللہ کرے کہ وہ خیریت سے ہو۔ میں نے اس پیغام کے بعد خیر خیریت کا کوئی پیغام بھی کئی دن تک نہ بھیجا تھا اور چند دن کے بعد جب میں نے پیغام بھیجا تو اس کا جواب اتنے نارمل انداز میں دیا تھا اس نے کہ میں حیران رہ گئی۔

جانتی تھی کہ وہ پردیس میں ہے مگر یہ بھی علم تھا کہ وہ میری بہت بہادر بیٹی تھی اور چھوٹی چھوٹی بات پر دل

سلمیٰ اعوان کا "تنہا"

☆ وہ خطہ جو کبھی میرا آپ کا پور بو
پاکستان تھا۔ ☆ پچھمی پاکستان کا وہ
بازو کیسے ٹوٹا۔ ☆ محبتوں کی شکست و
ریخت کیسے ہوئی۔ ☆ سلمیٰ اعوان کے

ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ناول

دوست پبلیکیشنز اسلام آباد 051-4102784

رہے تھے، جانے میری آنکھ کیا منظر دیکھنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں..... ہر طرف لہو کے چھینٹے دیکھ کر میں ہی مر گئی تھی۔ دانیال نے خودکشی کر لی تھی، یہ سوچ کر ہی میرے بدن سے جان نکل گئی، میں نے یہ تو ضرور چاہا تھا کہ اسے اس دنیا میں بھی عبرت ہو اور یہ بھی سوچا تھا کہ اس سے خلع لینے کے بعد اس کا مکروہ چہرہ ساری دنیا کے سامنے لاؤں گی مگر اس وقت اپنے ہی لہو پر گرے ہوئے دانیال کو دیکھ کر میں سکتے میں چلی گئی، کوئی آواز نکلی نہ آنسو..... فاطش چیخ رہی تھی، رانیہ..... جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے پہنچی ہی تھی اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ صدف اپنے بال نوچ رہی تھی۔ میری بیٹیوں کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے، احمد نظر آیا تھا پھر ایسبولینس کے سائرن کی آواز..... ہر طرف بھگدڑ مچی تھی، سب بھاگ رہے تھے۔

میں وہیں قالین پر ڈھسے گئی تھی۔ میری انگلیوں کو قالین نرم محسوس ہوا، میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا، لال لال لہو..... کمرے سے باقی لوگ فوراً غائب ہو گئے تھے۔ کمرہ خالی ہو گیا تھا۔ میں مرے، مرے قدموں سے وہاں سے نکلی، نیچے آئی جہاں اکیلا مصطفیٰ، کوثر کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا ساتھ بھان بھان کر کے رو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا کیونکہ اس کے لیے رونا ٹھیک نہ تھا۔ ملازمہ سے کہا کہ اس کے لیے پانی لے کر آئے اور اسود کو بھی دیکھے، میری گود میں آ کر مصطفیٰ چپ ہو گیا تھا۔ میرے آنسو زار و قطار بہنے لگے، وہ لوگ مجھے جھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ”صاحب کیا کر رہے تھے کمرے میں جب تم انہیں رانیہ کا بتانے کے لیے گئی تھیں؟“

”وہ اپنا پستول الماری سے نکال کر مڑے ہی تھے، میں نے سوچا کہ آپ کو بتاتی ہوں مگر اس سے پہلے ہی.....“ کوثر نے ہکلا ہکلا کر بات پوری کی۔

”دانیال ہمیشہ اپنا پستول خود ہی نکال کر۔“

باقاعدگی سے صاف کرتے ہیں اور اس میں کبھی گولی بھی نہیں ہوتی۔“ میں بڑبڑا رہی تھی، شاید میں ملازمہ کے ذہن میں آنے والے اندیشوں کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”جانے کس طرح اس میں گولی رہ گئی جو صاف کرتے ہوئے چل گئی؟“ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں بے یقینی کا لپ تھا..... ”سب لوگ چلے گئے، میرا کسی نے انتظار بھی نہیں کیا؟“ میں دیوانوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ جی، خون بہت بہہ رہا تھا اور پھر گاڑی میں چاروں بیٹھ کر ایسبولینس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں، میں بچوں کو سنبھال لیتی ہوں۔“ اس نے سوتے ہوئے مصطفیٰ کو میرے پاس سے اٹھایا اور اسود کے پاس لے گئی، میں نے اپنا کمرالاک کیا، بیگ اٹھایا اور ڈرائیور کے ساتھ نکلی، فون کر کے احمد سے پوچھ کر ڈرائیور کو بتایا کہ وہ کس اسپتال میں تھے۔ احمد سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ دانیال.....؟

☆☆☆

خودکشی کے لیے فار تو دانیال نے خود پر کیا مگر اس سے مر گئی حنا..... اس کی بیوی مر گئی، اسپتال کے ٹھنڈے کاریڈورز میں احمد کے ساتھ بات چیت میں، میں نے جانا کہ اس نے خود کو نہیں بلکہ ہم سب کو ایسی موت مارنے کی کوشش کی تھی کہ ہم زندہ نظر آتے مگر زندہ نہ ہوتے..... فار کرتے وقت اس کا ہاتھ کانپا تھا جس سے اس کی جان تو بچ گئی مگر سر کے بائیں طرف لگنے والی گولی سے اس کا کافی خون ضائع ہو گیا تھا.....

”ممائی جان! نہ صرف ڈاکٹروں کو بلکہ سب کو علم ہونا چاہیے کہ وہ اپنا پستول حسب معمول صاف کر رہے تھے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی ملازمہ سے بھی یہی کہا تھا۔“

”میں نے صدف، فاطش اور رانیہ آپ کی کو بھی سمجھا دیا ہے..... کوئی بھی پوچھے ممائی جان!“ اس نے

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ دسمبر 2015ء
کی جھلکیاں

جہد برق

ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق، اردو کے
نامور قلم کار کا زندگی نامہ

بانگا پریت کا عقاب

ندیم اقبال کے شرر بار قلم کا شہکار، سیر پاکستان

بگ نصری

مریم کے خان کا کرکٹ کے دیوانوں کی
خاطر چونکا دینے والی تحریر

انے حصے کی شمع

سلمیٰ اعوان کی وہ تحریر جسے عرصہ تک
آپ بھلا نہ پائیں گے

راست غلط فیصلہ

رومانہ شعیب کی بسر مرگ سے ارسال کردہ سچ بیانی

اس کی جلاوہ

اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی
واقعات، سچے قصے، یاد رہ جانے والی تحریریں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ ہر شمارہ، خاص شمارہ، ہر شمارہ، خاص شمارہ

زور دے کر کہا۔ ”کوئی بھی..... اسے بھٹک نہیں لگنی
چاہیے کہ آپ کے اور ماموں کے بیچ کیا چل رہا تھا،
میری امی کو بھی نہیں..... یہ بات آپ کی بیٹیوں کے
علاوہ صرف میں جانتا ہوں اور اس کا دائرہ یہیں بند کر
دیں ممانی جان!“

”ہوں.....“ میں نے گہری سانس لی، میری
آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی مگر ایک بھی آنسو نہ بہہ رہا تھا۔
”آپ پریشان نہ ہوں، ان کی حالت اب
خطرے سے باہر ہے.....“ اس نے میرا کاندھا
تھپکا۔ ”میں آپ کا بیٹا ہوں اور آپ کسی بات کی پروا
نہ کریں، میں خود ہی آپ کو گھر چھوڑ کر آیا تھا، مجھے ڈر
تھا کہ ماموں کو کچھ ہو گیا تو آپ یہ صدمہ برداشت نہ کر
سکیں گی۔ صدف کی بھی حالت غیر ہے..... میں جانتا
ہوں کہ آپ نے ماموں کو پورے خلوص سے چاہا ہے
اور ان کی وفادار رہی ہیں، اگر ہم خود کشی کی کوشش
کا کہیں گے تو ہر سننے والے کے ذہن میں سوال اٹھے
گا، لوگ جانے کیا، کیا قیافے لگائیں گے، اس لیے
ضروری ہے کہ سب کا بیان ایک ہو۔“ میں نے اس
کے ساتھ خود کو اتنا محفوظ محسوس کیا کہ واقعی میرا اپنا بیٹا
ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ ساری بہنیں وہیں انتظار گاہ میں آ
گئیں..... نیلم بھی پہنچ گئی تھی، اس کا رنگ پیلا پھٹک ہو
رہا تھا..... عمر دانیال کے لیے خون دینے گیا تھا۔

”تم نے کچھ کھایا پیہا؟“ میں نے اسے
اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”کیسی پیلی ہو رہی ہو؟“
”مما.....“ وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

”میرے پاپا ٹھیک تو ہیں ناں؟“ اس نے ابھی تک دانیال
کو دیکھا نہ تھا اس لیے فکر مند تھی۔ ”آپ ملیں پاپا سے؟“
”احمد بتا رہا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔“ میں نے
اسے پیار کیا۔ ”میں نے بھی انہیں نہیں دیکھا۔“

”مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے.....“ وہ اپنا
سینہ مسلنے لگی، ساتھ ہی وہ ایک صوفے پر لیٹ گئی، رانیہ
نے بھاگ کر اسے پانی لا کر دیا، بہ مشکل اس نے ایک
گھونٹ پانی پیا، اسے ابکا کی سی ہوئی۔

”کہیں سے کچھ کھانے کو لاؤ بیٹا، غالباً اس نے کچھ کھایا نہیں ہوگا۔“ میں نے فاطش کو اپنا بیگ پکڑایا۔
 ”ڈرائیور باہر ہی ہے، اسے کہو کہ کچھ لے آئے جا کر۔“
 ”میں یہاں کینٹین سے دیکھتی ہوں ماما!“ وہ میرے بیگ سے والٹ نکال کر لے گئی۔

”ماما.....“ نیلم نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”عمر کو بلوائیں جلدی سے پلیز!“ میں نے صدف سے کہا کہ احمد کو فون کر کے عمر کو بلوائے، جلد ہی عمر آ گیا اور نیلم کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔
 ”اوہو..... آنٹی، میں نے غلط کیا کہ اسے ساتھ لے آیا۔“

”پاپا کا سن کر وہ کس طرح گھر رک جاتی عمر بھائی!“ رانیہ نے ہولے سے کہا۔
 ”لیکن اس کی اپنی حالت تو دیکھیں.....“ عمر نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ”اسے تو خود ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پڑ رہی ہے..... رانیہ آپلی پلیز..... کسی ڈاکٹر یا نرس کو بلا لیں۔“

”فاطش اس کے لیے کچھ کھانے کو لینے گئی ہے..... غالباً کمزوری ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔“ میری بہادر بیٹی رانیہ نے کہا۔ ”آپ خود ابھی خون دے کر آئے ہیں!“

”آنٹی... she is pregnant!“ عمر کے الفاظ پر میں شاک میں چلی گئی، کس موقع پر میں نے اتنی بڑی خوش خبری سنی تھی کہ میں چیخ کر خوشی کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی..... دو دن قبل ہی تو ایسی خوشخبری مجھے صدف نے سنائی تھی۔ میں اس حادثے کے بعد سے ابھی تک اس کی طرف سے فکر مند تھی..... رانیہ نے فوراً بہن کو اپنی بانہوں میں لیا اور اس کے ہاتھوں کو ملنے لگی۔

صدف نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو پکڑا اور لمحوں میں نیلم کو وہاں سے اسٹریچر پر ڈال کر کسی طرف لے جایا گیا، عمر وہیں بیٹھا تھا۔ احمد دانیال کے پاس تھا۔ صدف اور رانیہ نیلم کے ساتھ چلی گئیں..... فاطش کچھ جوس چپس اور بسکٹ لے کر لوٹی

تو سب کو غائب دیکھ کر پریشان ہو گئی مگر صورت حال کے بارے میں جان کر مطمئن ہوئی، عمر سے پوچھ کر اسی طرف روانہ ہوئی جہاں باقی تینوں تھیں۔
 ”کوئی مسئلہ یا پریشانی تو نہیں تھا انکل کو؟“ عمر نے مجھ سے پوچھا۔

”کس قسم کا بیٹا؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
 ”جس زاویے سے فار ہوا ہے.....“ وہ رکا۔
 ”میرا مطلب ہے کچھ ایسا تو نہیں کہ انکل نے خودکشی کی کوشش کی ہو؟“ اس نے جھجک کر اپنی بات مکمل کی۔
 ”ارے ایسا کیوں ہو گا بیٹا!“ میں نے چند لمحوں کے لیے سوچا کہ عمر کو بتا دوں کہ کیا صورت حال تھی اور اعتراف کر لوں کہ دانیال نے خودکشی کی کوشش ہی کی تھی، آخر جب میں نے خلع لینا تھی تو بھی تو اسے ان باتوں کا علم ہونا تھا..... مگر ہمت نہ کر پائی اس صورت حال میں اور احمد کی ہدایت یاد آ گئی کہ ہمیں کسی کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کہنا ہے، کسی کے سامنے بھی نہیں۔

”کاروبار کے حالات کا تو مجھے کوئی علم نہیں ہے لیکن اگر کوئی پریشانی کاروباری بھی ہوتی تو دانیال مجھ سے صبر تو کرتے۔“ میں نے خود ہی اپنا مان رکھا۔ ”اپنا پستول دانیال اکثر نکال کر خود صاف کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھار باہر نکل کر، کسی کھلی جگہ پر جا کر ہوائی فار بھی کرتے ہیں، ممکن ہے کہ پھپھی دفعہ فار کیا ہو اور اس کے بعد گولیاں نکالنا بھول گئے ہوں۔“ میں صفائی پیش کر رہی تھی۔

”جو بھی ہوا مگر ذرا سی بے پروائی سے کتنا نقصان ہو سکتا تھا.....“ اس نے ہمدردی سے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں ذرا نیلم کو.....“

”میں بھی چلتی ہوں بیٹا!“

”آنٹی..... ابھی تک ہم نے نیلم کی حالت کی خبر سب سے پوشیدہ رکھی ہے۔ اصل میں بلی کی شادی ہے ناں تو ایسے میں ایسی خبر کا لیک ہونا، ذرا نیلم خود کو شرمندہ سا محسوس کر رہی تھی، اس لیے آپ اس کی

رکھتا ہے، ناقدی کرنے والا شوہر عورت کے دل کے سنگھاسن سے گر کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اپنے کمرے میں گہری نیند میں اپنے پاؤں پر کیلے پن کے احساس سے میں جاگی..... گھبرا کر پاؤں کھینچا، سائنڈ ٹیبل پر رکھا لیپ جلا یا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”کیا بات ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

”معاف کر دو مجھے حنا!“ اس نے ہاتھ جوڑے، وہ میرے پیروں پر ماتھار کھے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں نم تھیں۔ ”گناہ گار ہوں تمہارا.....“

”نہ کوئی ضرورت ہے نہ فائدہ اس طرح کے ڈراموں کا!“ میری کوشش تھی کہ میری آواز بلند نہ ہو کیونکہ ساری بیٹیاں ارد گرد کے کمروں میں تھیں، چند دن میں بلی کے بعد، فاطش کا نکاح سجاد سے ہونا طے پایا تھا۔

”پلیز حنا!“ وہ گڑ گڑایا۔ ”forgive me and forget it“ اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ”بھول ہو گئی مجھ سے!“

”کیا؟“ میں استہزاء سے ہنسی۔ ”ہونہہ! معاف بھی کر دوں اور بھول بھی جاؤں؟ بھول؟ بھول ایک بار ہوتی ہے دانیال، تم نے تو میری ساری زندگی کو میری ایک بھول کی سزا بنا کر رکھ دیا۔“

”مجھے معاف کر دو حنا، میں شرمندہ ہوں، تم سے بھی اور بیٹیوں سے بھی، مجھے ان سے بھی معافی لے دو پلیز، ورنہ میرے جینے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ گڑ گڑا رہا تھا۔

”مرنے کی کوشش تو تم نے کر کے دیکھ لی دانیال..... یہ بھی نہ سوچا کہ لوگ کیا باتیں کرتے..... تم تو عمر بھر کی بے حیائیوں کو سمیٹ کر موت کے منہ میں چلے جاتے اور میں جیتے جی مر جاتی..... تمہارے ساتھ ایک ایک پل ایمانداری اور وفاداری سے گزار کر بھی میں معسوب ٹھہرتی، لوگ مجھے ہی قصور وار گردانتے، جانے کس، کس کے ساتھ منسوب کر کے میرے بارے میں چٹخارے دار خبریں پھیلاتے..... تم

بہنوں سے کہہ دیں کہ اس راز کو ابھی راز ہی رکھیں.....“ میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ کمرے میں داخل ہوئے تو نیلم ڈرپ کے زیر اثر نیند میں تھی، عمر کو وہاں چھوڑ کر ہم سب باہر نکل آئے، اب ہمارا رخ دانیال کے کمرے کی طرف تھا جہاں سے احمد ہمیں بلانے آیا تھا۔

☆☆☆

میں حسب معمول اپنے اس کمرے میں سو رہی تھی جہاں میں پچھلے چند ماہ سے علیحدہ سو رہی تھی، یہ کمرہ ہمارے کمرے سے متصل تھا، دونوں کمروں کے بیچ دروازہ بھی تھا جسے میں نے بند کر رکھا تھا۔ یہ کمرہ اصل میں دانیال نے پہلے اپنی اسٹڈی کے طور پر بنوایا تھا، بچیوں کی آمد سے اسے ہم۔ زبچیوں کا کمرہ بنایا جب تک دو بچیاں تھیں اور پھر دانیال کی اسٹڈی اوپر منتقل ہو گئی تھی۔ بچیاں جوں جوں بڑی ہوتی گئیں اپنے کمروں میں منتقل ہوتی گئیں مگر یہ بالحقہ کمرہ جوں کاتوں رہا..... فاطش اسود کی پیدائش کے بعد کچھ عرصے اس کمرے میں رہی۔ مجھے رات کو اٹھ کر اسود کی آیا کو چیک کرنے کی سہولت بھی تھی اور اگر فاطش سے اسود نہ سنبھلتا تو میں اس کی مدد بھی کر دیتی تھی۔

اپنی اسٹڈی کو اوپر منتقل کر کے دانیال بہت سی فکروں سے آزاد ہو گئے تھے اور اسٹڈی میں پڑھنے یا کام کرنے کے بہانے زیادہ سے زیادہ وقت گزارتے اور اپنے تمام ”مشاغل“ کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جان لیا تھا کہ میں اب دانیال سے محبت نہ کرتی تھی، نہ ہی مجھے اس کی پروا رہی تھی، نہ اسے عزت دینے کو دل چاہتا تھا..... اور تو اور اسے مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا میں نے۔ یہ احساس ہی عورت کے لیے کافی ہوتا ہے کہ اس کا مرد، جس کے لیے وہ مخلص اور وفادار ہے وہ اس کے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھے بھی، اپنے مرد کے بدلے ہوئے اطوار ایک گنوار سے گنوار عورت بھی پہچان لیتی ہے..... بیوی کی نظر میں مرد بھی تک معتبر ہوتا ہے جب تک وہ اپنی محبت سے اسے معتبر

نے تو..... اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے بھی صرف اپنی نجات کا سوچا، کسی اور کے بارے میں نہیں۔“

”جانتی ہو حنا..... میرا نشانہ اتنا کچا نہیں کہ چوک جاتا۔ مگر میرے ہاتھ سے فار ہو تے ہی..... لمحے کے ہزار ویں حصے میں پستول کا رخ مڑ گیا، اس لیے کہ میں نے سوچا کہ میرے مر جانے پر تمہیں جانے کیسی کیسی وضاحتیں لوگوں کو دینا پڑیں گی..... میں غلط تھا، سزا مجھے ہی ملنا چاہیے تھی اسی لیے اپنا خاتمہ کرنے کا سوچا مگر تم لوگوں کے سامنے کس طرح سراٹھا کر چلو گی؟ کیا کیا جواب دو گی اور کون تمہاری باتوں کا یقین کرے گا؟ بس یہی سوچ آئی، جو اختیار میں ہوتا تو میں اس گولی کو روک لیتا مگر وہ چل چکی تھی..... جانتا ہوں کہ احمد نے کس کس طرح اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس بات کو پھیلنے سے روکا ہے۔ مگر میں قصور وار ہوں تو سزا بھی مجھے ہی میں چاہیے ناں!“

”سزا کا فیصلہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے دانیال..... میں کون ہوں تمہیں سزا دینے والی یا تمہارے ان عیبوں کو فاش کرنے والی جن کا پردہ اللہ نے بہتوں کے سامنے رکھا۔ تمہاری بیٹیاں تمہارے کرتوتوں کو جانتی ہیں..... تم کہتے تھے کہ میں باہر کیوں نہیں نکلتی، اپنا حلقہ احباب کیوں نہیں بڑھاتی، ایک تو تمہیں کھل کھیلنے کی آزادی گھر کے اندر مل گئی تھی جس سے میری بیٹیاں متاثر ہوئیں..... اور کیا بتاؤں تمہیں جو ایک بار میں اپنے دفتر جانے میں لیٹ ہوئی تو میں نے اندر جانے سے پہلے کیا سنا، مسز ہمدانی کے الفاظ نے مجھے زمین میں ہی گاڑ دیا تھا۔ وہ اپنی باقی کو لیگز کے ساتھ ہنس رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔“ دانیال جیسی عورتوں کو تو طوائف کہتے ہیں، مردوں کے لیے اس کا متبادل کیا لفظ ہے؟“ بس اس دن میں نے جانا کہ جتنا حلقہ بڑھاؤں گی اتنی ہی بے عزتی اور بدنامی سمیٹوں گی، جس کی فکر سے تم بے پروا اور آزاد ہو گئے تھے۔“ وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ میں نے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے لیے جینا ہے دانیال! اس لیے میں نے تمہاری اور

دوسروں کی پروا کرنا چھوڑ دی ہے۔“

”مجھے ایک بار معاف کر کے تو دیکھو، تمہاری تو قیر میری نظروں میں اور بڑھ جائے گی حنا!“ اس نے میرے سامنے ہاتھ باندھے۔

”تمہاری نظروں میں میری تو قیر؟“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم ہو کون جو مجھے تمہاری نظروں میں اپنی تو قیر کی پروا ہو؟ جب تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ میں نے تمہیں عمر بھر پونے کی حد تک چاہا، تمہیں ماتھے پر ہٹھا کر رکھا، تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا بھی مجھے تمہاری توہین لگتی تھی۔ میں نے ’آپ‘ سے ’تم‘ کا سفر کتنی طویل مسافت کے بعد طے کیا ہے..... میرا تو دل بھی نہیں چاہتا کہ تم اب میرے سامنے بھی آؤ، مجھ سے بات کرو مجھے چھوڑ..... اور تو اور میرے نام سے جڑا تمہارا نام بھی مجھے برا لگتا ہے۔“

”حنا پلیز..... مجھے چھوڑ کر نہ جانا، مجھ سے خلع نہ لینا، مجھے اپنی بیٹیوں کی خاطر معاف کر دو۔“ میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی بیٹیوں نے ہی تو اسے اس مقام تک پہنچایا تھا، انہوں نے کھل کر اس سے بات کی تھی۔ اسے نہ صرف دنیا بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی ڈرایا تھا، اس سے قطع تعلقی کی دھمکی دی تھی..... اپنی اولاد کے سامنے وہ ڈھٹائی نہ دکھاسکا تھا نہ ہی اسے اس عمر میں یہ گوارا تھا کہ میں اس سے خلع لوں۔ اس کی رہی سہی سا کھ..... (جسے وہ اپنی ساکھ سمجھ رہا تھا) ختم ہو جاتی، اسی معاشرے میں وہ لوگوں کے منہ بند کر سکتا تھا نہ باہر نکلنے کے قابل رہتا۔

اٹھتے بیٹھتے، دانیال اور اس کی بیٹیوں کی طرف سے معافی کے مطالبے کے سامنے میں ڈٹی نہ رہ سکی۔ بیٹیاں کوئی غلطی کریں تو باپ انہیں عموماً معاف نہیں کرتے مگر میری بیٹیاں باپ کی تمام غلطیوں کو معاف کرنے کو تیار تھیں۔ میں نے ان کے چہروں پر باپ کی۔ خود کشی کی کوشش کے دن قیامت اترتے دیکھی تھی اور اس کے تندرست ہو کر گھر آ جانے پر ان کے چہرے پھولوں کی طرح کھلتے دیکھے تھے۔ باپ کو سلامت دیکھ

ہوئے میز پر اعلان کیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دانیال کا سر کچھ اور جھک گیا تھا..... رانیہ نے پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹا پانی پیا، کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

”اس سے زیادہ کا کیا مطلب ماما؟“

”اس سے زیادہ کا مطلب ہے کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں، ہم گھر میں اسی طرح رہیں گے جیسے دو اجنبی رہتے ہیں..... صرف دنیا کے دکھاوے کو ہی تو یہ رشتہ رہ گیا ہے۔“ میں نے حتیٰ لہجہ میں کہا۔

”اس طرح تو ٹھیک نہیں ہے ماما!“ فاطش نے کہا۔ ”اب تو آپ دونوں بالکل تنہا رہ جائیں گے اور ایسے میں آپس میں لا تعلقی تو ٹھیک نہیں۔“

”اس وقت، اس سے زیادہ جبر میں خود پر کر نہیں سکتی بیٹا!“ کہہ کر میں نے اپنی کرسی کھسکائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”نہ ہی میں اسے دل سے معاف کر سکتی ہوں، اتنا بھی میں تم لوگوں کی خاطر کر رہی ہوں۔ میں جھوٹ بھی نہیں بول سکتی، اگر بظاہر کہہ بھی دوں تم لوگوں کو خوش کرنے کو تو وہ جھوٹ ہوگا..... معاف کرنا میرے اختیار میں ہے، وہی نہیں کیا جا رہا اور بھولنا..... یہ تو بالکل ناممکن ہے، باقی اس کی سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

”آپ ایسی ظالم تو کبھی نہیں تھیں ماما!“ رانیہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں ایسی بے وقعت بھی کبھی نہ تھی میری جان!“ میری آنکھیں بھر آئیں، صدف نے کچھ کہنا چاہا تو احمد نے اسے روک دیا۔

”ممائی جان کو کسی بات پر مجبور نہ کرو.....“ احمد نے کہا۔ ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا، کہنا آسان ہے مگر جس پر گزرے وہی جانتا ہے۔“ وہ سب جان گئی تھیں کہ احمد دانیال کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا، غالباً اس نے صدف کو بتایا تھا اور صدف نے باقی بہنوں کو۔

کران کی مسکراہٹیں لوٹ آئی تھیں۔ دل سے تو میں نے خلع لینے کا ارادہ پہلے سے ہی ترک کر دیا تھا، میری دو بیٹیاں تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی تھیں، انہیں سکون کی ضرورت تھی۔ فاطش نئی زندگی کا آغاز کرنے والی تھی..... اس کے لیے ان حالات میں خوش رہنا ممکن نہ ہوتا۔

رانیہ کو اس روز یوں اچانک آتا... دیکھ کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ اس کے سر پر انز نے تو میری جان ہی لے لی تھی جو اسی وقت فائر نہ ہوتا تو میں اس سے پوچھتی کہ کہیں وہ عابد سے ناراض ہو کر تو نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی اور تھکاتھکا وجود کوئی کہانی سنارہا تھا..... وہ کہانی تو اس نے بعد میں سنائی، اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ عابد کی طرف سے بھی... بدگمانی کا شکار ہو گئی تھی اور اس نے اس سے علیحدگی اختیار کرنے تک کا بھی سوچ لیا تھا۔ اس نے تو ایک غلط فہمی کی بنا پر ایسا سوچا تھا جو اللہ نے خود ہی دور کر دی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس کا عابد سے رابطہ نہ ہوا اس وقت جب وہ مایوسی اور بدگمانی کی انتہا پر تھی، ورنہ وہ غصے میں کیا کچھ بول دیتی اور عابد کا دل برا ہوتا، حالات ٹھیک بھی ہو جاتے مگر دلوں میں ایک گرہ پڑ جاتی..... عابد کو یاد رہتا کہ رانیہ نے غصے میں اسے کیا کیا کہا اور اس کے بارے میں کیا کیا بدگمانیاں پال لی تھیں۔ اگر رانیہ ناراض ہو کر آتی یا وہ عابد سے خلع لے لیتی، اگر فاطش نے اشعر سے خلع لی تو کیا مجھے اس کی تکلیف نہیں تھی اسی طرح اگو میں خلع لیتی تو کیا میری بیٹیوں کو تکلیف اور مسائل نہیں ہوں گے؟“ میں نے خود سے سوال کیا، اور پھر حنا مرگئی اور صرف ایک ماں زندہ رہ گئی.....

☆☆☆

”ٹھیک ہے..... میں خلع نہیں لوں گی، مگر چھوڑوں گی نہ ہی دانیال سے مگر چھوڑنے کا کہوں گی مگر مجھے اس سے زیادہ پر مجبور نہ کیا جائے.....“ میں نے سب بیٹیوں، احمد اور دانیال کے ساتھ کھانا کھاتے

”میرے سر میں درد ہے.....“ کہہ کر میں نے چلنے سے پہلے دانیال کے چہرے کو دیکھا جس پر شرمندگی سے پیلا پن آ گیا تھا، وہ بھرے بازار میں ننگا ہو گیا تھا جیسے، اس نے اپنی عزت خود کھوئی تھی اپنے پیاروں کی نظروں میں، اب اسے عمر بھر اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہوگا۔

”تم لوگ خواہ مخواہ ممائی جان کو مجبور نہ کرو.....“ وہ دل کی بہت نرم ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ان کے دل میں ماموں کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا، میں جانتا ہوں ان کو، وہ معاف تو کر دیں گی ماموں کو مگر اس میں وقت لگے گا۔ وہ سب کچھ بھلانا..... بھی ممکن ہے جب ماموں خود کو بدلیں گے، دوبارہ غلطی نہیں کریں گا اور اپنے رویے سے انہیں ممائی کو ان کی اہمیت کا احساس دلانا ہوگا!“ میں کھانے کے کمرے سے نکلی تو یاد آیا کہ میرا فون وہیں رہ گیا تھا، واپس اندر داخل نہ ہوئی تھی کہ احمد کی آواز نے قدم روک لیے۔

”پاپا اگر ایسا کچھ کیا آپ نے دوبارہ.....“

صدف کی آواز بھرا گئی۔

”تو آپ ہم سب بہنوں کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے.....“ رانیہ نے اس کا فقرہ پورا کیا۔ ”ہم سب خود کشی کر لیں گی۔“ میرا دل کانپ گیا۔ میں اپنا فون لیے بغیر واپس آ گئی۔

☆☆☆

فاطش کی شادی سجاد سے ہو گئی اور اس کے چند ماہ کے بعد وہ اسود کے ساتھ امریکا روانہ ہو گئی..... عابد بھی چند ہفتوں کے لیے آیا تھا اور اس کے ساتھ رانیہ کی واپسی ہوئی۔

”اب تم مصطفیٰ کے بہن بھائی لانے کا پلان کرو رانیہ..... وہ بڑا ہو گیا ہے، اسے گھر میں رونق چاہیے۔“

ایئر پورٹ پر اسے واپس نہ جانے کی ضد کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے رانیہ سے کہا۔

نیلیم کے ہاں بیٹے اور صدف کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی۔ ہمارے خاندان میں خوشیوں کی لہر دوڑ

گئی۔ خوشی کے ان سب مواقع پر ہم ساتھ ساتھ شامل ہوئے۔ میں اور دانیال..... مگر یہ سب صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ ہم ایک گھر میں رہتے تو ہیں، دن کو اپنے اپنے جھمیلوں میں مصروف مگر جو نہی شام ڈھلتی ہے تو ہم گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں، کھانا ہم ملازموں کے سامنے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹی وی لاونج میں اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی پر خبریں سنتے اور سبز قہوہ پیتے ہیں مگر ملازموں کے اپنے کوارٹروں میں جاتے ہی ہم دونوں دو علیحدہ علیحدہ کمروں کا رخ کرتے ہیں۔ اب یہی زندگی کا ڈھب ہے۔ میں نے دانیال کو کبھی زبان سے بھی نہیں کہا کہ..... ”جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا!“ زبان دل و دماغ کے ساتھ ہے، جھوٹ نہیں بول سکتی نہ ہی میں منافقت کر سکتی ہوں۔ معاف کر دوں تو اس کا کیا بھول نہیں سکتی، ہاں جانچ رہی ہوں، کبھی کبھار دل ہمتا بھی ہے..... شاید کبھی ایسا وقت آ جائے کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں، بقول احمد کے، وہ خود کو اس حد تک بدل لیں، اپنی تمام بری حرکتیں چھوڑ کر اللہ سے معافی مانگیں، اپنے کئے کو بھلانے میں میری مدد کریں۔ میری نظروں میں مجھے گرا دینے والے کو ہی علم ہونا چاہیے کہ اسے کیا کرنا ہے..... ایسی زندگی صرف اسی کے لیے سزا نہیں ہے بلکہ میرے لیے بھی ہے۔ ایک ہی بار ملنے والی زندگی کو اس طرح گزارا جائے کہ جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا وہ نظر کے سامنے ہو، ہاتھ اسے چھونا چاہیں تو چھو بھی سکیں، آنکھ اسے دیکھے، اس سے قدم ملا کر دنیا کے سامنے چلتی بھی ہوں مگر دماغ اسے شجر ممنوعہ قرار دے دے، دل کا کیا کروں جو کہتا ہے.....

زندگی جس کے مقدر میں ہوں خوشیاں تیری اس کو آتا ہے نبھانا، سو نبھاتے گزری! زندگی نام ادھر ہے کسی سرشاری کا..... اور ادھر دور سے اک آس لگاتے گزری زندگی خاک نہ تھی، خاک اڑاتے گزری! تجھ سے کیا کہتے، تیرے پاس جو آتے گزری (ختم شد)

کمرے میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔
 کچھ دیر پہلے ثریا بیگم جتنی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں
 اب چہرے پر پتھر لیے تاثرات لیے یک ٹک سامنے کی
 طرف دیکھ رہی تھیں۔ جہاں سے پردہ اٹھا کر چائے کی
 ٹرالی لیے وہ دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی ان کی
 طرف بڑھ رہی تھی۔ سلیقے سے سر سے دوپٹا اوڑھے،
 چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ لیے۔ وہ بلاشبہ ایک خوب
 صورت اور جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ پاس آ کر اس نے

آہستگی سے سلام کیا اور سب کو ایک، ایک کر کے چیزیں
 سرو کرنے لگی۔
 اس کے لہجے کی نرمی اور مٹھاس دل موہ لینے والی
 تھی۔ اس کے سلام کا جواب بہت گرم جوشی سے صرف
 روبینہ آنٹی نے دیا تھا۔ ثریا بیگم نے سرد مہری سے نگاہ
 پھیر لی تھی۔ جسے اس حساس لڑکی اور اس کی سویرسی ماں
 عقیلہ نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔
 چائے سرو کرنے کے بعد وہ خاموشی سے اپنی

مَعذُورَہ

ترقی العین خرم ہاشمی



ماں کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ہر چیز سے سلیقہ اور تمیز جھلکتی تھی۔ جس کا اندازہ دیکھنے والوں کو بہ خوبی ہو جاتا تھا۔ عقیلہ حق میزبانی بخوبی ادا کر رہی تھیں۔

وہ اب کمرے سے جا چکی تھی جبکہ عقیلہ، ثریا بیگم کے تاثرات میں الجھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد عقیلہ ان سے اجازت لے کر کسی کام سے ڈرائنگ روم سے باہر آئیں۔ جیسی انہوں نے اپنے پیچھے زہر میں ڈوبی ثریا بیگم کی تلخ آواز سنی۔

”میرے پڑھے لکھے، برسرِ روزگار اور خوب صورت بیٹے کے لیے ایسا رشتہ دیکھا ہے آپ نے؟“ ان کے باہر جاتے ہی ثریا بیگم رشتے کروانے والی روبینہ آنٹی پر برس پڑیں۔

”ثریا بہن میری بات سنیں۔ آپ نے جس طرح کے لوگ اور لڑکی کا کہا تھا ماشاء اللہ یہ ویسے ہی ہیں۔ چھوٹا سا گھرانہ، دو بہن بھائی، پڑھے لکھے، صاف ستھرے، شریف لوگ..... آپ نے عقیلہ بہن اور ان کی بیٹی کے طور طریقے تو جانچے ہی ہوں گے۔ شائستگی، تمیز اور خاندانی رکھ رکھاؤ ہے۔ میں ان لوگوں کو کافی عرصے سے جانتی ہوں۔ اس دن جب آپ نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے اچھے اور شریف لوگوں میں رشتہ دیکھنے کو کہا تو میرے ذہن میں فوراً انہی لوگوں کا خیال آیا تھا۔“ روبینہ آنٹی نے وضاحت سے ثریا بیگم کو بتایا تو وہ تپ گئیں۔

”میں نے اپنے بیٹے کے لیے بلاشبہ اچھے اور شریف لوگوں میں ہی رشتہ کروانے کے لیے کہا تھا مگر یہ نہیں کہا تھا کہ لڑکی اپاچ ہو۔ آپ میرے بیٹے کے لیے اس معذور لڑکی کا رشتہ دیکھنے لائی ہیں۔ جو لڑکی خود ٹھیک سے چل نہیں سکتی۔ اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی وہ ایک گھر کو کیسے سنبھال سکتی ہے۔ بقول اس کی ماں کے یہ کبھی کبھی اسٹک بھی استعمال کرتی ہے تو ایسی لڑکی جو اپنے چلنے کے لیے اسٹک کی محتاج ہو وہ زندگی کی دوڑ میں کیسے حصہ لے سکتی ہے؟ میرے بیٹے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کیا چل سکے گی؟ حد کرتی ہیں آپ بھی۔“ ثریا بیگم نے سارا

لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ادھ کھلے دروازے کے پیچھے موجود اس کی بڑی، بڑی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی اور وہ مزید کچھ سنے وہاں سے چلی گئی۔

”معذور اور اپاچ!“ روبینہ آنٹی نے شاکد لہجے میں دہرایا۔ ”بہت افسوس ہے ثریا بیگم مجھے آپ سے ایسے رویے اور سوچ کی امید نہیں تھی۔ یہ بچی نہ تو معذور ہے اور نہ اپاچ..... ہاں بچپن میں ہونے والے حادثے کی وجہ سے اس بچی کی ایک ٹانگ میں معمولی سا نقص ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتی ہے مگر یہ بہت معمولی سالنگ ہے۔ یہ بچی پڑھی لکھی، باشعور ہے اور مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ اپنا اور گھر والوں کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے اور دوسری بچیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ بھی کر رہی ہے۔ شکل، صورت اور اخلاق میں بھی یہ کسی سے کم نہیں ہے۔ مجھے آپ کی کوتاہ بینی پر شدید افسوس ہو رہا ہے بلکہ اس کا یہ نقص تو اتنا واضح بھی نہیں ہے مگر آپ کو صرف یہی نظر آیا۔“

روبینہ آنٹی نے سنجیدگی سے کہا تو ثریا بیگم ناگواری سے منہ بنا کر رہ گئیں جبکہ ساتھ بیٹھی ہوئی ان کی بیٹی جو میٹرک کی طالبہ تھی خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ دونوں میں سے کون ٹھیک ہے اسی وقت عقیلہ بیگم کمرے میں دوبارہ داخل ہوئیں تو انہیں دیکھتے ہی ثریا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں اور جانے کی اجازت چاہی۔

اس سے پہلے عقیلہ بیگم کچھ کہتیں وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کی بد اخلاقی پر روبینہ آنٹی آہستہ سے معذرت کرتی دکھی دل کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

”ثریا بہن معذرت کے ساتھ مگر میں دوبارہ اس کام میں آپ کی مدد نہیں کر سکوں گی۔ دراصل آپ کو شاید برا لگے مگر میں یہ کام کسی ذاتی غرض یا پیسے کے لیے نہیں کرتی ہوں بلکہ فی سبیل اللہ کرتی ہوں اور میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ رشتہ ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بات

انہوں نے بہت دھوم دھام سے اپنے بیٹے کی شادی کر دی تھی۔ اب اس بات کو بھی تین سال گزرنے والے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی اب تھرڈ ایئر میں بڑھ رہی تھی۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی مگر اسی روز مرہ کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں وہ لمحہ، وہ وقت ضرور آتا ہے جب وقت کے ہاتھ گروی رکھے الفاظ اور عمل واپس بھی لوٹائے جاتے ہیں۔

☆☆☆

”لگتا ہے آپ نئی ہیں اس کالج میں۔ میں کافی دیر سے آپ کو یہاں اکیلے بیٹھا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ میرا نام نورین ہے اور آپ کا؟“ عاصمہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی سب لڑکیوں کو آپس میں ہنستا بولتا دیکھ رہی تھی جب ایک لڑکی نے اس کے پاس آ کر اپنا تعارف کروایا۔

”جی، میں اس کالج میں نئی ہوں اور آج میرا پہلا دن ہے اس کالج میں۔ اس لیے فی الحال کوئی دوست بھی نہیں ہے۔“ عاصمہ نے مسکراتے ہوئے نورین سے ہاتھ ملایا جو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

”میری بھی بیسٹ فرینڈ ایک ہی تھی۔ جس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور میں یہاں اکیلی رہ گئی مگر آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ میری یہ شکایت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ سووی آر فرینڈز؟“ نورین نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا جسے عاصمہ نے مسکراتے ہوئے تمام لیا۔ یوں کالج کا پہلا دن عاصمہ کی توقع سے بڑھ کر اچھا ثابت ہوا تھا۔ وہ ایف ایس سی میں مطلوبہ نمبرز نہ آنے اور اپنی فرینڈز سے پھٹنے کی وجہ سے جتنی اداس اور اکیلی خود کو محسوس کر رہی تھی۔ نورین کی زندہ دلی اور اچھی کمپنی میں اس کی اداسی کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ورنہ اسے نئے کالج اور اجنبی لوگوں میں بی ایس سی کے یہ دو سال گزارنا بہت مشکل لگ رہے تھے۔ پہلا دن لڑکیوں اور ٹیچرز سے تعارف میں ہی گزر گیا تھا۔ سوائے اسٹیٹ کی ٹیچر کے جو کچھ دن کی لیو پر تھیں۔ عاصمہ نے نورین اور باقی کلاس فیلوز سے ان کی بہت تعریف سنی تھی۔ جس نے اس کے اشتیاق کو

ہے مگر میں ان لوگوں کو ساتھ لے کر نہیں چلتی جو اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوں جن کے لیے کسی انسان کے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ رشتہ پسند آنا یا نہ آنا آپ کا ذاتی مسئلہ ضرور ہے مگر کسی کو منع کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ زیادہ نہیں تو جتنی عزت انہوں نے آپ کو دی تھی اتنی ہی آپ انہیں لوٹا سکتی تھیں۔ اچھے اور خاندانی لوگوں کی پہچان انہی باتوں سے ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر آپ بھی بیٹی والی ہیں۔ کسی کی بیٹی کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کرنے سے پہلے ایک بار سوچنا ضرور چاہیے۔“ روبینہ آنٹی راستے بھر انہیں ان کے مکروہ رویے کا احساس دلاتی رہیں۔ ان کی باتوں پر جلتی بھنتی ثریا بیگم منہ ہی منہ میں بڑا کر رہ گئیں روبینہ آنٹی کا گھر آچکا تھا۔

☆☆☆

یہ سچ تھا کہ روبینہ آنٹی، یہ کام فی سبیل اللہ کرتی تھیں۔ ثریا بیگم سے ان کی ملاقات، اپنی دوست کے گھر میلاد میں ہوئی تھی اور وہاں سے آپس میں اچھی سلام دعا شروع ہوئی۔ جب ثریا بیگم کو پتا چلا کہ روبینہ یہ کام بھی کرتی ہیں تو انہوں نے اپنے تیسرے نمبر والے بیٹے جو ابھی ابھی برسر روزگار ہوا تھا کے رشتے کے لیے کہا۔ اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے لیے بہویں وہ خاندان سے لائی تھیں۔ اسی لیے اب وہ باہر سے بہو لانا چاہتی تھی۔ بڑی دونوں شادی کے کچھ عرصے بعد لڑجھکڑ کر الگ ہو چکی تھیں۔ اپنی بڑی شادی شدہ بیٹی سے مشورہ کر کے اب وہ خاندان سے باہر رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بڑی بیٹی دوسرے شہر بیاہی ہوئی تھی۔۔۔

سو اس لیے ماں کے ساتھ اس مہم پر نہیں جاسکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی چھوٹی اور لاڈلی بیٹی جو ابھی میٹرک کی طالبہ اور دنیا سے یکسر انجان تھی کو اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔

اس دن کے بعد سے روبینہ آنٹی سے کبھی ان کا رابطہ نہیں ہوا تھا اور دوسری رشتہ کروانے والیوں کے توسط سے انہیں اپنا مطلوبہ گوبر ناپا بل چکا تھا اور

کافی بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

”لگتا ہے تمہیں کالج پسند آ گیا ہے۔ اس لیے موڈ اتنا خوشگوار ہے؟“ دوپہر کے کھانے کے بعد جب دونوں ماں بیٹی سستانے کے لیے لیٹیں تو اماں نے عاصمہ سے پوچھا جو پُر جوش ہو کر انہیں اپنے تمام دن کی روداد سنار ہی تھی۔ ایک دم سے رک گئی اور کچھ سوچ کر بولی۔

”اماں کالج تو سچ میں بہت اچھا ہے مگر نورین نہ ملتی تو شاید اتنا اچھا نہیں لگتا۔ سچ میں بہت اچھی اور کوآپرٹیوٹری کی ہے وہ۔“ عاصمہ جب سے کالج سے لوٹی تھی نورین نامہ سنار ہی تھی۔ اماں جانتی تھی کہ ان کی یہ بیٹی بہت جذباتی سی ہے۔

”کیوں اماں کو اپنی بیکاری باتوں سے بور کر رہی ہو۔“ اسی وقت تھکا ہارا فیصل کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر ڈھسے سا گیا۔ فیصل کو دیکھ کر عاصمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”جی نہیں بھائی، اماں تو میری باتوں سے بہت خوش ہوتی ہیں۔“ عاصمہ نے بھائی کو منہ چڑاتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”اور کیا اگر عاصمہ بھی نہ بولے تو ہم میاں بیوی یا تو ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جائیں یا پھر دیواروں سے باتیں کریں۔ تمہاری بیوی تو بچوں سمیت آئے روز میکے گئی ہوتی ہے کسی نہ کسی بات پر لڑ جھگڑ کر اور تم ٹھہرے کاٹھ کے الو..... ہر وقت اسے منانے اس کے پیچھے چلے جاتے ہو۔“ اماں نے تیکھے انداز میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”اوہو..... اب بس بھی کر دیں اماں پہلے ہی میں شہلا کے ساتھ دماغ کھپا کر آ رہا ہوں اور اب گھر آتے ہی آپ شروع ہو گئیں۔ مت بھولیں کہ شہلا بھی آپ کی ہی پسند ہے۔ جسے آپ بہت مان اور دعوے کے ساتھ بیاہ کر لائی تھیں۔ میں تو آپ دونوں کے درمیان فٹ بال بن کر رہ گیا ہوں۔ بیوی کی سنوں تو ماں ناراض، ماں کی مانوں تو بیوی ناراض ہو کر میکے جا

بیٹھتی ہے۔ ان روز، روز کے جھگڑوں میں میرے دونوں بچے بھی بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ کیا کروں؟ اسے لے کر علیحدہ ہو جاؤں بڑے دونوں بھائیوں کی طرح؟“ شدید ذہنی دباؤ کا شکار فیصل بری طرح پھٹ پڑا اور غصے سے اپنی پیشانی کو مسلنے لگا۔ اماں نے عاصمہ کو اشارہ کیا جو فوراً اٹھ کر بھائی کے لیے پانی لینے چلی گئی۔ اب اماں کو بھی اپنی جلد بازی پر افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے ہی شہلا اور بچوں کی وجہ سے اداس اور پریشان سا رہنے لگا تھا اور پر سے اماں کی ایسی باتیں..... اس کا رہا سہا ضبط بھی ختم کر دیتی تھیں۔ ”بھائی پانی۔“ عاصمہ نے پانی کا گلاس فیصل کی طرف بڑھایا جسے تھام کر اس نے فوراً منہ سے لگالیا۔ ٹھنڈا پانی پی کر اس کے جلتے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو اسے اپنے لہجے کی سختی اور کڑواہٹ کا احساس ہوا۔

”سوری اماں، میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا مگر شہلا کے روز، روز کے بڑھتے مطالبوں اور لڑائی جھگڑوں سے میں سخت تنگ آ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟“ فیصل نے ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اماں چادر کے پلو سے اپنی نم آنکھیں پونچھتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔ ”بیٹا میں نے تو سارا شہر چھان کر کتنے رشتوں کو رد کر کے اس شہلا کو تمہارے لیے منتخب کیا تھا مگر مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آ کے ہمارا جینا حرام کر دے گی۔“ اماں نے دلگیر لہجے میں کہا تو فیصل سر جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ پچھتانے سے کیا حاصل..... چار سال ہو گئے ہیں یہ مصیبت جھیلنے ہوئے۔“ فیصل نے افسردگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ اماں اسی طرح افسردہ سی بیٹھی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

”یہ مس نوشین ہیں، اسٹیٹ کی ٹیچر۔“ نورین نے کہنی مار کر دوسری طرف دیکھتی عاصمہ کو متوجہ کیا تو

دیوار

جب دیواروں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار گر جاتی ہے۔ مگر جب دلوں میں دراڑ پڑتی ہے تو دیوار بن جاتی ہے۔ اپنے دلوں میں دیوار نہیں بلکہ در بناؤ۔

از: نزہت جبین ضیاء کراچی

کیا خوب بتایا

میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے بُرے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے۔

از: ممتاز خانم، کراچی

اس نے گردن موڑ کر سامنے کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک گلابی چہرے پر نرم اور ہلکی سی مسکراہٹ لیے، خوب صورت سی لڑکی کھڑی کلاس سے اپنا تعارف کروا رہی تھی اور پھر کلاس کی سب لڑکیاں باری باری اٹھ کر اپنا تعارف کروانے لگیں۔ عاصمہ، مس نوشین کو دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔ اسے یہ چہرہ مانوس سا لگ رہا تھا۔ جب عاصمہ نے اپنی باری آنے پر اپنا تعارف کروایا تو اس نے مس نوشین کو چونکتے اور خود کو غور سے دیکھتے ہوئے پایا مگر جلد ہی وہ باقی کلاس کی طرف متوجہ ہو گئیں اور لیکچر دینے لگیں۔ ساری کلاس ہمہ تن گوش نہیں سن رہی تھی۔ ان کے لہجے کی مٹھاس میں ایک سحر تھا۔ جو سب کے دلوں پر اپنا اثر چھوڑ رہا تھا۔ ان کا بڑھانے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ ساری کلاس بہت دلچسپی اور توجہ سے انہیں سن رہی تھی اور آنے والے دنوں میں مس نوشین سب کے ساتھ، ساتھ عاصمہ کی بھی پسندیدہ ٹیچر بن چکی تھیں۔

☆☆☆

اس دن صبح سے ہی موسم کے تیور کافی خراب تھے۔ کالج میں کافی کم تعداد میں طالبات آئی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جو سارا دن جاری رہی۔ عاصمہ کافی دیر شیڈ کے نیچے کھڑی بارش ہلکی ہونے کی دعا کرتی رہی۔ کالج سے بس اسٹاپ کچھ فاصلے پر تھا۔ کافی لڑکیاں جا چکی تھیں۔ جونہی بارش ہلکی ہوئی عاصمہ اللہ کا نام لے کر خود کو بارش کی کن من سے بچاتی بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ سنان سڑک دیکھ کر وہ جلدی، جلدی قدم اٹھانے لگی جب ایک گاڑی آکر اس کے پاس رکی۔ عاصمہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ گاڑی میں دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو خواہش بھری نظروں سے سر سے لے کر پاؤں تک اسے گھور رہے تھے۔ عاصمہ خوف زدہ سی ہو کر مڑ کر دیکھنے لگی۔ کالج کافی پیچھے رہ گیا تھا۔

”آجائیں مس، ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے

ہیں۔“ ایک لڑکے نے مہذب بننے ہوئے کہا مگر اس کی مکروہ تہی کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ عاصمہ نے انہیں جواب دینے کے بجائے تیز، تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ دونوں لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ عاصمہ کچھ سمجھتی ایک لڑکا فوراً گاڑی سے اتر آیا اور عاصمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ عاصمہ نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھالیتے۔ ایک گاڑی آکر ان کے پاس رکی۔ وہ لڑکا اور عاصمہ دونوں چونک گئے۔ گاڑی سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر عاصمہ بے اختیار چلائی۔

”مس نوشین.....!“ تب تک مس نوشین گاڑی سے اتر چکی تھیں انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی اسٹک زور سے اس لڑکے کے ہاتھ پر ماری۔ تکلیف کی شدت سے بلبلا کر اس نے عاصمہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سامنے کھڑی لڑکی اور اس کے پیچھے آتے ڈرائیور کو دیکھ کر فوراً اپنی کار میں بیٹھ کر رنو چکر ہو گئے۔ عاصمہ رونی ہوئی مس نوشین کے ساتھ لگ گئی۔ اگر مس نوشین بروقت نہ پہنچتیں تو نہ جانے آج اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ مس نے اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا تھا۔

عاصمہ سارا راستہ بہت ڈری اور سہی ہوئی سی بیٹھی رہی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچ گئی تھی۔ ایک خوف اب بھی اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

گاڑی میں مس نوشین کے ساتھ ایک عمر رسیدہ خاتون بھی بیٹھی تھیں جو عاصمہ کو تسلی دے رہی تھیں اور وہ بالکل خاموش تھی۔ زندگی میں ہونے والے بہت سے حادثے اسی طرح قوت گویائی کو سلب کر دیتے ہیں اور ایک مسلسل حیرانی اور سوچ دے جاتے ہیں کہ اگر ایسا ہو جاتا تو.....؟

☆☆☆

اماں کا دل آج صبح سے ہی بہت بے چین تھا۔ انہیں بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ ایسے موسم میں عاصمہ کو کالج کیوں بھیج دیا۔ ایسے موسم میں لوکل ٹرانسپورٹ کا ملنا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ بے چینی سے اندر باہر چکر کاٹ رہی تھیں۔ شہلا اپنی ساس کو بے چین دے کر قرار دیکھ کر بھی مست تھی۔ وہ اتنی ہی بے حس اور بے پروا سی تھی۔ اسی وقت بھی وہ اپنے دونوں بچوں کو پاس بٹھائے کھانا کھا رہی تھی اور ایک نظر اپنی ساس پر بھی ڈال رہی تھی۔ جنہوں نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا کہ عاصمہ آجائے تو اکٹھے ہی کھائیں گی۔ اسی وقت ڈور بیل ہوئی تو اماں نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور عاصمہ کے ساتھ ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر چونک گئیں۔ عاصمہ روتے ہوئے اماں کے سینے سے لگ گئی تو اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”کیا ہوا میری بچی، سب خیر تو ہے ناں؟ صبح سے میرا دل بہت بے چین اور پریشان سا تھا۔“ اماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں عاصمہ کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھ کر پوچھا۔

”آپ حوصلہ رکھیں بہن، بچی ہے اسی لیے گھبرا گئی ہے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے سب ٹھیک ہے۔ آپ اندر چلیں میں آپ کو سب تفصیل سے بتاتی ہوں۔“ ان خاتون نے نرمی سے کہا تو اماں کو احساس ہوا اور وہ

انہیں فوراً لے کر اندر آئیں۔ شہلانے عاصمہ کے ساتھ اجنبی خاتون کو اندر آتے دیکھا تو چونک گئی اور سلام کر کے اٹھ کر کچن میں چلی گئی مگر اس کے کان اندر کی گفتگو پر ہی لگے ہوئے تھے۔

”بس بہن! اللہ نے بہت کرم کیا۔ میری بہو اسی کالج میں لیکچرار ہے۔ مجھے ضروری کام تھا تو ڈرائیور کے ساتھ میں بھی اسے لینے کالج چلی گئی۔ بس ہم واپس آرہے تھے جب راستے میں.....“ وہ خاتون دھیرے، دھیرے کر کے سب بتانے لگیں۔

”اماں یہ مس نوشین کی بات کر رہی ہیں جن کے بارے میں اکثر میں باتیں کرتی رہتی ہوں۔ آج اگر وہ نہ ہوتیں تو.....“ عاصمہ نے اپنی ماں کے گلے لگتے ہوئے کہا تو اماں کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عاصمہ کے منہ سے اکثر انہوں نے مس نوشین کا ذکر سنا تھا اور آج وہی اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔

”میں آپ کا یہ احسان کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔ میں خود آپ کی بہو کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، کہاں ہے وہ؟ کیا وہ آپ لوگوں کے ساتھ نہیں آئیں؟“

”وہ دراصل باہر کار میں ہی بیٹھی ہوئی ہے، میں بھی اس بچی کی حالت کے پیش نظر اندر چلی آئی تھی کہ خود اسے اندر تک چھوڑ آؤں..... اچھا اب میں چلتی ہوں ہمیں کسی کام سے جانا ہے۔“ ان نفیس سی خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا تو اماں فوراً بولیں۔

”نہیں..... میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔ جاؤ عاصمہ بیٹے اپنی مس نوشین کو بھی بلا کر لے آؤ۔ کچھ کھائے پیے بغیر آپ لوگ نہیں جاسکتے۔“ اماں کے بے حد اصرار پر ان خاتون کو بیٹھنا ہی پڑا۔ اماں، بہو کی بے پروائی اور بدتہذیبی کو دل ہی دل میں کوسی کچن کی طرف چل پڑیں۔ اسے پتا بھی تھا کہ مہمان آئے ہیں مگر اس نے کچھ بھی پوچھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ جب تک اماں کو لڈ ڈرنک گلاسوں میں ڈال کر لائیں۔ عاصمہ، مس نوشین کو لیے اندر لاؤنج میں داخل ہو رہی

نے آپ کے گھر کی عزت بچائی ہے۔ میں آج ایک عزت دار گھرانے کی بہو بھی ہوں اور ایک محبت کرنے والے شوہر کی بیوی اور ہاں دو بچوں کی ماں بھی ہوں اور یقین کریں ان سب کے ساتھ ساتھ میں اس معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہوں اور یہ سب کچھ میرے آس پاس رہنے اور بسنے والے ان لوگوں کی مضبوط سوچ اور یقین کی وجہ سے ہوا ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جسمانی معذوری سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک ذہنی و اخلاقی معذوری ہے۔ جسمانی معذوری پھر بھی قابل قبول اور قابل علاج ہوتی ہے مگر اخلاقی معذوری اور تہذیبی بد حالی نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیتی ہے۔“ وہ کچھ بل رک کر پھر بولی تھی۔

”میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا آنٹی اسی لیے عاصمہ کو پہلے دن پہچان لینے کے باعث میں آج آپ کے سامنے آنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے کہ جب اللہ نے مجھے بہترین سے نوازا ہے تو مجھے کسی سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو بہت معذرت چاہتی ہوں۔“ نوشین نے بہت سلیقے اور تہذیب سے کہا اور ایک نظر حیران سی کھڑی عاصمہ اور شرمندہ سی کھڑی ثریا بیگم پر ڈالی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

آج عاصمہ کو سمجھ آیا تھا کہ اسے مس نوشین کا چہرہ مانوس سا کیوں لگا تھا۔ آج اسے کئی سال پہلے کا وہ سین یاد آ گیا تھا جب وہ اماں کے ساتھ اپنے بھائی فیصل کے رشتے کے لیے نوشین کو دیکھنے گئی تھی۔

ثریا بیگم کو بھی آج صحیح معنوں میں ذہنی اور اخلاقی معذوری اور جسمانی معذوری میں فرق سمجھ میں آیا تھا۔ آج وہ تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں کہ اس اخلاقی معذوری سے بہتر تو وہ جسمانی معذوری ہی ہے جو کم از کم انسانی وجود کو کائی تو نہیں لگاتی کائی لگے وجود نہ اپنے لیے کارآمد ہوتے ہیں اور نہ معاشرے کے لیے۔

تھی۔ میز پر گلاسوں کی ٹرے رکھتی اماں کی نظر جوں ہی اسٹک کے سہارے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس لڑکی کے سلیج چہرے پر پڑی وہ اپنے ذہن پر زور دیتی ایک دم سے بری طرح چونک گئیں۔ حیرت اور شاک کی کیفیت میں وہ اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے ایک معمولی سے نقص کی وجہ سے انہوں نے بری طرح رد کیا تھا۔ اس کا مذاق اڑایا تھا اور آج وہی لڑکی پورے اعتماد اور شان کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ انہوں نے حیرت سے اس نفیس اور سو برسی عورت کی طرف دیکھا۔ جن کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے ان کی خاندانی امارت اور سلیقے طریقے کا پتا چل رہا تھا اور اس عورت نے اپنے اکلوتے اور خوب صورت بیٹے کے لیے اس لڑکی کا انتخاب کیا تھا اور اب بھی کتنے فخر اور خوشی سے اپنی بہو کی تعریف کر رہی تھی۔ کیا سچ میں ایسا بھی ہوتا ہے؟

ہاں اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ زندگی کا امرت، مٹی کے کچے برتن میں بھی مل سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ برتن سونے کا ہو یا چاندی کا بس یقین اور نیت خالص ہونی چاہیے۔ یہ امرت کسی کا بھی نصیب بن سکتا ہے۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان خاتون نے اجازت چاہی اور خدا حافظ کہتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئیں۔ ان کے پیچھے، پیچھے نوشین بھی نکلنے لگی۔ جب اماں نے دھیرے سے نوشین سے اپنے چار سال پہلے والے بد صورت رویے اور الفاظ پر معافی مانگی تو باہر کی طرف قدم بڑھاتی وہ رک گئی اور پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک اسی خاموشی کے ساتھ وہ ان کے شرمندہ چہرے کو دیکھتی رہی پھر بولی تو اس کا لہجہ بہت سہاٹ تھا۔

”دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ آپ نے رشتے سے انکار کیا۔ دکھ اس بات کا تھا جو جواز اور الفاظ آپ نے مجھے مسترد کرتے ہوئے استعمال کیے کہ جو لڑکی اسٹک کی محتاج ہو وہ ایک گھر کو کیسے چلا سکتی ہے؟ اور آج وقت نے کیسی کروٹ لی کہ اسی اسٹک کی مدد سے میں

پاکھونے کھونے کے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو۔۔۔ مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو پچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

لاہور

10 اگست 1991ء

وہ ٹھنک کر رکا تھا اور چونک کر مڑا تھا۔

وہ تینوں غیر ملکی خواتین، مارکیٹ کے اس بڑے

سپر اسٹور میں دکاندار سے قیمت کم کرانے کی پاکستانی اسٹائل کی زنانہ بحث میں ابھی پیچھے انتظار میں کھڑے دیگر خریداروں کی تنگی وقت سے قطعاً بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان تینوں میں بالکل بائیں طرف والا انتہائی



چھوٹے ہیرا سائل والا سر تھا، جس نے اسے اس قدر غور سے دکاندار سے ابھی خواتین کا ایسا بھرپور جائزہ لینے پر مجبور کیا تھا۔

وہ ان کی ادائیگی مکمل ہونے کے انتظار کے پورے دس منٹ انتہائی صبر سے اس بات کا منتظر رہا کہ وہ لڑکی ذرا سا اپنا رخ ادھر کو موڑے تو وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے..... لیکن وہ سر تو جیسے فریم میں جڑا تھا..... اس نے نہ جنبش کی نہ دکاندار سے بحث میں ابھی نہ اپنی ساتھی خواتین کو مشورہ دینے کے لیے ہی اپنا رخ موڑا۔ وہ اسے یونہی انداز سے مخاطب کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

گاہوں کی قطار لمبی ہوتی دیکھ کر، ایک دوسرا خوش شکل سیلز مین مدد کو آگے بڑھا تھا۔

”سر آپ کی کیا خدمت.....؟“ اس نے گردن گھما کر سیلز مین کو دیکھا جو بظاہر اپنے مہذب نظر آنے والے گاہک کو سوتی شلوار دوپٹے میں ملبوس، غیر ملکی خواتین کا جائزہ لیتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ فہد نے دوسرے کاؤنٹر کی طرف بڑھنے کے بجائے اسٹور سے باہر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسے یہاں سے جو بھی خریدنا تھا، اس کے لیے پھر بھی آیا جا سکتا تھا۔ اس کی گاڑی قریب ہی کھڑی تھی لیکن ابھی انکیشن میں چابی گھمائی نہیں تھی کہ اس نے دیکھا، وہی تینوں غیر ملکی لڑکیاں اسی اسٹور سے چند شاپنگ بیگز اٹھائے باہر نکل رہی تھیں۔

بلاشبہ یہ یادداشت کے آنے یا جانے کی کوئی فلمی کہانی نہیں تھی..... وہ وہی تھی، سو فیصد وہی..... اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا اور اپنا تعارف پیش کرتا، ایک چمکدار ہوٹا اکارڈ کے تیز رفتار ڈرائیور نے اس کی گاڑی کے عین ساتھ، اپنی گاڑی ایسے لگائی کہ وہ دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کر کے باہر

نکلنے میں تیزی دکھائی مگر اس عرصے میں، وہ تینوں لڑکیاں اس کی نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ اس نے گول چکر (چورنگی) کے گرد، انتہائی آہستہ رفتار سے، دوسرا چکر لگاتے غور کیا کہ آج اس کے ساتھ یہ ہوا کیا تھا۔

اس کی زندگی میں پشیمانیوں پالنے کی فرصت کم تھی۔ ایسے میں وہ ایک لمحہ، جولبرنی کے راؤنڈ اباؤٹ کے پاس اس کے ہاتھ سے پھسلا تھا، اس پر غور کرنے کی مہلت اسے دوبارہ اگلے کئی دنوں بعد ہی مل پائی۔

”وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔“ اس نے آج کے آخری مریض کو تسلی آمیز باتوں کا انجکشن لگا کر رخصت کرنے کے درمیان سوچا۔ وہ ان دنوں سخت مصروف تھا مگر جانتا تھا کہ میڈیکل کے شعبے کی کوئی ریسرچ، مریضوں سے رابطے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔

”اس لیے بیکار پچھتاؤں میں وقت ضائع کرنا بالکل مناسب نہیں ڈاکٹر صاحب.....“ اس کے اندر سے ایک دوستانہ مشورہ برآمد ہوا تھا۔

☆☆☆

لاہور

12 اگست 1991ء

لیکن اتفاقات حقیقت بھی بنتے ہیں..... عظیم نقصانات پورے بھی ہو جاتے ہیں..... اور خسارے کی تحریریں کبھی کبھار دھل جایا کرتی ہیں۔ وہ ابھی انکشاف کی حیرت سے سنبھل ہی رہا تھا کہ افسوس، اس کے بعد کا لمحہ پھر کہیں راستے میں گر گیا تھا۔

وہ بہت تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا آیا تھا۔ اس لیے کرکٹ ہاؤس سے نکلتی ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر فوری بریک لگانے میں کچھ لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ جب اس کی کار کے پیچھے رکے تو وہ جیل روڈ کی نہروالی کراسنگ پر، سرخ سنگٹل اور لاتعداد گاڑیوں کے درمیان یوٹرن لینے کا راستہ ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس کی گاڑی کے سائڈ مرر میں پیچھے رہ جانے والی، پیدل چلتی لڑکیاں کسی نامعلوم راستے پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

کھونے کھونے لمحے

”آپ چلتے کیوں نہیں؟“ ریمہ کی ناراض سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اور اسے احساس ہوا کہ سڑک کے پار کا منظر بدلتے دیکھ کر اس نے بے اختیار بریک لگائی تھی اور پاؤں اٹھانا بھول گیا تھا۔

”سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ آخر وہ کیوں اس سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے بریک سے پاؤں اٹھاتے، ایک دفعہ پھر سوچا۔

لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ وہ اس سڑک سے ایک بار نہیں، بار بار گزرا۔۔۔۔۔ یہ اس کا روزگار راستہ نہیں تھا۔ ریمہ متحسّس تھی کہ اس کا بھائی جو کبھی لٹچ کرنے گھر نہیں آتا، ان دنوں اسے انتہائی مصروف اوقات کار سے فرصت نکال کر اسے کالج سے گھر ڈراپ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

15 ستمبر 1991ء

اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں وہ اس جیل روڈ پر سے جانے کتنی بار گزرا ہوگا۔

”اور یہ لاہور شہر آخر کتنا بڑا ہے؟“

اس نے آج کی تاریخ کے ڈوبتے سورج کو بادشاہی مسجد کے میناروں سے پرے دیکھ کر سوچا۔۔۔۔۔ شاہی قلعے کی برجیاں ماند پڑ جانے والی کرنوں کی روشنی سے اور بھی سرخ ہو رہی تھی۔ اسے اپنی تلاش کے لا حاصل اور حماقت انگیز ہونے کا احساس بھی تھا۔

”اگر وہ اس شہر میں موجود تھی تو کیا اتنی ہی فرصت سے ہوگی کہ آج، ابھی، اس شہر کے تاریخی مقام دریافت کرنے ضرور یہاں آئے گی۔ ہاں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے، وہ ایک عجیب سے جنون کا شکار ہو رہا ہے پھر بھی کچھ عقل سے کام لینا چاہیے۔“ اس نے خود کو خود ہی سمجھایا۔

وہ کوئی ہیر روزگار نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس کے کام کا حرج ہو رہا تھا۔ زندگی میں ایسی بے وقوفیوں کی گنجائش رکھی ہی نہیں جاسکتی۔

☆☆☆

20 ستمبر 1991ء۔۔۔ اور پھر کمال ہو گیا۔

بس ایک لمحے کی بات تھی۔۔۔۔۔ دوسرا لمحہ وہ تھا جب اس نے یوٹرن لیا، گاڑی دائیں طرف کا رخ موڑ کر واپس گھمائی اور یہ جانتے ہوئے بھی وہ ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکی ہے، اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی تھی۔

☆☆☆

لاہور

10 ستمبر 1991ء

تیسری بار پھر۔۔۔ وہ اسے اسی سڑک پر دکھائی دی۔ آج بھی وہ اکیلی نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ آج وہ بھی اکیلا نہیں تھا۔

آج اسے ریمہ کو کالج سے گھر چھوڑنا تھا۔ اس کی بہن، کالج کے سبز گرل والے گیٹ سے اس کی گاڑی دیکھتے ہی اپنے ہاتھ میں مسالے والا مکئی کا بھٹکا سنبھالے اپنی دوستوں کو خدا حافظ کہتی باہر آئی۔ وہ ابھی دروازہ کھول کر ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ اس کا بھائی گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

وہ سخت عجلت میں تھا۔ اسے ریمہ کے کتنی گرمی ہے اور پھلی کھائیں گے بے والے والہانہ جملوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریمہ کو لگا، اسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ وہ سامنے دیکھ کر گاڑی چلانے کے بجائے اپنے دائیں طرف کی کھڑکی کے پار، کسی کو کھوجتا لگ رہا تھا۔

ریمہ نے بھائی کی نظروں کے تعاقب میں، دائیں طرف کے اس پار والے منظر پر نظر ڈالنی چاہی اور بس وہی لمحہ تھا جب ایک بے حد بوسیدہ سی دین، عمارت اسپتال کے سامنے رکی بھی اور چل بھی پڑی۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ وہ کھٹار اسی دین، آج پھر اسے اپنے پروں میں چھپائے فہد کے اگلے راستے گم کیے دے رہی تھی۔

”یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔“ وہ بری طرح مایوس ہوا۔

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے ساتھ یہ

اتفاق بار بار ہو رہا تھا آخر کیوں۔۔۔۔۔؟

وہ کسی کام سے سروسز اسپتال آیا تھا اور اب اس نے واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی اسپتال کے مین گیٹ سے نکالی ہی تھی۔ ریس کورس پارک کے سنگل سے بائیں طرف مڑتے ذرا سی دیر میں اس نے دیکھا کہ اپنی صحت سے محبت کرنے والے لاہوریوں کی ایک بڑی تعداد شام کی سیر کرنے پارک میں جا رہی تھی۔ اور لڑکیوں کا وہ گروپ جو اس کے سامنے ابھی ابھی پارک میں داخل ہوا تھا، اس میں ایک وہ بھی تھی۔ اس بار اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔

اس نے گاڑی پارک کی ذیلی سروس روڈ پر لگائی..... اور انتہائی عجلت میں تیز تیز چلتا ہوا، مین گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ انہیں ڈھونڈنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

وہ اکیلی نہیں تھی..... وہ ایک گھونگر یا لے، بھورے بالوں والی انتہائی دراز قد، غیر ملکی لڑکی کے ساتھ تھی۔

وہ جانتا تھا اگر آج کا یہ لمحہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ اسے دوبارہ ڈھونڈنے میں شاید کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

وہ لپک کر قریب گیا تھا اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر پکارا تھا۔
”ہیلو، بہرینہ.....“

وہ جو اپنی طرف سے پارک کے قدرے کم رونق والے حصے میں جویمیر ہاسٹل کی لڑکیوں کو تفریح کرانے لائی تھی، خوف سے سن ہو گئی۔ وہ اس بڑے شہر کے ہنگامے میں، صرف اور صرف شناسا چہروں سے ہی بچتی پھر رہی تھی۔ اس کی شکل پر کچھ ایسا تھا..... جیسے کسی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس نے اس کے رنگ اڑتے چہرے کو بھی دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کی ہراساں سی بیگانگی کو بھی۔

مگر وہ زیادہ دیر انتظار نہ کر سکا اور انگریزی میں بولا تھا۔

”تم نے مجھے پہچانا نہیں.....؟ میں فہد ہوں، فہد

مرتضی.....“ اس کے چہرے کے رنگ اڑتے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”تم ایڈنبرا میں تھیں ناں..... ہم وہاں مل چکے ہیں۔“ وہ آخر کہاں کہاں سے بھاگے گی..... زندگی میں انسان کو فرار کے کتنے موقع ملتے ہیں بھلا.....؟ وہ کسی حقیر سے خوفزدہ چوہے کی طرح گھر کر مارے جانا نہیں چاہتی تھی۔

”تم یقین نہیں کرو گی کہ میں تمہیں کتنے دنوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔“ وہ اپنی شستہ انگریزی میں جو کہہ رہا تھا، یقیناً اس کا لغوی مطلب بھی وہی تھا۔

”تو کیا وہ سوچ لے کہ اس کی اڑان بس یہیں تک تھی؟“ اتنی تھکا دینے والی طویل پرواز کے بعد کسی نے اس کی ڈوری کھینچی اور پھر پھر پھڑائی ہوئی وہ زمین پر آ رہی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں، ایک انوکھی سی چمک تھی۔ اس نے فرار کی بے فائدہ کوشش کے لیے کچھ دور بیڈ منٹن کھیلتی چڑیوں کی طرح چھپھاتی لڑکیوں کے گروپ کی طرف نظر دوڑائی مگر وہ اس کے ارادے بھانپ چکا تھا۔

”بہرینہ گیبرنل.....!“ اس نے ذرا جھک کر کہا۔
”آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ مجھے بتا دیں اگلی بار میں آپ سے ملنا چاہوں تو مجھے آپ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ معاف کیجیے..... اگر آپ دوبارہ گم ہو گئیں تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟“ اس کے اٹھتے قدم رکے۔

شرارت آمیز دوستانہ انداز، جس میں حکم نہیں شکوہ سا تھا۔ وہ ایسے لہجوں کی بالکل عادی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا لیکن رکنے کا ارادہ بالکل ترک کر کے دوبارہ لڑکیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”دیکھو.....“ وہ اس کے ساتھ آیا۔ ”تم میری بات کا جواب تو دے سکتی ہو؟“

لڑکیوں کا گروپ، اس گھونسلے جیسے بالوں والی لمبی لڑکی کے ساتھ بے پرواہی بکھیرتا ان کے قریب آ رہا تھا۔

کھونے کھونے لمحے

گفتگو کا بہ مشکل قائم ہوا تسلسل توڑ دیا تھا۔ بھورے رنگ کے بالوں والی لڑکی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کرتی اس سے واپسی کا ارادہ معلوم کر رہی تھی۔

”تم بتاؤ گی نہیں کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟“ فہد کو لگا کہ وہ اس پر ایک نظر اور ڈالنے کی تکلیف گوارا کیے بغیر دوبارہ کھوجانا پسند کرے گی۔ چند منٹوں میں اس نے اس کے چہرے کو بہت سے حساب کتاب کرتے دیکھا تھا۔ فہد نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے اپنا پین اسے پیش کرتے اس کے چہرے پر لکھے زبردست گریز کو صاف محسوس کیا تھا۔ اب وہ کارڈ اپنی ہتھیلی پر الٹ کر کچھ نہ کچھ لکھ رہی تھی۔

کارڈ پر نظر ڈال کر وہ خوش ہو گیا۔

”پڑھتی ہو وہاں؟“

”پڑھاتی ہوں۔“ وہ اس سے اس کا وزیٹنگ کارڈ لیے بغیر جا چکی تھی۔ پھر بھی فہد کو لگا مغرب میں گرتے سورج کی کرنیں آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

☆☆☆

”بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ..... اور کیا پتا جو.....“ ایک اونچے قمقمے نے اس کی توجہ کھینچی..... سونیا کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔ وہ اینڈریا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر، آج کے کسی غیر اہم واقعے کو، ناقابل فراموش ثابت کرنے پر تکی ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی لڑکیوں سے زیادہ فاصلہ رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ جتنا سونیا کو جان چکی تھی وہ جوئیر اور سینئر ہاسٹل کی تمام وارڈز اور لڑکیوں میں سب سے بڑی ڈراما کوئین تھی۔

”کس قدر بے تکا ہستی ہے یہ سونیا.....“

اس نے خفیف سی ناگواری سے اپنی نظر ہٹالی۔ ہاسٹل کا کامن روم جو شام کو ٹی وی روم بن جاتا تھا۔ محبت کی کسی لازوال کہانی پر مبنی ڈرامے کے نشر ہونے کا منتظر تھا۔ کمرے بے فکر لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبرینہ نے اپنی توجہ واپس اسی نکتے پر مرکوز کی، جس نے کم از کم آج کی رات تو اس کی نیند اڑا ہی ڈالی تھی۔

”کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟“

اس نے بغیر سوچے سمجھے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے دیکھا۔ مہربان لہجے والا شخص توجہ سے، اس کی ایک ہاں یا نہ کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ ڈگمگائی۔

فہد مرتضیٰ اگر دماغ پر ذرا ساز و ردا تو سوچ سکتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کے انداز میں خود مختاروں والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش میں اپنے آپ سے الجھتی لگ رہی تھی۔ پھر کسی اکتادینے والی گھڑی میں وہ اس کھیل سے بھی تنگ آ گئی۔

”میرے پہچاننے یا نہ پہچاننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

فہد کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

”شکریہ..... ورنہ مجھ سے بڑا بے وقوف اس شہر میں کوئی نہ کہلاتا۔“ اسے کچھ کچھ یاد آیا، وہ شخص تو شاید ایسا ہی تھا۔ حالات اور وقت صرف اسی کے لیے تبدیل ہوئے تھے۔ اور ممکن ہے، یہ سب ویسے نہ ہو جیسے وہ سمجھ رہی ہے۔ دوست اور دشمن لہجوں میں اتنا فرق بھی نہیں ہوتا۔ کسی گہری مشکل سے نکل کر اس نے ہلکے سے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اور..... سب کیسے ہیں؟“

”اور سب کون.....؟“ فہد کے منہ سے لکھا پھر جیسے اس نے اپنے جملے پر نظر ثانی کر لی۔

”واپس آنے کے بعد پچھلے کچھ سال، میں اتنا مصروف رہا کہ کسی سے زیادہ ملنے کا موقع نہیں ملا۔ تمہاری کسی سے ملاقات ہوئی؟“

اس کے سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں یہ بڑھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے خدشے بے بنیاد ہیں پھر بھی یقین اور بے یقینی کا درمیانی فاصلہ پل صراط بنا ہوا تھا۔ ”نہیں.....“ اب وہ آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

”میں تو کسی سے ملی نہیں۔“ کیا فائدہ ایسی سچائیوں کا جو آپ کی غلطیوں کا اشتہار بنا کر بل بورڈ پر لگا دیں۔

”یونہی تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا.....“

کم عمر لڑکیوں کی بے پرواہی نے رابطہ بڑھاتی

”اور اگر اس کے سارے شک ٹھیک نکلے تو.....؟“ اس نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی تھیں، بہت سے غلط فیصلے کیے تھے۔ اسے یقین تھا یہ خوف سے بھری زندگی اور اندیشوں کے عفریت اس کی سزائیں ہی ہیں..... لیکن ہاں، اگر آج اس سے غلطی ہوئی تھی تو اب تک کی تمام غلطیوں میں یہ سب سے بڑی ہے۔ اور اب یہ کون کون سے عذاب نہیں لائے گی..... یہ سوچ کر اسے جھرجھری آگئی۔

اور بھلا کیا ہو جاتا، اگر وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی تو..... مگر اس سے اتنی بڑی حماقت ہوئی کیوں آخر...؟ کیا اس لیے کہ وہ دشمنوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ بہت دنوں بعد باہر نکلی تھی اور زندگی کے تمام بڑے سوال بھلا کر، کچھ دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ یا وہ شخص بہت جانا پہچانا سا تھا یا شاید جانا پہچانا اتنا نہیں تھا جتنی اس کی آنکھوں میں دوستی تھی۔ خوش خلقی سے مسکراتی، مانوس سی، دوست آنکھیں..... یا شاید عرصے سے دشمن دنیا کے راستوں پر خوف کے ٹوکڑے لادے، وہ اتنی خود ترسی کا شکار ہو گئی تھی کہ جو پہلا شناسا چہرہ اسے دکھائی دیا بس اس نے اسی کو اپنا نجات دہندہ مان لیا۔

وہ ہاسٹل کے ڈائننگ ہال میں کتنی دیر سے کھانے کی میز پر بیٹھی پچھتاؤں سے بدسر پیکار تھی۔ سب کھانے والے کھانا کھا کر اٹھ چکے تھے۔

سونیا بھی اپنی پسندیدہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ، کب کی ہاسٹل واپس جا چکی تھی۔ روزانہ سبرینہ اور اینڈریا بھی ان کے ساتھ ہی نکلا کرتی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر کالج کے ڈائننگ ہال سے جوئیز اور سینٹر ہاسٹل کے درمیان لمبی اندھیری روشوں پر رات کے پھولوں کی خوشبو سونگھتے کچھ دیر چہل قدمی کرتا، اسے تازہ دم کر دیا کرتا تھا۔

لیکن آج سبرینہ چپ چاپ تھی۔ اینڈریا نے اسے کبھی اتنی گہری سوچ میں ڈوبے نہیں دیکھا تھا..... اور ہاسٹل میں رہنے والی ایک خاتون لیکچرر سے طویل

بحث میں اب بھی، اسی کے اٹھنے کے انتظار میں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جب سے پارک سے واپس آئی ہے، کسی اہم مسئلے میں گرفتار ہے۔ آخر جب ڈائننگ ہال کا اسٹاف، کھڑکیاں دروازے بند کرنے اور میز رات سے پہلے آخری بار چمکانے لگا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ خاتون لیکچرر کو رخصت کر کے وہ اس کی طرف آگئی۔

”آج واپسی کا ارادہ نہیں؟“ اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔ سبرینہ بغیر ایک لفظ کہے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ”کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے اینڈریا ایلین کے ساتھ اندھیرے درختوں کے نیچے دور تک خاموشی سے لیٹی طویل روش پر سے گزرتے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ اور کوئی، کوئی وقت اتنا ظالم ہوتا ہے جب انسان وقت کو نہیں، وقت انسان کو گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بار پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

”کس قدر اندھیرا ہے۔“ اس نے اینڈریا کو... بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

”پتا نہیں کیوں یہاں روشنی کا بندوبست نہیں کرتے، صبح ضرور بات کروں گی آفس میں۔“ اینڈریا نہیں جانتی تھی کہ اس کے لیے اندھیرے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ وہ ایسی پناہ گاہوں کی تلاش میں کتنی بار زخمی ہوئی..... اور کس کس طرح.....

”وہ تمہارا دوست تھا کوئی؟“ اینڈریا اس سے پارک میں ملنے والے اس اجنبی کے بارے میں سوال نہ کرتی اگر جو اسے شام سے اتنا پریشان نہ دیکھ رہی ہوتی۔ ”نہیں۔“ بہت دیر بعد اس کی آواز آئی۔

”دوست تو نہیں تھا۔“ اس نے اینڈریا سے زیادہ خود اپنے آپ کو یقین دلایا۔

اینڈریا نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو وہ ہاسٹل کی دوسری منزل پر اپنے کمرے کو جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

دوسری منزل کے لمبے برآمدے میں کھلنے والے ترتیب وار کمروں سے، کسی امریکی گلوکارہ کا گیت اس

جانے کی ہدایت کرتی..... اپنے روزگار کے تمام فرائض ایمانداری سے انجام دے کر اپنے بستر پر آگئی۔
شام سے اب تک ملامت، پچھتاوے اور افسوس کے کتنے ہی دور، اس پر سے گزرتے رہے تھے لیکن نیکی پر سر رکھتے ہی ایک زبردست خوف اس پر حملہ آور ہوا۔
یہ ستمبر کی ابتدائی راتیں تھیں۔ گرمی بہت زیادہ نہیں تھی۔ یا شاید اسے ہی اچھے برے موسم گزارنے کی عادت ہوگئی تھی..... لیکن اینڈریا بہت تکلیف میں تھی۔
وہ امریکا کی سردترین ریاست مینیسوٹا سے آئی تھی۔ اسے اس قیامت کی گرمی میں اپنے کمرے کے پوری رفتار سے چلتے پنکھے میں بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اپنی طرف کے کمروں کی چھت پر چھردانی لگا کر سونے کا آئیڈیا بھی اینڈریا کا ہی تھا..... اسی نے سبرینہ کو بتایا تھا کہ اس ملک میں، گرمی کے موسم میں چھت پر سونا ایک عام سی بات ہے۔ سبرینہ نے اینڈریا کو یہ بتا کر مایوس نہیں کیا کہ اس ملک پاکستان سے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح واقف ہے۔ سخت گرمیاں شروع ہونے کے بعد سے وہ اور اینڈریا چھت پر سو رہی تھیں۔

ستاروں بھرے آسمان سے اس کی دوستی بھی خوب ہوگئی تھی۔

آسمان جو ایک مہربان سامع تھا۔ ساری شکایتیں، سارے سوال خاموشی سے سنتا تھا۔ مگر آج ایک غیر معمولی رات تھی۔

اسے آسمان کی تاریکی سے، ایک کوبرا سانپ اپنی طرف لپکتا نظر آیا۔

”اگر فاروق کوچ بچ پتا چل گیا تو.....؟“ اسے لگا، رات بہت کالی ہے، چند ابھی نہیں نکلا تھا..... لیکن ستارے چمکتے چمکتے تھک کر سو بھی گئے تھے۔ جگمگانے اور چمکنے کا یہ کھیل جیسے ان کے لیے کوئی ناپسندیدہ سا فعل بن کر رہ گیا ہو۔

”تم اس بھول میں مت رہنا کہ تم کہیں بھاگ کر جا بھی سکتی ہو۔“

کسی کی خون جمادینے والی سفاکانہ سرگوشی اس

کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے کے باہر کاریڈور کے نیم روشن کونے میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

”کیا تھا جو آج کا دن کسی بڑے حادثے کے بغیر گزر جاتا۔“ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کندھے سے کندھا ملائے، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتی لڑکیوں کو، ایک بے دھیان سی مسکراہٹ کے ساتھ، نظروں کے سامنے سے گزرتا دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

لڑکیاں ڈراما دیکھ کر واپس آرہی تھیں۔ اونچی آواز میں ہیرو پر، ایک ساتھ جان دینے والی اور زندگی سے اپنا حصہ وصول کرتی لڑکیاں، جنہیں یقین تھا کہ ان کے حسین خواب، حقیقت ضرور بنیں گے، انہیں درد میں ڈوبی گلوکارہ وٹنی ہیوسٹن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جو کہہ رہی تھی۔

(”میں نے تم سے زیادتی کی لیکن میرے پیارے، کیا تم دیکھ نہیں سکتے، کیا تم میرے اندر جھانک نہیں سکتے۔“)

اور اس کی آواز سبرینہ کے دل میں، بہت دور تک بہت زور سے کسی ٹھیس کی طرح لگ رہی تھی۔

(”اگر میرے الفاظ بے معنی ہیں تو میرے گیت کی دھن پر دھیان دو کیونکہ میری محبت وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔“)

کاش اسے کوئی ٹائم مشین مل سکتی..... وہ وقت کو اتنا پیچھے لے جا سکتی کہ زندگی کی کتاب میں لکھی... بد صورت تحریریں مٹا کر دوبارہ لکھی جاسکتیں۔ وہ کسی اداس، ندیدے بچے کی طرح دونوں ہاتھوں میں چہرہ ٹکائے، اپنے آپ کو کبھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

لیکن افسوس کہ ایسا ہوتا نہیں..... زندگی ایک منہ بند غار ہے، جس میں صرف ایک ہی راستے پر آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایک کمرے میں جھانکتی، لڑکیوں کی گنتی پوری کر کے حاضری لگاتی، ٹھیک رات دس بجے جونیر ہاسٹل کے تمام کمروں کی بتیاں بجھوا کر لڑکیوں کو سو

کے کان میں گونجی تھی۔
”میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا..... مگر مجھے آزمانے
کی غلطی مت کرنا..... اب تک تمہیں شاید ٹھیک سے
اندازہ نہیں ہوا۔“

اسے ٹھیک سے اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس
کیا، اس کی کپٹی سے ہو کر کان اور بالوں میں جذب
ہوتے ٹھنڈے پسینے کے قطرے، گرمی سے نہیں، خوف
کی زیادتی سے بہہ نکلے تھے۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اتنے مضبوط اعصاب
کی مالک نہیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

اس خوفناک اکیلی رات میں، اس کے ساتھ کوئی
بھی بڑا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ شاید وہ کل کا سورج
دیکھنے کے لیے نہ بچ سکے۔ اور اگر اگلی تمام عمر اس کے
نام، ایک بے رحم قاتل کے خنجر تیز کرنے کی مشقت لکھ
دی گئی..... تو وہ اس خون آلود سرخ جہنم میں کیسے جل
سکے گی۔ کتنی دیر تک خوف کی شدید لہر اس کی ریڑھ کی
ہڈی کو سنسناتی گزرتی رہی۔ کتنی دفعہ اس نے سوچا کہ وہ
آواز دے کر ساتھ کی چارپائی پر سوئی اینڈریا کو
جگالے۔ لیکن اسے لگا اگر اس نے ذرا سی آواز اونچی
نکالی تو چھت کے کسی اندھیرے کونے سے، برآمدے
کے کسی ستون کے پیچھے سے نکل کر کوئی ڈراؤنا ہیولہ
اسے دبوچ لے گا۔

پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی اور کتنی ابھی گزرنا
باقی تھی۔

شاید اسے تھوڑی سی نیند آگئی تھی کہ سناٹے
میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ جیسے کوئی وزنی چیز دھم سے
گری ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی..... اس کا دل اچھل کر حلق
میں دھڑک رہا تھا۔

ایسی آوازیں صرف وہم سے نہیں آیا کرتیں مگر
کاش یہ اس کا وہم ہی ہو۔ کتنی دیر سانس روکے پڑے
رہنے کے بعد اسے لگا وہ خوفناک سا اسرار، وہ بھیاں تک
سربراہت، اس کے ارد گرد کی فضا سے معدوم ہو گئی ہے۔
اس کے دل کی دھڑکن ابھی معمول پر نہیں آئی تھی

پھر بھی وہ اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف غضب کا سکون اور
اطمینان تھا۔ رات اپنے دامن میں بے شمار لوگوں کے
خواب سیٹے دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ دور بہت
دور ہاسٹل کی باؤنڈری وال کے ادھر لمبی اور ویران سڑک
خاموشی سے لیٹی رات کے مسافروں کو راستہ دکھا رہی
تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس
ذرا دیر کو ہاسٹل کی پچھلی دیوار پر لہراتیں پھر دور ہوتے
ہوتے بالکل معدوم ہو جاتیں۔

گاڑیوں کے وقتاً فوقتاً بجتے ہارن، کسی بے قابو کار
کے چرچراتے ٹائر، چند لمحوں کو فضا کے جامد سناٹے کو
منتشر کرتے..... پھر گزر جاتے۔

یہ دوسری ہزاروں راتوں جیسی ایک عام سی رات
تھی۔ جس میں کوئی غیر معمولی پن نہیں تھا۔ کائنات کی
ہر حرکت پر سکون تھی۔ سوائے ہاسٹل کی چھت پر سانس
روکے بیٹھی اس لڑکی کے جسے ایک معصوم بلی نے
انجانے میں کود کر بے سکون کر دیا تھا۔ وہ پوری چھت پر
ٹہل کر، یہاں وہاں سے نیچے جھانک کر اچھی طرح
اطمینان کر کے بستر پر واپس آئی تو بھی اسے یقین
نہیں تھا کہ اس کا خوف بے بنیاد ہے۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ وہ موذن کی
آواز کو مہربان ماں کی لوری کی طرح سنتی، کب سوئی،
اسے پتا نہیں چلا۔ ایسی ہی ایک اور لمبی رات کو، اس
نے اپنے خدا کے بالکل نزدیک جا کر ایک دعا پہلے بھی
مانگی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اپنے آپ کو اسی رات کی
ادیت میں مبتلا دیکھ رہی تھی۔

اسے لگا، اسے سوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ
کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

اس نے بہ مشکل تمام کھلتی، بند ہوتی آنکھوں سے
دیکھا، اینڈریا اس سے کچھ کہہ رہی تھی پر کیا.....؟ وہ سمجھ
نہیں سکی..... وہ ایک خواب میں مسلسل جاگ رہی
تھی..... کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے قریب
پہنچ چکی تھیں..... اس کی سانس اکٹڑ رہی تھی۔ اس کے
پاؤں زخمی تھے مگر وہ رک نہیں سکتی تھی..... وہ بھاگے چلی

بھانپ لینے پر قادر ہے؟“ سبرینہ کو یہ بات زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوئی۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“

اینڈریا کو لگا، وہ کسی بات کا برا مان گئی ہے..... وہ سونیا کے ہاتھ میں دبی، اپنی کہنی ہٹا کر اس کے نزدیک آئی۔

”مجھے لگا، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

سبرینہ کو اچھا نہیں لگا، جیسے وہ اس کے چہرے پر کسی سوال کا جواب تلاش کر رہی تھی۔

”تم رات بھر بے چین رہیں، میری آنکھ کھلی تو تم چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ تم کچھ پریشان ہو سبرینہ.....؟ تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔“ وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑی، اتنی فکر مندی سے پوچھ رہی تھی کہ سبرینہ نے گرجوٹی کی ایک زبردست لہر اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں.....“ وہ اپنی تھرڈ ایئر کی کلاس لینے جا چکی تھی۔

اینڈریا کو لگا..... وہ کوئی فاصلہ کم کرنے کو تیار نہیں، وہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ خود اپنے مسکرانے سے خوفزدہ ہے..... حتیٰ کہ اب وہ کسی سے بات کرنے سے بھی خوفزدہ ہے حالانکہ سب کی رائے سبرینہ گبرٹل کے بارے میں یہ نہیں تھی۔ یہیں اسی کالج میں، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حسین، مغرور اور لیے دیے رہنے والی نئی لیکچرار، کسی کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتی..... لیکن اینڈریا ایلین جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اینڈریا کو ہونے والے زبردست طیریا بخار میں، دن رات ایک کر کے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ کسی معمولی اکتاہٹ کے اظہار کے بغیر اسے تازہ سوپ اور پلین دلیا کھلاتی، اس کا دھیان رکھتی وہ لڑکی، اینڈریا کو لوگوں کے ہر اندازے کو غلط ثابت کرتی بہت اچھی لگی تھی۔

☆☆☆

اپنی عمر کی چوتھی دہائی پھلانگ چکنے والی سونیا کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ ہاسٹل کی حالیہ چند سالہ تاریخ

جاری تھی۔ اسے ڈیڈی کے پاس جانا تھا..... اسے ایما کے پاس جانا تھا مگر کتے اس کے تعاقب میں تھے..... اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے قرار..... سرخ لپکتی زبانوں والے..... اس کی آنکھ کھلی تو تیز چمکی دھوپ اس کے اوپر تک آرہی تھی۔

وہ بستر سمیٹ کر نیچے آئی تو ہاسٹل کی خاموشی بتا رہی تھی کہ پڑھنے والے پڑھائی کرنے جا چکے تھے۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے دوران واش بیسن کے آئینے میں نظر ڈالی۔ کیا رات بھر کی کہانی اس کے چہرے پر صاف پڑھی جاسکتی تھی؟ وہ اپنا پہلا پیریڈس کرچکی تھی۔ کالج کی پرنسپل اچھی خاتون تھیں لیکن انہیں شکایت کا موقع دینا اچھی بات نہیں تھی۔ وہ ان کی احسان مند تھی کہ انہوں نے اسے بغیر کسی حوالے اور دستاویزی لوازمات کے، اس اجنبی ملک میں روزگار اور چھت کا آسرا دیا تھا۔ اس نے پرنسپل کے کمرے میں اپنی طبیعت کی خرابی کو تاخیر کا سبب بنا کر پیش کرنا چاہا..... اسے پتا چلا اینڈریا ایلین اس کی دوست یہ کام پہلے ہی کر چکی تھی۔

”ہم بلاوجہ ہی دنیا سے بدگمان رہتے ہیں..... کتنے اچھے لوگ اسی دنیا میں روزانہ ہمیں ملتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہونے دیتے۔“

اس نے بہت شکرگزاری سے اینڈریا کے بارے میں سوچا۔ یہ کل سے اب تک ہونے والا سب سے اچھا واقعہ تھا۔

اینڈریا اسے پرنسپل کے کمرے سے نکلتے ہی ملی۔ وہ سونیا بروس کی کوئی بات توجہ سے سنتی اسی طرف آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر دور ہی سے بولی۔

”میں نے پرنسپل کو بتا دیا تھا کہ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تم کوئی کلاس نہیں لوگی۔“ اسے خیال آیا..... رات جب وہ خوفزدہ ملی بنی..... چھت پر یہاں وہاں گھوم رہی تھی تو اینڈریا نے ایک بار بھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

”کیا وہ دوسروں کی بے چینی، سوتے میں بھی

اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتے رہنا..... اور کالج کی ایک سینئر پروفیسر مس تزئین اظہر سے ملنے ہاسٹل ہی میں موجود ان کی رہائش گاہ ”اسٹاف ہاؤس“ جانا۔ اسے بحث کرنے میں دلچسپی نہیں تھی..... لیکن مس اظہر کی باتیں اسے اچھی لگتی تھی۔

تزئین اظہر تاریخ پڑھاتی تھیں۔ جنوبی ایشیا اور اسلامی دنیا کی تاریخ..... جو اُن کے بقول، کبھی ترقی معکوس کا باب معلوم ہوتی ہے..... کبھی درباریوں کی خوشامد اور کبھی مستقبل میں جھانک سکنے والا جادوگر کی کراٹھ کرٹھال..... انہیں یقین تھا کہ تاریخ کو درست طریقے سے لکھا گیا ہوتا تو دنیا اس سے حقیقتاً کچھ سبق سیکھ سکتی تھی۔ جو تاریخ کتابوں میں درج ہے، اس میں سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ریت سے سونا الگ کرنا۔

تاریخ سبرینہ کا مضمون نہیں تھا مگر اس ملک کی تاریخ کا اُس ملک سے بہت گہرا تعلق تھا، جہاں سے وہ آئی تھی۔

کالج کے ساتھ تزئین اظہر کا بہت دیرینہ تعلق تھا..... دہرہ دون میں بچپن گزارنے والی تزئین اظہر تقسیم ہندوستان سے پہلے بننے والے اس تاریخی کالج کے ابتدائی سالوں کی فارغ التحصیل طالبات میں سے تھیں۔

”پاکستان بنانے والوں نے کیا سوچ کر ایک الگ ملک مانگا تھا؟“

”بعد میں آنے والوں نے اسے کیا بنا دیا؟“ سن سینتالیس میں، پاکستان بننے کے بعد، مسلمان گھرانوں کی جو گنی چنی لڑکیاں کالج کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور جو تزئین اظہر کے بقول، ساڑی پہن کر سائیکل چلا لیا کرتی تھیں، بہت بہادر اور ترقی پسند لڑکیاں تھیں..... ایسی لڑکیاں، اس نئے ملک کی تعمیر کے لیے، کس قدر قیمتی رہی ہوں گی۔“ وہ پاکستان کی تاریخ کے تمام اندرونی ابواب سے واقف دھوکہ بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔

کی سب سے پرانی غیر ملکی وارڈن تھی۔ اسے خود کو کم عمر اور پُر اعتماد ظاہر کرنے کا شوق تھا۔ اسے لوگوں پر ہنسنا اور بے لاگ تبصرے کرنا بھی پسند تھا۔ اس سے انسان زیادہ پُر اعتماد دکھائی دیتا ہے اور نہ جانے کیوں، اسے سبرینہ سے ایک عجیب چٹ تھی اور وہ ہاسٹل کی دیگر وارڈنز کو، اپنے خیالات سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ سبرینہ کو اپنے حسن پر سخت غرور ہے، تبھی وہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں..... کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

”وہ اتنی کم عمر نہیں، جتنی لگتی ہے۔“ اور.....

”ہاں نہیں، اس نے بچلرز بھی کیا ہے یا نہیں..... یہ تو مسز احمد ہی اتنی سادہ ہیں کہ اسے یہاں جاب مل گئی۔“ اینڈریا کو سونیا بروس سے سخت اختلاف تھا..... لیکن وہ دیکھتی تھی کہ سبرینہ کے لیے، سونیا جیسی عورت جیسے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی اور صرف سونیا ہی نہیں، اسے اپنے ارد گرد کی دنیا میں کسی سے کوئی زیادہ مطلب نہیں تھا۔ سبرینہ کے لیے اتنا کافی تھا کہ کالج کی نیک دل پرنسپل نے، اس کی استعداد کو، ایک ہی ملاقات میں جانچ کر اسے زندگی نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع دیا تھا۔

چونکہ وہ پچھلے کئی مہینوں سے ہاسٹل میں ہی رہ رہی تھی، اسے جونیر ہاسٹل کی وارڈن کی جزوی ذمے داری دینا، ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ انہیں انسانوں کی پرکھ کا دعویٰ تھا اب تک جو غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

وہ پڑھاتی کیسا تھی، اس کا اندازہ انہیں تھرڈ ایئر اکناکس کی طالبات کے امتحانی نتائج دیکھ کر ہو چکا تھا۔ وہ جس بھی وجہ سے یہاں تھی کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آئی تھی۔ پرنسپل یہ اندازہ بھی لگا سکتی تھیں کہ وہ زیادہ دیر شاید یہاں نہ رہے مگر جب تک یہاں ہے تب تک کالج کو اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔ اس کے دو ہی شوق تھے..... کتابیں پڑھنا.....

قائد اعظم کی عظمت

قیام پاکستان کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے قائد اعظم سے کہا۔ ”آپ کتنے خوش نصیب ہیں آپ نے اپنی قوم کے لیے ایک الگ ملک حاصل کر لیا آپ بانی پاکستان ہیں۔“ قائد اعظم نے جواب دیا۔ ”میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی میں بن گیا لیکن میں بانی پاکستان نہیں ہوں۔“ صحافی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر آپ اس مملکت کے بانی نہیں تو پھر کون ہے؟“ قائد اعظم نے جواب دیا۔ ”ہر ایک مسلمان۔“ یہ سن کر صحافی بہت حیران اور مرعوب ہوا۔

مرسلہ: رفعت مبین رنی، یو ایس اے

تحفظ کی ضمانت مانگی ہوتی۔

اس رات وہ ضد کر کے اپنے کمرے میں سوئی، کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کیے حالانکہ وہ جانتی تھی جس خوفناک گھڑی کے آنے کا اسے ڈر ہے اس نے اگرچہ بچ جانے کا ارادہ کر لیا تو یہ تالے، یہ چٹخیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ وہ سائڈ ٹیبل کا لیپ جلا کر بستر پر آگئی اور چھت کے گھومتے پتے کو گھورتے ہوئے پچھلے اٹھائیس گھنٹوں کے اٹھائیس کروڑ لمحوں میں اٹھائیس ارب دفعہ گزرنے والے اسی بھیاںک خوف کو اپنے اوپر سرسرا تا محسوس کرنے لگی، جس نے کل سے اس کا خون خشک کیے رکھا تھا اور یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ وہ بالکل بھی بہادر نہیں ہے۔

وہ اور ہوتے ہیں جو سکون سے خود اپنے ڈوبنے، ڈوبتے رہنے کا نظارہ کرتے ہیں، آہستہ..... آہستہ..... آہستہ اور آہستہ..... بہت بہادر اور بہت ہی عالی حوصلہ..... وہ مگر اتنا۔ اتنا سارا حوصلہ کہاں سے لائے لیکن وہ رات کوئی انہونی کیے بغیر گزر گئی تھی اور اس سے اگلی رات اور اس سے اگلی والی بھی..... اصولاً

اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو بہت عجیب انداز سے بہت قریب سے دیکھ لینے کے باوجود وہ ان تمام اچھی باتوں پر بھروسہ کرنا چاہتی تھی۔ تین پانچ گھنٹے اپنے گھنٹے والے، سرسری بالوں میں ہاتھوں سے کھینچ کر تھیں..... وہ اس ملک میں اب تک اسے ملنے والی سب سے متاثر کن شخصیت تھیں۔ وہ اسے کالج کی عظمت رفتہ کے قصے سناتیں۔ مسز منجلا کماری اور مسز رحیم الدین کے زمانے کی سنہری یادیں تازہ کرتیں..... تعلیم حاصل کرنے کے لیے، اپنے زمانے کی طالبات کی زبردست لگن اور مشکلات کا ذکر کرتیں..... لیکن جو بات انہیں اپنی عمر کے دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ مستقبل سے مایوس نہیں تھیں۔ سہرینہ ان کی مثبت سوچ اور امید بھرے الفاظ کو سنتی حیران ہوتی رہتی..... ان کی باتوں میں، ان کے خیالات میں کہیں بھی وہ پیرانہ سالی، وہ عمر رسیدگی نہیں تھی جو ان کی دوہری ہوتی کمر اور چہرے اور ہاتھوں کی جھریوں میں نمایاں طور پر چھلکتی تھی۔

سہرینہ سمجھ سکتی تھی..... وہ لڑکیاں کتنی خوش قسمت رہی ہوں گی جنہیں ان سے پڑھنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ ہاں لیکن..... آج کے دن اس کے لیے دنیا کی ہر دلچسپی اپنی کشش کھو بیٹھی تھی۔

اس نے اس بھیاںک کالی رات کی کسی گھڑی میں، خدا کے بالکل نزدیک جا کر دعا مانگی تھی اور وہ قبول بھی ہو گئی تھی لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ رات سے صبح کرے گی تو دن سے رات کرنا عذاب ہو جائے گا۔

یہ ایک گھنٹا گزرا ہے اب دوسرا گھنٹا گزر رہا ہے، ابھی تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ وقت جیسے کسی اڑیل ضدی گھوڑے کی طرح راستے کے بیچ رک گیا تھا اور چابک برسانے پر اور زیادہ اکڑنوں دکھانے لگتا..... وہ تمام دن گھڑی کی سوئیوں پر نظریں جمائے نامعلوم جلاو آہٹوں کی منتظر رہی تھی۔

اور اب پھر..... ایک سیاہ رات اس کے کمرے کے دروازے کے باہر سوال بن کر کھڑی تھی..... کاش اس نے لمحوں کے بجائے عمر بھر کے لیے خدا سے اپنے

تو اسے سکون کی سانس لینی چاہیے تھی مگر وہ اور بھی بے سکون ہو گئی۔ تمام دن وہ جلے پیر کی بلی کی طرح صبح سے دوپہر تک کلاسیں بدلتی پھرتی اور اسے لگتا، وہ منحوس گھڑی نہایت سفاکی سے دور بیٹھی اس کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ خوش فہمیاں پالنے کی اسے عادت نہیں رہی تھی۔ پھر اسے غصہ آنے لگتا..... جس برے وقت کو آنا ہے آخر وہ آ کیوں نہیں جاتا۔ اسے کس چیز کا انتظار ہے؟ کبھی وہ سوچتی..... کیوں نہیں وہ یہ ساری بزدلی چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی؟ اس اتنی بڑی دنیا میں کیا اسے چھپنے کے لیے ایک ننھا سا کونا بھی دستیاب نہیں ہوگا؟

اور سوچنے کی بات یہ بھی تھی یہ خیال پہلے کبھی اتنی شدت سے کیوں نہیں آیا؟ پھر سو سے اس کا راستہ گم کرنے لگتے، اسے فرار کی ہر کوشش بے فائدہ لگنے لگتی۔ اسے شک تھا..... فاروق شاید کس زیرک شکاری کی طرح اونچی مچان پر بیٹھ کر شکار کے دام میں آنے سے پہلے کی بوکھلاہٹ کا مزہ لے رہا ہے اور اسے یقین ہو کہ شکار چاہے کتنا ہی تیز دوڑے..... کتنا ہی آگے نکل جائے..... وہ رسی کا حقیر پھندا پھینک کر اسے پل میں قابو کر لے گا۔

☆☆☆

“May I come in Ma,m?”

کسی نے جالی کے دروازے سے ناک چپکا کر اسے پکارا تھا۔ وہ ابھی اپنے دھلے ہوئے کپڑے برآمدے میں تنی رسی پر پھیلا کر گمرے میں آئی ہی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور گردن کی ہلکی سی جنبش سے لڑکی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

وہ اس دفعہ کے بیچ کی ہاسٹل آنے والی ان دونی طالبات میں سے ایک تھی۔ جن کی انگریزی بولنے سے جان جاتی تھی۔ وہ جب بھی آتی، اپنا کوئی نہ کوئی مترجم ساتھ لاتی تھی۔ وہ لاہور کے کسی نواحی علاقے سے آئی تھی اور آمدورفت کا کوئی ذریعہ نہ ہونے یا شاید کسی اور مسئلے کی وجہ سے ہاسٹل میں رہنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مگر جس دن سے آئی تھی ہاسٹل اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔

شاید وہ اپنے گھر والوں سے اتنی قریب تھی کہ

ہاسٹل کی زندگی سے سمجھوتا نہیں کر پار ہی تھی۔ سبرینہ جب بھی اسے دیکھتی، اس کی آنکھیں روئی روئی اور چہرہ سرخ ہو رہا ہوتا۔ وہ جتنا چاہتی تھی کہ اس کا وارڈن سے واسطہ نہ پڑے، اتنا ہی اس کے کام سبرینہ کے پاس انکے رہتے تھے۔ وہ ہر بار کسی ساتھی طالبہ کو ساتھ لے کر آتی تھی۔ اس کے کان میں وہ اپنا مسئلہ بتاتی اور ساتھی طالبہ مستعدی سے انگریزی ترجمہ اگلنے لگتی۔

”میم یہ کہہ رہی ہے، اس کے ہاسٹل کے بلیو کارڈ پر اس کے بھائی کے دستخط ہونے رہ گئے ہیں..... اب یہ ویک اینڈ پر گھر کیسے جائے گی؟ اسے ہاسٹل سے گھر لے جانے کے لیے صرف اس کا بھائی ہی آ سکتا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولی۔

”میم..... اسے اپنے فزیکل ایجوکیشن کے یونیفارم کے لیے اپنے گھر فون کرنا ہے، کیا آپ اسے ساتھ لے جا کر کالج کے باہر کہیں سے فون کروادیں گی؟ آج اسے یونیفارم نہ ہونے کی وجہ سے جرمانہ ہوا ہے۔ دراصل کالج سے فون نہیں ہو سکتا، مسٹر چوہدری کے پاس فون کے ٹوکن ختم ہو گئے ہیں۔“ وہ دونوں لڑکیوں کے پیغامات سنتی، مسئلے حل کرتی رہتی..... اس نے کبھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسے لڑکی کی کوئی بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی۔

اس نے دیکھا آج وہ اکیلی آئی تھی۔

لڑکی اس کے اشارے پر کرسی سنبھالتے محتاط انگریزی میں بولی۔

سبرینہ نے اپنی کرسی سنبھال لی پھر میز پر رکھے کاغذات کی ترتیب درست کرتے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگ رہی تھی جیسے آج اپنے سارے مسئلے خود ہی حل کرنے کا تہیہ کر کے آئی ہو۔ ہمیشہ کی روئی روئی آنکھیں بھی آج کچھ روشن روشن سی تھیں۔

اس نے کارڈز کے ڈھیر کے نیچے سے اپنا مطلوبہ کاغذ تلاش کر کے سیدھا کیا۔

”میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ

کھونے کھونے لمحے

وہ رک رک کر یہاں نہ رہنے کے سبب بتاتی چلی گئی۔

سبرینہ نے اپنے سامنے میز پر رکھا رجسٹر بے سبب ہی کھولا تھا۔ پتا نہیں کیوں..... اسے شبہ ہوا وہ لڑکی اسے چڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”میں اپنے گھر کے بغیر نہیں رہ سکتی، گھر..... ہونہ۔“

لیکن لڑکی حیران رہ گئی تھی۔ میم سبرینہ نے اگلا فقرہ زبردست اردو میں ادا کر کے دھماکا کر دیا تھا۔

”ہاں لیکن اپنے مستقبل کے لیے اپنی پڑھائی کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔“

لڑکی منہ کھول کر حیرت کا بہ آواز اظہار کرنے کے بجائے اچانک ہی خوش ہو گئی تھی۔

سبرینہ نے خود کو اس کے چہرے پر پھیلنے والی روشنی سے اور بھی چڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اب وہ اسے ہاسٹل قوانین کے جن دکھا، دکھا کر ڈرا رہی تھی۔

”تم نے تین دن پہلے سے اطلاع نہیں دی تھی کہ تم ہفتے کے درمیان میں ہاسٹل سے گھر جانا چاہتی ہو۔ ہاسٹل کے قوانین میں نے نہیں بنائے۔ جس نے بنائے ہیں ان کے پاس جا کر اعتراض کرو۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”اگر ہاسٹل کی رولز بک تم نے نہیں پڑھی تو میرا کیا قصور.....؟“ وہ ٹپ ٹپ آنسو بہاتی لڑکی، وضاحتیں کرتی ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ فوری طور پر اپنے گھر اس لیے جانا چاہتی تھی کہ صرف چند دن کے لیے خود گھر سے روز کالج آ کر دیکھ سکے، آیا وہ تنہا پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کر سکتی ہے یا نہیں، اس کے بعد وہ ہاسٹل سرے سے ہی چھوڑ دے گی۔

مگر سبرینہ کسی بد مزاج ہیڈ مسٹریس کی طرح ”نہ“ ”نہ“ کرتی کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھی۔

آخر لڑکی تھک کر چپ ہو گئی۔ اب وہ ہاتھ کی پوروں سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ سبرینہ کا دل افسوس سے بھر گیا..... اتنی معصوم سی لڑکی کو زلا کر وہ

دراصل کس چیز کا بدلہ، کس سے لینا چاہتی ہے۔ پھر وہ چھوٹی سی لڑکی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جتنی ضدی سی

مجموعہ سمجھ نہیں آتی، یہ کیا ہے؟“ اس نے ایک کاغذ اس کے سامنے لہرایا۔

لڑکی ذرا سا ہچکچائی..... جیسے کچھ غلط کہنے سے ڈرتی ہو۔ پھر بولی۔

”دراصل میم..... میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا تم جانتی ہو.....؟“ سبرینہ نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”ایک بار تم نے ہاسٹل چھوڑ دیا تو تمہیں دوبارہ یہاں جگہ نہیں مل سکے گی۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں یہاں..... مجھے بتاؤ؟“

لڑکی نے اپنے ہاتھ مسلے اور سبرینہ کو محنت سے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ ہاسٹل کی زندگی سے مرکز بھی خود کو ہم آہنگ نہیں کر پائے گی۔

”وہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں.....؟“ اسے لگا وہ خواہ مخواہ ہی بحث کر رہی ہے۔

”تم اپنا مسئلہ سمجھاؤ گی نہیں تو ہم اسے کیسے حل کریں گے۔“ لڑکی کچھ دیر سر جھکائے رہی پھر بالکل صاف انگریزی میں بولی تھی۔

”میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی میم، یہ بہت عجیب سی بات ہے، دراصل میں اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔“

”اور یہ تو میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کیوں؟“

سبرینہ کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی مگر لڑکی سمجھ گئی تھی کہ میم اب غصے میں آ رہی ہیں۔ اس کے بالوں کی چھوٹی، چھوٹی لٹیں چھت کے گھومتے ٹکھے کی آزمائش سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے لڑکی کو پہلے سے قدرے کمزور انداز میں وضاحت کرتے سنا۔

”دیکھیں..... میم! میں رات دس بجے کے بعد اپنی پڑھائی شروع کرتی ہوں اور یہاں رات دس بجے ساری لائٹس آف کر دی جاتی ہیں..... اور مجھے کسی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ بتاتی جا رہی تھی۔

”ہاسٹل کا ماحول میرے گھر سے مختلف ہے۔۔۔ میں اپنے گھر کے بغیر جی ہی نہیں سکتی۔“

www.pdfbooksfree.pk

بن کر میم سبرینہ اتنی دیر سے مسلسل انکار کیے جا رہی تھیں..... اتنے ہی آرام سے وہ مان بھی گئیں۔ انہوں نے اسے گھر جانے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اچھی سی مزیداری کافی بھی بنا کر پلائی تھی۔

☆☆☆

وہ بد مزاج بوڑھیوں کی طرح ہر ایک سے الجھنے لگی تھی۔ صبح سے دوپہر تک پیریڈ کی گھنٹیوں کے تعاقب میں، ایک سے دوسرے کلاس روم میں جانا، اسے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان دنوں اپنی اسٹوڈنٹس کو کیا پڑھا رہی تھی اگر اتنی الجھی ہوئی نہ ہوتی تو اپنا محاسبہ ضرور کرتی۔

اور وہ ایسا ہی اکتاہٹ بھرا دن تھا جس میں سونیا بروں سے اس کی جھڑپ ہوتے ہوتے بچی..... اینڈ ریا اس کے عجیب و غریب موڈ سے تنگ آ کر لڑ پڑی تھی اور اس اداس سی روئی، روئی آنکھوں والی لڑکی کو چڑیا کی طرح چھپھاتے، اپنی ماں کے ساتھ ہاسٹل سے رخصت کرتے، اس کی آنکھیں خواہ مخواہ گرم پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ اس نے شدید رشک سے اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ اپنے محبوب گھر کو روانہ ہونے والی شادمان و فرحاں لڑکی کو دیکھا۔ جس نے زمانے کی مشکلات پر لعنت بھیج کر، اپنے گھر اور اس میں رہنے والوں کو اپنے لیے جن لیا تھا۔

لیکن اسے پتا نہیں، اتنی تکلیف کس بات پر ہو رہی تھی۔ وہ ساری شام قیمتی گاڑیوں میں آنے والے والدین اور ہاسٹل میں رہنے والی بیٹیوں کی ملاقات کے مناظر دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہی..... اور سب سے زیادہ تکلیف اسے تب ہوئی، جب وہ لمبا سفر کر کے آنے والوں کے گلے میں جھولتی، خوشی سے چلاتی، کالج کے قصے سناتی، ہاسٹل کی کم عمر طالبات کو دیکھ کر حسد محسوس کر رہی تھی۔ محبت اور فکر کا اظہار کرتے، حال چال پوچھتے، کالج کی سرگرمیوں کی روداد سنتے والدین..... ہنستے کھلکھلاتے بہن بھائی..... کچھ ماڈرن کچھ دیہاتی، درمیانی عمر کی مائیں..... سوٹ بوٹ والے، شلوار میس والے باپ..... سب کے معاشی

درجے، اس ملک کی اس کلاس کے نمائندگی کرتے تھے، جن کا بڑا حصہ ترقی یافتہ اظہر کے بقول قومی خزانے میں چند فیصد ہی ٹیکس جمع کروا پاتا ہے۔

وہی کلاس جسے ٹھوکر مارنے میں اسے کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ لیکن معاشی درجہ بندی سے پرے وہ سب ایک دوسرے سے جڑے..... محبت بھرے رشتے تھے اسی صاف ظاہر تھا۔

اسے شدید احساس کمتری ہوا۔ کتنے عرصے سے وہ اپنے آپ کو مضبوط کر رہی تھی۔ کتنے عرصے پہلے اسے لگا تھا اس نے خود کو سمجھا لیا ہے..... مگر یہ سچ کبھی کبھی بالکل برداشت نہیں ہوتا..... کہ کسی کو یہاں اس جگہ اس سے ملنے نہیں آتا تھا۔

اپنے باپ کو تو وہ اپنی سرکشی کی قبر میں دفن کر آئی تھی اور.....

”ایما..... ایما کیا کر رہی ہوگی اس وقت.....؟“ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ دھماکوں میں گھرے، چمکا چور کھڑکیوں والے، کسی پھٹے پرانے اسپتال کی آپریشن ٹیبل پر تکلیف سے کراہتے، درد سے چلاتے انسانوں کے زخم سی رہی ہوگی۔

کسی عظیم جدوجہد کے زخموں سے چور چور سپوت کی تکلیف اپنے ہاتھوں سے جنتے اسے ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کی فرصت نہیں ملی ہوگی کہ اس کی بہن دنیا کے کس نامعلوم کونے میں زندگی کے کن عذابوں میں گھری، اسے یاد کر رہی ہے..... آنسو پینے کی زبردست کوشش میں، اس کا گلابری طرح دکھ رہا تھا۔

اور یہاں آنا ہی کسے تھا..... سوائے اس بے رحم گھڑی کے..... جو قیامت کے کئی دن گزار کر بھی آنہیں رہی تھی۔

ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ آنے والے مہمان اپنی منزلوں کو روانہ ہونے والے تھے..... وہ ہاسٹل واپسی کے ارادے سے کالج کے مین آفس کے باہر پڑے میز کرسی سے اپنا سامان اٹھا کر پلٹ رہی تھی کہ اسے لگا..... اس کا وہم سچا ہو گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

For Next Episodes Visit

Paksociety.com

2015 www.pdfbooksfree.pk



بائے عمر و ان آہستہ چل پٹی

عاشقہ مسعود



چالیس کا سنگ میل عبور کے چند ہی دن ہوئے تھے۔ ایک روز صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ ہاتھ روم میں آئینہ دیکھا۔ شکل کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ شاید بہت عرصے بعد فرصت سے آئینے کے روبرو ہوئے تھے۔ ٹوتھ برش وہیں چھوڑا اور بار بار غور کیا۔ چند ہی آنکھیں کھول کھول کر دیکھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا شکل شریف کیوں اتنی باسی سی لگ رہی ہے۔ جیسے فریج میں بنریوں کے نیچے کسی کو نے کھدرے میں رہ جانے والی مولی گاجر..... دل کو تسلی دی شاید ہاتھ روم میں روشنی کم ہے۔ اصل میں جیسے جیسے بجلی کے نرخوں میں اضافہ ہو رہا ہے انرجی سیور کی دوج کم ہو رہی ہے۔ چھوٹا آئینہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالا۔ کھڑکی کھول کر

ٹیرس پر آ گئے۔ بند گھروں میں رہنے کی وجہ سے دن کی روشنی میں شاید برسوں بعد اپنی شکل دیکھی۔ ایک تو سورج کی روشنی دوسرے آئینہ بھی وہ کم بخت جو شکل کو بڑا کر کے دکھائے۔ چہرہ غور سے ملاحظہ کیا تو حواس کم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”یا الہی یہ ہم ہیں یا کوئی دکھاری ادھیڑ عمر عورت.....“ آنکھوں کے کونوں پر دو لائیں..... بہتری آنکھیں پٹنائیں لائیں جوں کی توں..... دور کی نظر بھی کم زور ہے اور عینک کے بغیر آئینہ بھی شاید عرصے بعد دیکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے باریک باریک لکیریں غور سے دیکھنے کے لیے آئینہ منہ کے قریب کیا تو جلد کے کھلے مسام کھلے مین ہول لگے۔ ہونٹوں کے اطراف کی لکیریں گہری بلکہ مستقل سی ہو گئی تھیں۔ دوہری ٹھوڑی..... یا اللہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے وزن سو پونڈ سے کم ہی رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے کیسے کیسے کھانے چھوڑ کر تقریبات اور شادیوں میں صرف سلاد اور ایک آدھ بوٹی پر گزارہ کیا اور مشروبات سے یوں پرہیز کیا جیسے سچ مچ ام النجاشٹ ہو۔ شادیوں میں جہاں کولڈ ڈرنک کی نہریں بہہ رہی ہوتی ہیں کیونکہ مائیں بچوں سے پکڑ پکڑ کر کرسیوں کے نیچے رکھتی جاتی ہیں اور پھر خود ہی اپنے ہٹنے جلنے سے گرا دیتی ہیں۔ ایسے میں بہت جی لپٹاتا تو بچے سے ایک آدھ گھونٹ لے لیا۔

”لاؤ دیکھوں تو زیادہ ٹھنڈا تو نہیں۔“ دل کو شدید دھکا لگا۔ غم کے اثرات جب چہرے پر پہنچے تو ماتھے پر باریک، باریک لکیروں کا جال بچھ گیا۔ دل ڈوبنے لگا۔ درود یوار گھومتے نظر آئے۔ دل چاہا دنیا بھر کے تمام آئینے نہ سہی پر گھر بھر کے تو ضرور توڑ دیں۔ اور چیخ چیخ کر روئیں۔ رونا اگر مسئلے کا حل ہوتا تو شدتِ غم سے دیواروں پر ٹکریں مار مار کر روتے..... مگر اے تیسری دنیا کی مجبور عورت تجھے ابھی ہمت کر کے اٹھنا ہے۔

”ان“ اور بچوں کو رخصت کرنا ہے۔ تیرے پاس اپنی ذات کا غم منانے کی فرصت کہاں۔ تجھے تو شاید جب فرشتہ

اجل بھی لینے آئے تو کہنا پڑے۔ ”بھائی ایک منٹ ٹھہرو بچہ ذرا باتھ روم میں ہے اسے دھولیں۔“ ”ان“ کو کہیں ہم دنیا سے جا رہے ہیں تو فرمائیں گے ایک کپ چائے دیتی جانا اور دروازہ بند کر دینا میرا ابھی اٹھنے کا موڈ نہیں۔ ٹھوڑی دیر بعد اٹھوں گا تمہارے مرنے کی دو چار چھٹیاں تو کرنی پڑیں گی۔“ بہر حال حواس مجتمع کیے اندر آ کر ان کو غور سے دیکھا کہتے تو ہم بھی ان کو موصوف ہی ہیں لیکن اگر موصوف کے مخاطب سے لکھتے تو کچھ قارئین جو ہماری طرح مصنفہ کا نام پڑھے بغیر پڑھنے کی عادی ہیں کسی مزاح نگار کا سمجھ کر سوچتیں اس مرتبہ انہوں نے کچھ ماثا سا لکھا ہے۔ اپنے ”ان“ کا ظالم نظروں سے ایکسٹریٹ کیا تو معلوم ہوا بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔ حالت تو ادھر بھی کچھ پتلی سی ہے۔ وہ زلفیں جو کنگھا کرنے کے بعد ماتھے پر جھولتی تھیں پیچھے ہٹی ہوئی تھیں۔ چند یا کچھ خالی، خالی سی نظر آرہی تھی اور شکل پر بھی بڑھاپے کے آثار و جیہہ جوان کے بجائے انکل انکل سے لگے تو دل کو کمینی سی تسلی ہوئی۔ اس دشت میں ہم تنہا داخل نہیں ہوئے۔

اصل میں ان کی اور ہماری عمر میں تین سال اور بارہ دن کا فرق ہے۔ بڑا کون ہے آپ خود اندازہ لگائیں شاید اس طرح ہمیں کچھ مارجن مل جائے۔ ہم دونوں ہی سنگل پسلی اور عمر چور بلکہ ڈاکو دونوں کو ہی چھوٹا بننے کا مراق..... یہ مراق کیسے پیدا ہوا اس کی ایک الگ داستان ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تو ساتھ ہی ہمارے جیٹھ کی بھی شادی ہوئی۔ وہ دونوں ماشاء اللہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں..... شاید ہم دونوں کا وزن ملا کر بھی ان میں سے ہر ایک سے کم ہو اس لیے ہم سب کو چھوٹے، چھوٹے لگے بیوٹی پارلر پر ایک خاتون گویا ہوئیں۔

”آج کل ماؤں کو آخر آئی ہوئی ہے ان کا بس نہیں چلتا ورنہ پیدا ہوتی کوئی بیاہ دیں۔“ شادی کے بعد مسائیوں سے میل ملاپ ہوا یا ٹیرس پر سے کسی سے ہائے ہیلو سوال ہوا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

”بیٹا کون سی کلاس میں پڑھتی ہو، ہائے سچ سچ
شادی شدہ ہو یقین نہیں آتا۔“ یہ فقرے دس بارہ سال تو اتر
سے سنتے رہے۔ اب چند سال سے ان کی گونج کچھ کم
ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اب بھی کوئی نہ کوئی معصوم پوچھ ہی
لیتا۔ ”کیا آپ کی شادی ہو گئی؟“ تو دل چاہتا ہے جھٹ
اس کی بلا میں لے لیں۔ دل کئی دن تک سرشار سا رہتا۔
جب پہلی پریکٹس میں ڈاکٹر کے پاس گئے تو سوال ہوا
”شادی شدہ ہو؟“ جھٹ بولے اگر شادی نہ بھی ہوئی
ہوتی تو آپ کے سامنے خود کو شادی شدہ ہی ظاہر
کرتے۔ کافی شرمندہ ہوئیں۔ جب بھی بچوں کی نئی
کلاس ٹیچر سے ملے یا رزلٹ لینے گئے یہی سوال ہوا۔
چوتھے بچے تک لوگ پوچھتے رہے۔ ”کیا پہلا بچہ
ہے؟“ ایک دو مرتبہ تو ہم نے کہا بھی پلیز ایک بار پھر کہیں
ہم نے موبائل میں فیڈ کر کے میاں کو سنانا ہے۔ کچھ یہی
حال ان کا بھی رہا۔ ہم کہیں گئے یا کوئی مہمان پہلی مرتبہ
ہمارے ہاں آیا۔ ہم ہمیشہ ان کے جانے کے بعد خوش
ہوتے رہے۔ جب بھی اپنے کلاس فیلوز کو ملتے آپس
میں ایک دوسرے کو دکھا کر دونوں ہی خوش ہوتے۔ وہ
جو موٹی سی آنٹی ہیں اور نج سوٹ میں یہ ہمارے ساتھ
کالج میں ہوتی تھیں۔ یا وہ جو موٹا سا گنجا سا ہے میرا
ہاسٹل فیلو تھا۔ باہر بھی ان کا یہی حال تھا۔ ہر نئی جگہ نیا
اسٹاف پوچھتا ”سر آپ کی شادی ہو گئی ہے۔“ جب بتاتے
میرا بڑا بیٹا او لیول میں ہے تو لوگ حیرت کا اظہار
کرتے۔ خیر اپنی اپنی جگہ پر ہم دونوں کا یہی خیال تھا ہم
ہمیشہ یونہی جوان رہیں گے۔ مگر اب سارا دن عجیب
پریشانی میں کٹا۔ صبح صبح منکشف ہونے والی افتاد کے
بارے میں سوچتے رہے۔ کبھی اپنے آپ کو کوستے کاش
کوئی ٹاسٹ کریم ہی استعمال کرتے رہتے آخر ساری دنیا
کرتی ہے، کوئی نہ کوئی تو فائدہ ہوتا ہی ہوگا۔ ایسی بھی کیا
سستی اور بے پروائی۔ کبھی پارلر ہی چلے جاتے آخر
رسالوں میں کوئی ایسے تو نہیں لکھا ہوتا ہے کہ میں سال
کے بعد فیشل باقاعدگی سے کروانا چاہیے۔ ہم نے تو
شادی کے وقت میک اپ کے علاوہ کبھی پارلر کی شکل ہی

نہیں دیکھی تھی۔ کبھی دل کو تسلی دیتے۔ زمانہ کافی ترقی کر گیا ہے کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا۔ شو بزدالے بھی آخر کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی ہیں۔ پھر خیال آیا ایک چکر پارلر کا بھی لگالیں۔ بھویں بنوائیں جو عینک لگانے کی وجہ سے نہیں بنواتے، فیشل کروا کر بال چھوٹے کروالیں۔ شاید شکل پر کچھ فرق پڑ ہی جائے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا اچھے پارلر سے یہ سب کروانے پر کافی خرچہ آتا ہے۔ انہوں نے جو خرچہ پچھلے پندرہ سالوں سے نہیں کیا ایک دم کرنے پر کیسے آمادہ ہوں گے۔ کنجوس ابن کنجوس ہیں..... خیر اللہ کا نام لے کر فون کر کے پوچھا۔ بولے ”مہینے کا آخر ہے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اکٹھے پانچ ہزار.....“ گویا پانچ لاکھ مانگ لیے ہوں۔ پھر سوال کیا..... ”کیا یکم کے بعد مل جائیں گے؟“

”نہیں اس مرتبہ بچوں کی فیس دینی ہے۔ دیے تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوچھی۔ کیا کسی ایڈ میں کام مل گیا ہے۔ جیسی ہو ویسے ہی گزارہ کرو۔“

اور کھٹ سے فون بند..... دل میں وہموں کی یلغار ہو گئی۔ یقیناً کوئی نہ کوئی چکر ہوگا جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم بوڑھے لگیں۔ کوئی نئی اسٹاف یا کوئی ڈاکٹر کوئی؟ خیر رات کو بہانہ بنا کر پوچھیں گے۔ ہمارے ساتھ گانٹی کا کوئی مسئلہ ہے، کوئی اچھی ڈاکٹر نظر میں ہو تو بات کروائیں۔ ظاہر ہے جو آج کل اچھی لگ رہی ہوگی اسی کا خیال آئے گا اور ان کی سلام دعا سے ہم کچھ نہ کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ ویسے تو ہمارے سامنے آنے والے فون کو یا تو کاٹ دیتے ہیں یا کہتے ہیں کہ پھر بات کروں گا۔ اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ فون پر کوڈ لگا ہوا ہے۔ بچوں کا بہانہ کر کے کہ ہر چیز انہیں دکھانے والی نہیں ہوتی۔ ویسے فون کا اس طرح خیال رکھتے ہیں جیسے ماں، اپنے نوزائیدہ کا..... رات کو بھی سوئے، جان کر ہاتھ لگانے کی کوشش کرو تو فوراً تڑپ کر اٹھیں گے کیا ہوا؟ ایسے میں فون اپنے ہاتھ میں لینے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میرے فون میں بیلنس نہیں ایک ضروری کال کرنی ہے۔ بادلِ نخواستہ دے تو

دیں گے مگر ساتھ ہی پھیرے لینے شروع کر دیں گے۔ ”جلدی فارغ کرو مجھے ذرا باہر جانا ہے۔“ ایسے میں دکھاوے کے لیے ملائی ہوئی کال پر بھی ٹھیک طرح سے بات نہیں ہوتی۔ فون پر کیا خاک چیک ہوگا۔ جلد ہی اس کا توڑ بھی تلاش کر لیا گیا۔ ایک عام سادہ سا فون جس میں ہمیشہ بیلنس ہوتا..... اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

میاں تڑپتے ہوئے ”جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرو۔ مجھے لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“ بیوی فون ہاتھ میں لیتے ہوئے ”میرے پاس تو بیلنس نہیں جلدی سے اپنا کوڈ بتاؤ۔“

میاں ”ٹھہرو، ٹھہرو، مجھے لگ رہا ہے میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔“

ایک دن کسی دوست کی فوتگی سے واپس آئے تو عجیب سی کیفیت میں بولے۔

”ایک وعدہ کرو اگر میں خدا نخواستہ تم سے پہلے فوت ہو گیا تو اللہ نہ کرے تو میرا فون ایسے ہی نہر میں پھینک دینا۔“ ہم نے آواز میں رقت بھرتے ہوئے کہا اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے وعدہ نہیں کرتے ایک دم سے اتنے خرچے ہوں گے مجبوری میں بیچنا بھی پڑ سکتا ہے۔ سن کر چپ ہو گئے چند دن بعد پچاس ہزار ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا یہ پیسے بہت سنبھال کر رکھو کبھی ایمر جنسی ہو سکتی ہے۔ تب سے ہم ہر نئے فون کی آمد پر یاد دلاتے ہیں کہ یہ فون تو مہنگا ہے۔ تو مزید پیسے مل جاتے ہیں۔ اللہ کرے جلدی سے ایک اور اچھا سا فون لیں تو ہماری سونے کی چوڑیاں آجائیں گی جو کب سے پسند ہیں۔

خیر رات گئے تک ہماری گرما گرم بحث ہوتی رہی اور انہوں نے ہمارے کپڑے، جوتے اور ہم نے ان کے موبائلز کے بل اور ہوٹل کے خرچے گنوائے۔ آخر کار تھوڑے سے پیسے حاصل کرنے میں کامیابی ہو ہی گئی۔ صبح ہی جا کر بال چھوٹے کروائے۔ مختلف رسالوں میں پڑھی تراکیب ذہن میں لائے۔ اٹھائے

کی ماں ہیں؟“ دل چاہا کولڈ ڈرنک میں زہر ملا دیں۔ یا اللہ تمام دنیا کی آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔ سب نے آخر ہمارا دل جلانے کا ٹھیکا کیوں لے رکھا ہے۔

غور کیا تو پتا چلا ہمارے ”ان“ کا بھی حال ہم سے زیادہ فرق نہیں۔ ایک دن تیل کی بوتل اٹھا کر بولے ”ذرا تیل تو لگا دو۔ بال گر رہے ہیں۔“ جب مالش کروا کے دل کو تسلی ہوئی تو بولے۔

”آج ایک مریضہ جس نے پرچی پر اپنی عمر پینتیس سال لکھوائی بولی انکل۔ میرا دل تو غصے سے کھول اٹھا۔ لگ رہا تھا بی پی شوٹ کر جائے گا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ زہر کا ٹیکا لکھ دوں اگر ایمان ملک اور ہا وسیم کی وجہ سے ڈاکٹروں کی شامت نہ آئی ہوتی تو قسم سے یہی کرنا تھا۔“ چند دن ہوئے اپنی کپڑوں کی الماری شاید زندگی میں پہلی مرتبہ کھول کر کھڑے تھے۔ ”ہم نے پوچھا کیا چاہیے؟“ بولے۔

”ایک بھی ڈھنگ کی شرٹ مجھے..... کس قسم کے عجیب مرے مرے سے رنگ ہیں۔“ ہم اس حال سے گزر چکے تھے فوراً اندازہ ہوا دل پر چوٹ لگی ہے۔ ٹھنڈا پانی پلانے کے بعد ہم نے پھر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ کہنے لگے۔

”آج تو حد ہی ہو گئی۔ کلینک کے ساتھ والے دکاندار سے سلام دعا ہے۔ آج بولا سر میرے سر کو کوئی نوکری دلوادیں۔ پوچھا کتنی عمر ہوگی تمہارے سر کی؟ فوراً بولا سر کچھ زیادہ نہیں تقریباً آپ کی جتنی ہوگی چند سال پہلے فوج سے ریٹائرڈ ہوا ہے۔“ اسی شام ہماری ایک رشتے کی بھانجی اسلام آباد سے آئی ہوئی تھیں۔ اپنی گڑیا کو ”ان“ کی گود میں ڈال کر بولی ”جاؤ بیٹا نانا پاس.....“ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ قاعدے میں بنی صس سے ضعیف کی شکل آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

خیر اس کے بعد کچھ دن تک ہم دونوں الجھے الجھے رہے۔ جی بھر کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کیں۔ یہ بھی میروں کالی گہرے گہرے رنگوں کی شرٹس لالا کر الماری

دہی، شہد، جو کا آنا سب کے باری باری ماسک لگائے تاکہ تھوڑے فریش لگیں۔ پھر نہا کر بہن سے مانگ کر لایا چھوٹی آستینوں اور چھوٹی شرٹ ٹراؤزر والا نئے فیشن کا سوٹ پہنا۔ اکلوتی میک اپ کی چیز لب اسٹک لگا کر دل کو تھوڑی تسلی ہوئی ابھی ڈولے (گرے) بیروں کا کچھ نہیں بگڑا۔ شام کو انہوں نے بھی کل کی لڑائی کی تلافی یا پھر اپنے پیسے پورے کرنے کے لیے ترچھی سی نظر ڈالتے ہوئے اپنا فرض پورا کیا۔ بال کٹوا کر چھوٹی لگ رہی ہو۔“ دل کو کافی ڈھارس ہوئی۔ جو چند روزہ ثابت ہوئی۔ ایک صبح جب اپنے چھوٹے بیٹے کو اسکول بیگ پہنا رہے تھے ایک ذلیل سائیکل والا بولا۔ خالہ جی ذرا بچنا۔ پھر وقفے وقفے سے آنے والے فقرے اتوار بازار کے فضول دکاندار.....

”خالہ جی یہ لیں..... آنٹی جی بات سنیں۔“ پھر تو گھر والے بھی ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگے۔ چھوٹا بیٹا ساتھ لیٹا ہوا ہمارے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ دو چار سفید بال نظر آئے تو بولا۔ ”اماں آپ تو بڑھی ہو گئی ہیں۔“ ایک دن بڑے والے نے پوچھا ”کیا آپ کے بچپن میں آئس کریم ہوتی تھی۔“ یا اللہ کیا ہم پتھر کے زمانے کے لوگ ہیں۔

میری امی بچوں کو نماز کے لیے ڈانٹ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ہمیں لپیٹتے ہوئے بولیں۔

”اب تم اور کس زمانے میں فجر کی نماز پڑھو گی۔ اب عمر ڈھل رہی ہے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔“ یا اللہ کیا..... ہم اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک دن یہ میرے لیے سوٹ لائے ساس بولیں۔ ”ہیں یہ تم اس کے لیے سرخ سوٹ لائے ہو۔“ جیسے یہ خود ان کے لیے سرخ سوٹ لے آئے ہوں۔ حالانکہ ان کو سرخ اور گلابی رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ کا پتا ہی نہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہماری چھوٹی بہن کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہم حسب معمول گندے مندے پھر رہے تھے۔ فوراً بڑی سی چادر اوڑھ کر اندر چلے گئے۔ پوچھا گیا ”کیا آپ لڑکی

میں رکھتے رہے۔ نکال کر پہن کر خود کو آئینے میں دیکھتے اور اتار کر کوئی ہلکے رنگ کی شرٹ پہن لیتے۔ بالوں کا اسٹائل چینیج کیا۔

ہم بھی جس کو فریش دیکھتے فوراً اس کی لب اسٹک کا نمبر اور برانڈ پوچھتے۔ کوئی بہن یا بھالی جن کپڑوں میں کھلی کھلی لگیں۔ سوٹ ادھار مانگ لیتے کچھ بالوں کی لٹ کاٹی..... تو کبھی بال کھول کر ٹوپی سر پر رکھی۔ اپنی عادت کے برعکس گہرے رنگوں کے جدید ڈیزائن کے کپڑے سلوائے تاکہ لڑکی لڑکی لگیں۔ یہ بھی کرشمہ سے ہوتے ہوئے کترینا تک آئے۔ ہمیں بھی ربیر کپور بھانے لگے۔ اب بھی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا کبھی کبھار چھو ہی لیتا ہے یا اپنی کولیگ کے ساتھ کسی نئے اسپتال گئے۔ وہ محترمہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ لیکن خاصی کچم شہیم..... وہاں کسی نے ان سے پوچھا آپ اپنے بیٹے کے ساتھ آئی ہیں۔ ”ان“ کو مارے خوشی کے دو دن تک نیند نہیں آئی۔ ہم ”ان“ کے کسی واقف کی شادی پر گئے۔ ”ان“ کی اسٹاف کہنے لگیں سر کی عمر تو اچھی خاصی ہے ان کی بیوی تو چھوٹی سی لڑکی ہیں، سن کر خون میں سیروں اضافہ ہوا۔ جو اگلے دن ایک ہی وار میں خشک ہو گیا۔ جب اسپتال کی ایڈمن کہنے لگی۔

”میں نے امی کو آپ کے بارے میں بتایا کہ آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ وہ آپ سے ملنے آئیں گی۔“ یعنی کبھی سوکھے تو کبھی ڈوبے۔

گزشتہ ہفتے رات کو بارش کے بعد موسم بہت خوب صورت تھا۔ اور اتفاق سے یہ بھی فارغ تھے۔ ہم سب موسم انجوائے کرنے لانگ ڈرائیو پر نکلے۔ پھرتے پھرتے ان کے ہاسٹل کے پاس سے گزرے۔ گاڑی روک کر بچوں کو بتانے لگے۔ پھر بولے آؤ بچو تمہیں اپنا کمراد دکھاؤ..... ہمیں تو گاڑی میں بیٹھنا تھا کیونکہ بوائز ہاسٹل میں رات میں خواتین کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہمارا خیال تھا اب کم از کم آدھ گھنٹا تو ضرور بور ہوں گے۔ یہ ٹھیک پانچ منٹ بعد کھوٹے سکے کی طرح تشریف لائے بولے آج کل کے لڑکے عجیب

فضول ہیں۔ کہنے لگے ”آئیں انکل بیٹھیں۔“

آخر ایک دن قرآن پاک پڑھتے ہوئے ہم اس آیت پر پہنچے ”جب انسان چالیس سال کا ہوا اور اپنی بھرپور جوانی کو جا پہنچا۔“ بار بار یہ آیت پڑھی۔ قرآن بند کر کے مزید سوچا تو پتا چلا کہ بہت سے پینمبروں کو نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی۔ یعنی اللہ کے نزدیک چالیس سال میچور ہونے کی عمر ہے۔ ایک دم ہلکے پھلکے ہو گئے۔ ممتاز مفتی نے سچ ہی کہا ہے۔

”عورت نے نئی روش کے تحت لڑکی بن کر جینے کو اپنا لیا ہے۔ وہ عورت بن کر جینے سے الرجک ہو گئی ہے۔ پرانے زمانے میں حسن کا معیار صحت مند مٹیاری ہوا کرتی تھی۔ اب پچکے گالوں والی زرد انیمک لڑکی۔“ یوں ہم نے لڑکی پن کو خدا حافظ کہا اور عورت بن کر جینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ویسے بھی تمیں سے چالیس سال کا عرصہ جوانی کا بڑھاپا اور چالیس سے پچاس سال کا عرصہ بڑھاپے کی جوانی ہے۔ اس لیے ہم بڑھاپے کی جوانی گزار رہے ہیں۔ اور خوش ہیں، جوانی تو ہے بڑھاپے کی ہی سہی۔ البتہ تمیں کے قریب والوں سے اتنی گزارش کرنے کی جسارت ضرور کرتے ہیں۔ آنٹی خالہ یا انکل بناتے ہوئے اپنے بارے میں ضرور سوچیں آپ کو بھی جلد ادھر ہی آنا ہے۔ آپ پر بھی یہی ستم ٹوٹیں گے۔ ساتھ ساتھ تھوڑا سا خیال ہم فوری نانی کا ضرور کریں۔ ہم بھی دل رکھتے ہیں اور اس میں کچھ ارمان ابھی باقی ہیں۔

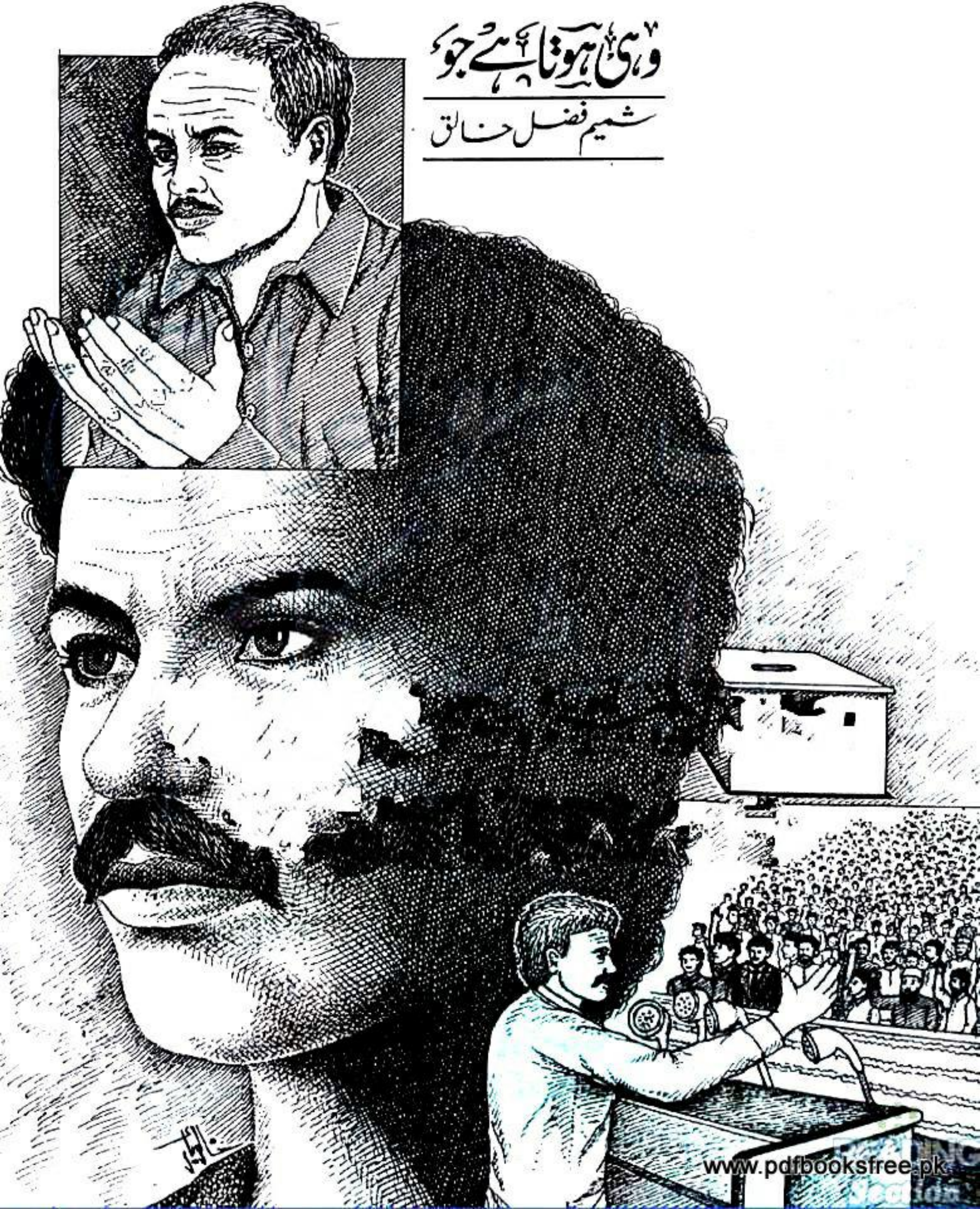
ہماری جتنی عمر ہے ہمیں اس کا اچھی طرح احساس ہے۔ آپ بھی اپنی عمر کا خیال کریں اگر ہم کبھی تیار شیار ہو کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں تو پلیز ہماری خوشیوں کو خاک میں مت ملایا کریں۔ چند سال پہلے تک صرف عورتیں ہی آپا یا باجی بنانے کی شوقین تھیں۔ اب مرد بھی اس میدان میں کافی ترقی کر رہے ہیں۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا ہمیں خوش ہونے کا اتنا ساق تو ہونا چاہیے ناں.....!

کاغذات داخل کرانے کی آخری تاریخیں تھیں اور ملک
قاسم نے وہاں دفتر میں اپنا ایک خاص بندہ کھڑا کیا ہوا
تھا تاکہ وہ ملک قاسم کو ہر اس امیدوار کے بارے
میں اطلاع دے جو اس دن نامزدگی کے کاغذات

ملک قاسم اپنے وسیع و عریض ٹیرس پر ٹہل رہا
تھا..... بظاہر تو وہ چہل قدمی کر رہا تھا لیکن دراصل وہ
سخت ٹینشن میں تھا..... دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں
آ رہی تھیں..... اسمبلی کے الیکشن کے لیے نامزدگی کے

وہی ہونا ہے جو

شیم فضل حناق



داخل کرانے کے لیے آئے۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا..... اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔
 ”یہ نالائق کرموفون کیوں نہیں کر رہا..... میں نے اسے کہا بھی تھا کہ مجھے پل پل کی خبر دیتے رہنا۔“
 اچھے بھلے محمد کریم کو ملک قاسم نے کرمو بنا دیا تھا..... لیکن کرمو، ملک قاسم کا دایاں ہاتھ تھا..... ملک قاسم کو خود پر اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا کرمو پر تھا۔ وہ ملک قاسم پر اپنی جان فدا کر سکتا تھا اس کا ملک قاسم کو اچھی طرح یقین تھا لیکن اس کے باوجود وہ غصے میں آتا تو اس..... بیچارے کے جسم پر ایک چیتھڑا نہ چھوڑتا۔

”بد ذات..... کم بخت کہیں کا..... اب مجھے ہی اسے فون کرنا پڑے گا۔“ بے قراری حد سے سوا ہوئی تو ملک قاسم نے اپنا قیمتی سیل فون پاکٹ سے نکالا اور کرمو کو فون کرنے لگا..... رنگ جا رہی تھی لیکن کرموفون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ملک قاسم نے دانت کچکچا کر اسے چند موٹی موٹی گالیاں دیں اور سیل فون پاکٹ میں رکھنے لگا اسی وقت اس کا فون گنگنا اٹھا..... ملک قاسم نے اسکرین دیکھی..... کرمو کا فون تھا۔

”کہاں مر گیا تھا بد ذات.....“ وہ دہاڑا۔ ”فون ریسیو نہیں کر رہے تھے تم، نہ ہی خود فون کر رہے تھے؟“
 ”وہ جی.....“ وہ ذرا گھٹیا کر بولا۔ ”معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔“

”کیسی معلومات.....؟“ ملک قاسم کے کان کھڑے ہوئے۔ اب تک جتنے بھی آزاد امیدواروں نے نامزدگی کے کاغذات داخل کرائے تھے اس حلقے سے..... وہ کوئی قابل ذکر لوگ نہیں تھے۔ نہ ہی وہ ملک قاسم سے الیکشن جیت سکتے تھے..... ملک قاسم کی ساری زندگی سیاست کے داؤ پیچ کھیلتے گزری تھی..... اسے سیاست کے سارے گرائے تھے۔

”اب بک بھی.....“ وہ گرج کر بولا۔
 ”سائڈ پر ہو رہا تھا مالک.....“ وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔

”آپ عبدل کو تو نہیں بھولے ہوں گے.....“

وہی جو اپنے حجرے میں نوکرتھا۔
 ”کون عبدل؟“ ملک قاسم سوچ میں پڑ گیا۔
 ”کہیں تو کالو کی بات تو نہیں کر رہا؟“ قدرے وقفے سے وہ بولا۔

”جی..... جی..... وہی۔“ کرمو جلدی سے بولا۔
 ”اس کا کیا ذکر ہے یہاں..... چو لھے میں ڈالو اسے اور کام کی بات کرو۔“ ملک قاسم بگڑ کر بولا۔
 ”وہی تو بتا رہا ہوں مالک..... عبدل نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرائے ہیں۔“

”کیا بکو اس کر رہا ہے تو؟“ ملک قاسم اتنی زور سے دہاڑا کہ اس کی آواز کی گونج دور دور تک سنی گئی..... دوسری طرف کرمو بھی سہم گیا..... ملک قاسم کو خود کو قابو کرنے میں چند لمحے لگے..... پھر وہ بولا۔ ”پوری بات بتا!“

”مالک..... عبدل ہمارے حجرے سے نکل کر غریبوں کی جس بستی میں رہتا ہے وہاں ان کی کمیٹی کا صدر بن گیا وہ اپنے لوگوں کے چھوٹے موٹے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا..... ان لوگوں کے اصرار پر وہ الیکشن میں کھڑا ہونے کے لیے رضامند ہو گیا..... آپ دیکھیے مالک..... پوری کی پوری غریب بستی اس کے ساتھ آئی تھی..... لوگ اتنے جوش و خروش میں تھے کہ مانو وہ آج ہی الیکشن جیت گیا ہو..... سب لوگ بڑے پُر اعتماد تھے کہ عبدل الیکشن ضرور جیتے گا۔“
 ”خاموش.....“ ملک قاسم زور سے چٹکھاڑا.....

اور مارے غصے کے فون کاٹ کر قریب رکھی میز پر اس طرح اچھالا کہ فون سیٹ گرتے، گرتے بچا..... مارے طیش کے ملک قاسم کے نتھنے زور زور سے پھڑک رہے تھے..... دل تھا کہ بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ امیروں سے مقابلہ کر سکتا تھا لیکن غریبوں سے مقابلہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا..... وہ عبدل کے بارے میں سوچنے لگا۔

عبدل چند سال پہلے اس کے حجرے میں نوکرتھا۔ دو سال تک اس نے وہاں کام کیا تھا..... ایک دن وہ ملک قاسم کے لیے ناشٹا ڈاننگ ٹیبل پر رکھ رہا تھا کہ

کی امید ہے ان کی آس ہے..... وہ مر جائے گا لیکن کبھی نہیں بکے گا۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے..... مار دو اسے۔“ ملک قاسم سفاکی سے بولا۔ ”پرویز اور امان سے بات کرلو۔“ پرویز اور امان، ملک قاسم کے خاص بندے تھے جو اس کے لیے ایسے ہی خطرناک کام کرتے تھے وہ اپنے کام میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ کبھی کسی کو ان پر شک نہیں ہوا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مالک..... لیکن اس طرح اس حلقے سے الیکشن نہیں ہو سکے گا۔ آپ کو یاد ہوگا پچھلی بار ایک امیدوار قتل ہوا تھا تو وہاں الیکشن روک دیا گیا تھا۔“ کرمو اس سے زیادہ باخبر تھا۔

”اوہ.....“ ملک قاسم جیسے ڈھے سا گیا اس بار اسے اپنی جیت کا پورا یقین تھا۔ اس کی پارٹی جو ہماری پارٹی کے نام سے تھی اب ایک بڑی پارٹی کے طور پر ابھرنے لگی تھی۔ اس بار تو انہوں نے بجلی کے بحران سے فائدہ اٹھایا تھا اور ”روشنی ہم دیں گے“ کے نعرے کے ساتھ اپنی الیکشن مہم کا آغاز کیا تھا..... لوڈ شیڈنگ کے ستائے لوگ ان کے نعروں پر یقین کرنے لگے تھے لیکن اب یہ عبدل؟ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو کاٹ لیا کرتی ہے اور پھر غریب لوگوں کا ایکابھی تو بے مثال ہوتا ہے۔ وہ سوچ، سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ اگر الیکشن نہ ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ عبدل کو قتل کرانے میں مزید ایک لمحہ نہ سوچتا..... لیکن اب کیا کیا جائے..... وہ ذہنی طور پر تھک سا گیا..... اس مسئلے کا کیا حل سوچا جائے..... اسے کافی کی طلب ہونے لگی تو فون اٹھا کر اس نے خانساں کو کافی لانے کے لیے کہا۔

یہ مردانہ حصہ جو حجرہ کہلاتا تھا زانہ حصے سے الگ تھا۔ ملک قاسم زیادہ تر اسی مردانہ حصے میں رہتا تھا..... اس کی بیوی مہر و ایک سادہ سی عورت تھی۔ جس نے کبھی شوہر کی ان دلچسپیوں میں غل ہونے کی کوشش نہیں کی..... حجرے میں بھی ملک قاسم کا ایک شاعر بیڈروم تھا اور وہ اکثر وہیں رات گزار لیا کرتا تھا.....

ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی..... جہاں سارے برتن ٹوٹ گئے وہاں چائے کی چھینٹیں ملک قاسم کے سفید براق کپڑوں پر بھی جا پڑیں..... ملک قاسم اس وقت ڈاننگ چیر پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا..... اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے وہیں عبدل کو دھنک کر رکھ دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوکروں کی پٹائی کرنا تو اس کا وتیرہ تھا..... نوکر بیچارے روپیٹ کر دوبارہ اپنے کاموں میں لگ جاتے لیکن عبدل اس مار کے بعد نہیں رکا..... اور اپنا حساب کتاب کر کے وہاں سے چلتا بنا.....

”تھوڑا سا برداشت سے کام لیتا تو عبدل آج بھی میرا نوکر ہوتا تو اس طرح میرے مقابلے پر نہیں آتا.....“ ملک قاسم نے سوچا۔ اسے کسی طور چین نہیں آرہا تھا..... دل سینے میں پھڑک رہا تھا..... ”کیا وہ عبدل جیسے بندے سے ہار جائے گا؟“ یہ سوچ اس کے دل کو نوچ رہی تھی، بے چینی حد سے سوا ہوئی تو اس نے پھر کرمو کو فون ملایا۔

”یتا کرمو..... کیا نئی تازہ خبر ہے..... اس کا لو سے ملاقات ہوئی؟“

”جی مالک..... بڑی اچھی طرح ملا..... آپ کی خیریت بھی پوچھی اس نے اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے جیسے غریب لوگوں کی قسمت بدلنے کے لیے آیا ہے..... وہ اسمبلی میں جا کر اپنے لوگوں کی تقدیر بدلے گا..... اسی طرح کی باتیں وہ کر رہا تھا۔“

”اچھا اب تقریر چھوڑ۔“ ملک قاسم کے حلق میں کڑوا تھوک آ گیا اس نے منہ ایک طرف کر کے آخ تھوکیا اور رازداری سے بولا۔ ”تو نے اسے خریدنے کی بات کی.....؟“ ملک قاسم جانتا تھا کہ کرمو بہت سارے ضروری کام اس سے اجازت لیے بنا ہی کر دیتا اور بدلے میں اس کی شاباش سمیٹتا..... نہ صرف شاباش بلکہ انعام و اکرام بھی.....

”ڈھکے چھپے لفظوں میں کی تو لیکن وہ تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگا مالک..... وہ کہنے لگا کہ وہ تو غریب بستی

یہاں اس کے دوست احباب بھی آیا کرتے تھے، رات گئے تک سیاسی بحثیں چلتی رہتیں..... قہوے کے، کافی کے دور چلتے رہتے..... ملک قاسم کے دو بیٹے تھے جنہیں اس نے پڑھنے کے لیے بیرون ملک بھیجا ہوا تھا۔

کافی آگئی تو وہ کونے میں رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا..... زیادہ سوچنے سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا..... وہ انگلیوں سے ماتھے کو دباتا ہوا گھونٹ، گھونٹ کافی پی رہا تھا کہ کرمو آ گیا..... سلام کر کے وہ ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”کرمو..... میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہوگا؟“

”کس مسئلے کا..... مالک؟“ وہ ادب سے پوچھنے لگا تو مالک قاسم نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔

”ارے..... تیرے باپ، عبدل کی بات کر رہا ہوں۔ اس خبیث کالو کی اور بھلا مجھے کیا مسئلہ ہوگا۔“

”ہاں مالک.....“ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”مسئلہ تو بڑا سنگین ہے، جو لوگ اس کے ساتھ تھے ان کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ سب عبدل کو کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے..... غریب بستی میں ایک عبدل ہی پڑھا لکھا ہے باقی تو سب ان پڑھ ہیں۔“

”تو جانتا ہے..... غریبوں کی تعداد امیروں سے زیادہ ہے۔“ ملک قاسم پر سوچ انداز میں بولا۔

”جی مالک..... یہ تو ہے.....“

”تو سن..... ہم کیوں ناں اس غریب بستی کے ووٹرز کو خرید لیں۔“ اسے جیسے ایک حل سوجھ گیا تھا۔

”میرا نہیں خیال مالک..... کہ اس میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ نہیں بکس گے..... اس بار وہ اپنی حالت سدھارنے کے لیے میدان میں کودے ہیں..... آپ ان کا جوش و خروش دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔“

”ایک تو، تو بہت منحوس ہے..... مجال ہے کہ کوئی بات میرے مزاج سے بھی کر لے۔“ ملک قاسم نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”جی مالک.....!“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”میں کوشش کر لیتا ہوں۔“

”سن..... تو عبدل سے بھی مل لے..... مگڑی آفر دینا اسے..... اور ووٹرز کے لیے تو اپنے ساتھ نوٹوں کی گڈیاں لے کر جانا۔“

”جی مالک.....“ وہ سعادت مندی سے سلام کر کے چلا گیا اور ملک قاسم بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا..... دو گھنٹے بعد جب یہ بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ کرمو کو فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آ گیا۔

”کیا..... کیا پتا؟“ ملک قاسم کو لگ رہا تھا جیسے اس کے سیاسی مستقبل کا انحصار اب صرف کرمو کی ہاں یا نہ میں ہے..... لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بری طرح ناکام لوٹا ہے..... ملک قاسم نے غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔

”بولو..... کیا ہوا.....؟“ وہ شدید بے چینی کے عالم میں پوچھنے لگا۔

”ہونا کیا تھا مالک.....“ وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر بولا۔ ”بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں..... میری آفر پر تو وہ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کر رہے تھے اور وہ عبدل..... وہ بھی ان کے ساتھ مل گیا تھا۔“

”کینے..... شیطان کی اولاد..... اس خبیث سے تنہائی میں بات کرنی تھی ناں.....“ ملک قاسم غصے سے چلا کر بولا۔

”تنہائی میں ہی کی..... اس سے بڑی رازداری سے بات کی تھی اور ووٹروں سے بھی الگ سے بات کی..... لیکن نہ جی..... وہ تو سب دوسری ہوا میں ہیں..... کہہ رہے تھے کہ وہ زمانے لد گئے جب تم دولت کی چھب دکھا کر ہم سے اپنی مرضی کے بندے کو ووٹ ڈلوایا کرتے تھے۔ اب ہم اپنے لیے خود جہد و جد کریں گے..... اور دیکھ لینا اسمبلی میں جا کر دکھائیں گے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا..... بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت کھلے پڑ گئی۔“

سے آئی ہوگی..... کچھ دیر اور سونے دو انہیں.....“
خانسا ماں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا..... سب کرمو کی
حیثیت جانتے تھے..... سو اس کی بات ماننا سب کے
فرائض میں شامل تھا..... جب گیارہ بج گئے تو
خانسا ماں پھر کرمو کے پاس آیا۔

”ارے.....!“ کرمو اس کی بات سن کر چونک
اٹھا۔ ”ابھی تک نہیں اٹھے؟“

”جی میں تیسری بار چائے لے کر گیا تھا.....
اور اس بار دروازے پر دستک بھی زور سے دی.....
لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔“ خانسا ماں نے بتایا
تو کرمو کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے
لگے..... وہ جیسے بھاگتا ہوا ملک قاسم کے بیڈروم
میں گھسا اور ایک ساتھ ساری لائشیں جلا دیں.....
ملک قاسم اپنے بیڈ پر عجیب غیر فطری انداز میں لیٹا
ہوا تھا..... کرمو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ
دیوانہ وار ملک قاسم کی طرف بڑھا..... کبھی اس کے
دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرتا..... تو کبھی نبضیں
ٹٹولنے لگتا..... پل بھر میں سارے نوکر بیڈروم میں
جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ ملک قاسم کو دیکھتے
ہی ڈاکٹر کہنے لگا۔

”ان کو تو مرے کافی دیر ہو چکی ہے..... بڑا
سیریس ہارٹ اٹیک ہوا..... جو ان کے لیے جان لیوا
ثابت ہوا۔ اگر وقت پر طبی امداد مل جاتی تو شاید.....“
وہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

ملک قاسم کا بہت بڑا جنازہ تھا..... ملک کے ہر
شہر سے لوگ آئے تھے..... کرمو نے دیکھا جنازے
میں عبدل بھی شریک تھا۔

”مالک..... آپ نہیں جانتے تھے کہ آج عبدل
کی نہیں آپ کی آخری رات تھی دنیا میں۔“ وہ خود سے
کہنے لگا۔

مدی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

ملک قاسم اپنے ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے
رگڑتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا۔

”دعا کریں مالک..... کہ عبدل راتوں رات

مر جائے..... اسے ہارٹ اٹیک ہو جائے..... پھر
غریبوں کی بستی میں کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے جو عبدل کی
سیٹ سنبھال سکے۔“ کرمو کو کچھ نہ سوچا تو یہی کہنے لگا۔
”تمہارے منہ میں کبھی شکر کرمو..... پہلی بار

کوئی ڈھنگ کی بات کی ہے۔“ ملک قاسم نے پہلی
بار کرمو سے بغیر گالی دیے بات کی تھی..... کچھ دیر
دونوں اسی موضوع پر بات کرتے رہے لیکن جب
کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو فیصلہ یہ طے پایا کہ
کل پارٹی کے خاص خاص بندوں کو بلا کر میٹنگ کی

جائے اور اسی کے مطابق اقدامات کیے
جائیں..... ملک قاسم بہت تھک گیا تھا..... آج
سارا دن شدید قسم کے جذباتی ہیجان میں گزرا
تھا..... اس نے ڈنر بھی برائے نام کیا..... اور صرف

کافی کا ایک کپ پی کر اسی حجرے میں اپنے بیڈروم
میں چلا گیا..... کرمو کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

وہ بار بار دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے آج کی
رات عبدل کی آخری رات ہو..... اس طرح ہل دی

لگے نہ پھٹکری..... اور رنگ بھی چوکھا آئے گا.....
اگر ایسا ہو گیا یعنی عبدل آج چل بسا تو پھر دنیا کی

کوئی طاقت اسے الیکشن جیتنے سے نہیں روک سکتی۔
بستر پر جانے سے پہلے اور نیند کی گولی لیتے ہوئے

بھی اس کے ہونٹوں پر یہی دعا تھی۔

اگلے دن صبح نو بج گئے..... پھر دس بج گئے۔

خانسا ماں دوبار بیڈ ٹی لے کر ملک قاسم کے بیڈروم
میں گیا..... ہلکی سی دستک دی..... لیکن ہمیشہ کی طرح
ملک قاسم کی آواز نہ آئی..... کہ ”اندر آ جاؤ.....“ خود
سے وہ ڈر کے مارے اندر جا نہیں سکتا تھا۔ وہ کرمو کے

پاس گیا اور اسے ساری بات بتائی تو کرمو بے پروائی
سے کہنے لگا۔

”رات کو مالک خاصے پریشان تھے..... نیند دیر

اعشوق ترے ہیں کھیل عجیب

ڈرامن بلال

وہ کمال ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار... یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصع ہو، زیر نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قطعہ 4



سارہ نے صبح کالج جاتے ہوئے کاجل اور لپ اسٹک اپنے بیگ میں رکھ لی تھی اور خوب صورت سی وہ قیمتی بالیاں جو اس نے پچھلی عید پر تین سو کی خریدی تھیں وہ بھی بیگ میں رکھ لی تھیں۔
آج وہ ذہنی طور پر اسجد کے ساتھ باہر جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ ذوی اسکول کے لیے گھر سے نکل چکی تھی۔

”اچھا اماں میں کالج جا رہی ہوں۔“ سارہ نے چادر سر پر لیتے ہوئے سیما بیگم کو اطلاع دی۔
”سارہ میری آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لگتا ہے بلڈ پریشر ہائی ہے میرا..... تو ایسا کر مجھے ایک کپ چائے بنا دے۔“ سیما بیگم گلو کے لاپتا ہونے کے باعث پریشانی سے بیمار پڑ گئی تھیں۔
”اماں، چائے بناتے، بناتے مجھے کالج جانے میں دیر ہو جائے گی۔ آج تو صبح سے سوئی گیس بھی بہت کم آرہی ہے.....“ سارہ نے بیگ اور اپنی فائل اٹھاتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔
”ایک تو ان کم بختوں نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے پہلے بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوا کرتی تھی اب بجلی کے ساتھ، ساتھ گیس بھی بند کر دیتے ہیں نامراد کہیں کے۔“ سیما بیگم غصے میں بولیں۔
”سن آج تجھے بھی بڑی جلدی ہے کالج جانے کی..... ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔“
”اماں کالج جاتے ہوئے مجھے پندرہ بیس منٹ لگتے ہیں۔ اور ویسے بھی آج جس ٹیچر کا پہلا پیریڈ ہے وہ بہت سخت ٹیچر ہیں۔ پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو پوری کلاس کے سامنے بے عزتی کر دیتی ہیں.....“ آج سارہ بڑی روانی سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی تھی۔ صرف اسجد کے لیے۔
”اچھا چل جا پھر..... تیرے ابا اپنے والدین کی قبر پر تلاوت کرنے گئے ہیں وہ آتے ہیں تو انہیں کہہ دوں گی۔ مجھے ایک کپ چائے بنا دیں گے۔“
”اماں آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“ وہ التجائیہ انداز میں کہتی ہوئی ان کے پاس پلنگ پہ بیٹھ گئی۔
”کون سی بات؟“

”اماں وہ میری سہیلی ہے ناں حنا..... وہ کچھ دنوں سے بیمار ہے اور کالج نہیں آرہی..... کلاس کی دو تین لڑکیاں کالج سے چھٹی کے بعد اس کے گھر اس کا پتا کرنے جا رہی ہیں۔ میں بھی ان لڑکیوں کے ساتھ حنا کو دیکھ آؤں؟“
”ہاں چلی جانا مگر زیادہ دیر نہ لگانا..... ورنہ تیرے ابا سوال یہ سوال کر کے میری جان کو آجائیں گے کہ سارہ کہاں گئی ہے؟ کالج سے ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کس سہیلی کے گھر گئی ہے؟ وغیرہ، وغیرہ.....“ سیما بیگم نے اسے تسبیہ کی۔

”جی اماں مجھے پتا ہے، میں چھٹی کے بعد بس گھنٹے ڈیڑھ تک آ جاؤں گی۔“ سارہ پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”اچھا ٹھیک ہے، باہر کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر جانا۔“
”اچھا اماں اللہ حافظ!“

سارہ ان سے اجازت لے کر گھر سے نکل گئی تھی۔ آج وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی کالج کی طرف روانہ تھی۔
سیما بیگم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آج سے پہلے وہ کبھی اتنے شوق سے اور اتنی جلدی میں کالج جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ ایک بے چینی تھی، ایک انتظار کی کیفیت تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔
کالج میں بھی اس نے غائب دماغی سے تمام کلاسز اینڈ کی تھیں۔ آخری پیریڈ بنک کرنے کے بعد وہ کالج کے وسیع لان میں ایک درخت کے نیچے آ بیٹھی۔ سارہ نے اپنے بیگ میں سے چھوٹا سا مرر نکالا پھر کاجل نکال کر اپنی

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

بڑی، بڑی خوب صورت آنکھوں میں کاجل لگانے لگی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگانے کے بعد بیک سے بالیاں نکال کر پہننے لگی۔

اسی اثنا میں چھٹی کی گھنٹی سنائی دی۔

سارہ نے جلدی سے بیک اور فائل اٹھائی۔ چادر کو سر پہ لیا اور گیٹ کے قریب آ گئی۔ لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں گیٹ سے باہر نکلنے لگیں۔ سارہ نے گیٹ سے باہر جھانکا مگر اسے اسجد کہیں دکھائی نہ دیا۔

وہ اندر آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گیٹ سے دوبارہ باہر جھانکا۔ اس بار بھی اسے مایوسی ہوئی۔ اسجد کہیں نظر نہ آیا.....

”بھئی کہاں غائب تھیں سارہ! آج آخری پیریڈ ہی نہیں لیا تم نے؟“ اس کے عقب میں کھڑی حنا اس سے پوچھ رہی تھی۔

سارہ نے چونک کر بے اختیار حنا کی طرف رخ موڑا۔

”واہ بھئی..... بڑے میک آپ شیک آپ..... کہاں کی تیاری ہے؟“ حنا نے رازداری سے پوچھتے ہوئے اسے آنکھ ماری۔

”کک کہیں نہیں..... آج بس دل چاہا تو کاجل لگا لیا۔“ سارہ شپٹائی۔ اس نے کبھی حنا سے جھوٹ نہیں بولا تھا..... اور وہ ہمیشہ سادہ سی کاجل یا لپ اسٹک کے بغیر ہی کالج آیا کرتی تھی۔

”دل ایویں ہی تو نہیں چاہتا میری جان..... یہاں جب لڑکیاں اس طرح تیار ہو کر گیٹ کے پاس کھڑی ہوتی ہیں تو تم اچھی طرح سے جانتی ہو وجہ کیا ہوتی ہے؟ اور تمہیں تو میں تین سال سے جانتی ہوں..... سچ، سچ بتاؤ..... کسی لڑکے کے چکر میں ہو؟“ حنا نے مسکراتے ہوئے رازداری سے اس سے پوچھا۔

”ہاں نہیں..... چلو اب گھر چلتے ہیں۔“ سارہ زور سے ہو چکی تھی۔

”ہاں تو خیر مجھے چل ہی جائے گا..... یہ بتاؤ جو لڑکا روز ہمارے پیچھے آتا ہے کہیں اسی سے افیر تو نہیں چل رہا تمہارا؟“

”ہاں وہی ہے، محبت کا دعویٰ کرتا ہے مجھ سے.....“ وہ دھیرے سے اعتراف کرنے لگی کیونکہ حنا سے اب مزید کچھ چھپانا بالکل فضول تھا۔

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کالج گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ سارہ نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اسجد کہیں ہوتا تو دکھائی دیتا۔

”اچھا..... تو ہمارے گروپ کی انوشے تو خواہ مخواہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ لڑکا اس کے پیچھے آتا ہے۔“ حنا مسکرائی۔

اب کے سارہ خاموش رہی..... باقی کا راستہ ایسی ہی چھوٹی موٹی باتوں میں طے ہو گیا تھا۔ سارہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا..... آج پہلی بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے..... مگر اس نے ایسا کیا نہیں تھا..... آہستہ، آہستہ سب لڑکیاں اپنے، اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی تھیں۔ حنا کا گھر سارہ کے گھر سے پہلے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا.....

اب سارہ اکیلی رہ گئی تھی..... اس نے اپنی رفتار آہستہ کر دی..... اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس بار بھی مایوسی نے

اس کے دل کو اور پریشان کر دیا تھا۔ نہ جانے وہ اسے کیوں ستا رہا تھا..... کیوں اس کو خفگی دکھا رہا تھا؟ اب سارہ راستے میں ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔ آٹھ دس منٹ اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے کے باوجود وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ ایک بار پھر مرے قدموں سے چلنے لگی۔ اس کا دل ہر اٹھتے قدم کے ساتھ ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنی چادر کے پلو سے لپ اسٹک صاف کر لی اور بالیاں اتار کر بیگ میں رکھ لیں۔ اس کا گھر اب ایک گلی کے فاصلے پر تھا..... اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ اسجد اس سے ناراض ہو گیا۔ سارہ کے دل پر ایک بوجھ سا آن پڑا..... وہ مرے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہو چکی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے..... اس نے گھر کا دروازہ بجایا۔ جہاں داخل ہوتے ہی اسے ہمیشہ کی طرح نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆

ایشال کمرے میں داخل ہوئی تو پیٹو..... عنایہ کے ہاتھ پیروں پہ لوشن لگا رہی تھی..... ”کیسی ہو تم.....؟“ ایشال نے منہ پھلائے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔
 ”ہم تو ٹھیک ہیں مگر لگ رہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو؟“ عنایہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ایشال کو دیکھا۔

”ہاں میں بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں..... اور آج کا دن بھی بہت برا گزرا ہے میرا..... اور عمر بھائی کے سامنے آج مجھے بہت embarrassment فیل ہوئی۔“ ایشال نے اپنے ٹیڈی بیر کو خود سے لپٹاتے ہوئے بتایا۔
 ”کیوں بھی ایسا کیا ہو گیا آج؟“ عنایہ ہنوز مسکراہٹ چھپائے پوچھ رہی تھی۔
 ”عنایہ، جو آج میرے ساتھ ہوا ہے ناں..... اللہ کرے وہ کبھی کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ ہو۔“ ایشال کی آواز میں افسردگی تھی۔

”یا اللہ خیر..... ایٹو بی بی اب ایسا وی کیا ہوا ہے جی..... جھمتی دسو میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔“ اب کے پیو بھی پریشان ہوئی۔

پھر کیا تھا..... ایشال نے ڈاکٹر عمر کے حوالے سے اپنے ساتھ ہونے والا قصہ ان دونوں کے گوش گزار کر دیا جسے سنتے ہوئے عنایہ اور پیٹو کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔
 ”مجھے اتنی ہمتی (بے عزتی) محسوس ہو رہی ہے اور تم ہنس رہی ہو؟“ ایشال نے اپنے قریب رکھا کشن اٹھا کر عنایہ کو مارا۔

”تو تم نے لاؤڈ اسپیکر اپنے گلے میں فٹ کر کے علیحدہ سے عمر بھائی کے حوالے سے اس طرح کی گوسپ نہیں کرنی تھی ناں.....“ ہنس ہنس کر عنایہ کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔
 ”تو مجھے کیا معلوم تھا کہ عمر بھائی کے کان اتنے باریک ہوں گے..... یا وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے میری باتیں اتنی آسانی سے سن لیں گے۔“ ایشال جھنجلائی۔

”اپنی ویز جو بھی ہوا بہت برا ہو۔“ عنایہ نے کہا۔
 ”تو اور کیا..... ٹینشن سے میرا تو سر پھٹ رہا ہے۔“ ایشال اپنے ٹیڈی بیر کو اٹھائے بیڈ سے اٹھ کر انٹرکام کی طرف آئی۔

”اسلم میرے لیے اچھی سی کافی بنا کر روم میں بھیجو.....“ ایشال نے انٹرکام پر بٹلر کو ہدایت کی..... اور واپس بیڈ پر آ گئی۔

”پیو، دادو جاگ رہی ہیں؟“

ایسے عشق ترے ہیں کھیل عجب

”نہیں ایٹھ بی بی، وڈی اماں تو ظہر کی نماز پڑھ کر سو گئی تھیں جی۔“ ایٹھ نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”پینو اب بس کرو۔“ عنایہ نے پاؤں سمیٹ لیے..... پینو جو عنایہ کے پیروں پر لوشن لگا رہی تھی اٹھ کر واش
 روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔ عنایہ سائڈ ٹیبل پر سے موبائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔
 ”ایٹھ وڈے آج تمہارے ساتھ ہوا بہت برا ہے۔“

”عمر بھائی کی موجودگی میں ہمیشہ میرے ساتھ ایسے ہی کیوں ہوتا ہے اور یہ بات مجھے آج تک سمجھ
 نہیں آئی۔“

”عمر بھائی دل کے بہت اچھے ہیں، بس وہ خاصے چنگو تل آدمی ہیں۔ اصول پسند، سنجیدہ مزاج سے اور
 اگر وہ تمہیں کسی بات پر ڈانٹ بھی دیتے ہیں تو وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں..... تاکہ تم اپنے فیوچر
 کے بارے میں سنجیدہ ہو جاؤ۔“ عنایہ نے بڑی بہن ہونے کے ناتے ایٹھ کے دل سے ڈاکٹر عمر کے لیے
 بھری بدگمانی نکالنی چاہی۔
 ایٹھ خاموش رہی۔

اس دوران پینو بھی گیلے ہاتھ اپنے دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے آگئی تھی۔

”ایٹھ بی بی میں آپ کے سر کا مساج کر دیتی ہوں۔ فوراً آپ کے سر کی پیڑ (درد) دور ہو جائے گی۔“ وہ
 ایٹھ کے سر کا مساج کرنے لگی۔

”پینو تم سچ میں بہت اچھی ہو۔“ اس کے مساج کرنے سے ایٹھ کو سکون ملنے لگا اور اس کی آنکھیں بند
 ہونے لگیں۔

”بس ایٹھ بی بی چنگی (اچھی) تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ جس نے آپ کے دلاں دے وچ مجھ حقیر سی بندی
 کے لئے انس ڈال رکھی ہے۔ جو چھاں جو تحفظ اور جو پیار مجھے یہاں اس کار (گھر) میں ملا ہے اگر نہ ملتا تو پینو پتا
 نہیں کتھے دھکے کھا رہی ہوتی۔“ پینو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”پینو تم پچھلے آٹھ سال سے ہمارے ساتھ ہو۔ ڈونٹ وری تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی۔“ عنایہ نے موبائل
 ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے اس کو تسلی دی۔

”اللہ آپ دونوں بہنوں کو ہمیشہ خوش رکھے جی۔“

”او کے میں چلتی ہوں میرے جم کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ عنایہ بیڈ سے اٹھی۔ اسی اثناء میں اسلم دروازہ ٹاک کر
 کے ایٹھ کی کافی لے آیا تھا۔

”بھینکس پینو..... اب بس کرو..... میں کافی پی لوں۔“ پینو اور اسلم کمرے سے باہر نکل گئے۔

”ایٹھ اگر تمہیں آج ٹائم ملے تو سیلون چلی جانا..... تمہارے بال بہت عجیب اور روکھے ہو رہے ہیں..... اور
 تمہارا فیس بھی رف ہو رہا ہے۔“ تھوڑی دیر بعد عنایہ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، سائڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی
 موبائل اور گلاسز اٹھاتے ہوئے ایٹھ سے مخاطب تھی۔

”ہاں میں ابھی کال کر کے اپائنٹمنٹ لے لیتی ہوں۔“ عنایہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

”چھوٹو یا راب اٹھ جاؤ۔“ اقصم بہت گہری نیند سو رہا تھا اور وہ اس کے سر ہانے کھڑی مسلسل اسے
 جگا رہی تھی۔

تو اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑی مناب کو دیکھا..... بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکی کا

ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھالے۔ اسے اپنے قریب کر لے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھے کہ یہ کب، کیسے اور کتنا عجیب کھیل کھیلا ہے تم نے میرے دل کے ساتھ..... کہ یہ دل اب تمہارے علاوہ کسی کے ذکر پہ یوں دھڑکتا ہی نہیں۔ یہ تمہارے علاوہ اب کسی کی سنتا ہی نہیں، کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ چپکے چپکے تمہاری اس محبت نے کیسا کھیل کھیلا ہے مجھ سے؟ سنہرے سپنے دکھا کر ایک تاریک راستے پر گامزن کر دیا مجھے..... وہ سفر جس کی کوئی منزل ہی نہیں..... بس چلتا چلا جا رہا ہوں میں..... واپسی کا راستہ مل رہا ہے نہ آگے منزل دکھائی دے رہی ہے۔“ تب اس کے اندر کوئی کرب سے بولا تھا۔

”محبت کی تاریک گھاٹیوں سے نکلنے کا منتر آج تک کوئی نہیں جان سکا..... جو اس سفر پر ایک بار گامزن ہو جائے، اسے کبھی یوٹرن نہیں ملتا۔“

”چھوٹو کہاں کھو جاتے ہو تم؟ میں کتنی دیر سے تمہیں جگا رہی ہوں۔“ مناب جھنجلائی۔ ”ہمیں بروقت یہاں سے نکلنا ہے۔“ انصم نے جمائی لیتے ہوئے اپنے اوپر سے کبل ہٹایا۔

”اٹھ رہا ہوں..... آپ بے فکر رہیں..... تھوڑی دیر میں آپ کو کالج پہنچا دوں گا۔ آپ کی کلاں مس نہیں ہونے دوں گا میں۔“ انصم نے بستر سے اٹھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اس کی آنکھیں اب بھی نیند سے بند ہو رہی تھیں۔

”اوکے میں ناشتا بناتی ہوں تب تک تم شاور لے کر فریش ہو جاؤ۔“ مناب دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

”وہی آپ بڑے ظالمانہ طریقے سے جگاتی ہیں۔“ انصم کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”تم اگر اب بھی نہیں اٹھتے تو میں تم پر پانی پھینکنے والی تھی۔“ مناب ہنسی۔

”میں اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔ آپ کے جگانے سے ٹوٹ گیا۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

”خواب ہوتے ہی ٹوٹ جانے کے لیے ہیں..... اس لیے ان پر افسوس کرنا فضول ہے۔“ مناب کی بات پر

وہ دھیرے سے سر ہلا کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ کچن میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے..... ناشتا کر رہے تھے۔

”آپ سب کچھ اتنا مزے کا بناتی ہیں کہ میں تعریفیں کر کر کے تھک گیا ہوں۔“ انصم چھری اور کانٹے کی مدد

سے اپنی پلیٹ میں رکھا اسپینش چیز آلیٹ بہت شوق سے کھا رہا تھا۔

”تو کس نے کہا ہے تم تعریف کرو..... میں جانتی ہوں میرے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔“ مناب کافی پیٹے

ہوئے مسکرائی۔

”ارے آپ تو کچھ کھا نہیں رہیں؟“

”میرا ناشتا ایسا ہی ہوتا ہے..... ایک کافی کاگ اور بران بریڈ (جو کروالی ڈبل روٹی) کا ایک سلاٹس.....“

”اسی لیے آپ اتنی دہلی پٹلی اور عمر چور دکھائی دیتی ہیں۔“ انصم مسکرایا۔

”عمر چور..... کیا مطلب ہے بھئی تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ آپ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتی ہیں..... ستائیس کے بجائے بائیس، تیس سال کی لگتی ہیں آپ۔“

مناب اس کی رائے پر ہنس پڑی۔

”کم آن چھوٹو لگنے سے کیا ہوتا ہے..... میں ستائیس سال کی ہوں اور مجھے بائیس سال کی نظر آنے کا کوئی

شوق نہیں ہے۔“

”آپ بھی کمال کرتی ہیں..... لڑکیاں تو اپنی عمر کے حوالے سے بڑی کانٹھس ہوتی ہیں..... کہ ان کی اصل عمر

کے بارے میں کسی کو پتا نہ چل جائے مگر آپ کی سوچ اس معاملے میں بڑی عجیب ہے۔“

”عجیب نہیں ہے چھوٹو..... میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ حقیقتوں کو کسی بھی صورت جھٹلایا نہیں جاسکتا۔“

اب کے مناب کی بات پر اس نے خاموشی اختیار کرنی ہی بہتر سمجھی تھی۔ وہ ایک رائٹر تھی اور اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا تھا پر وہ شاید یہ بات بھول گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اقصم اپارٹمنٹ کو لاک لگا رہا تھا اور مناب اس کے پاس کھڑی تھی۔ مناب نے اپنا لپ ٹاپ والا بیگ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اقصم نے لاک لگانے کے بعد اس کا ہینڈ کیوری پکڑا۔

”لائیں یہ بھی مجھے پکڑا دیں۔“

”اُس اوکے یہ اتنا وزنی نہیں ہے۔“

”اوکے۔“ وہ دونوں ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف آئے۔

اقصم نے اس کا سامان گاڑی میں رکھا..... تب تک مناب بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی..... اقصم گاڑی پارکنگ سے نکال کر مین روڈ پر لے آیا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

”خاموش کیوں ہیں؟ کہیں ولی بھائی تو نہیں یاد آ رہے؟“ اقصم نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”بھلا مجھے ولی کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔“ مناب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”دل..... یہ کم بخت دل.....“ دل میں سوچتے ہوئے اس نے اسٹرٹنگ پہ مکا مارا۔

”کیا ہوا؟“ مناب حیران ہوئی۔

اقصم کا جی چاہا کہ گاڑی یہیں بیچ راستے میں روک کر اسے چیخ چیخ کر بتائے کہ تم ایک قاتل ہو.....! تم نے میرے اندر کا ایک ہنستا ہوا انسان مار ڈالا ہے۔

”چھوٹو کیا ہوا؟“ مناب نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں..... ایک ضروری چیز گھر بھول آیا ہوں۔“ اس نے دھیرے سے وضاحت کی..... اور پھر باقی کا

راستہ وہ خاموش ہی رہا۔

مناب گاڑی میں چھائی خاموشی توڑنے کے لیے کوئی بات کرتی تو وہ جواب دے دیتا۔ مناب بہت عرصے

کے بعد اس سے یوں ملی تھی۔ اور وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہو گئی تھی۔ وہ بچپن سے جس اقصم کو جانتی تھی..... وہ یہ

اقصم نہیں تھا۔ وہ اقصم ہمیشہ خوش رہنے والا، نٹ کھٹ سا..... دوسروں کو خوش رکھنے والا ایک شور مچاتے جھرنے

جیسا لڑکا تھا۔ اور یہ والا اقصم ایک جھیل کی طرح تھا..... خاموش..... اس خاموشی کے اندر کتنے طوفان پیچھے ہوئے

تھے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ مناب نے اس اقصم کا مزاج تیزی سے بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی وہ خوش ہوتا اور پھر

اگلے ہی لمحے وہ اداس ہو جاتا۔ وہ کچھ کہتا اور پھر کہتے کہتے رک جاتا۔ وہ بات کرتا اور پھر بات کرتے، کرتے

کہیں کھو جاتا۔ وہ مناب کو ایک پہیلی کی طرح لگ رہا تھا..... جسے بوجھنے کی کوشش میں خود مناب بھی الجھ گئی تھی۔

انہی سوچوں میں ڈوبے کب وہ لندن پہنچ گئے۔ احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اقصم نے جب اسے اس کے فلیٹ

کی بلڈنگ کے باہر اتارا تو مناب نے اسے اوپر آنے پر بہت زور دیا تھا۔

”چھوٹو چلو ناں..... میرے ساتھ اندر تو آؤ..... لنچ تم میرے اور فارمہ کے ساتھ کرو..... پھر واپس چلے

جانا.....“ مناب نے اصرار کیا۔

”نو ٹھینکس..... آپ پلیز جائیں..... مجھے واپس بھی جانا ہے۔“

”او کے ایز یوش..... تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔“

مناب کی بات پر اقصیٰ منہ سے مسکرایا تھا۔

مناب اس کا شکریہ ادا کر کے اندر بڑھ گئی تھی۔ اور وہ کتنی ہی دیر وہاں بے مقصد کھڑا رہا تھا..... یہ دودن جو مناب نے اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ آج جب وہ اسے چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہو۔

☆☆☆

شام کے چھ بج رہے تھے جب ایثال سیلون سے واپسی پر ساجدہ پھوپھی کی طرف آ گئی تھی۔ گیارہ بج میں ڈاکٹر عمر کی گاڑی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کا دل گھبرایا تھا مگر اگلے ہی لمحے..... ساجدہ پھوپھی کا خیال آتے ہی اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا کیونکہ وہ ان کی بھی بے پناہ لاڈلی تھی۔

”السلام علیکم.....!“ وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو ساجدہ پھوپھی اسے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے نظر آئیں۔

”علیکم السلام..... میری ایشو آئی ہے۔“ ساجدہ بیگم نے محبت سے اسے خود سے لپٹا کر اس کا ماتھا چوما۔
”پھوپھی آپ تو ہم سے ملنے آئی نہیں..... میں نے سوچا کہ میں ہی اپنی پھوپھی سے مل آؤں۔“ اب ایثال ان کے پاس صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

”بس میری جان پچھلے دنوں کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے گھر سے نکلنے کو دل بھی نہیں چاہا۔ مگر آج میں تمہیں اور عنایہ کو بہت یاد کر رہی تھی۔“

”جھوٹ بالکل جھوٹ..... آپ کو ہماری یاد آئے تو آپ ہر روز ہماری طرف آئیں۔“ ایثال نے انہیں خفگی دکھائی..... وہ ایسے ہی ساجدہ بیگم کو نخرے دکھایا کرتی تھی۔

ساجدہ بیگم مسکرائیں..... ”پگلی جن سے پیار ہوتا ہے ضروری نہیں کہ ان سے روز ملا جائے..... اپنے پیاروں کی محبت تو دل میں ہمیشہ بسی ہی رہتی ہے۔ چاہے ان سے روز نہ بھی ملا جائے۔ ان کے لیے دل میں موجود محبت کبھی کم نہیں ہوتی۔“

ساجدہ بیگم نے اسے بڑے پیار سے لپٹایا۔

”میری جان، تم اور عینی تو میرے پیارے مرحوم بھائی کی اولاد ہو..... تم دونوں مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہو.....“ ساجدہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایثال کی آنکھوں میں بھی آنسو جگمگا گئے۔

”پھوپھی..... ماما اور بابا کے بعد جس طرح سے آپ نے اور بڑے پاپا نے ہمیں پیار دیا ہے اور جس شفقت سے پالا ہے..... اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔“ ایثال کو سنجیدہ دیکھ کر ساجدہ بیگم مسکرائیں۔

”تم دونوں بہنوں میں ہی ہم سب کی جان انکی رہتی ہے۔“

”اور آپ کا ہٹلر بیٹا ہمیشہ میری جان نکالنے کے چکروں میں رہتا ہے۔“ ایثال نے دل میں سوچا۔

”پھوپھی آپ نے بس ابویں خود کو ہر وقت گھر کے کاموں میں بڑی کر رکھا ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ روز نور منزل آیا کریں.....“ ایثال نے خوش دلی سے ان کے گلے میں بازو ڈالے۔

”ہاں تو یہ اچھی بات ہے ناں اگر میں خود کو بڑی نہ رکھوں تو بیمار پڑ جاؤں گی۔ بستر سے لگ جاؤں گی۔“ ساجدہ بیگم نے پیار سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”اللہ نہ کرے پھوپھی آپ کو کبھی کچھ ہو۔“ ایثال نے پیار اور لاڈ سے اپنا سر ان کے کندھے سے ٹکالیا.....

”دوپہر میں عمر آیا تو میں اس سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔“

”یقیناً میری شکایتیں ہی لگا رہے ہوں گے۔“ ایثال نے منہ پھلایا۔

”میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے تمہاری شکایتیں لگانے کے لیے.....“ ڈاکٹر عمر ہاتھ میں شرٹ پکڑے نہ

جانے کہاں سے اچانک نازل ہوئے تھے کہ انہوں نے ایثال کی بات سن کر اسے یوں جواب دیا تھا۔

”السلام علیکم.....!“ وہ جزبزی ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔ جانے آج کل ایثال کے ستارے کیوں گردش میں تھے۔

”وعلیکم السلام.....“ سلام کا جواب دینے کے بعد وہ ساجدہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

”مما میرے کپڑے پر لیس ہو کر نہیں آئے کیا؟“

”نہیں بیٹا..... فیضو (ملازم) کہہ تو رہا تھا کہ آج دھوبی دے جائے گا مگر ابھی تک وہ نہیں دے کر گیا۔“

”اور یہ فیضو کہاں ہے؟“

”بیٹا وہ تو مارکیٹ تک گیا ہے کچن کی ایک دو چیزیں لانی تھیں۔“

”او کے ممّا پھر آپ ثریا سے کہیں یہ شرٹ پر لیس کر دے۔“ ڈاکٹر عمر نے شرٹ ان کی طرف بڑھائی۔

”عمر بیٹا میں تمہاری شرٹ خود پر لیس کر دیتی ہوں۔ ثریا (ملازمہ) کا بچہ بیمار ہے آج وہ جلدی کو اور ٹرچلی گئی تھی۔“

”اب کیسا ہے ثریا کا بیٹا؟“

”صبح تم نے جو اسے میڈیسن دی تھیں اس سے کافی بہتر ہے۔“

”او کے..... ممّا مجھے دیر ہو رہی ہے اسپتال سے..... میں اپنے روم میں ہوں..... آپ پلیز میری شرٹ

پر لیس کر کے وہیں لے آئیے گا۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر عمر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے..... اور

وہ ساجدہ بیگم کے ساتھ اسٹور روم میں چلی آئی۔

ساجدہ بیگم نے آرن اسٹینڈ پر رکھی استری کا سوچ آن کیا۔

”لائیں پھپھو میں پر لیس کر دیتی ہوں شرٹ.....“ ایثال نے بلاوجہ آفر کی..... حالانکہ اسے مردانے کپڑے تو

پر لیس کرنا بالکل نہیں آتے تھے۔

”ارے نہیں میری جان میں کر لیتی ہوں اور ویسے بھی تمہیں کہاں یہ کپڑے پر لیس کرنے آتے ہیں؟“

”آتے تو نہیں پھپھو..... مگر میں کر سکتی ہوں۔“ ایثال نے ان کے ہاتھ سے استری لیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

”رہنے دو ایثو کہیں تم کپڑے پر لیس کرتی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھو.....“ ساجدہ بیگم کے لہجے میں

تشویش تھی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا پھپھو..... آپ سب نے تو مجھے بس ایویں ہی سمجھ رکھا ہے۔“ ایثال بلاوجہ ایفی ٹینسی

دکھاتے ہوئے شرٹ پر لیس کرنے لگی شاید وہ ان کی شرٹ پر لیس کر کے..... اپنی اس خفت کو، اپنی اس

شرمندگی کو مٹانا چاہتی تھی جو آج دوپہر سے لے کر اب تک اسے اٹھانی پڑ رہی تھی۔

”لو بھئی تم پھر اسے پر لیس کرو..... آج صبح میں نے شامی کباب بنائے تھے میں ذرا تمہارے لیے وہ

فرائی کر لوں۔“

”ڈونٹ وری پھپھو..... میں ابھی آپ کے پاس آتی ہوں۔“ ساجدہ بیگم کے اسٹور روم سے نکلنے کے بعد وہ

شرٹ پر لیس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اسی دوران اس کا سیل فون بج اٹھا..... عنایہ اسے کال کر رہی تھی۔

”ہیلو!“ ایثال نے کال ریسیو کی۔

”کہاں ہوا ایٹو.....؟ میں جم سے واپس بھی آگئی ہوں اور تم نے سیلون میں اتنی دیر لگادی؟ مجھے تمہارے ساتھ شاپنگ مال جانا تھا۔“

”یعنی میں فارغ ہو کر پھوپھو کی طرف آگئی تھی۔“

”پھوپھو کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں، تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔“

”او کے تم پھوپھو کو میرا سلام کہتا۔ میں تھوڑی دیر تک تمہیں وہاں سے پک کر لوں گی۔ تم ڈرائیور کو واپس بھیج دو۔“

”او کے.....“ ایٹال کال سن کر پلٹی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ کال سننے کے دوران اسے شرٹ کے اوپر سے استری اٹھا کر سائڈ پر رکھنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر عمر کی شرٹ استری سے بری طرح جل چکی تھی۔

”او گاڈ.....! میری نیکیاں ہمیشہ میرے گلے کیوں پڑ جاتی ہیں؟“

”مما بھی کہاں ہیں آپ، ابھی تک میری شرٹ پر لیس نہیں ہوئی کیا؟“ ڈاکٹر عمر ماں کو ڈھونڈتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے تو اپنے سامنے ایٹال کو اور پھر اس کے ہاتھوں میں اپنی جلی ہوئی شرٹ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔

”تم.....؟ اور..... یہ شرٹ تمہارے ہاتھ میں؟“ وہ غصے میں آگے بڑھے۔

ایٹال نے چہرہ جلی ہوئی شرٹ کے پیچھے چھپا لیا۔

”مم..... مجھ سے..... جل..... گئی..... آپ کی شش..... شرٹ.....“ وہ بری طرح سے ہکلائی۔

ڈاکٹر عمر نے غصے میں ہاتھ بڑھا کر شرٹ کھینچ کر اس کے چہرے سے ہٹائی تو ایٹال نے آنکھیں میچ لیں۔

”انتہا درجے کی اسٹوپڈ ہو تم..... جو کام انسان کو سرے سے ہی نہ آتا ہو تو اسے دوسروں کے سامنے کبھی شخی دکھانے کے لیے بھی نہیں کرنا چاہیے۔“ اسے ڈاکٹر عمر کی سخت نظریں اپنے چہرے پر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

”سس..... سوری..... عمر بھائی..... مم..... میں تو پھوپھو کی ہیلپ کرنے کی کک..... کوشش کر رہی تھی..... پتا نہیں یہ کیسے..... جل گئی۔“

”مما کو پتا بھی ہے کہ تم ایک نان سیریس قسم کی لڑکی ہو..... تمہاری ہیلپ ہمیشہ دوسروں کے لیے مہنگی ہی پڑتی ہے پھر بھی..... میری فحورٹ شرٹ تمہیں پر لیس کرنے کے لیے دے دی۔“

ڈاکٹر عمر نے شرٹ آئرن اسٹینڈ پر پھینکی اور اسٹور روم سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

داؤد چوہدری اور سمیرا بیگم..... بڑی اماں کے کمرے میں موجود تھے..... پیو چائے کی ٹرالی وہیں لے آئی تھی..... اور انہیں چائے سرو کر رہی تھی۔

”داؤد میرے بچے، اپنے ملک کو چھوڑ کر کیا ضرورت تھی ملائیشیا میں نئی فیکٹری لگانے کی؟“

نور بیگم اپنی راکنگ چیئر پر براجمان تھیں..... پیو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے وہ ان سے مخاطب ہوئیں۔

”اماں جی ہمارے ملک کے آج کل جو حالات چل رہے ہیں اس صورت حال میں یہاں مزید پیسہ انویسٹ کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ یہاں لوگوں کے چلتے کاروبار تباہ ہو گئے ہیں..... لوڈ شیڈنگ سے لوگوں کی فیکٹریاں اور ملیں بند ہو رہی ہیں..... لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر..... بنگلہ دیش، ملائیشیا اور دوسرے ملکوں میں نئی فیکٹریاں لگا رہے ہیں۔ اماں جی اسی لیے میں نے بھی زارون ٹیکسٹائل کے نام سے ملائیشیا میں نئی فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا ہے.....“

اپنے ملک میں ٹیکس دینے کے باوجود ہمارے لیے مسائل کے انبار لگ رہے ہیں۔“

داؤد چوہدری چائے کے سب لیتے ہوئے بولے۔

”ہاں بیٹا کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہی ہو..... یہاں کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے مگر یہ ملک ہمارا ہے، ہمیں ہی اسے ٹھیک بھی کرنا ہے۔“ نور بیگم بھی دکھی ہوئیں۔

”چھوڑیں داؤد اس ٹاپک کو..... خواہ مخواہ بی پی ہائی ہو جائے گا آپ کا بھی اور اماں کا بھی۔“ سمیرا بیگم چائے پیتے ہوئے مسکرائیں۔

”بس بہو..... یہ ملک ہماری شناخت ہے..... بہت اچھا وقت گزرا ہے یہاں ہمارا..... جس درخت کی چھاؤں تلے انسان سستانے بیٹھتا ہو اس درخت کی شاخیں کاٹ کر اس کی چھاؤں ختم کر دی جائے تو..... سستانے والوں کا چھاؤں کی فکر کرنا عجیب بات نہیں..... اور پھر اس ملک کو تو ہم نے بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا.... بہر حال..... وہی وقت اچھا تھا کم از کم زندگیوں میں سکون تو تھا۔“

داؤد چوہدری نے چائے کی خالی پیالی ٹرالی میں رکھی۔

نور بیگم نے ایک طویل سانس لی.....

”میں نے صبح اقصم سے بات کی تھی..... ماشاء اللہ آواز سے تو بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔“ انہیں اچانک اقصم کا

خیال آیا۔

”جی اماں شکر ہے اب تو اقصم بالکل ٹھیک ہے، بتا رہا تھا کہ مناب دودن اس کے پاس ہی رہی اور اس نے اقصم کا بہت خیال رکھا۔“ سمیرا بیگم نے انہیں تفصیل سے بتایا۔

”ساجدہ آپا نے اصغر بھائی (بہنوئی) کی وفات کے بعد جس طرح سے عمر اور مناب کی تربیت کی انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ بنایا وہ نہایت قابل تعریف ہے۔ مناب کو دیکھ کر ہمیشہ میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے مجھے ایک اور بیٹا دیا ہوتا تو یقیناً میں اس کے لیے مناب کا انتخاب کرتا۔“

داؤد چوہدری کے انداز اور لہجے میں خوشی تھی..... تفاخر تھا۔

”ہاں یہ تو ہے..... بہر حال ولی بھی بہت اچھا لڑکا ہے..... اللہ اسے ولی کے ساتھ خوش رکھے۔“ سمیرا بیگم نے بھی تائید کی۔

”اماں میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ زارون کی شادی کے بعد اقصم اور ایشال کی باقاعدہ منگنی نہ کر دی جائے؟“

انہوں نے ماں سے رائے لی۔

”ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... یہ جو دونوں ہر وقت چونچیں لڑاتے رہتے ہیں، ہر وقت ایک دوسرے سے بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑوں میں وقت برباد کرتے ہیں..... کم از کم اس سے تو ہماری جان چھوٹے گی۔“ نور بیگم کے انداز پر داؤد اور سمیرا دونوں ہی مسکرا دیے۔

”اقصم کے آنے میں چند مہینے ہی تو رہ گئے ہیں مگر زارون کی شادی پہ آئے گا تو میں اس سے ایشال کے حوالے سے بات کروں گی۔“ سمیرا بیگم نے ارادہ ظاہر کیا۔

”ایشال سے یاد آیا۔ بھئی کہاں ہیں میری دونوں بیٹیاں..... نظر نہیں آرہیں؟“ داؤد چوہدری نے فکر مندی سے پوچھا۔

”دونوں کہیں باہر نکلی ہیں۔“

”اچھا اسی لیے گھر میں رونق نہیں ہے..... خاص طور پر ایشو گھر میں ہو تو کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا ہوتا رہتا ہے گھر

میں۔“ داؤد مسکرائے۔

”تو اور کیا..... پچھلے دنوں تو ایشو نے میرا بی پی تک غلط چیک کیا۔ وہ تو بھلا ہو عمر کا..... وہ آیا اس نے دوبارہ مجھے چیک کیا تو پتا چلا کہ ایشو کا تو بی پی آپریشن ہی خراب تھا۔“ نور بیگم نے مسکراتے ہوئے بیٹے کو تفصیل بتائی تو داؤد کے ساتھ سمیرا بھی ہنسنے لگیں۔

”پھر تو ایشو کو ڈانٹ پڑی ہوگی عمر سے۔“ داؤد چوہدری صوفے سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”ہاں عمر تو کہہ رہا تھا اس غیر سنجیدہ لڑکی کو ڈاکٹر بنا کر ہم نے اچھا نہیں کیا۔“

نور بیگم کی بات پر مسکراتی ہوئی سمیرا بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”اماں اسی لیے تو عمر کے ساتھ ایشو کو ایڈجسٹ کروایا ہے۔ اس کے سنجیدہ مزاج سے، رعب دار شخصیت سے ڈرتی ہے ایشو اور عمر جیسے ذمے دار بندے کے ساتھ کام کرے گی تو اس کے مزاج میں بھی سنجیدگی آجائے گی۔“

”اللہ کرے میرے بچے، ایسا ہی ہو..... ورنہ یہ بیل تو منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔“ وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”اماں اب ہمیں اجازت دیجیے..... ہمیں ایک ڈنر پر جانا ہے۔“ داؤد چوہدری نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب کی۔

”اچھا میرے بچوں اللہ تم سب کو اپنی اماں میں رکھے۔“ دونوں ماں سے اجازت لے کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ پیو جب چائے کی ٹرالی کچن میں چھوڑ کر دوبارہ نور بیگم کے کمرے میں آئی تو وہ چھڑی کے سہارے چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ چکی تھیں۔ پیو..... ان کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبائے لگی۔

”پیو تم ڈرا وہ ڈراما تو لگا دو..... جو مجھے بہت پسند ہے۔“ نور بیگم نے فرمائش کی۔

”وڈی اماں، کمال ہے، آپ کے ساتھ چووی (چوبیس) گھنٹے صائمہ چوہدری والا ڈراما دیکھ دیکھ کے میرا دماغ پٹھا (الٹا) ہو گیا پر آپ کو ابھی اس ڈرامے کا ناں وی یاد نہیں ہوا۔“

پیو نے ڈراما سیریل ڈولی کی آئے گی بارات کی سی ڈی لگاتے ہوئے نور بیگم سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

”مجھے ڈرامے کے نام سے کیا لینا دینا..... مجھے تو بس صائمہ چوہدری پسند ہے میں تو اسی کے لیے دیکھتی ہوں یہ ڈراما.....“ نور بیگم نے اس ڈرامے کی پوری سیریز دیکھ رکھی تھی..... اور ان کے پاس تمام کی سی ڈیز موجود تھیں۔ وہ ڈراما سا بھی بور ہوئیں تو پیو سے یہی سی ڈی لگوا لیا کرتیں..... ان کے ساتھ، ساتھ پیو کو بھی یہ ڈراما ہر روز دیکھنا پڑتا تھا۔

☆☆☆

سارہ جب مجھے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو سیمائیگم اسے دیکھ کر حیران ہوئیں..... اور اس سے زیادہ حیران اس کی آنکھوں میں سجا کا جل دیکھ کر ہوئیں۔

”تم نے تو کہا تھا کہ تم دیر سے گھر آؤ گی؟ اور یہ کاجل کہاں سے آنکھوں میں لگا لیا تم نے؟“

سارہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اس کے پیچھے چلی آئیں۔

”ہاں دیر سے ہی گھر آنا تھا اماں..... مگر حنا آج خود کالج آگئی تھی..... اب وہ کافی بہتر ہے اور اسی نے میری آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ آج کل وہ پارلر کا کام سیکھ رہی ہے۔“

سارہ نے بہانہ بنایا..... چادر اتاری اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”زویا آپ نہیں آئیں؟“

”زویا باتھ روم میں ہے..... چل تو پھر کپڑے بدل لے اور روٹی بنالے۔“

”اماں آج میرے سر میں بہت درد ہے آج زویا آپ سے کہو وہ روٹی بنادیں گی۔“ سارہ پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

”ٹھیک ہے میں زویا سے کہہ دیتی ہوں..... میں نے پیاز انڈے بنا دیے تھے۔“ سیما بیگم باہر جانے کے لیے اٹھیں۔

”اماں گلو کا کچھ پتا چلا؟“ سارہ نے فکر مندی سے پوچھا۔ گلو دودن سے گھر نہیں آیا تھا اور اس کا فون بھی بند تھا۔

”نہیں..... نہ جانے کہاں دفع ہو گیا ہے یہ لڑکا..... تیرے ابا اسی کا پتا کرنے گئے ہیں۔“ انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

”پتا نہیں یہ دودن اس نے کہاں اور کس کے پاس گزارے ہوں گے؟ زندگی میں پہلے پریشانیاں کیا کم تھیں جو یہ لڑکا اور پریشانیاں دینے پر تل گیا ہے۔“ سیما بیگم بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

اور سارہ پلنگ پر لیٹی..... اسجد کے بارے میں سوچنے لگی وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتی خود کو اتنا ہی ملامت کرتی..... اسے اسجد کا اظہارِ محبت یاد آتا..... شدید گرمی اور دھوپ میں اس کا انتظار کرنا یاد آتا۔ انہی سوچوں میں لیٹے لیٹے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ زویا ہاتھ میں ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوئی۔

”سارہ اٹھو کھانا کھا لو.....“ اس نے پلنگ پر ایک طرف ٹرے رکھی۔

”آپنی مجھے بھوک نہیں آپ کھالیں۔“

”ارے کیوں.....؟ بھوک کیوں نہیں ہے تمہیں؟“

”حنانے کینٹین سے سمو سے کھلا دیے تھے..... میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔“ سارہ کے انداز میں بیزاریت تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں سردرد کی گولی لا دیتی ہوں تم کھا کر تھوڑی دیر سو جاؤ۔“ زویا نے دراز سے سردرد کی گولی نکال کر اسے دی۔ پانی کا گلاس اٹھا کر اسے پکڑا یا۔ وہ دوا کھا کر دوبارہ لیٹ گئی۔

زویا ہٹے اٹھا کر پلنگ میں آگئی..... اور وہیں چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

”زویا میں ذرا تیری پھونگت کی طرف جا رہی ہوں..... صبح سے دوبار پیغام بھیج چکی ہے۔ آج سمعیہ کی سسرال والے شادی کی تاریخ لینے آرہے ہیں..... تمہارے ابا گھر آئیں تو کہنا کہ ساتھ والے رشید کا موٹر سائیکل لے کر وہیں آجائیں۔ میں انہی کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔“ سیما بیگم چادر اوڑھتے ہوئے زویا کو ہدایت دینے لگیں۔

”جی اماں..... میں کہہ دوں گی ابا سے۔“ زویا نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

”میں چلتی ہوں تم کنڈی لگا لیتا.....“ وہ بے فکر ہو کر باہر نکل گئیں۔

زویا نے کھانا ختم کیا..... دھونے والے برتن سنک میں رکھے اور خود دروازہ بند کرنے کے لیے صحن میں آگئی۔

ابھی وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور خضر اپنی ہتھکڑی موٹر سائیکل لے کر اندر داخل ہو گیا۔

”میرے استقبال کے لیے تم یوں راستے میں کھڑی نظر آؤ گی؟ یقین نہیں آرہا مجھے۔“ خضر نے مسکراتے ہوئے موٹر سائیکل درخت کے نیچے کھڑی کی اور زویا سے مخاطب ہوا۔

”جی نہیں میں تمہارے استقبال کے لیے نہیں بلکہ دروازہ بند کرنے کے لیے آئی تھی۔“ وہ مسکرائی۔

”ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو مگر مجال ہے جو تم نے کبھی میرا دل رکھنے کی کوشش کی ہو۔“ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

زویا درخت کے نیچے چار پائی بچھا چکی تھی۔
 ”اماں اور ابا گھر پر نہیں ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔
 ”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ خضر نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔
 ”اماں تمہاری طرف ہی گئی ہیں۔“ زویا نے سر جھکا لیا۔
 ”مجھے پتا ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔“
 ”مگر کیوں؟“

”تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اور کیوں.....“
 ”دیکھ لیا ہے..... اب جاؤ..... ابا آگئے تو کیا سوچیں گے۔“ زویا کو فکر ہوئی۔
 ”تو دیکھ لیں میں کون سا غیر ہوں..... تمہارا منگیترا ہوں..... اور ماموں کا بھانجا ہوں۔“
 ”چائے بناؤں تمہارے لیے.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔
 ”نہیں..... بس تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ.....“ خضر اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھانے لگا۔
 ”کیا کر رہے ہو خضر.....؟“ زویا نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانی چاہی۔
 ”کچھ نہیں کر رہا میں..... بیٹھو میرے پاس۔“ خضر نے اس کی کلائی پکڑے پکڑے اسے اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھالیا۔

”کیا کر رہے ہو.....؟ اندر سارہ سو رہی ہے وہ اٹھ گئی تو.....؟“ زویا گھبرائی۔
 ”تو دیکھ لے یار، تم میری ہونے والی بیوی ہو۔“ خضر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب سے دو ہزار نکالے اور زویا کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔
 ”یہ کیا ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”دو دن بعد تمہاری سالگرہ ہے۔ اس بار امی کو تنخواہ دیتے ہوئے یہ دو ہزار میں نے سائڈ پر رکھ لیے تھے..... میری طرف سے ان روپوں کی کوئی چیز خرید لینا۔“
 ”ارے نہیں خضر..... یہ بہت زیادہ ہیں، یہ میں نہیں لے سکتی۔“ زویا نے ہاتھ پیچھے کیا۔
 ”یہ زیادہ نہیں بلکہ بہت کم ہیں، آج کل دو ہزار کی بھلا اوقات ہی کیا ہے۔“
 ”مگر میرے لیے یہ بہت زیادہ ہیں خضر.....“

”زویا پلیز مجھے شرمندہ مت کرو..... اور یہ رکھ لو..... مجھ پر اگر چار جوان بہنوں کی ذمے داریوں کا بوجھ نہ ہوتا تو یقیناً تمہارے ارمان، تمہارے چاؤ اپنی حیثیت سے بڑھ کر پورے کرتا.....“ وہ بیچارگی سے کہہ رہا تھا۔
 ”سمیعہ کی شادی کے بعد مزید تین بہنوں کی ذمے داریوں سے ابھی سبکدوش ہونا باقی ہے..... نہ جانے ابھی ہمیں اور کتنے سال لگیں گے ایک ہونے میں۔“ خضر نے افسردگی سے زویا کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”تم پریشان مت ہوا کرو خضر..... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ہم سب بھی انہی حالات سے نبرد آزما ہیں..... گلو کی حرکتیں روز بروز ناقابل برداشت ہو رہی ہیں..... اس گھر کو چلا نام و نہر و مشکل ہو رہا ہے۔ اور سے خالد بھائی..... وہ زارا بچو کو چوتھے بچے کی ولادت کے لیے یہاں بھیج رہے ہیں..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس گھر کے حالات کب اور کیسے بدلیں گے؟“

زویا کی پریشانی دیکھ کر خضر اپنی پریشانیاں بھول گیا۔
 ”اس ملک میں امیر روز بروز امیر ہو رہا ہے اور غریب یہاں روز بروز غریب ہو رہا ہے نہ جانے

ہمارے طبقے کو سکھ کی سانس کب نصیب ہوگی؟“ خضر حد درجہ مایوس ہوا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے آفس میں میرے لیے کوئی جاب ڈھونڈنا۔“ زویا کو یاد آیا۔

”مجھے یاد ہے زویا اور یہ کوئی بھولنے والی بات تھوڑی ہے، میں نے اپنے آفس میں بات کر رکھی ہے جو نہیں

کوئی سیٹ خالی ہوئی، میں تمہیں وہاں جاب دلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

زویا نے اس کی یقین دہانی پر اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

زارون کو ملائشیا گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا..... عنایہ زارون کے بغیر خود کو بہلانے کے لیے خود کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی..... اس وقت بھی وہ اسے بیڈ پر بیٹھی گود میں لیپ ٹاپ رکھے..... ٹیکسٹائل کے حوالے سے پرنٹ ڈیزائننگ میں مصروف تھی۔ جب اس کے موبائل پر میسج ٹون بجی..... عنایہ نے موبائل اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی۔

اس نے لیپ ٹاپ پر کھلے پروگرام کو Minimise کیا..... اور اسکاپ پہ آن لائن ہو کر اسے وڈیو کال کی۔ اگلے ہی لمحے وڈیو کال ٹھرو ہو گئی اور زارون چوہدری کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے اندر تک سرشار کر گیا۔

”کیسی ہو سوئیٹ ہارٹ.....؟“ اس نے بڑے پیار سے عنایہ کو مخاطب کیا۔

”میں ٹھیک ہوں..... تم کیسے ہو؟ کیسا ٹائم گزر رہا ہے؟“ عنایہ نے پُر جوش ہو کر پوچھا

جواب دینے سے پہلے زارون نے اک سرد آہ بھری۔ ”پارتنہ ہیں بہت مس کر رہا ہوں کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔

ویسے پاپا کو چاہیے تھا کہ وہ شادی کے بعد مجھے یہاں بھیجتے..... کم از کم تم تو میرے ساتھ ہوتیں۔“ وہ اداس لہجے

میں بولا۔

”انشاء اللہ چند مہینوں کے بعد ہم ہمیشہ ایک ساتھ ہوں گے۔“ عنایہ مسکرائی۔

”ہاں بالکل..... تم ہی تو میری آنکھوں کی روشنی اور میرے لبوں کی مسکراہٹ ہو، تمہارے بغیر میری لائف ان

کلیٹ ہے۔“

فخر اور خوشی سے عنایہ کی آنکھیں اور ہونٹ مسکرانے لگے۔

”اگر میں اتنی ہی اہم ہوں تو مجھے چھوڑ کر گئے ہی کیوں؟“ زارون نے ایک طویل سانس لی۔

”مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہیں جاتا۔ یہ بتاؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“

”ہاں سب تو ٹھیک ہیں پر میں نہیں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ فکر مند ہوا۔

”تمہیں بہت مس جو کرتی ہوں.....“ زارون اس کی بات پر مسکرایا۔

”کہتے ہیں دور جانے سے محبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔“ زارون کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

”میں جانتی ہوں..... ہم صرف ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں..... اور ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے

ہیں۔ اس یقین اور اطمینان کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے زارون..... ہم ایک

بے تاب آرزو کی طرح ایک دوسرے کے دل میں دھڑکتے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو تم..... جو دل کے آئینے میں بسے ہوں ہر وقت ہر لمحہ اور ہر جگہ وہی دکھائی دیتے ہیں

ہمیں.....“ وہ جذباتی ہوا۔ اور عنایہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”جیسے یہاں ہر جگہ مجھے تم ہی تم دکھائی دیتی ہو۔“ زارون کے اظہار پر ایک کھٹکتی ہوئی ہنسی اس کے لبوں پر بکھر

گئی تھی۔

وہ ایسا ہی تھا دل کھول کر عنا یہ سے محبت کا اظہار کرنے والا..... اس کی بے پناہ تعریفیں کرنے والا اسے سراہنے والا..... اور وہ بھی زارون کی حد درجہ چاہتوں، بے پناہ محبتوں پہ کھل اٹھتی تھی..... کبھی کبھی وہ خود بھی اپنی قسمت پر رشک کیا کرتی کہ ایک کامیاب ترین ہر لحاظ سے مکمل پرسنالٹی کا حامل شخص اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ اس کے دل پر راج کرنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہے۔ ان کے سوشل سرکل کی تمام لڑکیاں عنا یہ کی قسمت پر رشک کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کا شمار اپنی سوسائٹی کے چند پرفیکٹ اور خوب صورت ترین کہلو میں ہوتا تھا۔ ایک مکمل زندگی نے ان کے گرد اپنی محبت کے پر پھیلا کر انہیں اپنی آغوش میں لے رکھا تھا مگر وہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی اگر اپنی خوب صورتی دکھاتی ہے تو بد صورتی بھی دکھاتے دیر نہیں لگاتی۔ اگر محبت اپنے پر پھیلا کر اپنی آغوش میں لیتی ہے تو محبت جتنی دھوپ میں پھینک کر امتحان لینا بھی جانتی ہے۔ آنے والا وقت ان کے لیے خوشیوں کے پیغام لانے والا تھا یا ان کو کڑے امتحان میں ڈالنے والا تھا؟ وہ دونوں بے خبر تھے۔ وہ دونوں انجان ایک دوسرے کی محبت میں بس گم تھے۔

☆☆☆

ایک ایمر جنسی آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے آج ڈاکٹر عمر وقت سے پہلے اسپتال آگئے تھے۔ بچے کو پے در پے موشن اور الٹیاں آنے سے فٹس پڑ رہے تھے..... بروقت طبی امداد ڈرپ وغیرہ لگانے سے بچے کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر عمر ایمر جنسی وارڈ سے باہر نکلے تو انہوں نے ایشال کے نمبر پر میسج ٹائپ کیا..... اور اسے بتایا کہ وہ اسپتال آچکے ہیں..... تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے روم کے ساتھ ملحق سنگ روم میں آکر اپنے لیے کافی بنانے لگے۔ آج ڈاکٹر عمر ناشتا کیے بغیر ہی اسپتال آگئے تھے۔

اسپتال میں ٹی بوائے بھی موجود تھے جو دیگر ڈاکٹرز کو چائے وغیرہ بنا دیا کرتے تھے مگر ڈاکٹر عمر ایسے چھوٹے موٹے کام مثلاً چائے یا کافی وغیرہ خود ہی بنالیا کرتے تھے۔ کافی کے ساتھ کوکیز لینے کے بعد وہ اپنے آفس میں اپنی مخصوص ریوالونگ چیئر پر آکر بیٹھ گئے۔ جہاں وہ اپنے پشمنٹ کو چیک کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ صبح ڈیوٹی کرنے والی نرس بھی وہاں موجود تھی۔

”ڈاکٹر ایشال ابھی نہیں آئیں؟“ انہوں نے نرس سے دریافت کیا۔

”نہیں سر، وہ ابھی نہیں آئیں۔“

”اوکے آپ سرمد سے پوچھیں..... باہر کتنے مریض ہیں؟ مجھے آج دو بجے کہیں جانا ہے..... اگر مریض ہیں تو انہیں اندر بھیجنا شروع کریں۔“ ڈاکٹر عمر کی ہدایت پر نرس اثبات میں سر ہلا کر روم سے باہر نکل گئی۔ اسی اثناء میں ان کے روم کا دروازہ کھلا تھا اور ایشال..... پرنیڈ بلیک اور یلوکٹر کے نیروٹائٹ پر پلین یلوکٹر کا ٹاپ پہنے ماتھے پر گلاسز اور ہاتھ میں شوز کے ساتھ میچ کیا بلیک پرس پکڑے داخل ہوئی۔

ڈاکٹر عمر نے اسے سر تا پاؤں دیکھا اور بھونچکا رہ گئے..... ٹائٹ میں پھنسی اس کی ٹانگیں..... گھٹنوں سے اوپر ہاف سلیوز ٹاپ..... ڈاکٹر عمر کے ماتھے پر ابھرنے والی شکنیں دیکھ کر ایشال کو خطرے کی گھنٹیاں صاف سنائی دینے لگیں۔

”السلام علیکم.....“ ایشال نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ مختصر جواب.....

”یہ کس صلیبے میں تم اسپتال آئی ہو؟“

اے عشق تیرے ہیں کھیل عجب

”کک کیا مطلب.....؟“ ایصال نے حیرت سے اپنے لباس کو دیکھا۔ وہ اور عنایہ تو عام طور پر ایسا ہی لباس پہن کر شاپنگ مائز اور مارکیٹس بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ گھر میں تو وہ اکثر سیلیولیس پہنا کرتی تھیں..... اور یہ لباس تو ایصال کو اچھا خاصا معقول لگ رہا تھا۔

”تمہیں ہر بات کے مطلب سمجھنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے..... کبھی اپنے فضول برین کا استعمال بھی کر لیا کرو..... جاؤ جا کر خود کو آئینے میں غور سے دیکھو..... تمہارے گاڑی سے نکل کر یہاں تک آنے میں نہ جانے کتنے مردوں کی گندی نظریں تم پر اٹھی ہوں گی..... اندازہ ہے تمہیں؟ گھر اور پبلک پلیس میں کیا فرق ہوتا ہے..... تم کیا دودھ پیتی بچی ہو کہ ہر بات تمہیں سمجھانی پڑ جائے؟“ ڈاکٹر عمر غصے میں بولتے ہوئے اپنی چیئر سے اٹھ کر اس کے سر پر کھڑے اسے بری طرح سے ڈانٹ رہے تھے۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے تم اسپتال کے بجائے کسی فیشن شو میں آئی ہو۔“ آنسو پٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی بھی وہ منہ سے جو بات نکالتی اسے پورا کیا جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر عمر ہی تھے جو دھڑلے سے اسے دو منٹ میں جھاڑ دیا کرتے تھے۔ گوکہ ڈاکٹر عمر غلط نہیں کہہ رہے تھے مگر ان کا سخت لہجہ ایصال کو اندر تک چھلنی کر گیا تھا۔

”اگر میرے اسپتال میں میرے ساتھ تم نے کام کرنا ہے تو آئندہ ایسا گھٹیا ڈریس پہن کر مت آنا..... now go back and get change your dress“ ڈاکٹر عمر نے غصے میں اپنا آخری جملہ ادا کیا اور واپس اپنی چیئر پر آ بیٹھے..... ایصال سر جھکائے ان کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تمام راستے وہ روتی رہی تھی۔ گھر آ کر اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا پھر وہ دوبارہ اسپتال نہیں گئی تھی۔





میرے نسوانی حسن کا راز

ہلوسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈڈ ٹائٹنگ کریم (ہرٹل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs.250/=



چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔ قیمت = 150/-

یونانی کریم
گلیسی

جیتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور مرکیبات سے تیار کردہ۔ بدخود داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔

□ یو پی چنار سٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ

نوٹ

آپ اگر اپنا مانج کرنا چاہتے ہیں تو انٹرنیٹ پر SKYPE آن لائن آ کر اپنا مسئلہ بتا کر دوا منگوائیں۔
اپنی سخت کے بارے میں مفت کتابچہ منگوائیں۔ 0345-7000088
کریم گھر منگوانے کیلئے رقم ایزی لوڈ کروا کر اپنا ایڈریس SMS کریں۔

- خواجہ سٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی
- صدر میڈیکل سٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی
- مسلم جنرل سٹور ہفت مارکیٹ ملیر کراچی
- ابراہیم بن ہفت مارکیٹ ملیر کراچی
- وقاص میڈیکل سٹور لا آصف سکور این 22 کراچی
- قمری انٹارجنرل سٹور بند پوک ریم بازار حیدر آباد
- نوری دوا خانہ کٹورہ پیدو ڈسٹرکٹ
- ملت دوا خانہ کٹورہ پیدو ڈسٹرکٹ
- خالد دوا خانہ صرافہ بازار ایف 10
- قدیمی چندی دوا خانہ کچہری بازار سرگودھا
- شامی طبی دوا خانہ چینیٹ بازار فیصل آباد
- سلیم ہسپتال کورنوال دوا خانہ آوار
- شانی دوا خانہ محمد علی رید گیت شانی بازار بہاولپور
- محمد علی دوا خانہ اسلام آباد 2278463
- ایس ایس انٹرنیٹ 22 ملہ ساقیالہ راولپنڈی
- محی القیوم جنرل سٹور ہتھلہ جالپل

□ بادشاہ دی ہٹی بوٹر بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528

□ مقیم الدین برادر کی گلی بس 1، ڈیٹو ہال کراچی۔ فون 2433682 ریاض محمد 69 یو ماسکیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264

ہر سیم پاکستان میں گھر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ

Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com

کہتے ہیں محبت ایک پرندے کی طرح ہوتی ہے اسے سختی سے رکھو گے تو یہ مر جائے گی اور اسے نرمی سے رکھو گے تو یہ اڑ جائے گی۔

شاید سارہ کے ساتھ بھی ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک ہوئی تھی۔ اسجد دوبارہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ روز لا شعوری طور پر کالج سے چھٹی کے وقت اس کا انتظار کرتی..... کئی بار رک کر پلٹ کر دیکھتی اور مایوس ہو کر چلنے لگتی۔ اس کے دل کی حالت بھی عجیب ہو گئی تھی۔ نہ اسے بھوک لگتی نہ وہ ہنستی بولتی..... چھوٹی سے چھوٹی بات پر آج کل وہ جھنجلا جاتی۔ اپنے پاس ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کو وہ بات بات پر جھاڑ دیتی..... وہ کوئی کام کرتی تو اس کے کانوں میں اسجد کی محبت بھری باتیں گونجتی، وہ صبح شام خود کو ملامت کرتی کہ ناحق اس نے اسجد کی محبت کو ٹھکرا دیا..... سمعیہ کی شادی میں بھی اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ زارا بچو اپنی تینوں بچیوں سمیت ان کے گھر میں آ چکی تھی..... وہ پھر بھی خاموش رہی۔ اس دن بھی وہ بے دلی سے صبح کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جب زویا نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”سارہ کیا بات ہے.....؟ میں کئی دن سے محسوس کر رہی ہوں..... تم بہت چپ چپ رہنے لگی ہو؟“
”کچھ نہیں آپ..... بس ایگزامز ہونے والے ہیں..... پھر گھر کے حالات دیکھ کر ٹینشن سے ہنسنے بولنے کو دل ہی نہیں کرتا۔“

سارہ کی بات پہ زویا نے پیار سے اس کے کندھے پر چپٹ لگائی۔
”بگلی! میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔“ سارہ..... اس کی تسلی پر صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

”چلو شاباش..... باہر آؤ..... مل کر ناشتا کرتے ہیں۔“
زویا اسے صحن میں لے آئی..... شا کر حسین صحن میں رکھی چیر پر بیٹھے تھے..... ان کے سامنے ایک چھوٹی سی ٹیبل رکھی تھی جس پر چائے کا ایک کپ اور چنگیر میں رکھی روٹی سے وہ ناشتا کر رہے تھے..... سیما بیگم کچن میں روٹیاں بناتے ہی تھیں..... زارا بھی ان کے پاس موڑھے پر بیٹھی تھی..... اور چائے میں روٹی ڈبو کر اپنی تینوں بچیوں کے منہ میں باری باری نوالے ڈال رہی تھی۔

اب ایک، ایک روٹی زویا اور سارہ کی ہے.....“ سیما بیگم نے توڑے سے روٹی اتار کر الگ چنگیری میں رکھی۔
”نانی..... بھوک لگی ہے، ہمیں اور روٹی دونوں.....“ زارا کی سب سے چھوٹی تین سالہ بیٹی نے نانی سے کہا۔
”غضب خدا کا..... تم تینوں ایک، ایک روٹی کھا چکی ہو ابھی بھوک نہیں مٹی کیا.....؟ یا جوج ماجوج کی اولاد کہیں کی..... اپنے باپ پر گئی ہیں تیری بیٹیاں.....“ سیما بیگم نے غصے میں اپنے پاس بیٹھی زارا کو گھورا۔
”اماں یہی تو عمر ہے ان بچپاریوں کے کھانے پینے کی..... اگر تھوڑی سی اور روٹی مانگ لی بچی نے تو کون سا قیامت آگئی ہے۔“ زارا اثر مندہ ہوئی۔

”تیری آمد ہمارے لیے قیامت بن کر ہی آتی ہے..... تجھ پر جو دو مہینے ہم خرچا کرتے ہیں وہ قرض کی صورت میں ایک سال میں اترتا ہے ہمارے سر سے..... تو ان کے باپ سے کیوں نہیں کہتی کہ اپنے بچوں کی ذمہ داری خود اٹھائے ہم نے انہیں پالنے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا..... یہاں تیرے باپ کی فیکٹریاں نہیں چل رہیں..... اور بھائی تیرا یہ گھر چھوڑ کر کہیں دفع ہو گیا ہے..... ہم نہ جانے کس طرح گزارہ کر رہے ہیں..... کبھی تو ہمارے حال پر رحم کر لیا کر۔“ خالد جب کہتا ہے، تو بچے لے کر دوڑی چلی آتی ہے..... سمجھاتی کیوں نہیں اسے؟“ سیما بیگم کا پارہ ہائی ہو چکا تھا لہذا وہ بیٹی کو نان اسٹاپ کھری کھری سنار ہی تھیں۔

زار اس باتیں سن کر رونے لگی۔ اور اپنی تینوں بچیوں کو تھپڑ مارتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ زوبا اور سارہ کی آنکھیں بھر آئیں..... اس گھر میں ہمیشہ لڑائی غریب کی وجہ سے ہی ہوا کرتی تھی۔

”خدا کے لیے بس کر دو سیما بیگم..... اس میں بھلا میری زارا کا کیا قصور.....؟ وہ ہمارے پاس نہیں آئے گی تو اور کہاں جائے گی؟ یہ گھر اس کا میکا ہے ہم نہ رہے تو کس کے پاس آئے گی وہ یہاں؟“ شاکر حسین کو از حد افسوس ہوا۔

”ہاں میں ہی بری ہوں..... سارے قصور میرے ہی ہیں جو ایک معمولی کلرک کے ساتھ ساری زندگی نبھا کرتی رہی اور اپنی جان پر عذاب بھیلی رہی۔ اتنی ہی پروا ہے ان بیٹیوں کی..... تو ان کے لیے کوئی ڈاکا ڈال لیا ہوتا کہیں فراڈ کر لیا ہوتا..... دنیا دفنوں میں اتنی ہیر پھیر کرتی ہے، رشوت لیتی ہے مگر آپ پر تو ساری زندگی ایمان داری کا بھوت سوار رہا۔ نہ خود ڈھنگ سے جی سکے نہ ہمیں ڈھنگ سے جینے دیا۔“ سیما بیگم غصے سے انھیں ہاتھ میں پکڑا چمٹا چنگیری میں پنچ کر کچن سے باہر نکل گئیں۔

”سیما بیگم تم تو خواہشات کی غلام عورت ہو، جس نے زندگی کی کالی راتوں میں کبھی سویرا نہیں ہونے دیا..... خواہشات کے بھنور میں پھنسی ہوئی وہ عورت ہو تم، جسے اپنا مقصد حیات ہی بھول گیا۔ کیونکہ تم نے ہمیشہ اپنی زندگی کو ضرورت کے بجائے خواہشات کی نذر کیا..... اری پاگل عورت، ضرورت فقیروں کی بھی پوری ہوتی ہے اور خواہشات بادشاہوں کی بھی باقی رہ جاتی ہیں..... نہ تم نے خود قناعت پسندی کی عادت اپنائی اور نہ تم نے اپنے بیٹے کو اس کا درس دیا..... تم کیا جانو عزت کمانا، دولت کمانے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے..... بے شک میں نے حرام کی کمائی سے دولت کے انبار نہیں لگائے مگر میرا دل مطمئن ہے، میرے دل میں سکون ہے کہ میں نے جو کمایا اپنی محنت سے حق حلال کمایا..... کسی کو دھوکا نہیں دیا..... کسی سے فراڈ نہیں کیا..... جو انہیں کھیلا..... جن چیزوں کو میرے اللہ نے حرام قرار دیا..... میں نے ان چیزوں سے پرہیز کیا۔“

”بس کریں شاکر صاحب ساری زندگی یہ کتابی باتیں کر کر کے آپ وقت گزاتے رہے ہیں..... اب ہم سے یہ عذاب نہیں سہا جاتا، نہ خیالی اور کتابی باتوں سے گزارہ ہو جاتا ہے۔“ وہ سنک پر سے ہاتھ دھو کر صحن میں بچھی چار پائی پہ آ بیٹھیں۔

”تمہاری ہر وقت کی ناشکری کی عادت ہر وقت لعنت ملامت کرنے پر..... ہمارے گھر میں رزق سے اللہ نے اسی لیے برکت اٹھالی ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کو اور شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تم اسی وجہ سے ہر وقت بے سکون رہتی ہو۔“ شاکر صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مجھے بے سکون ہی رہنے دیں..... شکر ہے آپ تو سکون میں ہیں..... دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کھائی اور باہر نکل گئے۔ ایک میں جو ہوں یہاں سڑنے اور کڑھنے کے لیے۔“ سیما بیگم نے منہ پھلایا اور چار پائی پر لیٹ گئیں۔

شاکر حسین خامے دل گرفتہ ہو کر گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

”اماں خدا کے لیے آئندہ ایسی باتیں مت کرنا..... اگر زارا بچوں کے ساتھ ہماری طرف آگئی ہیں تو اللہ ان کے نصیب کا رزق بھی دے گا ہمیں..... آپ میرے حصے کی روٹی بچیوں کو دے دیں..... مجھے ناشتا نہیں کرنا..... مگر آئندہ ان بیچاروں کو یوں طعنے تشنے مت دیجیے گا۔“ سارہ نے از حد دکھ سے کہا اور چادر اوڑھ کر کالج کے لیے بھوکی ہی نکل گئی۔

زوبا کا دل بھی خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ چپکے سے کمرے میں آگئی تھی اور اپنی دراز سے خضر کے دیے

دو ہزار روپے نکال لائی۔

”اماں یہ دو ہزار رکھ لیں۔ اس کا تھوڑا بہت جو بھی راشن آئے وہ لے آئیں..... میں نے اسکول کے سالانہ فنکشن پہ ایک سوٹ بنوانے کے لیے یہ جمع کر رکھے تھے مگر اب آپ اسے رکھ لیں۔“

زویا نے پیسے سیمائیگم کو دیتے ہوئے دل میں یہ اعتراف ضرور کیا کہ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے مگر زندگی امتحان لے کر سبق دیتی ہے۔

کمرے میں بیٹھی زارا..... اب اپنی تینوں بچیوں کو خود سے لپٹائے رو رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے دس بجے کا وقت تھا..... وہ ایک درمیانے درجے کا کوئی رہائشی علاقہ تھا۔ دونو جوان لڑکے پچھلے ایک گھنٹے سے اس علاقے کے بینک کے سامنے بنے پلازے کی سیڑھیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان کے قریب ہی ان کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ اسی اثناء میں ایک شخص موٹر سائیکل پر سوار بینک کے سامنے رکا اور بینک سے ملحق اے ٹی ایم کے کیبن کی طرف گیا۔

سامنے بیٹھے دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک لڑکے نے اٹھ کر اپنی موٹر سائیکل اشارٹ کی..... اتنے میں دوسرا لڑکا بھی ہاتھ میں پکڑا موبائل اپنی جیب میں ڈال کر اس لڑکے کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا..... اس دوران اے ٹی ایم کے کیبن کا دروازہ کھلا تھا اور وہ شخص بجلت میں موٹر سائیکل اشارٹ کر کے ان کے قریب سے گزرا.....

یہ دونوں لڑکے جو پہلے سے تیار کھڑے تھے، اس شخص کے پیچھے تیزی سے موٹر سائیکل بھگانے لگے۔

”اوئے سالے تیز چلا کہیں شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے.....“ کچھلی سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے موٹر سائیکل چلانے والے لڑکے کو تنبیہ کی تو چلانے والے نے اسپید بڑھادی۔

آگے جا کے وہ شخص یوٹرن لینے والا تھا کہ اس کے تعاقب میں یہ دونوں لڑکے موٹر سائیکل پر سوار اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جیسی پیچھے بیٹھا لڑکا برق رفتاری سے موٹر سائیکل سے اتر ا اور اس شخص پر پستول تان کر دوھاڑا.....

”جیب میں جتنا کیش ہے جلدی نکال ورنہ اس پستول میں جتنی گولیاں ہیں تیرے بھیجے میں اتار دوں گا۔“

وہ شخص حیران پریشان، مارے خوف کے کانپنے لگا۔

”جلدی نکال جلدی.....“ پستول تانے شخص نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ مقابل شخص کپکپاتے ہاتھوں سے جیب میں سے کیش نکالنے لگا۔

”جلدی سے نکال الو کے.....“ پستول تانے شخص نے اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈالے۔ ”اب جیب سے فون بھی نکال جلدی کر۔“ اس ڈرے ہوئے شخص نے موبائل بھی نکال لیا۔

”اب اتر اس موٹر سائیکل سے۔“ پستول تانے شخص نے ایک اور مطالبہ کیا۔

”کک کیوں بھائی..... یہ تو..... مم..... مت چھینو۔“

”ابے اترتا ہے یا اتاروں تیرے بھیجے میں گولیاں.....“ پستول تانے شخص نے اسے گریبان سے پکڑ کر موٹر سائیکل سے نیچے اتارا اور خود موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہ دونوں جوان آگے پیچھے موٹر سائیکلیں بھگاتے ہوئے اس شخص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

ماہم روح سفر ہین

شہناز اسیم



دھتے ڈال دیے تھے۔ بچھلے خالوصوفے پر گول مٹول ہو کر ناٹکیں سیکڑے پڑے تھے اور کچھ نہ کچھ بڑا ارہے تھے۔

”پچیس سال ہو گئے میری شادی کو، میں جب

اس نے ایک بار پھر لاؤنج پر نظر دوڑائی، وسیع عریض خوب صورت و خوش رنگ کارپٹ پر گاؤتکے اور کٹن بکھرے پڑے تھے۔ بچوں کے فیڈر سے رہنے والے بچے کچے دودھ نے قالین پر گول گول اور گیلے

بھی یہاں آتا، آپا جان نئے دولھاؤں کی طرح میرا سواگت کرتی تھیں۔ میں لاکھ کہتا آپ اتنا تکلف نہ کیا کریں مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں، ہمیشہ صاف ستھرا بستر اور تکیہ فراہم کرتیں، ایک ان کے نہ ہونے سے کتنا فرق پڑا ہے نہ بستر ہے نہ تکیہ، صوفے پر پڑا ہوا ہوں۔“

”میں جب بھی رہنے آتی مجھ سمیت سب بچوں اور میاں کے کپڑے بناتیں، میں منع بھی کرتی مگر مان کر نہ دیتیں، مگر پچھلی مرتبہ نہ جانے کیا ہوا کپڑے بنانا ہی بھول گئیں۔ خیر اس عمر میں یادداشت ویسے بھی کمزور ہو جاتی ہے۔“ بڑی پھپھوکی آواز سنائے میں لہرائی۔

”ارے اس کے ہاتھ کی کڑھی کا تو جواب ہی نہیں تھا پورے بارہ سالوں کا تڑکا لگاتی تھی، فون کر کے مجھے دعوت دیتی تھی کہ آج کڑھی بنا رہی ہوں کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیے گا..... ہائے ہائے..... آہ اب ایسی کڑھی کہاں کھانے کو ملے گی۔“ چھوٹے ماموں نے آہ بھری۔

”ارے بھئی یہ اس وقت کا کھانا کس کے گھر سے آیا تھا؟ اتنا بد مزہ تھا، چکنائی سے بھر پور چھپچڑے زدہ بوٹیاں! اب تک حلق چکنا ہو رہا ہے، منگی کی سی کیفیت الگ ہو رہی ہے اس چہار دیواری کے اندر آج پہلی مرتبہ اتنا بد مزہ کھانا کھانے کو ملا۔“ پھوپا جی کسی کونے سے پکایے اور پھر ایک کونے کی طرف منہ کر کے فرش پر تھوک دیا۔

”مرحومہ بہت سے وعدے ادھورے چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں نے کتنے مان سے کہا تھا کہ نوید کی شادی پر سونے کے کنگن لوں گی، انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا مگر جب بھی وعدہ یاد دلایا تو یہی کہا کہ ابھی ہاتھ تنگ ہے حالانکہ صرف میں نے کیا، خاندان بھر بلکہ سارے زمانے نے دیکھا کہ نوید کی شادی پر بھائی جی نے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ارے جب آدمی کا دل ہی تنگ ہو جائے تو ہاتھ تو تنگ ہو گا ہی ناں..... وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔“ زرینہ آنٹی نے سسکیاں بھریں۔

”ارے چھوڑو زرینہ! کیا ذکر لے کر بیٹھ گئیں

مرنے کے بعد ویسے بھی آدمی کی اچھائیاں یاد کرنی چاہئیں۔ اب مجھے ہی دیکھو میں یہ بات بالکل بھلا دوں گا، ایک مرتبہ میں نے کچھ قرض مانگا تھا مگر انہوں نے منع کر دیا، مجھے بہت صدمہ بھی ہوا تھا۔ خیر! اب میں ہر بات بھلا دیتا چاہتا ہوں کیونکہ وہ بہت اچھے گھر اور اچھی جگہ پہنچ گئیں، اللہ ان کے درجات بلند کرے۔“

بڑے خالوا اپنی جھونک میں بولے جا رہے تھے۔

”ہائے اللہ! بھابی کے بعد اب ان کے گھر کی دیکھ رکھ کون کرے گا..... دیورانی، جیٹھانی ہونے کے باوجود میرا ان کا بڑا بہنا پا تھا، ہمیشہ کہتیں ”ارے کیوں کرائے کے گھر میں پڑی ہو ہمارا دل اور گھر دونوں بڑے ہیں، دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے اس گھر کے بھی اور دل کے بھی.....“ ہائے میری بہنو جیسی جیٹھانی! کہاں سے لاؤں گی اب انہیں.....“ چھوٹی چچی بلک بلک کر رونے لگیں۔

”ارے کیوں رنج کرتی ہو، وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا ان کی نشانیاں تو ہیں ان کے بچے، ان کا گھر، ان کی چیزیں..... اب تم ہی کو یہ سب دیکھنا ہے ان سے محبت کا حق تو اسی طرح ادا ہو سکتا ہے ناں کہ ان کی تمام ذمے داریاں تم سنبھال لو اور یہ سب کرنے کے لیے تمہیں یہاں تو رہنا ہی پڑے گا۔“ چھوٹے چچا نے غمگین اور بلغمی آواز میں کہا۔

کونے میں غم سے نڈھال ایک صوفے پر پڑے نوید نے تڑپ کر ایک طنز بھری نگاہ سب رشتے داروں پر ڈالی، وہ موازنہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کون زیادہ غم سے نڈھال ہے۔ اسے ڈرتا تھا کہ غم کی شدت سے ان میں سے کوئی ایک آدھا اپنی جان سے ہاتھ ہی نہ دھو بیٹھے۔ وہ پرسوں رات کی فلائٹ سے اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع سن کر اپنی بیوی عمیمہ اور دو بچوں کے ساتھ شارجہ سے یہاں پہنچا تھا۔ اس کے آتے ہی ان کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی مگر رات کو اچانک ان کی حالت دوبارہ بگڑ گئی اور ڈاکٹر انہیں نہ بچا سکے۔ غم کی ایک طویل رات تھی جو ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی،

غزل

حسرت بھری نگاہوں کو آرام تک نہیں
وہ یوں بدل گئے کہ اب سلام تک نہیں
جس کی طلب میں زندگی اپنی گزار دی
اس بے وفا کے لب پہ میرا نام تک نہیں
جو کہہ گئے تھے شام کو بیٹھیں گے آج پھر
کچھ سال ہو گئے کوئی پیغام تک نہیں
دفن ہوں تیرے ہجر کی اک ایسی قبر میں
کتبے پہ جس کے آج کوئی نام تک نہیں
بے اختیار اٹھتے ہیں میرے قدم ادھر
حالانکہ اس گلی میں مجھے کام تک نہیں
مرسلہ: جگینہ ضیا بنگش، کراچی

غزل

کسی سے کوئی شکایت نہ کچھ گلہ رکھیے
دراز صرف محبت کا سلسلہ رکھیے
خیال و خواب میں ہی اس سے رابطہ رکھیے
خرد سے کچھ تو جنوں کا معاملہ رکھیے
دلوں کی بات دلوں تک رہے تو بہتر ہے
زبان کھول کے کیوں اپنا مدعا رکھیے
تمہاری راہ پہ آجائے گا کبھی نہ کبھی
ابھی تو باتوں میں کچھ دن اسے لگا رکھیے
جدائی اس کی دل و جاں پہ لاکھ بار سہی
وہ مل ہی جائے گا اک روز، حوصلہ رکھیے
عطائے دوست ہے جانے نہ دیجیے اس کو
متاع غم کو کسی طور سے بچا رکھیے
جو بات ہے، وہ دلوں تک پہنچ ہی جائے گی
چھپا کے شعر میں کچھ حرف آشنا رکھیے
خود اپنے ضبط کا دامن نہ چھوٹ جائے کہیں
قریب جا کے بھی کچھ، اس سے فاصلہ رکھیے
شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی

نوید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ رات اس کی پوری
زندگی پر محیط ہو گئی ہے۔

”آہ امی! کہاں سے لاؤں آپ کو..... اتنی بڑی
دنیا میں ایک بھی چہرہ آپ جیسا نہیں..... آپ نے یہ
کیوں سمجھا کہ اب مجھے آپ کی ضرورت نہیں رہی۔
آپ تو ہر کام میں دوسروں سے مشورہ کرتی تھیں پھر
اس دنیا سے جانے کا فیصلہ بغیر کسی کو بتائے.....؟ بغیر
صلاح مشورہ کے.....؟ میں بہت اکیلا رہ گیا ہوں
امی.....“ نوید بہت جذباتی ہو کر سوچ رہا تھا اس نے
بے آواز روتے ہوئے پھر ایک نگاہ رشتے داروں پر
ڈالی۔ کریمین بوا سوجی آنکھوں اور غمگین چہرے کے
ساتھ بالکل خاموش سی فلاسک سے گرم گرم چائے
نکال کر سب کو تقسیم کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے گھر
نمک کا کھایا تھا وہ اپنی ذمے داریاں نبھانے کھڑی
ہو گئی تھیں۔

شرت جو بہت دیر سے سیڑھیوں پر بیٹھی یہ منظر
دیکھ اور سن رہی تھی نے سیڑھیوں کی ریلنگ پر اپنی پیشانی
ٹیک دی۔ آنسو ابل ابل کر اس کا چہرہ تر کر رہے تھے۔
وہ سوا مہینہ نہا کرامی کے بلانے پر میکے رہنے آئی تھی۔
امی نے اس کے بچے کے لیے بہت پیارے پیارے
کپڑے اور ادنی سیٹ تیار کیے تھے۔ وہ ایک ہفتے سے
امی کے ہاں تھی، امی کس قدر خوش تھیں اس کے آنے
پر! اپنے ماں، باپ کو وہ ایک آئیڈیل کپل بانتی تھی۔
اس نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس کے پاپا نے کبھی کوئی
عامیانہ سا اظہار محبت کیا ہو یا امی نے روایتی انداز
میں عورتوں والے گلے شکوے اپنے شوہر سے کیے
ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے خوش اور
مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ پاپا، نوید اور اس کے شوہر کے
لیے باریک ململ کے کرتوں پر نفیس کڑھائی کرتیں،
سردی آنے سے پہلے نوید اور پاپا کے لیے سویٹر اور مفلر
تیار کرتیں، گاجر اور گھیکوار کا حلو اور گوند تیار کر کے پاپا
کو اپنی نگرانی میں کھلاتیں۔ پاپا، امی کا زبان سے نہیں
نگاہوں سے شکریہ ادا کرتے اور امی کا چہرہ اندرونی

خوشی اور اطمینان سے پرسکون نظر آنے لگتا۔

”آف! میرے خدا! پاپا کہاں ہیں؟ سوری امی! ابھی تو آپ کو گئے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے اور ہم پاپا کا خیال نہ رکھ پائے..... نوید.....“ وہ چلائی۔

”نوید! پاپا کہاں ہیں؟ انہیں تو دیکھو.....“ وہ رینگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”نوید ادھر آؤ..... یہاں میرے پاس!“ وہ پکاری۔

نوید ایک جھٹکے سے اٹھا اور دوڑتے ہوئے سیرھیاں پھلانگ کر اوپر آیا۔ ثروت نے نوید کے سینے میں منہ چھپالیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ نوید نے اسے رونے دیا۔ منع کرنے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا اور پھر خود بھی تو وہ دل کھول کر رونا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بالوں پر پیار سے بوسے دے رہا تھا، اس کی آنسوؤں سے بھری گیلی آنکھوں کو چوم رہا تھا۔ ثروت اس کی ایک ہی تو بہن تھی، دونوں میں بے حد پیار اور دوستی تھی۔

”نوید! ہم اپنا بہت کچھ کھو چکے، امی کو اب کہاں سے لائیں گے۔ گھر کا حال تو تم نے دیکھ لیا..... امی کے جانے کے بعد کس طرح بکھرا پڑا ہے۔“ وہ سرگوشیوں میں نوید کو بتا رہی تھی تب ہی اوپر والے بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور عمیمہ باہر آئی، اس نے ایک رنجیدہ سی نظر دونوں پر ڈالی، ہاتھ میں پکڑی بچے کی فیڈر ریک پر رکھی اور دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی ان دونوں کے پاس آ گئی۔ ثروت اس کی نند ضرور تھی مگر اس سے بہت دوستی تھی، شوہر اور اپنی نند کا درد وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے بھی اپنی ساس سے بے حد محبت تھی ان کے درمیان کبھی ساس، بہو والا جلاپا نہیں رہا۔ جس طرح وہ اس سے محبت کرتی تھیں وہ بھی اپنی ساس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ عمیمہ کو دیکھ کر ثروت کے آنسو ایک بار پھر چہرے کو تر کرنے لگے۔

”عمی..... تم نے دیکھا، ہم سب کے ساتھ یہ کیا سانحہ ہو گیا۔“ عمیمہ نے ثروت کے کندھے پر محبت سے ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور اس کو اپنے قریب کر لیا۔ اس

کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں چوم لیں۔

”میں آپ دونوں سے ہرگز یہ نہیں کہوں گی کہ صبر سے کام لیں، مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اس گھر میں ایک ہستی اور بھی ایسی ہے جس کا غم ہم سب سے سوا اور جدا ہے انہیں بھی کسی کندھے اور سینے کی خواہش ہوگی..... ہاں ہم سب کے پاپا! چلیے نوید، پاپا کے پاس چلتے ہیں۔“

نوید نے ایک نظر نیچے لاؤنج پر ڈالی، وہاں لائٹ آف ہو چکی تھی اور زیادہ تر لوگ سو چکے تھے۔ واقعی ثروت ٹھیک کہہ رہی تھی اس کی ماں کا سجا ہوا اور سمٹا ہوا گھر بے طرح بکھرا پڑا تھا اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔

”ایک گھر پر ہی کیا موقوف، ہم لوگ بھی تو بری طرح بکھر گئے ہیں۔ نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے گا خود کو سمیٹنے اور سنبھالنے میں، چلو ثروت پاپا کے پاس چلیں۔“ نوید نے ثروت کو پکڑ کر اٹھایا بھی سب کو احساس ہوا کہ پیچھے کوئی ہے، انہوں نے مڑ کر دیکھا، پاپا کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور وہ نہ جانے کب ان کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نوید نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں پھڑکنے والے ساٹھی کے دکھ کے ساتھ، ساتھ بچوں کے لیے محبت بھی تھی۔

”سوری میرے بچو.....! تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں! مجھے تو خود اس وقت اپنے بچوں کے پاس آ جانا چاہیے تھا، بیٹا تم کہاں تھے اتنی دیر..... ثروت، عمیمہ! ہم سب کا ہی غم بڑا ہے، بہت بڑا، اس کائنات سے بھی بڑا.....“ پاپا نے کرب سے ڈوبی ہوئی آواز میں سب کو مخاطب کیا۔

”بچو! میں آپ سے شرمندہ ہوں، آؤ میرے پاس، اچھا میرے کمرے میں چلو..... آؤ میرے ساتھ۔“ احتشام صاحب نے تینوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

ہم سب آج کی رات جاگیں گے کیونکہ ہم لوگوں کا غم ان سب سے جدا ہے، ہے ناں.....! تو یہ بیٹا تم وہاں کیوں کھڑے ہو، یہاں آؤ ناں میرے پاس، میرے قریب..... مگی کو بھی بٹھاؤ یہاں میرے پاس.....“ انہوں نے فلورکشن کی طرف اشارہ کیا۔

”آج کی رات جو غم و اندوہ کی رات ہے اس میں کچھ بھی یاد نہیں کریں گے سوائے تمہاری امی... کی باتوں کے۔“ پاپا کی آواز غم سے بوجھل تھی۔

”آج کی رات میں صرف اور صرف شمیم کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ یاد تو خیر وہ ہم کو ہمیشہ رہیں گی کیونکہ وہ ایسی ہی سحر انگیز شخصیت کی مالک تھیں جن کو بھولنا ممکن ہی نہیں مگر آج کی رات اس لحاظ سے فیصلہ کن ہونی چاہیے کہ ہماری آنے والی ”کل“ کو کیسا ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں بچوں کہ اپنے پاپا کا یہ انداز اور یہ روپ تم تینوں کو بہت عجیب اور عامیانه لگ رہا ہوگا..... مگی بیٹا یہ نہ سوچنا کہ پاپا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، دراصل میں آج تم سب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری امی میری زندگی کا کتنا خوب صورت رنگ تھیں..... کتنا حسین احساس تھیں..... میں بہت کوشش بھی کروں گا تب بھی مجھے وہ الفاظ نہیں مل سکیں گے جن سے میں تمہاری ماں کی صحیح تصویر کھینچ سکوں جبکہ میں ایک مصور ہوں رنگوں اور برش سے کھیلتا ہوں، تصویریں بناتا ہوں مگر الفاظ میں؟ کاش! میں الفاظ کے سلسلے میں اتنا تہی دست نہ ہوتا۔ میں شاید دنیا کا ایک عجیب و غریب باپ ہوں حالانکہ ایسے معاملات میں انسان صرف اپنے قریبی دوستوں کے سامنے ہی کھلتا ہے مگر آج میرا جی چاہتا ہے کہ میں.....“ پاپا کچھ دیر توقف کے بعد پھر گویا ہوئے۔

”بیٹا! آج تم کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت، دلاویز اور امنٹ رنگ تمہاری ماں کا ہے اور تم جانتے ہو یہ رنگ میری زندگی میں کیسے شامل ہوا؟“ وہ گویا کسی کہانی کا آغاز کر رہے تھے۔

پاپا کا بیڈ روم گھر کے ہر کمرے سے مختلف تھا۔ بے حد کشادہ ہوا دار اور روشن..... ایک دیوار کے ساتھ کتابوں کے شیلف رکھے تھے اور رائٹنگ ٹیبل تھی ایک کونے میں رنگ، برش، ایزل اور فریم رکھے تھے۔ تیسری جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ نیچے لان میں لگی ہوئی ایک پھولوں سے لدی بیل دیوار کے سہارے اس کھڑکی تک آگئی تھی۔ اس بیل کے پچھلے اس کھڑکی کے راستے کبھی کبھی اندر بھی جھانکا کرتے اور دیوار گیر بڑے سے آئینے میں اپنا منہ دیکھتے تھے۔ کھڑکی کے پاس ہی رکھی ہوئی ایک ٹیبل پر الیکٹرک کیبل، کافی کے گگ، کافی میٹ اور چمچ رکھے ہوئے تھے، اس سے ذرا فاصلے پر ہینگر پر پاپا کا کیمرا، ڈریننگ گاؤن اور کپڑے لٹکے تھے۔ کمرے میں کوئی بیڈ نہیں تھا، صرف کارپٹ اور کشن رکھے تھے پاپا ہمیشہ زمین پر سوتے تھے ان کے کمرے میں ثروت اور نوید بہت کم آتے تھے۔ کیونکہ وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہو کر پینٹنگ کرتے تھے۔ پاپا محکمہ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ملک کے ایک نامور مصور بھی تھے۔ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی انگریزی بیشن کئی ممالک میں ہو چکی تھی۔ ان کی بنائی ایک، ایک تصویر لاکھوں میں فروخت ہوتی تھی۔ امی ہمیشہ بچوں کو پاپا کے کمرے میں جانے سے منع کرتی تھیں، وہ کہتیں تخلیقی کام کے لیے ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے اور آج پاپا خود ان سب کو اپنے کمرے میں لائے تھے۔

”بیٹھو بیٹا! بیٹھ جاؤ.....“ انہوں نے بہت پیار سے بچوں کو مخاطب کیا تھا۔

”آج ہماری فیملی کتنی نامکمل لگ رہی ہے ایک تمہاری امی کے نہ ہونے سے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔

”ثروت، ثروت! میری جان ادھر آؤ میرے پاس۔“ انہوں نے ثروت کا ہاتھ پکڑ کر فلورکشن پر بٹھا دیا۔

”بچو! نیچے سارے مہمان غالباً سو گئے ہیں لیکن

”میں انگلستان سے جب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹا تو ایک بے فکر نوجوان تھا، آزاد فضاؤں، خوب صورت مناظر، بہتے جھرنوں گنگناتی ندیوں اور سرسبز وادیوں کے درمیان اپنے کمرے کے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر تمہاری دادی اماں نے بھی ہر ماں کی طرح اپنی آنکھوں میں میری شادی کے خواب سجائے رکھے تھے۔ وہ میرے سر پر سہرا اور گھر میں بہو دیکھنا چاہتی تھیں..... پوتا کھلانے کی آرزو تھی انہیں! صبح شام بس ایک ہی وظیفہ تھا ان کی زبان پر.....

”بیٹا! اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتادو، ورنہ جو لڑکی مجھے پسند آئے گی لے آؤں گی اپنی بہو بنا کر.....“ میں اس زمانے میں اتنی جلدی شادی کرنے کے حق اور موڈ میں نہیں تھا، میں آزاد رہنا چاہتا تھا اپنے کمرے کے ساتھ، رنگوں اور برش کے ساتھ..... کتابوں کے ساتھ..... مگر تمہاری دادی ماں کہتیں.....

”میرے چاند! لڑکوں کی شادی اگر جلدی اور وقت سے ہو جائے تو اس سے بہت فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو لڑکے کسی برائی میں نہیں پڑتے، بچے جلدی جوان ہو کر باپ کی طاقت بنتے ہیں اور شادی انہیں ذمے دار بھی بناتی ہے۔“ یہ کہتے کہتے میری ماں کی آنکھوں میں پھلجڑیاں سی پھوٹنے لگیں..... میں سوچنے لگتا میری پیدائش کے ساتھ ہی شاید میری ماں نے اس خواہش کو پروان چڑھایا ہے اور انتظار کیا ہے اب چونکہ میں تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہوں، کیوں نہ میں اپنی ماں کی یہ خوشی اس کی زندگی میں ہی پوری کر دوں..... سو میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے اماں.....! آپ کی بہو آپ کی پسند سے ہی آئے گی مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں، آپ جس لڑکی کو بھی پسند کریں گی بس مجھے وہی پسند آجائے گی، وہی یقیناً بہت اچھی ہوگی۔“ پھر ایک محفلِ میلاد النبی ﷺ میں سفید کلف لگا، جتنا ہوا دوپٹا اوڑھے سر اور آنکھوں کو جھکا کر نعتِ رسول ﷺ پڑھتی ہوئی شمیم ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ ایک لمحے میں انہوں نے میری تقدیر کا

فیصلہ کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں تمہیں اس کی تصویر لا کر دکھا دوں گی جسے میں اپنے بیٹے کی دلہن بنانا چاہتی ہوں۔ اس پر میں بولا۔

”ارے نہیں اماں..... آپ تصویر وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ بس میں نے چھوڑ دیا ہے آپ پر سب کچھ۔“ اس طرح شمیم میری زندگی کا سب سے خوب صورت اور حسین رنگ بن کر میرے شب و روز کی ہم سفر بن گئی۔ بیٹی عیمہ اور ثروت تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں نے شادی سے پہلے شمیم کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ جب اماں اسے رخصت کرا کر گھر لائیں تو انہوں نے مجھے آواز دی۔ ”احتشام بیٹے ادھر آؤ، دیکھو یہ ہے میری اگلی نسل کی امین تمہاری دلہن شمیم! دیکھو اور بتاؤ کیسی ہے میری نگاہ انتخاب.....“ اور وہ وقت تھا کہ جب میں اپنی شریکِ سفر کو پہلی بار دیکھا۔ ”پاپا نہ جانے کون سی خوابناک کہانی سنار ہے تھے۔ وہ تینوں خاموشی سے متوجہ تھے۔

”ماں کے کہنے پر میں پُرشوق ہو کر آگے بڑھا، وہ ایک خوب صورت اور آراستہ مسہری پر گھٹنوں پر دونوں ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکائے گاؤ تکیے سے ٹکی بیٹھی تھی۔ اس کی بھوؤں کے اوپر افشاں سے گول گول ٹیکوں کی قطاریں سی بنی ہوئی تھیں۔ سرخ صبیح گالوں پر سونے کے تار کی بنی ہوئی بڑی سی نتھ میں سچے موتی دمک رہے تھے، بالوں کی لٹیں شرم اور پسینے سے ماتھے پر چپک گئی تھیں۔ کپکپاتے ہونٹوں پر سرخ رنگ کھلا پڑ رہا تھا۔ کانوں میں ہلکورے لیتے آویزے اور اس کے لبوں کی مسکان قابلِ دید تھی۔ ماتھے کاٹیکا اور جھومر عجیب بہار دکھا رہا تھا، خوب صورت مہندی لگے پیروں میں پازیب اور اگلیوں میں بچھوئے پہنے وہ میرے سامنے تھی۔“

پاپا شاعری سنار ہے تھے۔

”اوہ میرے خدا.....! وہ سماں اور وہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا..... میں پُرشوق ہو کر آگے بڑھا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ یہ آنکھیں کھولے اور مجھے دیکھے.....

”نو..... نو مائی سن.....“ پاپا نے نوید کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔

”be brave my lovely child ابھی تو رات باقی ہے، تمہاری ماں جو ہم سب کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی نہ جانے کیسے رہے گی..... اسے تو ہر دم اپنا گھر، اپنا شوہر اور اپنے بچے یاد رہتے تھے اس نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے سیر کرانے لے چلو، مجھے کپڑے دلاؤ، زیور خرید کر دو، میں اکثر شیم سے کہتا تم مجھ سے کوئی فرمائش کیوں نہیں کرتیں، بیویوں کی طرح لڑتی بھی نہیں ہو۔“

”ارے سب کچھ تو ہے میرے پاس اور لڑنا تو بہت ہی بری بات ہے۔“ وہ ہنس کر کہتی۔
”اس نے مجھے تمام خاندانی بکھیروں سے آزاد کیا ہوا تھا، بہت سے ایسے کام جو صرف میری ذمے داری تھے اسے بھی اس نے بحسن و خوبی نبھایا۔ کتنا

میں بھی تو دیکھوں اس کی آنکھیں کیسی ہیں مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں نے انگلیںڈ میں دورانِ تعلیم عورت کو ایک بے باک اور مختلف روپ میں دیکھا تھا، عورت کا یہ روپ میرے لیے حیران کن تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عورت کا اس قدر حسین انداز اور روپ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انگلیوں کی پوروں سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اور کہا۔ ”میں تمہارے اس خوب صورت پاؤں کی ایڑھی دیکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ ساری زندگی کسی دوسری عورت کا چہرہ مجھے پسند نہیں آئے گا، تم نے تو آتے ہی میرے دل پر لکھ دیا کہ یہ شارع عام نہیں ہے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، وہ یہ سن کر چھوٹی موٹی کی طرح سمٹی اور جھکتی ہی چلی گئی۔“ ثروت، عمیمہ اور نوید کی آنکھوں میں حیرت تھی پاپا ٹرانس میں بات کر رہے تھے۔

”میرے بچو! میرے شکر یارو! یہ کہانی یا افسانے کا کوئی منظر نہیں ہے بلکہ میری زندگی کی ایک نہ بھولنے والی یاد ہے۔ میرے راج ڈلاروں تمہارے چہروں پر نظر آنے والی حیرت فطری ہے۔ اپنے پاپا کا یہ انوکھا روپ تمہیں صرف حیران ہی کر سکتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے بلکہ میں خوب جانتا ہوں کہ شیم نے ایک ماں ہونے کے ناتے بچوں کی دوست ہونے کا کردار بھی بہ خوبی نبھایا۔ تم دونوں بہن، بھائی اور عمیمہ اپنے ہر مسئلے اور الجھن کو ان سے بہ خوبی ڈسکس کر لیتے تھے۔ بے جھجک ہو کر..... تو آج کی یہ باتیں اس لیے بھی ہیں کہ میں وہ فاصلے کم کرنا چاہتا ہوں بلکہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ شیم کی طرح میں بھی اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا بلکہ کرتا ہوں مگر کھل کر اظہار آج کیا ہے۔“ انہوں نے ثروت اور عمیمہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور نوید کو اپنے قریب کر لیا۔

”تمہاری ماں نے زندگی بھر مجھے اتنے سکھ دیے کہ شمار نہیں کر سکتا اور اب یہ دکھ.....“ پاپا کی آواز کرب سے بھاری ہو گئی۔ نوید نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سیریس ڈائجسٹ

ماہنامہ

میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

شیش محل

ہرلعزیز اور معروف قلم کار

اسما قادری کے قلم سے

کبھی خوش امید اور کبھی مایوس کن جذبات میں ابھی زندگی کے تیکھے انداز.... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

خوش نصیب تھا میں..... اور اب کتنا بد نصیب ہو گیا ہوں میں، وہ بھرے میلے اور بھری بہار میں مجھ سے پھڑ گئی۔ وہ شادی کے بعد جب رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو اس کی آنکھیں بند تھیں، میرے شدید اصرار پر بھی اس نے آنکھیں کھول کر مجھے نہیں دیکھا تھا اور آج بھی جب وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی تھی تب بھی اس کی آنکھیں بند تھیں، کیسا عجیب اتفاق ہے یہ.....“ پاپا کے آنسو اندر کہیں جلتے ہوئے دل پر چھن چھن کر رہے تھے اور نوید اس آواز کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پاپا کے کندھوں پر نرم اور محبت بھرے دباؤ سے ہاتھ رکھا پھر بے قرار ہو کر ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”پاپا، آپ اپنے سارے دکھ اور کرب، تکلیفیں میری جھولی میں ڈال دیں..... پلیز پاپا.....“ ثروت کی سسکیاں سنائے کو توڑتی رہیں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پاپا کی آواز پھر سنائی دی۔ ”جب ہم اسے اس کی آخری آرام گاہ میں اتار رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر ایک الوداعی نظر مجھ پر ضرور ڈالے گی مگر..... ایسا نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے نہیں دیکھا..... آج بھی شمیم کا چہرہ اتنا ہی دلکش لگ رہا تھا دنیا کی ہر عورت سے ممتاز اور جدا.....“ پاپا رک رک کر دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔

”وہ اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتی ہوئی چلی گئی کہ اس کے شوہر نے اسے کندھا دیا، آخری دم تک ساتھ دیا اور وفا نبھائی۔“

”بس کیجیے پاپا! بس کیجیے میرا کلیجا پھٹ جائے گا آپ کی باتیں سن کر.....“ ثروت نے تڑپ کر پاپا کے گھٹنوں پر سر ٹیک دیا۔

”میری بچی! تمہاری ماں نے ساری زندگی تو مجھے خوش رکھا ہی تھا مگر جاتے جاتے وہ ایک اور انوکھی خوشی کے لمس سے مجھے سیراب کر گئی۔ نوید بیٹا! پرسوں رات جب تم انجیکشن لینے نیچے گئے تھے تو اس نے ہاتھ کے

اشارے سے مجھے قریب بلایا، اگرچہ وہ اس وقت بہت تکلیف میں تھی مگر رک رک کر اس نے وہ بات مجھ سے کہی جسے اس کے منہ سے سننے کا میں ہمیشہ متمنی رہا۔“

”پاپا..... امی نے آپ سے کیا کہا؟“ ثروت اور عمیدہ نے دم بخود ہو کر پوچھا۔

”بیٹا.....“ پاپا کی آواز کرب سے دھیمی اور بھاری ہو گئی۔ شمیم نے مجھ سے کہا.....

”میں گھر داری اور بچوں اور آپ کے کاموں میں اتنی مصروف رہی کہ کئی بار جی چاہا کہ آپ کو یہ بتاؤں کہ آپ مجھے اچھے لگتے تھے بہت زیادہ، میں یہ کبھی کہہ نہ پائی اور وقت گزرتا ہی چلا گیا۔“ پاپا نے اپنی گردن جھکالی اور کئی لمحے خاموش بیٹا آہٹ کے گزر گئے۔

”شاید اس نے یہ بات اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھی تھی کہ اس کے بعد اور اس کے بغیر جو زندگی میں گزاروں گا..... یہ بات میرے لیے زندگی کی حرارت کا سبب بنے گی اور میں اس جملے کی توانائیوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔“ پاپا اٹھ کر دھیمے دھیمے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے انہوں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے کچھ جواز چاہیے ہوتے ہیں۔ کچھ اسباب ہوتے ہیں جو اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکساتے ہیں، کچھ ذمے داریاں ہوتی ہیں جو اسے نبھانی ہوتی ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہتا ہے بلکہ قدرت ہر انسان کو کسی نہ کسی چھوٹے بڑے مشن پہ بھیجتی ہی اسی لیے ہے کہ وہ محدود اور مخصوص وقت میں اس مشن کو پورا کرے اور واپس آجائے..... شاید تمہاری امی نے اپنے حصے کے کام پورے کر لیے تھے..... اور میرے حصے کے کچھ کام ابھی باقی ہیں اسی لیے میں ان کے ساتھ یا ان سے پہلے نہیں جاسکا۔“ انہوں نے گردن جھکا کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور مڑ کر بچوں سے مخاطب ہوئے۔

”گو ابھی رات باقی ہے مگر میرے شکر پارو!

گرد ہیں۔ تم جیوگی ان کے لیے جو تم سے وابستہ ہیں، تم سے جڑے ہیں جن کو تمہاری ضرورت ہے مثلاً تمہارے بچے، تمہارا شوہر، نوید اور ہم سب.....“ پاپا نے کہا۔

”بیٹی زندگی صرف روپ بدل گیتی ہے ختم نہیں ہوتی، زمین کا سینہ چیر کر باہر آنے والی کوئیل تیز ہوا کی زد پر بھی خود کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ پیغام دیتی ہے کہ میں موجود ہوں، میں زندہ ہوں۔“ پاپا نے عمیمہ کے ہاتھ میں کافی کاگ دیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

”اور وہ کوئیل عمیمہ ہے، شمیم زندہ ہے مگر وہ اب عمیمہ ہے۔ وہ ثروت کے روپ میں بھی زندہ ہے جو اسی کی تربیت کو لے کر اگلے گھر گئی ہے..... اور ہاں یہ بتاؤ کہ کافی کیسی ہے؟“ انہوں نے تینوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔

”بالکل زندگی کی طرح ہے تلخ بھی اور شیریں بھی، کل تک میں زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ پاپا مجھے لگتا تھا کوئی میرے دل کی باریک رگوں کو جیسے شیشے کے ٹکڑے سے کاٹ رہا ہے..... مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ مجھے پھر سے زندگی سے محبت کرنے پر مجبور کر دیں گے۔“ انہوں نے نوید کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کے ماتھے کو چوما۔

”میں ہوں ناں تم سب کے پاس..... میں شمیم کی چھوڑی ہوئی اثاث کا وارث ہوں، میرے بعد تم ہو گے تمہارے بعد تمہارا بیٹا اور پھر.....!“ پاپا نیچی آواز میں بولتے ہوئے اٹھے۔

”آؤ میرے بچوں میرے ساتھ.....“ وہ تینوں کو اٹھاتے ہوئے بولے۔

”رات ختم ہو چکی ہے کھڑکی سے باہر دیکھو..... کس قدر خوب صورت اور روشن صبح طلوع ہو چکی ہے اور دیکھو یہی تو زندگی ہے۔“

تینوں اب پاپا کے ساتھ لگے کھڑے می کے ہاتھ سے سجائے گئے لان کو گیلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

رات کتنی ہی کٹھن، طویل اور صبر آزما کیوں نہ ہو، نہ صرف ختم ہو جاتی ہے بلکہ جاتے جاتے ایک مسکراتی ہوئی اجلی، روشن اور پاکیزہ صبح اور چمکتا ہوا دن ہمیں تحفے میں دے جاتی ہے۔“ نوید کی آنکھوں میں حیرت تھی اور ثروت کی آنکھوں میں آنسو.....

”پاپا! آج آپ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پئیں گے، میں کافی بہت اچھی بناتی ہوں۔“ عمیمہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”ضرور اچھی کافی بناتی ہوگی۔ کیونکہ تم خود بھی تو بہت اچھی ہو مگر آج میرے بچے میرے کمرے میں آئے ہیں، میرے مہمان ہیں تو آج مجھے اپنے ہاتھ سے ان کو کافی بنا کر پلانا چاہیے اور میں بھی کافی بہت اچھی بناتا ہوں۔“ پاپا نے شفقت اور محبت سے عمیمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”نہیں پاپا.....! آپ یہاں بیٹھیں۔“ اس نے پاپا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”آج یہ کام میں کروں گی اور فیصلہ نوید اور ثروت کریں گے کہ کون اچھی کافی بناتا ہے۔“ نوید نے تشکر بھری نظروں سے عمیمہ کو دیکھ کر اشارے سے منع کیا۔

”نہیں عمیمہ.....! آج ہم سب مل کر اپنے پاپا کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پئیں گے، پاپا آپ کافی بنائیے۔“

”شیور! میں اس وقت یہ کام بہت خوش ہو کر کروں گا کیونکہ میرے پیارے بلکہ بہت ہی پیارے مہمان میرے کمرے میں آئے ہیں اور کافی کی فرمائش کر رہے ہیں۔“ انہوں نے گردن موڑ کر بہت پیار سے ثروت کو دیکھا، وہ دوڑ کر باپ کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”پاپا! آپ ہمارے لیے کتنا پیار رکھتے ہیں اپنے دل میں..... پر ہم امی کو نہیں بھول سکتے، ہم کیسے رہیں گے ان کے بغیر..... کیسے؟“

”نہیں میرے شکر پاروں، میرے دل کے چین و سکون! ہمیں رہنا ہوگا ان کے بغیر..... بہادری کے ساتھ جینا ہوگا ان لوگوں کے لیے جو آب ہمارے ارد



جرس الفیت کے اسیر

نہر حسین اظفر



جانب مائل ہو جاتا۔ سوائے اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی پسندیدگی جو صرف اور صرف خاص الخاص بلال کے لیے تھی اور جسے محسوس کر کے وہ اور زیادہ کوفت میں مبتلا ہو جاتا۔..... اور اس چیز کو جب وہ شاہ نور کے ساتھ مل کر انجوائے کرتی تو غصے کے مایے اس کا دل

رویشہ کے لیے اس کی پسندیدگی کی عمر اتنی طویل نہیں تھی۔ جتنی ہانیہ کو ناپسند کرنے کی۔ وہ جدید دور کی پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ اسی حساب سے اس کا پہناوا تھا اور اسی انداز کا گفتگو کا طریقہ۔
بلال کو اس میں کوئی بات ایسی نہ لگتی کہ وہ اس کی



چاہتا کہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی بہن کا بھی گلا دبا دے جو ہانیہ کے بڑے بھائی دانیال سے منسوب تھی۔

اس نے بار بار روبیشہ کو خاندان کی تقریبات میں سچے سنورے دیکھا تھا۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود رشتے داری ایسی قریبی نہ تھی اور نہ ہی اس نوعیت کی تھی کہ بحالت مجبوری خاندان ہی کی تقریبات کے علاوہ ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا ہوتا دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی عرصہ دراز تک یہی سمجھتا رہا کہ روبیشہ، زین ہی کی شریک سفر بنے گی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی دونوں کو بلا وجہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے نہیں دیکھا۔ جیسا کہ ہانیہ سارے جہان میں بیاٹنگ دہل بلال کو اپنا فیانی کہتی پھرتی تھی۔ اسے اس بات کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ بلال کو یہ بات کیسی لگتی ہے۔ اس کے برعکس روبیشہ کا تمیز دار لباس، دھیمہ انداز اور خصوصاً زین العابدین کے ساتھ بے حد معتدل رویہ، ہمیشہ اس کی نگاہوں میں پسندیدہ رہا۔

زین العابدین کی کسی اور سے شادی اس کے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی، جتنی دوسروں کے لیے۔ لیکن اس نے چند ہی روز بعد دل میں خواہش کی ایک نئی نازک کوئیل کو پھوٹتے دیکھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوئیل، ست رنگے پھولوں سے لدی نیل میں بدل گئی..... جس نے اس کے دل کی چار دیواری کو اپنے سبزے سے ڈھانپ لیا تھا۔

اسے یوں لگنے لگا جیسے روبیشہ سے کتنے برسوں پرانی شناسائی ہے۔ مہینوں سے اس کی شکل تک نہ دیکھنے کے باوجود وہ اسے چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کا تصور کرتے کرتے، اتنی دور پہنچ جاتا کہ یہ حقیقت خود بخود اپنا وجود کھودیتی کہ روبیشہ کو اس کے ارادوں کی بھنک تک نہ تھی۔ اور وہ سب کچھ جاننے کے بعد کیا سوچتی، کیا کہتی، کیا سمجھتی اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی..... شاید اس کو خود پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں ایک محسوس کیا جانے والا تناؤ تھا۔ تائی امی جہاں بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھیں وہیں بہو سے شرمسار۔ وہ سمجھتی تھیں زین کی زندگی میں کسی اور کے آجانے سے رُبا خود بخود نکل جائے گی۔ شریک حیات کی اپنی ایک الگ مستحکم حیثیت ہوتی ہے۔ مگر ان کی سب تدبیریں ایک کے بعد ایک ناکام ہوتی چلی گئیں۔ جب زین نے جاب شروع کی تو انہوں نے اپنے شوہر کا مکان بیچ کر دیورانی کے گھر سے دور دراز علاقے میں بہتر جگہ پر نیا گھر لے لیا۔ تاکہ زین کی آمدورفت کم ہو سکے۔

اپنی بہو کی تلاش میں انہوں نے کنوؤں میں بانس ڈلوادیے۔ جو حور پری وہ زین کے لیے چن کر لائی تھیں اس کے حسن کی چمک سے ان کی اپنی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ زین تو پھر مرد تھا۔ انہیں پتا تھا کہ تھوڑے ہی دن اس کے خوب صورت ساتھ کے آگے روبیشہ اور زین کی (اپنے تئیں) نام نہاد محبت کہیں منہ چھپا کر بھاگ جائے گی۔ سارا خاندان بشمول ان کی دیورانی اور خود رُبا کے، منہل کے حسن کے قصیدے پڑھتا نظر آیا۔ شادی والے دن ان کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔ جب ویسے میں انہوں نے زین کے دائیں بائیں منہل اور روبیشہ کو بیٹھا دیکھ کر ان کا موازنہ کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ رُبا کو اس بلکہ کسی بھی قسم کے تقابل کے قابل ہی نہیں گردانتی تھیں۔ نہ وہ صورت میں اس کے برابر تھی۔ نہ تعلیم، نہ خاندانی اسٹیٹس اور سب سے اہم چیز ذہنی ہم آہنگی اور سیرت تو ان کے نزدیک قابل غور چیزیں تھیں ہی نہیں۔

کئی مہینے گزر جانے کے باوجود وہ دونوں اوائل دنوں کے مانند دور دور، خاموش اور لا تعلق نظر آتے تھے۔ شادی شدہ جوڑے تو اوائل ایام میں بے حد قریب، پُر جوش اور خوش دیکھتے ہیں۔ وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ نہ زین کی نظریں معنی خیز تھیں کچھ کہتی، کچھ سنتی، بولتی۔ نہ منہل کے عارض گلگلوں ہوتے۔ نہ اٹھتی گرتی پلکیں، نہ حیا آمیز مسکراہٹ۔

دوسری شادی کرنا پڑی۔“ انہیں جوان بیٹے سے نظریں چھانا پڑیں۔ آمنہ کا سر بھی جھک گیا۔
”اس کی اپنی جڑواں بہن فلی مینٹلی اپنا رمل ہے۔ بڑی بہن بے اولاد ہے اور بچپن میں دو بھائی پیدا ہوتے ہی انتقال کر چکے۔ ایسی لڑکی سے شادی کی خواہش؟ اور کون ضمانت دے گا کہ مستقبل میں وہ اس قسم کی مشکلات سے دوچار نہیں ہوگی۔ یا اسے ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوگا۔“

انہوں نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔
”اس بات کی ضمانت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا بابا اور بھلا مستقبل کی کسی بھی بات کی ضمانت دے ہی کون سکتا ہے۔ اللہ کے سوا.....؟“

”تم اپنا منہ بند ہی کرلو تو بہتر ہے۔ ارے سالوں سے وہاں دیکھ رہی تھیں امینہ بیگم مگر ہوا کیا۔ اس نے بھی دکھادی ناں ہری جھنڈی۔ ظاہر ہے آنکھوں دیکھی کبھی کون لگتا ہے۔ بس اب تم بھی اس بات کو یہیں ختم کر دو۔“

اپنی طرف سے انہوں نے جھٹ پٹ معاملہ نمٹایا تھا۔ مگر بلال ایک دم بھڑک اٹھا۔

”ہرگز نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس طرح کی فضول فکریں پکڑا کر میرا ارادہ بدل دیں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف رویشہ سے بس۔“ وہ بولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ آمنہ حق دق رہ گئیں۔ باپ کے سامنے اس قدر بدتمیزی اور بلال۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں لیکن ریحان سعدی سمجھدار تھے۔ وہ نہ تو حیران تھے اپنی بیگم کی طرح..... نہ ضدی تھے اپنے بیٹے کی طرح۔ وہ پُرسوج انداز میں دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے جہاں سے بلال باہر نکلا تھا۔

”میرے خیال میں ہمیں بلال کی بات مان لینی چاہیے۔“ کافی دیر بعد ان کے منہ سے نکلا۔ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

”یہ سب رویشہ کا ہی کیا دھرا ہے۔“ بالآخر وہ فیصلہ کن انداز میں سوچتی ہوئی انھیں۔ منہل لاؤنج میں پتھر کا بت بنی ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ اسے بتا کر باہر نکل آئیں۔ ان کا رخ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب تھا۔ دیورانی کے گھر کا راستہ قدرے لمبا سہی مگر اتنا بھی طویل نہ تھا کہ وہ زین کے علم میں لائے بنا وہاں جانہ سکیں۔

☆☆☆

ریحان سعدی گہری نظروں اور انتہائی سنجیدگی سے اپنے اکلوتے فرمانبردار بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شرمسار تو تھا لیکن اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہاری دونوں باتیں بڑوں کی ناراضی کا سبب بن رہی ہیں۔ ہانیہ سے شادی سے انکار بھی اور اس لڑکی کی ضد بھی۔“ اپنی بیگم کی بہ نسبت انہیں رویشہ اور اس کے گھر والوں سے کوئی ذاتی پُر خاش نہ تھی۔ بلکہ منصفانہ طریقے سے سوچتے تو وہ ہی انہیں ہمدردی کی مستحق بھی نظر آتیں۔

”لیکن دونوں باتیں جائز بھی ہیں اور میرا حق بھی۔ میں ہانیہ سے شادی سے انکار بھی کر سکتا ہوں اور رُبا کا انتخاب بھی کر سکتا ہوں۔“

آمنہ کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔
”تمہیں اندازہ نہیں ہے یہ صرف اتنی سی بات نہیں ہے بلال۔ اگر ہانیہ تمہیں پسند نہیں تو کہیں اور کرلو شادی مگر وہاں..... وہاں نہیں۔“
”کیوں نہیں؟“ وہ اب بھی پُرسکون تھا۔

”ایک تو وہ میری بہن کی سوکن کی لڑکی ہے دوسرے تم..... تم کچھ نہیں جانتے۔ بھئی اسے سمجھائیں ناں۔“ وہ آخر میں زچ ہو کر پھر شوہر کی طرف مڑ گئیں۔

”بیٹا، اس فیملی میں صرف ایک اس لڑکی کو چھوڑ کر باقی سب میں کوئی نہ کوئی فزیکل یا مینٹل ڈسٹربنس ہے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ خود ان کی اپنی والدہ کوئی صحت مند خاتون نہیں تھیں۔ جیسی تو صداقت کو

”ارے واہ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کہہ دی آپا!“ فون پر صالہ تھیں۔ ان کا رد عمل توقع سے بہت قریب تھا۔

”آسانی سے نہیں کی ہے صالہ! تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر ایک طرف تمہاری بیٹی ہے تو دوسری طرف میری اپنی اولاد اسی فیصلے کی زد میں آکر نقصان اٹھائے گی۔“

”تو پھر یہ بیوقوفی کیوں؟ مزے آگئے بلال کے تو۔ بیٹھے بٹھائے من کی مراد مل جائے گی اور میری بیٹی اس کا کیا کروں میں؟ وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ جب سے گھر میں یہ بات نکلی ہے۔“ ان کی آواز بھرا سی گئی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ صالہ میں کیا کروں۔ ایک طرف ہماری بیٹیاں ہیں تو دوسری طرف.....“ انہوں نے دانت بھینچ کر اپنا غصہ نکالا۔ خدا جانے بلال پر یا رویشہ پر۔

”اور اب تو ریحان بھی اس کی حمایت کر رہے ہیں۔“ آمنہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ بلال کو روئی کی طرح ڈھنک کر رکھ دیں۔ جس نے انہیں اپنی بہن کے سامنے شرمندہ کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اس رویشہ کو تو کچا ہی چبا ڈالیں۔

”تم ذرا ایک دو دن صبر کرو آپا، میں صداقت سے کہتی ہوں۔“ صالہ کی پرسوج آواز نے ان کے مُردہ جسم میں جیسے نئی روح پھونک دی۔

”ہیں؟ تم بات کرو گی ان سے وہ مان جائیں گے؟“ ”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کبھی ان بیوی، بیٹیوں کا نام تو زبان پر نہیں لاتے۔ مگر خرچہ بھیجنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔“

ان کے صاف گوانداز پر وہ ڈھیلی سی پڑ گئیں۔ ”اچھا دیکھو! خدا کرے کوئی صورت نکل آئے۔“

دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے انہوں نے مُردہ دلی سے ریسور رکھ دیا۔

☆☆☆

مغرب کا دھندلا سماں اپنے پر پھیلائے سرد اداسی میں اونگھ رہا تھا۔ جیسی ایسا لگا جیسے گھر میں بھونچال آگیا ہو۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی۔ کب سے جائے نماز پر بیٹھی اپنے مجازی خدا کے مزاج مل جانے کی دعا مانگتی گزر گئی تھی۔

”ہاں گئی تھی میں، ان ماں بیٹیوں کے لپھن سدھارنے..... ارے شرم نہیں آتی..... لوگوں کے گھر اجاڑنے کا سامان کرتی پھر رہی ہے دن دھاڑے۔ ایسی بے شرم لڑکی تو دیکھی نہ سنی۔“

”کیا ہو گیا ہے امی آپ کو؟ آپ کی اپنی بھتیجی ہے وہ، آپ کا اپنا خون۔ اس پر اس طرح کا الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آپ خود بھی بیٹیوں والی ہیں۔“

”اے ہاں ہم بھی بیٹیوں والے ہیں مگر خدا گواہ ہے۔ ہماری بیٹیوں نے کسی پر نگاہ نہیں رکھی۔ جہاں باندھ دیا چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئیں نہ چوں نہ چرا ایک یہ ہیں۔ جوانی پھٹی جا رہی ہے.....“ تائی امی کے زبان کے جوہر پہلی بار منہل پر کھلے تھے۔ اس کا منہ کھل گیا۔

”بس کریں امی!“ زین اس قدر زور سے دھاڑا کہ اسے لگا اس کا دل باہر آ جائے گا۔ اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”اب ایک لفظ نہیں بولے گا آپ۔ بہت کہہ چکیں اور بہت سن لیا میں نے۔“ اس کا چہرہ انگارے کے مانند دھک اٹھا۔ تائی امی اور منہل دونوں ہی اپنی جگہ سہم سی گئیں۔

”رویشہ کے بارے میں کسی نے مجھ سے ایک لفظ بھی آئندہ کہا تو نٹائی کا ذرے دار وہ خود ہوگا۔“ اس کی آواز کسی دھاڑ سے مشابہ تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں گیا۔ اور پوری قوت سے دروازہ دے مارا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تائی امی اور منہل کسی خواب سے جاگی تھیں۔

☆☆☆

بات کرنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر چپ کر گئیں۔ کبھی صرف ایک گہری سانس بھرنے پر اکتفا کیا۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سینے پر الٹ کر رکھ لی۔

”یہی کہ بلال کا رشتہ لے جانے کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا؟“ بات تھی یا آہ۔ جو جانے کب سے دل میں دبی تھی۔

”تو آپ بالآخر اس بات پر راضی ہو ہی گئیں۔“
”کیا کرتی ہوتا ہی پڑا۔“ ان کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ چونک سے گئے۔

”کیوں؟ کل تک تو آپ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھیں۔“

”ہاں..... بس“ انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
”صالحہ نے کہا تھا صداقت بھائی سے کہلوانے کے لیے کہ وہ لوگ اس رشتے سے انکار کر دیں۔“

”کیا..... بات کر رہی ہیں آپ آمنہ؟ کیا ضرورت تھی یہ فضول بات کرنے کی۔“ ریحان ایک دم جگڑ سے گئے۔ آمنہ گڑبڑا گئیں۔

”میں نے کہاں.....؟ بس صالحہ خود ہی کہہ رہی تھی تو میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

”حد کرتی ہیں آپ بھی۔ ایک باپ پہلے ہی بیٹیوں کو عید کے علاوہ شکل نہیں دکھاتا۔ اوپر سے آپ کہتی ہیں کہ ایک بیٹی کا رشتہ بچانے کے لیے دوسری بیٹی کے رشتے سے انکار کر دیں وہ؟“ ان کی بات غلط نہ تھی۔ آمنہ کے پاس سوائے ایک اور ٹھنڈی سانس بھرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

”انہوں نے بھی یہی کہا کہ میرے لیے تو دونوں ہی برابر ہیں۔“

”ہاں تو کیا غلط کہا انہوں نے۔ روئے بھلے غیر متوازن ہوں مگر اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔“ وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹتے ہوئے بولے۔

”میرے خیال میں یہ ویک اینڈ مناسب رہے گا۔“
☆☆☆

اسے اپنے وجود سے آگ کی لپٹیں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک وحشت کے عالم میں اس نے ٹائی گھسیٹ کر دور پھینکی۔ اس کی نگاہوں میں رویشہ کا سرخ چہرہ گھوم رہا تھا۔

”کیوں آتے ہیں بار بار یہاں۔ جانتے نہیں ہیں سب کو برا لگتا ہے۔“ اس نے جڑے بھینچ کر شرٹ کے بٹن کھولے اور بیڈ پر اچھال دی۔

”ایک بار مجھے ٹھکرا کر چین نہیں ملا کیا آپ کو۔ جو بار بار بے عزت کرنے.....“

”او خدا یا!“ اس نے فل اسپینڈ میں پنکھا چلا دیا۔
”وہ روئی تھی۔“ اس نے پورے جسم پر پسینے کی کمی محسوس کی۔

”وہ مجھ سے بدگمان تھی۔“
”اسے مجھ سے شکایت ہوئی..... رہا کو..... مجھ سے۔“ وہ اب اپنے جسم پر موجود بنیان گھسیٹ رہا تھا۔

پنکھے کی سرد ہوا خنک موسم میں جسم میں گھسنے لگی تھی مگر اس کا وجود کسی طور ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

”مت آیا کریں یہاں۔ جائیں یہاں سے۔“
کسی نے اس کے پردہ سماعت پر انگارہ گرایا۔

”مت آیا کریں۔“
”چلے جائیں مت آیا کریں۔“

اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ واش روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں صرف رویشہ کا چہرہ تھا۔ سرخ متورم۔ اس کے کانوں میں صرف رویشہ کی آواز تھی..... رندھی ہوئی..... بیٹھی ہوئی..... چلاتی ہوئی۔

”مت آیا کریں یہاں۔“ وہ اب ٹھنڈے پانی کا شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا تھا۔ بخ پانی کی دھاریں اس کے وجود کو سرد کرتی جا رہی تھیں اور وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

ریحان صاحب بہت دیر سے اپنی بیگم کا کھویا کھویا سا انداز ملاحظہ کر رہے تھے۔ کتنی بار انہوں نے

منگنی کی انگٹھی بہت قیمتی اور خوبصورت تھی۔ بلاشبہ پہنانے والوں کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھی اور اس کی انگلی میں آکر جی سی گئی تھی۔ اسے یہ انگٹھی پہنے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ مگر جذبات اس حوالے سے بالکل سپاٹ سے تھے۔ اسے امی کا تمنا تھا ہوا چہرہ اور نم آنکھیں یاد تھیں۔ ایسی ہی نمی اس نے شاید زین کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ جو بالکل اچانک بلال اور اس کے گھر والوں کی آمد کے بعد وہاں آیا تھا۔

مگر.....

وہ وہاں آیا ہی کیوں تھا۔ کیسے.....؟ کس لیے.....؟ ایک بار رویشہ سے سن لینے کے بعد اسے یقیناً دوبارہ پلٹ کر وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا وعدہ خلاف تو نہ تھا پھر.....؟

”میں نے بلایا تھا اسے، تاکہ اپنی آنکھوں سے تمہاری نسبت ہوتی دیکھ لے اور پھر آئندہ تمہارا نام نہ لے۔“ اس کی سوچیں یمنی نے پڑھ لی تھیں۔

اور وہ ایک دم ہی ہنس دی پھر دیر تک ہنستی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی نمی آن ٹھہری۔ جو اس نے زین کی بے یقین نگاہوں میں چمکتی دیکھی تھی۔

”تم کتنی نادان ہو یمنی! کتنی نادان..... تم سمجھتی ہو زین کو یہاں بلا کر انہیں میری منگنی کی رسم دکھا کر تم نے ان کے دل میں موجود میرے لیے جو جذبات ہیں ان کا سد باب کر دیا ہے؟“ اس نے جیسے یمنی کے بچپنے پر سر جھٹکا۔

”بالکل پاگل ہو تم۔“ آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا اور وہ نکلنے پر مجبور تھی۔

”معلوم نہیں کیوں..... کیوں سب لوگ ہمارے اتنے دشمن ہو گئے۔ وہ لوگ جو ہمارے اپنے تھے۔ کیا ملا انہیں ہمیں یوں دور دور دیکھ کر۔ ہم نے تو کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔“ وہ ایک عالم بے خودی میں بڑبڑاتی، بیڈ پر دم سادھے بیٹھ گئی۔ یمنی تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر دمیرے سے آواز دی۔ مگر وہ اپنے

آپ میں تھی کہاں۔

”کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا کسی سے ہم نے..... ہم نے تو..... ایک دو بجے سے ایک دوسرے کا ساتھ تک نہیں مانگا۔ پھر کیوں..... کیوں سب ہمارے ایسے دشمن ہو گئے؟ ہمیں قریب دیکھ کر خفا ہمیں دور دیکھ کر خوش، راضی.....“

”رہا!..... رہا!.....“ یمنی نے گھبرا کر اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ مگر وہ سامنے جانے کون سے غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔

”ہم کون سا مر رہے تھے ایک ہونے کے لیے۔ ہم نے تو صبر ہی کر لیا تھا ناں۔ پھر کیوں تماشا بنانے لگے سب؟ کیا ملا سب کو یہ کر کے؟ جدا تو ہو گئے تھے ہم۔ مان تو لی تھی بات۔ مار تو لیا تھا دل پھر پھر..... پہلے تالی امی، پھر تم.....“

”رہا ہوش کرو کچھ، کیا ہو گیا ہے اب کی بار یمنی کی آواز بلند تھی۔ اس نے بنا چوکے یمنی کی طرف چہرہ موڑا تو آنکھوں میں ٹھہرا پانی چھلک گیا۔

”کیا کیا انہوں نے؟ کیا کیا تالی امی نے؟“ وہ یمنی کے سوال پر چونک کر جیسے حواسوں میں لوٹی۔

”انہوں نے وہی کیا جو تم نے آج کیا۔ مگر وہ جیت گئیں۔ وہ بازی لے گئیں۔ تم جیت گئیں۔ سب لوگ جیت گئے ایک سوائے میرے۔ صرف میں ہار گئی۔ زین ہار گئے۔ بس..... بس ہم..... وہ بے دردی سے اپنے ہاتھوں میں پہنے گجرے کھسوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے سیاہ کشکول سے، تاریکی اور سناٹے کے سکے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے۔ اس کی بے نیند سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اور ان میں صرف ایک مانوس چہرہ آن سما یا تھا۔ کتنی حیرت اور بے یقینی تھی اس چہرے پر۔ کتنے سوال تھے اس کے خاموش لہجے میں۔ اور کتنا دکھ تھا اس معمولی سی نمی کی دہ میں..... اور وہ واپس چلا گیا۔ چچی کو مبارک باد دے کر۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کوئی جواب نہیں

پہلے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا۔ اپنی خوشی میں شامل کرنے کے لیے ہی سہی۔ ایک بار یاد تو کیا ہوتا۔ تم جان لیتیں..... دوستی کسے کہتے ہیں۔“
اس کی پلکوں پر نکلے آنسو رواں ہو گئے۔

”یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھول جائے۔“
یہ سیل بھی زین کا تحفہ تھا اور یہ سنگل بیڈ بھی۔ جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ سر ہانے دیوار میں نصب ہوئی جدید طرز کی رائٹنگ ٹیبل، لیمپ اور کتابوں کے ڈھیر میں حصہ بنی بیشتر کتابیں اسی کی یادگار تھیں۔ اس کے دستخط اور دعائیہ الفاظ سے جن کے سرورق جگمگاتے تھے۔
وہ سیل آف کر کے سینے پر رکھ کر بے اختیار سک پڑی۔ جس سینے میں دھڑکتا دل اسی کے نام کی مالا جپتا تھا۔

”مجھے معاف کر دیں زین جو بھی تکلیف آپ نے یمنی کی وجہ سے اٹھائی اس کے لیے۔“ ٹوٹتے الفاظ، لبوں کو چومتے جارہے تھے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کچھ دن پہلے زین کے لبوں سے نکلتے

مانگا۔ کوئی بات نہیں کی۔ اس کے پاس آ کر بیٹھا تک نہیں۔ اور رویشہ کا سر جو جھکا تو اس کے بعد دوبارہ اٹھ ہی نہ سکا۔

اس کا دل تو تب سے ہی پکھل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے، قطرہ قطرہ، لمحہ لمحہ، نہ کل رات اور نہ آج، اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کل وہ واپس کب گیا۔ وہ اس کے بعد سب کچھ بھول گئی تھی۔
یمنی کی چہکتی آواز..... بلال کے چہرے کے انگنت رنگ..... متوقع ساس اور سرکار روکھا رویہ اور اکلوتی نند کی غیر موجودگی وہ بھی اتنے اہم موقع پر۔ کسی بھی دھیان کی راہ پکڑنے سے پہلے دو غم، حیران آنکھیں اس کے راستے میں کھڑی ہوئیں اور وہ خود سے نظریں چرانے لگی۔ موبائل کی اسکرین لمحہ بھر کو چمک کر بجھ گئی۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے مسکرا کر نہیں بلکہ بے تابی سے جھپٹ کر سیل اٹھایا تھا۔

”راستے تو جدا ہو ہی گئے لیکن منزل پر پہنچنے سے

ہر شمارہ خاص نمبر

لیکن خاص نمبر کی بات ہی کچھ اور ہے

سرگزشت

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 2016ء

پہلا سرگزشت نمبر

انتہائی چونکا دینے والے، حیرت زدہ اور لرزادینے والے واقعات

ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کر رکھنے پر مجبور ہو جائیں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرائیں

فضاؤں میں تحلیل ہو گئے تھے۔

”مجھے معاف کر دو رویشہ، جو بھی تکلیف تمہیں
امی نے پہنچائی اس کے لیے۔“

☆☆☆

آج پتا نہیں کون سا دن تھا... زین العابدین اور
منہل کی بات چیت بند ہوئے۔ وہ اس کے معمولات
اور ضروریات کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھ رہی تھی لیکن
زین ایک ”ہوں“ سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔ کئی
بار اس نے سوچا، اس سے اس موضوع پر بات کرے یا
کم سے کم اتنا ہی پوچھ لے کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا
کیا قصور تھا۔ بہر حال وہ اس کا شوہر تھا اور ایک مشرقی
بیوی کی طرح اس کی بے اعتنائی اسے جلاتی اور تڑپاتی
تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اسے اچھی طرح
پتا چل چکا تھا کہ اپنے شوہر کی سوچوں اور دل و دماغ پر
وہ اکیلی ہی قابض نہیں۔ کوئی اور بھی پورے طمطراق
سے وہاں براجمان ہے۔ یا پھر شاید وہ خود تو کہیں تھی ہی
نہیں۔ ہر جگہ وہ ہی وہ تھی..... ”رویشہ.....“ اس نے
ایک حسرت سے اس کا نام لے کر دوسری طرف کروٹ
لے کر سوتے ہوئے زین کو دیکھا۔ پھر کچھ دیر یونہی
دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیا سوچ کر دھیرے سے اس کا
بازو ہلایا۔

”زین!..... زین!“

وہ گہری نیند سے جاگا تو مُندی مُندی آنکھوں
میں حیرانی سموئے اسے دیکھنے لگا۔ اور وہ اسے جگا تو
چکی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کرے۔
اسے یوں نیند سے جگانے کی کیا وجہ بیان کرے۔ کوئی
ایسی بات جو اس کا دل خوش کر دے۔ یا کچھ ایسا کہ وہ
مسکرا دے۔ الفت کی نظریا کرم کی کوئی ایک ساعت
اس کے نصیب میں لکھ دے۔

”میں..... مجھے نیند نہیں آرہی۔“ وہ اٹکنے لگی۔

”تو.....؟“ اس کا سوال اتنا ہی لا تعلق تھا جتنا

کہ وہ خود۔

”میں نے سوچا آپ تھوڑی دیر.....“

میں..... میرے ساتھ جاگ لیں تو ہم باتیں کر لیتے۔“
آخری الفاظ پر اس کی آواز بالکل دم توڑ گئی۔

”نیند تمہیں نہیں آرہی اور جاگوں میں؟“ منہل
کو لگا جیسے لمحے بھر کے لیے اس نے منہل کی ہنسی اڑائی۔
گو یا پس عبارت کہیں ”تمہاری اوقات کیا ہے؟“ چھپا
بیٹھا تھا۔

وہ سر جھکا کے لب کھلنے لگی۔ کسی نا کردہ جرم کے
مانند اس نے زین کو جگانے کی غلطی کر ڈالی تھی۔

”کوئی سلیپنگ پلو لے لو۔ مجھے صبح آفس جانا ہے۔“

قیمتی مشورہ حاضر تھا۔

وہ کبل منہ تک تان کر لیٹ چکا تھا۔

شادی کی پہلی رات کے علاوہ اس نے کبھی منہل
کو اپنی اس ”خاص توجہ“ سے نہیں نوازا تھا جس کا
ارمان اور جس کا تصور ہر نوبیا ہتا کے چہرے پر گلال
بکھیر دیتا ہے۔ جو سہاگن کے وجود کو گلاب کی طرح
مہکا دیتا ہے۔

منہل کب تک اس پتھر کے وجود کو کتنی اپنی قسمت
سے شکوہ کرتی۔ جلد یا بدیر اسے نیند آ ہی جانی تھی۔ پلو
کے بغیر بھی لیکن جب تک نیند نہ آئی۔ آنسو اس پر
مہربان تھے۔ جانے کیوں بہتے آنسوؤں کی تپش تلے
دل کے کسی پوشیدہ کونے میں کہیں کچھ بہت غلط
ہو جانے کا احساس سر پہوڑائے سلگ رہا تھا۔

☆☆☆

بلال کو اس کا نمبر پہنچایا جا چکا تھا۔ یقیناً یہ یمنی کی
مہربانی تھی۔ جس کی خود اسے خواہش تھی نہ ضرورت۔
ہاں ایک مجبوری ضرور تھی۔ جو اسے نبھانی تھی۔ اس
بات سے بے خبر یا جان بوجھ کر نگاہیں چرائے کہ یہ خیر
خیریت، صبح و شب بخیر کے مختصر پیغامات چند لمحوں یا چند
دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں اور مجبوری تا حیات کون
نبھاسکتا ہے بھلا..... ایک نہ ایک دن، کسی نہ کسی کو تو ختم
ہونا ہی پڑتا ہے..... یا تو مجبوری..... یا اسے نبھانے
والے کو خود.....

ایک سرخ، سرد، اداس شام میں یمنی آئی تو

پٹا خا چھوڑا۔

”یا اللہ خیر.....“

”میری بہن کے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہو۔“ اس نے بے اختیار دہل کر خدا سے دعا کی۔

”ہاں بھئی اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہم تو خدا سے یہی دعا کرتے ہیں بس۔“ رویشہ کو ایک فیصد بھی یقین نہ تھا۔ نہ ان کی باتوں پر نہ ان کی دعاؤں پر۔

کھر آلود شام کو اندھیرے نکل رہے تھے۔ برآمدے میں پلنگ کے پائے سے لپٹی صبغہ اپنا سر کھجاری تھی۔ اس نے سردی کی شدت میں اضافے کو محسوس کر کے اسے اندر لے جانا چاہا تو اس کے پیر سے بندھی زنجیر نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔

☆☆☆

وقت ست رفتاری سے گزرا مگر، بہر حال..... اسے بلال کی خبر گیری کی عادت پڑ ہی گئی۔ خوش ہوئے بغیر وہ اس کے ایس ایم ایس اور کال کی منتظر رہنے لگی۔ زین تو اس دن کے بعد سے پلٹ کر نہیں آیا۔ بس وہ آخری پیغام اور اس سے جڑی طویل خاموشی ایک ایسا زخم تھا جو معمولی سی یاد کی ٹھیس سے پکنے لگتا۔ رسنے لگتا اور ایسے میں بلال کو زبردستی سوچنا نکال نکال کر اس کے میسجز پڑھنا..... ایک پین کلر کے مانند..... ایک درد کشا کے بہلاوے کی طرح۔ درد کشا..... جس کا زخم کی گہرائی اور اس کی نوعیت سے اتنا واسطہ نہیں ہوتا لیکن وہ زخم کھانے والے کو وقتی طور پر درد سے نجات دلا کر ایک پرسکون غنودگی میں دھکیل دیتا ہے۔

ایسا ہی ایک درد کشا منہل کو چاہیے تھا۔ اپنے شریک سفر کی بے رخی، بے اعتنائی کاٹنے کے لیے۔ ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا عذاب بھو گئے کے لیے اور اس کے پاس اس کی تنہائی کے رفیق فی الحال یہ سناٹے اور خاموشی ہی تھی۔

وہ اکیلے ان بدنما، عفریت نما دوستوں سے نبرد آزما رہتی اور زین چپ، چاپ اپنے کام میں گم۔

مسکراہٹ اس کے لبوں پر دمک رہی تھی اور نگاہوں کی چمک خیرہ کن تھی۔

امی نے چٹا چٹ چوم کر اس کی نظر اتار ڈالی وہ ہونق بنی اس کا منہ تک رہی تھی جب انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی۔

”دیکھ کیا رہی ہو خیر سے خالہ منے والی ہو۔ خدا خیریت سے وہ دن دکھائے میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں اس سچی خوشی کو دیکھنے کے لیے۔“

انہوں نے کپکپاتے لبوں سے اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعا میں دیں اور خود چائے بنانے اٹھ گئیں۔

دوسرے دن شام تک اس خوشی کو بانٹنے کچھ مہربان چلے آئے۔ تائی امی اور منہل کی آمد نے اسے اس حد تک حیران کیا کہ وہ سلام کرنا ہی بھول گئی۔ دل تو چاہا کہ وہیں سے پلٹ کر کمرے میں چلی جائے اور دروازہ بند کر کے اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک وہ واپس نہ چلی جائیں مگر دل پر کس کا زور..... لوگ کس طرح دوسروں کو اپنی نظروں سے گرا کر رشتے استوار کرنے چلے آتے ہیں۔

”اور ان کو یہ خبر دی کس نے؟“ یہ معما بھی ان ہی کی زبانی حل ہوا۔ دوپہر کو آمنہ کے فون کرنے پر امی نے خوشی خوشی انہیں اپنی خوشی میں شریک کیا اور شام تک نمک پاشی کے اسباب سمیت احباب موجود تھے۔

”ارے دوسری سب باتیں بھلا کر خوشی منانے چلے آئے ہم تو۔“ انہیں اپنے گزشتہ رویے پر کوئی ندامت نہ تھی۔

”بس اللہ نظر بد سے بچائے۔“ امی حسب عادت مسکرائے گئیں۔ سالوں گزرے انہوں نے جیٹھانی سے کبھی تکرار نہیں کی تھی۔ جب باقاعدہ ارادے کے ساتھ وہ رویشہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے آئی تھیں تب بھی نہیں تو پھر اب اس مبارک موقع پر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”ہر مہینے دھیان سے الٹرا ساؤنڈ کروانا۔ ورنہ اپنی بہن کا قصہ تو یاد ہے ناں تمہیں۔“ تائی امی نے

وہ آزمائش کی کن گتھتوں سے الجھ رہی تھی اسے خود بھی نہیں پتا تھا۔

وہ کسے آزمارہی تھی۔ خود کو، اپنے ضبط کو یا زین کی محبت کو جو کسی اور کے در پر تشنہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

آگہی کا ناگ جولا شعور سے شعور کے درمیان کھینچے باریک حاشیے پر کندلی مارے بیٹھا تھا۔ اسے تب ڈستا جب وہ ادراک کے دروازے کھولتی اور یہ کواڑ تو ایک نہ ایک دن وا ہونے ہی تھے پھر وہ دن جلد ہی آن پہنچا۔

تائی امی یمنی کی خوشخبری کی مبارکباد دے کر آنے کے بعد سے ہی اسے ٹول رہی تھیں۔ اٹھتے بیٹھے، کھاتے پیتے چلتے ہوئے وہ ان کی نظریں خود پر محسوس کرتی جزبز ہوتی رہتی۔

”کتنے ہفتے ہو گئے شادی کو اب تک کوئی خوشی کی خبر نہیں سنائی تم نے۔“ انہوں نے بہت نرمی اور سجاؤ سے بات شروع کی تھی۔ وہ اسی وقت فون پر بیرون ملک مقیم اپنی بیٹی سے بات کر کے اس موضوع پر مشاورت کر کے بیٹھی تھیں۔

”جی!“ منہل بات کو یہیں تک رکھنا چاہتی تھی۔

”جی..... کیا جی“ انہوں نے حیرت سے گھورا۔

”کل چلنا میرے ساتھ۔“ بالکل اچانک فیصلہ ہوا۔

”کیوں؟“ وہ ہکا بکا سی ہو گئی۔

”ارے چیک آپ کراؤں گی تمہارا اور کیوں۔“

”لیکن کیوں..... کس لیے؟“

”لو جیسے تمہیں کچھ پتا نہیں۔ اتنے مہینے ہو گئے شادی کو اور بچے کی آمد کے کوئی آثار ہی نہیں۔ آج کل ویسے ہی زمانہ خراب ہے۔ نت نئی بیماریاں سن لو آئے دن بیٹھے بٹھائے۔“ تائی امی ناگواری سے بولتی چلی جا رہی تھیں۔

”لیکن میں کوئی بیمار نہیں ہوں۔“ وہ غصے کے مارے اتنا ہی بول سکی۔

”تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اچھی بھلی عورتیں شادی کے بعد بانجھ نکلتی ہیں۔ یہ تو ڈاکٹر ہی

بتائے گی۔“

”کیا بتائے گی ڈاکٹر؟ میرے بانجھ پن کی تصدیق کرے گی وہ..... تو سن لیں کان کھول کر۔ میں بانجھ نہیں ہوں کی اور محرومی آپ کے بیٹے میں ہے۔ سنا آپ نے۔“

”ہیں..... کیا بکو اس کر رہی ہو لڑکی.....؟“ وہ اچھل ہی تو پڑیں۔

”جی، ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ پوچھیے اس سے جا کر۔ اگر میری بات غلط ہے تو اتنے مہینوں سے.....“

بات کچھ مکمل کرتے، کچھ نہ کرتے اس کی آواز، انا، نسوانیت سب ریت کا ڈھیر بن گیا۔ اور آنسوؤں کے سیلاب میں یہ ریت بہہ ہی جاتی لیکن وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔

تائی امی گنگ تھیں۔ حیرت سے یا شاید صدمے سے۔

☆☆☆

بلال کے بالکل اچانک ہی باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ وہ دل میں اٹھتے اداسی کے احساسات کو کچلنے کا سوچ کر ہی دنگ رہ گئی۔

”محبت رنگ بدلتی ہے۔“

اس نے سنا تھا کبھی۔ اب شاید اس تجربے سے گزرنے کا وقت آیا ہی چاہتا تھا۔ جیسی اس نے جانے سے پہلے ایک بار رُبا سے اپنے آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

”دوپہر کے کھانے میں ذرا اہتمام کر لیتا۔ باہر چلا گیا تو جانے کب واپسی ہوگی۔“ امی نے کہا۔

کباب، بریانی، کوفتے، ٹرائفل اور چائینز سوپ۔ اس اہتمام میں سب ہی کچھ شامل تھا۔ چاہے ایک فرد کے لیے ہی سہی لیکن اسے مستقل ایسا لگتا رہا جیسے سب کچھ اوپری سا ہے۔

”اور اگر اسی جگہ آج زین کو آنا ہوتا یا زین مجھے چھوڑ کر جا رہے ہوتے تو.....؟“ ایک خیال بڑا بے موقع چبھ گیا۔ گرم گرم سوپ چمچے سے اس کے ہاتھ پر ٹپک گیا۔

خیال میں امی یا بابا اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ اکیلے یہاں آئے۔ لیکن دراصل وہ اکیلے ہی آنا چاہتا تھا تاکہ من چاہی ہستی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار سکے۔ کھانا مزید از تھا۔ اور پھر یادگار بھی ہو گیا۔

رویشہ بالکل سامنے ہی تو بیٹھی تھی۔ رکی رکی سی، نیچی نظریں، دھیمی دھیمی آواز لہجہ اور انداز۔ ایک مسحور کن احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا سادہ چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اسے تکتے ہوئے، وہ اپنے برابر میں بیٹھی اس کی تواضع کا دھیان کرتی امینہ بیگم کو بھی بھول گیا۔ جیسی ایک سوچ.....

”اگر زین بھائی دیوانے تھے بھی تو، یونہی تو نہیں ہوں گے۔“ ایک اکیلی دل میں ابھرنے والے اس خیال نے لحظہ بھر کے لیے اسے دنگ کیا پھر مضطرب.....

ابھی وہ خود کو پیش کی جانے والی تاویل کی پھسلتی ڈور کو سنبھال ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اس نے یونہی بے دھیانی میں مڑ کر دیکھا۔ اور پھر جیسے ایک دم ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ کون تھی؟ روکھے بے ترتیب بال۔ بڑے بڑے باہر کو اہلتے دبے دبے ہونٹوں کے کناروں سے نکلتی رال اور عجیب بھاری اور ڈراؤنی آواز۔ اسے لگا، اس کا دل سینے سے باہر نکلتے نکلتے بچا ہے۔

”ارے صبغہ۔ تم کہاں آگئیں یہاں۔“ ربانے ایک دم بڑھ کر اسے سنبھال لیا پھر برابر میں بٹھالیا۔ بلال نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور نظر چرا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ”گھبراؤ نہیں یہ کچھ نہیں کہے گی تمہیں۔“ امینہ بیگم نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی تھی۔ وہ جھینپ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رویشہ اب خود کھانے کے بجائے اسے کھلا رہی تھی۔ وہ ایک چمچہ سوپ لے کر اس کے منہ میں ڈالتی پھر، باجھوں سے بہہ نکلتے والا لعاب کپڑے سے صاف کرتی۔

بلال کے لیے کھانا مشکل ہو گیا۔ اسے بے اختیار

اس نے ”سی“ کی آواز کے ساتھ ہاتھ مل کے نیچے کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں ایک ننھا سا آبلہ بن چکا تھا۔

وہ کئی لمحے اس آبلے کو دیکھتی اسے زین کی یاد سے جڑے تھنے سے تعبیر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ نیل بج اٹھی۔

امی نے دروازہ کھولا تھا۔ اسے لاؤنج سے بلال کے دھیرے دھیرے بولنے کی آواز آرہی تھی اور اپنے کمرے سے صبغہ کے چلانے کی بھی۔ اسے رات سے شدید بخار تھا۔

”مجھے بھی جا کر سلام کرنا چاہیے۔“

ہر مرحلہ ایک پُر سوچ آزمائش بن چکا تھا۔ (اور بھلا پوری زندگی آزمائش میں گزاری جاسکتی ہے؟ جانی بوجھی آزمائش)

”ایک شخص کے بدلنے سے کیا کچھ بدل چکا تھا۔ کہاں کہاں، کس کس جگہ۔“ اس نے گہری سانس لے کر قسمت کے آگے ہتھیرا ڈال دیے۔

بلال کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ایک واضح چمک آئی۔ یا شاید اس کی آنکھیں چمکدار ہی ہوں گی۔ اس وقت چمک بڑھ گئی تھی اور اس چمک کا عکس چہرے پر جھلما کر اسے روشن کر رہا تھا۔

”کیسی ہو رہا؟“ الفاظ کے سوا سب ہی کچھ مختلف تھا..... آواز، لہجہ اور انہیں ادا کرنے والا۔

وہ ”ٹھیک اور خیریت“ کی رسم کے درمیان معلق ہوئی چاہتی تھی کہ کمرے سے یکدم صبغہ کے چیخنے کی آواز آئی۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ پل میں لپک کر اندر چلی گئی۔ اور وہ پل کے لیے بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی۔ اسے جلدی واپس جانا تھا۔ اس لیے جلد ہی کھانا چن دیا گیا۔

وہ پہلی بار اپنی ہونے والی سسرال یوں تنہا آیا تھا۔ وہ بھی گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اس کے

گھن آنے لگی۔ اس نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور پھر مزید اصرار کے باوجود اور نہیں کھاسکا۔

رویشہ جانتی تھی یہی ہوگا۔ اس نے بلال کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے صبحہ کو وہاں بٹھایا تھا۔ اور اس کا ردِ عمل اس کی توقع سے مختلف نہ تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار دکھ نے سراٹھایا اور کسی احساسِ زیاں نے بھی۔ زین نے آج تک کبھی صبحہ سے گھن کھائی تھی نہ خوف۔ وہ ہمیشہ بہت آرام سے اسے چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ اور بلال ابھی تک اس پر ایک اچھتی نظر ڈال کر جھرجھری لے رہا تھا۔

”اوہ خدایا!“

بلال کے دل سے بار بار صدا نکلتی۔

”یہ رویشہ سے اس قدر مشابہہ کیوں ہے؟“

اس کی نظر اڑا کر ان دونوں پر پڑتی رہی، جب تک کہ رویشہ وہاں سے اٹھ کر چلی نہ گئی۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر صبحہ کو وہیں چھوڑ دیا۔

”جب زندگی بھر کا تاتا جڑنے جا رہا ہے۔ تو بہتر ہوگا کہ وہ مجھے اور مجھ سے جڑے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح پرکھ لے۔“ اس کی سوچ تھی۔

اسے چائے پکڑا کر واپس آتے ہوئے اس نے بلال کے چہرے پر کراہیت دیکھی۔ اس کا دل نئے سرے سے دکھا۔

ابھی وہ اسی خیال میں گم چائے کی کیتلی سنک میں رکھے اسے گھور رہی تھی۔ جب اس نے صبحہ کی آواز سنی۔ وہ زور زور سے اسے بلارہی تھی۔ اماں جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ پھرتی سے پلٹ کر کچن سے نکلتے نکلتے اسے بلال بھی آواز دے چکا تھا۔

صبحہ اس کا ہاتھ مٹھی میں دبوچے بری طرح کھینچ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ اور ساسر تھی۔ جسے وہ بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کوشش ناکام رہی اور گرم چائے اس کی سفید بے داغ شرٹ پر الٹ گئی۔ چائے بے حد گرم تھی۔ یقیناً اسے تکلیف ہوئی ہوگی۔ رویشہ نے بے اختیار زبان

دانتوں میں دبالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبحہ کو روکتی یا کچھ کرتی۔ بلال نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کے صبحہ کے منہ پر پھٹردے مارا۔

”ہا.....“ رویشہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

صبحہ کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہلچل مچاتے منظر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ بری طرح الٹ کر پیچھے گری۔

”صبحہ..... صوبی میری جان۔“

رویشہ کا دل جیسے کسی نے بھاری بوٹ تلے مسل دیا۔ وہ لپک کر بہن کو اٹھانے لگی۔ صبحہ کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ عجیب و غریب انداز میں بھونڈی سی آواز میں دھیرے دھیرے رونے لگی۔ رویشہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ بلال کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ بلال چند لمحے کو کوفت زدہ انداز میں اسے اپنی جڑواں اپنا رمل بہن کو پیار کرتے دیکھتا رہا پھر اپنی سفید شرٹ پر پڑے بدنما داغ دیکھتا ہوا سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل کر منڈیروں پر سمٹ گئی تھی۔ زرد، اداس اکیلی دوپہر۔ اسے اپنے وجود میں اور اس دم توڑتی دوپہر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ عزت نفس کی موت اگر انسان کی اپنی موت ہوتی تو وہ کب کی مرچکی ہوتی۔

”بانجھ..... بیٹے سے پوچھیں۔“

ادھوری پر چھائیاں.....

”مجھے کوئی بیماری نہیں۔“ بولتا لہجہ اور بدلتا منظر۔ خون آشام جڑیلی، سوکھی بلیں، تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ میں ڈولتی.....

”بانجھ ہے یہ..... یہ ہے بانجھ۔ اتنے.....

کتنے..... کتنے مہینے ہو گئے؟“

غصے میں چپختی چلاتی انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتی.....

وہ اس منظر میں موجود ہی نہیں تھی۔ جہاں وہ تھی،

وہ تو کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

گھنا، تاریک، تنہا، جنگل..... کالی گھور سیاہ رات..... اور سر سے زمین تک لگتی سیاہ بلیں جن میں کوئی پتا نہ تھا، کوئی پھول نہ تھا، فقط سرگلیں سیاہ..... جن کے نوکیلے ابھری نیلی رگوں والے ہاتھ لمبے ہو کر فضا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے بازوؤں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ اس کے وجود سے لپٹ کر اسے بے بس کر رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں پارہی تھی۔ تبھی کہ تبھی.....

”دھب“ کوئی چیز اس کے برابر میں آ کر گری۔ اس کی چٹھی ہوئی پلکیں جھپک گئیں۔ اس نے چونک کر برابر میں دیکھا۔

”یہ کچھ کتابیں ہیں۔ تمہیں رات میں نیند نہیں آرہی تھی ناں آج بھی شکایت ہو تو..... پڑھ لینا وقت اچھا گزرے گا۔“

اس کی اجنبی نظریں مانوس خدو خال پر ٹھہری تھیں اور وہ اندر جا چکا تھا۔ اسے لگا اسے یہیں بیٹھے بیٹھے رات بتا دینی چاہیے۔

جانے کتنا وقت گزرا تھا۔ وہ ڈراؤنا خواب دیکھتے، دیکھتے۔

عصر سے عشاء کا وقت ہونے کو آیا۔ جب کھلی آنکھوں میں چلتا خواب ٹوٹا بھی تو اسی دشمن جاں کی آواز پر جو اس کا سکون غارت کر کے اب بیڈروم میں بند ہو چکا تھا۔

تائی امی کا موڈ جانے کس بات پر خراب تھا۔ دوپہر میں زین کی چھوٹی بہن اپنے بچے کا چکر لگا کر گئی تھی۔ وہ تبھی سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔

تو یہ طے ہے کہ آج کے دن کا آخری کھانا بھی مجھے تنہا زہر مار کرنا ہے۔ دوپہر میں بھی ساس امی نے اپنی بیٹی کے ساتھ دوپہر کا کھانا اپنے کمرے میں ہی کھالیا تھا۔

اس کا جی ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا۔ جی چاہا ایک ہاتھ مار کر بھی سجاکی ٹیبل الٹ دے۔ وہ اپنے

حرس الفت کے اسیر

خیال کو عملی جامہ تو نہ پہنا سکی۔ لیکن کمرے میں زین وقت سے کہیں پہلے خدا جانے سو رہا تھا یا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اس نے جا کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

”کیا بات ہے؟ کیا مصیبت ہے؟“

”میرے اندر آگ لگی ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

”بھانہڑ جل رہے ہیں۔ عزت داؤ پر لگی ہے اور تم یہاں پڑے سو رہے ہو۔“ آخر میں اس کی آواز چیخ میں بدل گئی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“

”اور سمجھ آئے گا بھی نہیں۔ اس منحوس کی پٹی آنکھوں سے اترے گی تب ناں۔“

”کون؟“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ”رویشہ!“

”ہاں اسی ڈائن کی بات کر رہی ہوں میں۔“ اس وقت وہ خود کسی بلا کی طرح اسے نیند سے جگا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گئی تھی۔ زین لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکدم اس کا بازو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔

”ڈائن وہ نہیں ڈائن تم ہو تم۔ ایسی ڈائن جس نے میرے خوابوں کو کھالیا، میری خواہشوں کو نگل لیا، میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو ختم کر دیا تم نے اور اگر تھوڑے دن تم اور یہاں رہو گی تو ایک دن، مجھے بھی ختم کر دو گی۔“

چبا چبا کر بولتا وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر اٹھا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں پیچھے کو لڑکھرائی اور وہ تیزی سے اٹھ کر چپلیں گھسیٹتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کتنی صدیاں جیتی تھیں۔ کتنے زمانے گزرے تھے۔ جانے کتنا وقت باقی تھا صبح صادق کے آثار نمودار ہونے میں۔ زیست پر چھائی کالی رات ٹلتی نظر نہ آتی تھی۔ صبح کا ستارہ ناامیدی کی گود میں جا سویا تھا۔ جلتی آنکھیں، بھیکے لب، کسی نقصان کا نوحہ پڑھ رہے تھے۔

گہری بدلیوں نے چاند کے چہرے پر نقاب ڈال دیا تھا۔ اس کے دل کی طرح بھرے بھرے بادل کسی بھی لمحے برس پڑنے کو بے تاب تھے۔ تن تنہا..... خالی کمر، ویران وجود، بے شکن بستر۔ سب اس کی بربادی میں برابر کا غم بانٹنے کو تیار تھے۔

جیسی کمرے میں رقص کرتی وحشت کے گھنگر و تھے اور سناٹے نے ہانپتے ہوئے سانس بھری۔

ایک مانوس سی موسیقی کمرے میں جاگ رہی تھی۔ ایک بار، دوبارہ... اس نے جھنجلا کر سیل اٹھایا۔ زین کے موبائل پر روبیشہ کا نمبر دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس موبائل کو سامنے دیوار پر پوری قوت سے دے مارے مگر..... جانے کس خیال نے دستک دی تھی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

”زین..... زین آپ پلیز گھر آ جائیں۔ صوبی کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ اسے شام سے فٹس پڑ پڑ کے حالت خراب ہو گئی ہے۔ شدید بخار چڑھ گیا ہے پلیز آ جائیں۔“

وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ ایسا جو اس کے اندر جلتے الاؤ پر سرد چھینٹے ڈال دے۔ جو اس کے اندر بھری نفرت اور غصے کو ایک جملے میں اس پر انڈیل دے۔ جیسے اس کی اپنی نیندیں جل اٹھی تھیں۔ ویسے ہی اس کی نیندیں بھی جہنم رسید کر دے لیکن وہ تو پہلے ہی رو رہی تھی۔ منہل کو قرار سامنے لگا۔ وہ مضطرب تھی۔ زین کو پکار رہی تھی۔ بلارہی تھی مگر..... زین تو.....

”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

اس کے خیال میں اسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات مکمل کرتے ہی لائن کٹ گئی۔ کال پھر آنے لگی۔

”کہاں ہیں زین! پلیز ان سے کہیں گھر آ جائیں۔“

”کیسے کہہ دوں جب وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔“
”دیکھیں میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ باہر بہت شدید بارش ہے۔ ورنہ میں اکیلی اسے اسپتال

لے جاتی۔ ابو اور ان کی فیملی بھی یہاں نہیں۔ پلیز میری زین سے بات کروادیں۔ ایک بار خدا کے لیے.....“
اس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔
”تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی۔ نہیں ہے وہ یہاں اور اب فون مت کرنا۔“ اس نے سختی سے بات کر کے فون سرہانے کی طرف اچھال دیا اور واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

جلتی آنکھوں کو ذرا سا سکون دے کر جب باہر نکلی تو سیل متواتر بج رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں موبائل آف کر کے سائڈ ٹیبل کی سب سے چلی دراز میں پھینک دیا۔

☆☆☆

اگلے دن کی صبح کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ پاس پڑوس کی عورتوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ گھر کا سامان باہر نکالا جا رہا تھا۔ دن چڑھا اور سورج کی ادھ مری تپش آنگن تک آئی، تو چاند نیوں اور سپاروں کے انتظامات کیے جانے لگے۔

جن بازوؤں نے آخری وقت میں اسے سمیٹا تھا۔ وہی بازو گھٹنوں پر لیٹے۔ ان میں منہ چھپائے وہ کب سے خاموش سب سے پرلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

آہیں، آوازیں، سوگواریت، دنیا، لوگ..... ہر چیز سے چھپنا چاہتی تھی وہ۔ کہیں کسی اندھیرے کونے میں دور بہت دور۔ جہاں کوئی آواز اس تک نہ پہنچے۔ کوئی زندگی کا احساس دلاتی چیز نہ سنائی دے، نہ دکھائی دے، نہ محسوس ہو..... کوئی جنبش نہیں..... کوئی سانس، کوئی دھڑکن تک نہیں۔

میت کو غسل دیا جا چکا تھا۔ رشتے دار جمع ہو گئے تھے۔ خواتین، اماں کے سسکتے وجود کو دلاسا دینے کے لیے لپٹا تیں۔ یمنی کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔ جب کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔

”بہن کو دیکھ لو بیٹی، آخری بار“
آواز اداسی میں ملفوف ادھوری رہ گئی۔

بے تحاشا روتے ہوئے وہ اس کا گریبان تھام کر، جیسے دنیا جہان بھلا کر کسی اپنے سے اپنا غم کہہ رہی تھی۔ دو قدم پر کھڑے صداقت علی کی ہمت نہ تھی کہ اسے روک لیتے۔

کمرے کے اندر باہر..... گھر کے پورے منظر پر جمود طاری تھا۔ ان کے ساتھ کھڑے دو خاندانوں نے جدا جدا تاثرات سے یہ منظر دیکھا۔ ان میں بلال بھی شامل تھا اور ہانیہ بھی۔ تائی امی بھی تھیں اور منہل بھی۔ لیکن آج اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ پھٹے بانس کی طرح بیٹھی آواز اور خراش زدہ حلق کے ساتھ زور زور سے روتی وہ صرف زین کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے شکوہ کر رہی تھی۔ جو اسے سنبھالتے، سمیٹتے بے بس ہوا جا رہا تھا۔ بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ان ہی مہربان بازوؤں میں ہوش و حواس سے بے بہرہ ہو گئی۔ جن کا سہارا لینا اس کے نصیب میں نہ تھا اور وہ اپنے نصیب سے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

زیت کیا کیا وقت سامنے لاتی ہے۔ کڑا سماں، مشکل لمحات، کشن مرحلے..... انسان جانتے بوجھتے کسی منظر سے چرا کر آنکھیں بند کرتا ہے۔ پھر بند آنکھوں کے پیچھے اسی منظر سے گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر بند کرتا ہے، جھٹلاتا ہے، جھنجھلاتا ہے، شعور کی تیز نوکیلی آواز کو آن سنا کرتا ہے۔ بہرہ بن جاتا ہے۔ لیکن سچائی کسی عینک کی طرح اور اک کے دونوں اطراف کمائیاں اڑا کر بیٹھ جاتی ہے۔ دائیں بائیں اوپر نیچے اسے کتنا ہی ہٹانے کی کوشش کرو وہ شعور کی آنکھ سے چپکی ہی رہتی ہے۔ تاوقتیکہ انسان اپنی تمام اتا، ضد اور بعض اوقات عزت کو بھی بالائے طاق رکھ کر اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی منظر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

ایک جلتا ہوا منظر، ایک سلگتی ہوئی حقیقت، جس نے پچھلے چند ایک سال سے سجائے ہوئے اپنے تئیں تمام سپنے اور ارمان، ایک طنزیہ ہنسی اور پاؤں کی

”آخری بار“ اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ پھرائی آنکھوں سے سامنے سفید لباس میں لپٹی بے جان مورت کو دیکھا۔ پھر اس کے پاس، سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

بال نظر نہیں آتے تھے۔ عیب دار آنکھیں..... پوٹوں تلے چھپ گئی تھیں۔ لب خاموش، خشک شاید آج سے پہلے وہ کبھی اتنی صاف ستھری اور پاکیزہ نہیں لگی تھی۔ صاف ستھری پاکیزہ لیکن بے جان۔ ہو بہو اس کی شکل۔ اُسی کا قدبت..... اس کی جڑواں بہن..... وجود کا حصہ۔

ایک آنسو اپنی بے قدری کا احساس لپیٹ کر پلکوں کی دہلیز سے نکلا اور رزقِ خاک ہو گیا۔ کتنے گھنٹوں سے باندھا گیا بند ٹوٹ گیا اور نمکین سیلاب بہہ نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اس سے لپٹ رہی تھی۔ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔

جنہی برسوں کے بعد، جانے کتنے زمانوں کے بعد صداقت علی اور ان کے بالکل پیچھے زین العابدین نے گھر میں قدم رکھا۔

اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں اٹھائیں۔ کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے صحن کے وسط میں وہ اور اس کے پیچھے منہل..... وہ اٹھی اور باہر نکلی آگے بڑھتے صداقت علی کو نظر انداز کرتی سیدھی زین کے سامنے پہنچ گئی۔

زین نے اسے اپنے سامنے حال سے بے حال کھڑے دیکھا۔ اور اس کے سینے میں کسی نے بھالا اتار دیا۔

”اب آئے ہیں آپ یہاں اتنی دیر لگا کر؟ کہاں تھے کل رات سے؟ کتنا بلایا میں نے۔ میری بہن چلی گئی مجھے چھوڑ کر زین..... سب کو بوجھ لگتی تھی وہ۔ سب اس کے زندہ رہنے سے تکلیف میں تھے۔ مگر آپ تو ایسے نہیں تھے۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیوں نہیں آئے آپ؟ کتنا بلایا میں نے، کہاں تھے آپ؟ کیوں نہیں آئے؟“

حقارت بھری ٹھوکر سے ہوا میں اڑا دیے تھے۔

اپنے دل کی سنتے سنتے وہ جس حقیقت سے نظریں چرا کر اسے جھٹلانے چلا تھا۔ اب وہ حقیقت اپنے چہرے پر کڑوی آگہی مل کے، پوری آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ نہ کوئی جائے پناہ تھی نہ راہ فرار۔ بس چند آوازیں تھیں۔ پچھل پیریوں کی طرح تعاقب کرتی۔ راستے میں کھڑی کالی بلی کی طرح۔

”میں نے آپ کو بلایا تھا۔ آپ کیوں نہیں آئے۔“

”سب کو اس سے تکلیف تھی سوائے آپ کے۔“
یہ سن کر تو بلال کو وہیں صحن میں ہی سرما کی دھوپ میں پت جھڑکی زردی کھلتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے رویشہ نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا ہو۔

☆☆☆

ایمنہ بیگم کے لیے یہ دن پوری زندگی سے زیادہ بھاری تھے۔ جب صداقت علی ان کے گھر میں روز ہی تشریف لا رہے تھے۔ دنیا کی عورتوں کے لیے ان کے مرد سے بڑھ کر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ وہ کیسے خاوند تھے کہ ان کی آمد اور موجودگی نے ایمنہ بیگم کے دکھ کو دگنا کر دیا تھا۔ ان کے دل کا بوجھ اور بڑھا دیا تھا۔ پہلے دن سے لگی آنسوؤں کی جھڑی اب تک نہ ٹھہری تھی۔ اور سر کا درد گھر کے افراد کی طرح کمین تھا۔

بالآخر بہت سوچ سمجھ کر اور دقت کے ساتھ وہ اپنے باپ کے روبرو تھی۔

”آپ اپنے گھر چلے جائیں واپس۔“ نظریں زمین میں گاڑے اس نے پتھر سے لڑھکائے۔
صداقت علی ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظروں میں حیرت اور بے یقینی ثبت تھی۔

”بیٹی میں بہت شرمندہ.....“

”برائے مہربانی“ اس نے نرمی سے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹی۔

”ہم ان بھاری الفاظ کے قابل نہیں۔ بس آپ آئندہ تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔ ہمارا خرچہ اٹھا کر پہلے ہی آپ نے ہمیں اپنے احسانات کے بوجھ تلے دبا رکھا ہے۔ اب اگر مزید آپ یہاں رک بھی گئے تو اس احسان کے بوجھ سے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ آنکھوں میں جلن اور نمی بڑھ گئی۔

”ایسا مت کہو بیٹا۔ میری بات تو سنو۔“

”آپ میری بات سن لیں میں اپنی بہن کو کھو چکی ہوں، ماں کو کھونے کی ہمت نہیں۔ اور ویسے بھی ہم آپ کے بغیر جینا سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں آپ کی عادت نہیں رہی۔“

بیرونی دروازے سے داخل ہوتے زین نے رویشہ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔ چچا تھکے، تھکے برآمدے سے باہر نکل کر صحن میں آئے تھے۔

وہ لمحہ بھر کے لیے زین کے قریب ٹھہرے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گئے۔ ان کی آنکھوں میں امدتی کمی زین کی نظروں سے مخفی نہیں رہی تھی۔

زین نے ایک بڑی محرومی کا دکھ از سر نو اپنے بائیں پہلو میں کروٹیں لیتا محسوس کیا۔ اس نمی میں کیا کچھ تھا۔ شاید افسوس، شاید پچھتاوا یا شاید صرف جذباتیت۔ وہ خود بھی چپ چاپ ہاتھوں میں کپڑے، دواؤں اور پھلوں کے شاپرز برآمدے میں ٹیبل پر رکھ کر واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

منہل چلی گئی۔

تائی امی کو آئینہ دکھا کر۔ زین کے سامنے اعتراف جرم کر کے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

”اس رات آپ کے جانے کے بعد.....“ وہ جانتی تھی۔ زین واقف ہو چکا تھا۔
اس طوفانی رات کی صبح جب اس نے اپنا موبائل

اور رہی میں تو مجھ میں کوئی کمی نہیں، کوئی خامی نہیں۔ کوئی عیب نہیں..... پھر میں کیوں زبردستی ایک ایسے شخص کے سر پر سوار ہوں جو دانستہ یا نادانستہ میری ذات کی نفی کر کے خود تو ندامت سہے گا ہی، مجھے بھی نفسیاتی مریض بنادے گا۔“

تائی امی کا سر جھک گیا۔ ندامت کے احساس تلے چور چور ہو گئیں۔ جو باتیں منہل آج ان سے کہہ رہی تھی۔ یہ تو وہ ہمیشہ سے سمجھتی تھیں، جانتی تھیں۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ نے اپنے بیٹے کی خود سے محبت آزمائی۔ وہ آپ کی خواہش کیا احترام میں اپنی زندگی سے ہی دستبردار ہو گئے۔ اب آپ انہیں زندہ کر دیں امی! اپنے بیٹے کو اس کی زندگی، ایک جیتی جاگتی زندگی لوٹا دیں۔ ہاں میں ان کی بیوی ہوں مگر میں ایک عورت بھی تو ہوں اور عورت کا ظرف ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ سمندر جتنی وسعت اور ظرف عطا کیا ہے قدرت نے عورت کو۔ آپ کے پاس بھی اتنا ہی وسیع ظرف ہے۔ اتنا ہی بڑا دل ہے۔ بس اس کی کھوج لگا لیجیے گا۔ بہت سی الجھنیں سلجھ جائیں گی۔“

☆☆☆

وقت کے پیمانے سے قطرہ قطرہ ٹپکتے دنوں نے اس گھرے گھاؤ پر ٹھنڈے پانی سے بھیگا پھایا رکھا تو تھا۔ پر بھی کبھی کوئی یاد دل میں چٹکی بھرتی تو کچے زخم سے کمرٹا اتر جاتا اور وہ کہیں کوئے کھدرے میں منہ دے کر دل ہلکا کر لیتی۔ کیونکہ وہ امی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ زین کی آمد و رفت ختم نہیں مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔ رویشہ البتہ اس سے بات کرنے میں احتیاط ہی برتی تھی۔ ان ہی دنوں اس کا گھر ٹوٹنے کی خبر پورے خاندان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ امی نے زین سے تفصیلات تو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ افسوس ضرور کیا۔ مگر وہ کوئی بھی ردِ عمل ظاہر کیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔ رُبا وہاں نہیں تھی مگر اندر کمرے میں امی کی بات ضرور سن رہی تھی۔ اس کا گھر

فون تلاش کیا تو وہ اسے سائنڈ ٹیبل کی دراز میں آف پڑا ہوا ملا۔ وہ خود تو فون وہاں نہیں رکھ کر گیا تھا۔ ظاہر ہے کسی نے جان بوجھ کے ہی وہاں ڈالا تھا۔ فون آن کرتے ہی ربا کی ڈھیروں مسڈ کالز اور میسجز نے ساری حقیقت اس کے سامنے عیاں کر دی تھی۔ بعد میں اس ہی نے صداقت اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دی تھی۔ لیکن اس نے منہل سے کوئی بھی سوال نہیں کیا تھا۔ کوئی باز پرس نہ کی تھی۔ منہل کی سزا کے لیے اس کے ضمیر کی چھین ہی کافی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں۔ میں غصے میں بالکل اندھی، بہری بن گئی تھی۔“ وہ سر جھکائے سسک رہی تھی۔ زین نے تب بھی کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کے بندھے ہاتھ کھول کر، اس کے آنسو صاف کر دیے اور تھکے ماندے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔ تب وہ اٹھی اور اپنا سامان سمیٹ کر ساس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”آپ تو ماں ہیں اور ماں اپنی اولاد کی ہر تکلیف، ہر خوشی، ہر خواہش کو سمجھ لیتی ہے پہچان لیتی ہے..... اس وقت سے جب اسے ہنسنا اور رونے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ پھر آپ کیوں نہیں سمجھ سکیں اس کے دل کی خواہش کو؟ اس کی آرزو کی گہرائی کو ناپ کیوں نہیں سکیں امی؟“

تائی امی حیرت زدہ و نادام ہی اسے سن رہی تھیں۔ ”اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ سنہل جائیں۔ سمجھ جائیں۔ وہ کھل رہے ہیں، اندر ہی اندر جل رہے ہیں۔ یہ زبردستی کا ساتھ نہیں نبھائیں گے۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتے۔ وہ رویشہ سے ملتے نہیں۔ اسے دیکھتے تک نہیں۔ اس کی آواز بھی نہیں سنتے مگر اس کے ساتھ ہوتے ہیں ہر وقت۔ فضول کے واہموں میں گھر کر اپنی اولاد کو اس عذاب میں مزید مت تڑپائیں۔ پتا نہیں آپ کو اتنے سالوں میں کیوں نظر نہیں آیا وہ سب، جو میں نے فقط ایک منظر میں دیکھ لیا۔ وہ سب جو آپ کو سالوں پہلے نظر آ جانا چاہیے تھا

ٹوٹنے کی خبر نے اسے کوئی خوشی نہیں دی تھی۔ اسے اپنے دل پر قابو رکھنا آچکا تھا۔ دل میں اب بھی اس کی محبت پورے دھڑلے سے دھرتا دیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے پانے کی خواہش دم نہیں مار سکتی تھی۔ بلال بیرون ملک جا چکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک مختصر سے میسج میں اسے خدا حافظ کہا تھا اور بس۔

یمنی کی ڈیوری کے دن نزدیک آگئے۔ بچے ٹوئز تھے اس نے خاندان میں نہیں بتایا تھا۔ اس کے گھر آنے والی اس نئی خوشی کی تیاری نے امینہ بیگم اور روبیشہ کو صبح کی موت کے غم سے سنبھلنے میں بہت مدد دی۔ یمنی نے بھی جان بوجھ کر انہیں اپنی تیاریوں میں مصروف کر دیا تھا۔ اور یہ خوشی بہر حال کوئی چھوٹی بھی نہ تھی۔ وہ بہر حال کئی سالوں بعد بہت دعاؤں اور منتوں مرادوں سے ماں بننے جا رہی تھی۔

بلال کے فون اور میسجز میں صبح والے واقعے اور پھر دوسرے ہی دن اس کی دائمی جدائی کے بعد بہت تیزی سے کمی آئی تھی۔ روبیشہ نے بھی نوٹس لینا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ بہر حال اس حادثے میں کسی حد تک اسے بھی قصور وار سمجھتی تھی۔ اس دن صبح کو تیز بخار تھا اور اسے زندگی میں کبھی کسی نے سختی سے چھوا تک نہ تھا۔ کجا کہ کسی مردانہ ہاتھ کا تھپڑ..... اس کی طبیعت جب ہی سے بگڑنا شروع ہوئی تھی اور روبیشہ کے دل میں جنم لیتا بلال نامی نرم گوشہ بھی سے پتھر ہونا شروع ہوا۔

☆☆☆

وہ جنوری کی ایک سرد ٹھنرتی ہوئی رات تھی۔ جب تیسرے پہر اسپتال کے نچ بستہ کاریڈور میں اس کے لبوں پر دعائیں جاری تھیں۔ آپریشن تھیٹر سے نکلتی ڈاکٹر نے فکر آمیز انداز میں انہیں دیکھا اور نزدیک آئی۔

”مبارک ہو ٹوئز ہیں، بیٹیاں“

”میری بہن.....؟“ وہ بے تابانہ بولی۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں خدا کا شکر ہے لیکن بچیوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ دونوں بہت دیک

ہیں۔ خاص طور پر ایک بچی کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔ پیدائش سے پہلے ہی اس کی برہمنگ (تنفس) میں رکاوٹ آگئی تھی اور ہارٹ بیٹ میں بھی۔ آپ دعا کریں بس۔“

وہ بے دم انداز میں بیچ پر گر گئی۔

”اور کتنی آزمائش باقی ہے خدایا!“

امینہ بیگم کے لب بے آواز پھڑپھڑائے۔ انہیں لگا وقت الٹی چال چلنے لگا ہے۔ ان کی زندگی کے سخت ترین لمحات دوبارہ گھرائے جانے والے ہیں۔

چند گھنٹے گزرے تو یمنی کو روم میں شفٹ کر دیا گیا اور ایک کامی، پھول سی بچی اس کی گود میں آگئی۔ گلابی روئی کے گالے جیسی۔

”دوسری ابھی نرسری میں ہے“

نرس بے تاثر انداز میں اطلاع دے کر چلتی بنی۔

زین، تائی امی کو لے کر فجر کے وقت پہنچا۔ یمنی کے شوہر کو گھر بھیجا اور خود ٹھہر گیا۔ یمنی کی ساس کو کہ ضعیف تھیں مگر اس وقت مستقل وہیں موجود رہ کر امی کا حوصلہ بڑھانے کا سبب بنی رہیں۔ روبیشہ نے ان کی تھکن کا خیال کر کے انہیں بھی بیٹے کے ساتھ روانہ کر دیا۔

وہ ننھی منی فرشتہ سی جیتی جاگتی گڑیا کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اسے چوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انمول خوشی تھی اور چہرے پر بچکانہ شوق۔ عرصے بعد زین نے نظر بھر کر اسے دیکھا تھا۔

بھی ایک وارڈ بوائے وہ منحوس خبر لے کر آیا۔ جس نے سب کے دلوں پر غم کی کہر جمادی۔ یمنی بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی۔ زین نے فوراً اس کی سرال اور شوہر کو خبر دی۔ روبیشہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اللہ نے ایک بار پھر صبح کو ان سے واپس لے لیا ہے۔ لیکن وہ کفر کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

”چپ ہو جاؤ یمنی۔ اور شکر ادا کرو ایک بیٹی زندہ سلامت تمہارے پاس موجود ہے۔ خدا کی مرضی میں چھپی مصلحتوں کو بھلا ہم جیسے نادان کیا

جمع شدہ غبار کو نکال کر وہاں سے چلی گئی تھی۔
کئی مہینے پرانا ایک پریشان کن منظر بالکل کسی
گرما گرم خبر کی طرح ابھی آنکھوں میں تازہ تھا۔ اس
کے رنگ بھیکے نہ پڑے تھے۔ کہ ان رنگوں میں شاہ نور
کے آنسو گھلنے لگے۔

”تم اتنے بے حس بھی ہو سکتے ہو بلال۔ میں
نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“

بھلا وہ بے حس کب تھا جو شاہ نور نے ایسا کہا۔
”آپ کیوں نہیں آئے؟ میں نے رات میں کتنا
بلایا۔“ رویشہ کے لفظوں کی گونج، یہ اس کے
احساسات ہی تو تھے۔ جنہوں نے جینا مشکل کر دیا تھا۔
ایک معمولی فقرے میں پوشیدہ جذبے اس پر ایک بل
میں واہ ہو گئے تھے۔ پھر بھلا وہ بے حس کہاں تھا۔

روتے ہوئے لہجے، ٹوٹے ہوئے مان کا مرثیہ
پڑھتے الفاظ چابک کے مانند اس کی سماعتوں پر شاخیں
کر کے پڑتے اور وہ تکلیف سے سن ہو جاتا۔

دنوں پرانی باتیں یاد آتی جاتیں۔
”وہ جس نے زندگی میں کبھی تمہارے سوا کسی
اور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ کیا کرے۔“

ایک عکبوت اس کے گرد کس رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے
ہوئے بھی اس میں پھنسا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”اب بتاؤ۔ کیا اب بھی تمہارا دل مانتا ہے یہ
شادی کرنے کو؟“ آمنہ بیگم فون پر بلال کی برین
واشنگ میں معروف تھیں۔

”ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں بیٹا!“
اس کی مسلسل خاموشی نے انہیں دھیمہ کر دیا۔

”تم خود سوچو، بے شک فوج کے بارے میں
کسی انسان کو نہیں پتا۔ مگر جان بوجھ کر غلط فیصلہ کرنا تو
کوئی عقل کی بات نہیں۔ ارے تم نے دیکھا نہیں تھا۔
اس کی جڑواں بہن کو۔“

آمنہ بیزاری سے اسے بتا رہی تھیں۔
”بالکل اپنا رٹل لڑکی تھی وہ، خود سوچو، بھلا جس

☆☆☆

”دیکھا..... دیکھا آپ نے؟“ آمنہ ریحان
بری طرح خار کھائے بیٹھی تھیں۔

”وہی ہوائیاں جس کا ڈر تھا۔ جڑواں
بیٹیاں ہوئی تھیں یعنی کے یہاں..... ایک ہی بچ
سکی۔“ ریحان سعدی خاموش تھے۔ وہ تو ہم پرستی
کے سخت خلاف تھے مگر بیگم کو جھٹلانے کی پوزیشن
میں بھی نہیں تھے۔

”میں ابھی فون کرتی ہوں بلال کو۔ اب تو میں
کسی طور اس لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی۔ بس ہو گیا فیصلہ۔“
وہ قطعی انداز میں بولتی اٹھ کر فون ملانے
چل دیں۔

☆☆☆

کوسوں، میلوں، سمندروں پار کتابیں کھولے
وہ اپنی سوچوں سے اکیلا ہی نیر دازما تھا۔ لندن
فلانی کرنے سے ایک دن پہلے اس نے شاہ نور کو
اندھیرے میں ٹیرس پر روتے ہوئے دیکھا۔ وہ
جانتا تھا کہ اس کی بہن اس سے محبت کرتی ہے۔
لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ اس کے جانے پر یوں چھپ
چھپ کر آنسو بہائے۔ وہ حیرت زدہ انداز میں
پوچھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

”تمہیں کسی کے آنسو نظر آتے ہیں حیرت
ہے؟“ وہ تڑخ کر بولی۔

وہ گنگ رہ گیا تھا۔ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت
نہیں تھی۔

”اور نظر آئیں بھی تو کیا۔ تم نے تو کر لی ناں
اپنی خوشی پوری۔ اور اس کے پیچھے جو تین لوگ خوار
ہوئے وہ؟ ہاں یقیناً تمہارے لیے تو تمہاری اس
روپیہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ پھر میں ہوں، مانیہ یا
دانیال..... کوئی بنے یا روئے، جیسے یا مرے۔ تمہیں
اس سے مطلب؟“

وہ پھٹ پڑی تھی۔ اور کب سے اپنے دل میں

خاندان میں اس طرح کے کیسز ان کی ماں کے زمانے سے چلے آرہے ہوں تو۔ وہاں سے کون لڑکی لے گا۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔“

بلال کی خاموشی ان کا حوصلہ بھی بڑھا رہی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھیں۔

”اور وہ لڑکی رویشہ..... وہ خود کون سا خوش تھی مگنی کے وقت..... ارے سارا خاندان جانتا ہے وہ اور زین انوالوڈ تھے ایک دوسرے کے ساتھ۔ زین کی بیوی بھی اسی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلی گئی اور.....“

”امی پلیز.....“ بہت دقت سے اس کے منہ سے نکلا۔

امی کو روانی سے بولتے بولتے بریک لگ گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مگر ابھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ان لوگوں سے معذرت کر لوں گی۔ تم بیٹا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ ہانیہ کا سوچو۔ اس بچپاری کا اس معاملے میں کیا قصور ہے۔ وہ تو جب سے تمہاری مگنی ہوئی ہے۔ مستقل بیمار رہنے لگی ہے بیٹا۔“

بلال نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

”تو پھر میں جاؤں ان لوگوں کی طرف؟ ابھی تو اتنے دن بھی نہیں گزرے۔“

”ٹھیک ہے امی! جو آپ کا دل کرے وہ کریں۔“

ایک گھنٹے امی کی بات سننے کے بعد صرف اتنا کہنے میں ہی اس کے اعصاب شل ہو گئے۔ بے انتہا دکھ اور غم کے دم گھوٹتے احساس کے ساتھ اس نے ریسور رکھا اور بستر پر گر گیا۔

”مجھے مستقبل کی کوئی فکر تھی نہ اپنی اولاد کا کوئی خدشہ لیکن..... لیکن.....“

آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور تکیے میں منہ دے دیا۔

کبھی لوٹ آئیں تو نہ پوچھنا ہاں دیکھنا نہیں غور سے جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

☆☆☆

خاندان کے دو گھروں میں ایک ہی شام اپنی

ڈھیر ساری رونقوں سمیت اتری تھی۔ اور صداقت علی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس گھر میں رکھیں اور کس کو نظر انداز کریں۔

رویشہ اور ہانیہ دونوں ہی ان کی بیٹیاں تھیں۔ ان کا اپنا خون۔

بے شک وہ ایک لمبے عرصے تک رویشہ کے وجود سے بے پروا اور غافل رہے۔ مگر صبغہ کی موت نے انہیں دیر سے ہی کبھی مگر ان کے حقوق یاد دلادیے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے جا رہے تھے۔ خدا جانے اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی یا کیا..... مگر پورا دن گھر میں ہونے والی تقریب کے سلسلے میں وہ بے حد مصروف رہے۔ مغرب سے ذرا پہلے بمشکل وقت نکال کر جب ادھر پہنچے تو وہاں بھی تمام انتظامات مکمل ہی تھے۔

زین بھدا احترام ان سے ملا۔ تائی امی اور ان کی بڑی بیٹی جو خاص طور پر شہر سے باہر سے اس رسم کے لیے آئی تھی۔ دونوں کا ہی رویہ البتہ تھوڑا سرد سا تھا۔

صداقت علی کو آج یہی بات خوش کر رہی تھی کہ وہ رویشہ کے نکاح میں سرپرست کی حیثیت سے شامل ہو رہے تھے۔ اور آج یہی بات انہیں افسردہ بھی کر رہی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اپنی پہلی بیوی اور بیٹیوں کے وجود سے کس قدر غافل تھے۔ بار بار ان کی آنکھیں چمکتیں اور وہ بار بار فخر سے ایک اڑتی پڑتی نگاہ زین پر ڈال کر دل میں اطمینان اور سکون کی لہریں اترتی محسوس کر رہے تھے۔

انہیں آج پوری طرح احساس ہو رہا تھا کہ آج اگر یہاں زین کے بجائے بلال بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اس نکاح میں شامل ہی نہ ہو پاتے۔ ہو بھی جاتے تو ان کی خوشی اور اطمینان کا یہ عالم نہ ہوتا۔

وہ کس طرح ایک بیٹی کا گھر بسانے کے لیے دوسری بیٹی کا گھر بننے سے پہلے ہی اجڑتا ہوا دیکھتے۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کے معمولی سے تبادلے کے دوران انہوں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رویشہ کے

اسے معلوم تھا زندگی اور وقت ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اس کے لیے بھی اپنے دامن میں خوشی اور طمانیت چھپائے فقط اسے انتظار کروارہی ہے۔ اور وہ یہ انتظار ختم ہونے کی تحمل سے منتظر تھی۔ اس کے صبر اور خاموشی کا کیا انعام اسے ملنے والا تھا۔ اس بارے میں سوچنا بیوقوفی ہی تھی۔

منہل کی طرف سے ایک دن اچانک ہی خلع کا نوٹس موصول ہوا اور زین نے کسی اضافی جھنجٹ میں پڑے بغیر اس کی مشکل آسان کر دی۔

”میرے دل میں کوئی افسوس نہیں، اس کے لیے۔“ اس نے اپنے لیے بہتر فیصلہ کر لیا۔ وہ یقیناً اس سے کہیں اچھی زندگی گزارے گی جو میں اسے دیتا۔ ادھوری خوشیوں کے ساتھ یا مکمل دکھوں کی لپیٹ میں۔“

زین نے ہفتہ بھر پہلے ہی اسے تمام بات بتائی تھی اور صاف لفظوں میں یہ بھی کہ وہ اب مزید کسی انتظار کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ تقدیر کے اس اچانک ملنے پر اس قدر حیران ہوئی کہ جیسے خوش ہونا ہی بھول گئی۔ بس ایک حیرانی سی حیرانی اسے اپنے حصار میں لیے رکھتی۔

”ہاں بس ایک خیال سا آتا ہے۔ اگر امی نے پہلے اتنی ضد نہ کی ہوتی تو شاید منہل میری زندگی میں آتی ہی نہ..... تب اس کا دل ٹوٹنے سے بچ جاتا اور ہم پہلے ہی مل چکے ہوتے۔“ زین کے گہمیر لہجے میں یکا یک در آنے والا استحقاق، اس نے دل سے محسوس کیا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ٹھنڈک سی اتر آئی۔

ابا کے اندر آنے والی مثبت تبدیلی کی بڑی وجہ بھی شاید یہ رشتہ ہی تھا۔ ورنہ بلال جس طرح ان کی دوسری بیٹی کو ٹھکرا کر اسے اپنانے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھا تھا۔ اس سے بہت سارے لوگوں کے خواب بکھر جانے تھے۔

وہ نکاح والے دن لاشعوری طور پر صبح سے ابا کے آنے کی منتظر رہی۔ وہ بلاشبہ زندگی میں پہلی بار ان کا انتظار کر رہی تھی اور انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا

سر پر رکھا۔ پھر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا کر سسک پڑے۔

قسمت نے اس مقام پر اسے شکست دی تھی۔ جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چلا تھا۔ منگنی کے بجائے نکاح کی تقریب کا مشورہ شاید نہیں یقیناً بزرگوں نے مستقبل کی پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ تاکہ بلال آئندہ کسی اور کو اس نظر سے نہ دیکھ سکے۔ جس پر صرف اور صرف ہانیہ کا حق تھا۔

اس نے جگمگاتے ہوئے لان میں ادھر سے ادھر پھرتے ماں باپ، خالہ خالو، اپنی کزن کم منکوحہ..... بہن اور بہنوئی سب کے چہرے کھوج ڈالے۔ ہر چہرے پر چمک تھی، خوشی تھی۔ پالینے کا غرور تھا۔ سب لوگوں کے درمیان صرف ایک وہی تھا جو سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔

اس کے کانوں میں ہانیہ کے کھلکھلانے کی آواز آئی، شاہ نور ہنستے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

”میں نے اپنی بہن کے دل کی خوشی لوٹانے کے لیے اپنے دل کی خوشی کو لوٹا دیا تو کیا اب میں اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ ان لوگوں کی خاطر تھوڑی سی ایکٹنگ ہی کر لوں۔ کیا پتا کبھی محبت میرے دل پر بھی ہانیہ کے نام کا صحیفہ رقم کر ہی دے؟“ کھلکھلاتی ہوئی شاہ نور اور ہانیہ..... چہکتا ہوا دانیال۔ اس کے امی، ابو، سب کس درجہ خوش، مطمئن اور شاد تھے۔

”شاید میں نے..... ان کی خوشی کی قیمت چکا دی ہے اور یہ لوگ بھی مجھے کم عزیز تو نہیں پھر ملال کیسا۔“ یہ وہ پہاڑ سا مرحلہ تھا۔ جو اسے کسی کے علم میں لائے بغیر اکیلے ہی سر کرنا تھا۔

دل کو راہِ راست پر لانے میں کچھ وقت لگے گا پاگل ہے اس کو سمجھانے میں کچھ وقت لگے گا اس نے تشویش سے خود کو دیکھتی ماں کو دیکھا۔ جو اشارے سے فکر مندی سے ”کیا ہوا ہے؟“ پوچھ رہی تھیں۔ وہ بے وجہ ہی نرمی سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

تھا۔ جیسی نکاح کے بعد وہ جس طرح اسے لینا کر روئے،
رویشہ کا دل پکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے
ایک تواتر سے آنسو گرتے چلے گئے۔ وہ ننھی معصوم بچی
کی طرح ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ سینے سے
چمٹ گئی اور بلک پڑی۔

آج اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اور
وہ اس دن کوئی گلہ شکوہ دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

میرس کی طرف کھلنے والے دروازے سے جاتی
سرما کی ٹھنڈ اور نم ہوا کے جھونکے جالی دار پردوں کے
پیچھے اکھیلیاں کر رہے تھے۔

بیڈ کراؤن سے فیک لگا کے بیٹھا زین اور اس کے
برابر میں بیٹھی وہ خود بزبان خاموشی مجھ گفتگو تھے۔

کتنے لمبے سرک چکے تھے۔ کتنے زمانے بیت گئے
تھے۔ اس پر ایک عالم خود فراموشی طاری تھا۔ یوں جیسے
وہ شام سے اب تک کسی خواب میں جی رہی تھی۔ اسے
لگتا تھا اس کی آواز تو کیا معمولی سی جنبش بھی اس خواب
کو توڑنے کی تصور وار ٹھہر سکتی ہے۔

وہ دم سادھے بس خاموشی سے کمرے کی تزئین و
آرائش کا جائزہ لیتی رہی۔ کمرے کے ابجد جلدی میں سنوارا
گیا تھا مگر پھولوں سے بے تحاشا بھر دیا تھا۔ خوش رنگ
گلابوں کی بہتات اور امڈتی خوشبو اس کے حواسوں پر
چھا رہی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اس مدہوش کن
مہک کو اپنے اندر اتارا۔ جیسی زین نے اس کا ہاتھ
اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”کوئی بات کرو روبا“ اس کی آواز مدہم اور
جذبوں سے معمور تھی۔

اس کی گرم مضبوط گرفت میں روبا کا نازک ہاتھ
ایک عجیب استحقاق کے ساتھ دبا ہوا تھا۔ وہ غیر محسوس
انداز میں سمٹ سی گئی۔

”کیا بولوں“ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا
کہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ایک بات بتاؤں تمہیں۔“ وہ اب سامنے کی
اور دیکھتا دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔
”مجھے اب تمہیں پانے کے بعد احساس ہو رہا
ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو شاید میں بہت زیادہ دن جی
نہ پاتا۔“

رویشہ دل سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار محبت کا
اظہار اور وہ بھی اتنے خطرناک انداز میں۔
”پھر تو شکر ہے ہم مل گئے۔“ بے ساختہ اس کے
منہ سے نکل گیا۔

”ہوں۔“ زین نے ذرا سا ترچھا ہو کر شرارت
سے اس کی شکل دیکھی۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ وہ پُر شوق گرم نگاہوں
سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”میں اور تم..... ایک نیا رشتہ..... اور یہ تنہائی۔“
اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور روبا کی آواز اس
کے حلق میں پھنس گئی۔

”ظ..... ظاہر..... رہا..... ہے اچھا۔“ وہ انک
انک گئی۔

”ہوں۔“ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ میں
دبے روبا کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

”اور اب.....“ روبا نے بے بسی سے تھوک نکلا۔

زین کے انداز نرالے تھے۔ بولتی آنکھیں،
مسکراتے لب اور دلی دلی شرارتیں۔ روبا کی مزاحمت
دم توڑ رہی تھی۔ دل الگ بغاوت پر آمادہ تھا۔ زین اس
کی بے بسی سے محظوظ ہوتا رہا پھر وفور جذبات سے اپنا
دایاں بازو پھیلا کر اسے خود سے لگا لیا۔

”روبا..... تم جان ہو میری۔“

رویشہ جو اس کی قربت کی آنچ سے پکھلی جا رہی
تھی اس خوبصورت اظہار پر اس کے من مندر میں
گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

تحفظ کے گہرے احساس کے ساتھ اس نے زین
کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔

حقیقت کیا ہے؟ وہ جو آنکھ دیکھتی ہے، دل محسوس کرتا ہے، دماغ سوچتا ہے یا پھر وہ منظر جو ٹی وی اسکرین پر دکھائی دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ کسی کو کیا پتا کہ کون سا درایسا ہے جو دکھتا تو بند ہے مگر درحقیقت کھلا ہوا ہوتا ہے..... کہاں جا کر شعور کی حد ختم ہوتی ہے اور خواہش کی شروع۔ ہمیں کیا خبر کہ قدرت جب بظاہر سفاک ہونے پر آتی ہے تو وہ ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیتی کہ دراصل وہ ہمارے ساتھ رحم دلی

کر رہی ہوتی ہے۔ ماضی کی مشہور منجھی ہوئی ٹی وی اسٹارباتو کسی ٹی وی پروگرام میں ایک خوب صورت سے سجے سجائے سیٹ پر صوفے پر بیٹھی، میزبان خاتون کے ساتھ زور زور سے ٹھنھے لگا رہی تھی، ہنس رہی تھی مگر ہی تھی، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا حالانکہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی اس کی زندگی میں بہت کچھ ہوا تھا۔ اس کی مکمل کائنات ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل اور فنا ہو چکی تھی جس کے بعد لگتا

زندگی کی تماشائی بنی

نسیم احمد بشیر



تھا کہ وہ خود بھی فنا ہو جائے گی مگر وہ تو بڑے آرام سے بیٹھی اپنے گزشتہ ایکٹنگ کیریئر اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں یوں گفتگو کر رہی تھی جیسے اسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔

”ہائے آپ! اس کو دیکھو کیسے مزے سے باتیں کیے جا رہی ہے۔ شاید اسے پتا ہی نہیں چل سکا کہ کیا ہو گزرا ہے۔“ میری چھوٹی بہن نے اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”ہاں لگتا تو یہی ہے کہ اس نے اس خوف ناک حادثے کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کیا بلکہ رد کر دیا ہے۔ بعض اوقات انسان کا دماغی نظام یوں بھی کام کرتا ہے کہ آپ کو زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تلخیوں کو قبول نہیں کرنے دیتا۔ اچھا ہی ہے اس نے اسے بھلا دیا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

میں اور میری چھوٹی بہن تو جانتے تھے کہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی اس مشہور اداکارہ کی آنکھوں کی روشنی..... اس کا لاڈلا، اکلوتا بیٹا راضا قتل ہو چکا تھا اور اس کی لاش ان کی اپنی گلی کی جھاڑیوں میں گری پڑی ملی تھی مگر آج اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اس حقیقت سے بے پروا ہو چکی تھی کہ وہ اب اس پوری دنیا میں مکمل طور پر تنہا ہو چکی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال یا جینے کا سہارا بچا نہیں تھا۔

لگتا تھا کسی بے خبر کو شعور ہی نہ تھا کہ اس کا شہر بھنبھور لوٹا جا چکا ہے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بچادی گئی ہے۔ ایسی حالت میں اسے اس انداز میں گفتگو تو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لگتا ہے شہیا گئی ہے کیونکہ پہلے ہی وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بہت دور رہتی تھی۔

انٹرویو لینے والی خاتون کہہ رہی تھی۔ ”ناظرین! دیکھیے بانو کو..... ہنسی مسکراتی، زندگی کی طرف لوٹتی بانو.....“ میرے کانوں میں بائیسکوپ والے کی گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔ ”بارہ من کی دھوبن دیکھو، آگرہ کا تاج محل دیکھو، ملی کے دھڑ والی لڑکی دیکھو۔“ میرا جی چاہا میں دوڑ کر گلی میں جاؤں اور اس شیشوں والے

بائیسکوپ پر اپنی نظریں گاڑ دوں..... مگر یہ بائیسکوپ کا تماشا جو میرے سامنے ہو رہا تھا، کچھ کم دلچسپ تو نہ تھا۔ اب بانو کے پرانے ٹی وی ڈراموں کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جن میں وہ دہلی پتلی، صحت مند، جوان، خوب صورت، تروتازہ، فنکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال دکھائی دے رہی تھی اور آج کی بانو کیا ہو گئی تھی..... خاک، ملیا میٹ، مٹیالی رنگت والی ایک بچھی ہوئی عورت۔ اپنے دامن میں مہکنے والے واحد پھول کی خوشبو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا، تنہا، دیوانی سی۔

☆☆☆

میری بہن جسے ہم سب پیار سے چھوٹی کہتے اکثر بانو کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس جاتی اور آ کر مجھے اور سب گھر والوں کو بتاتی رہتی کہ مایہ ناز اداکارہ آج کس حال میں ہے چھوٹی کو ہمیشہ سے ہی اکیلی، دکھیا ری، لاوارث عورتوں کو گود لینے کا شوق رہا ہے۔

بانو کو بھی اکثر وہ گھبرلاتی، نہلاتی، کھلاتی پلاتی، کھانے، کپڑے لٹے دے کر پھر اس کے گھر چھوڑ آتی کیونکہ وہیں اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی جہاں وہ اور اس کا کتا رہتے تھے۔ یہ کتا بھی اس کے بیٹے رضا کی نشانی تھا کیونکہ رضا ہی اسے گلی سے اٹھا کر لایا تھا جہاں وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے خوراک تلاش کرتا پیادوں پیادوں کر رہا تھا۔ رضا اسے کھلاتا پلاتا، باہر لے کر جاتا اور ماں کے پاس اس وقت گھر چھوڑ جاتا جب وہ اکیلی ہوتی۔ کتا دونوں ماں بیٹے سے بہت مانوس تھا۔ ہم دونوں بہنیں سوچنے لگیں۔ ”اب کتے کا خیال کون رکھتا ہوگا۔ بانو کو تو اپنا ہی ہوش نہ رہتا، کتے کی بھوک کا کیا ہوتا ہوگا؟“

چھوٹی تو اب بانو کی مدرٹریا بنی تھی مگر میں بانو کو تب سے جانتی تھی جب وہ نئی نئی ڈراموں میں آنا شروع ہوئی تھی۔ ٹی وی کے ابتدائی دن تھے، سبھی ہر شام ڈرامے دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے ٹی وی کے آگے بیٹھا کرتے تھے۔ بانو کے ڈرامے ہم سب کو بہت بھاتے تھے۔ پھر ایک روز میرے کالج کے بڑے

آگیا پھر انہوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔
میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی گئی۔
”تم نے کہا نہیں کہ دروازہ کھولیں امی۔“ میں نے
جلدی سے پوچھا۔

”بہت کہا، گڑ گڑائی، رات بھر سردی میں باہر
بارش میں بھیکتی رہی مگر صبح ہونے پر ہی انہوں نے
دروازہ کھولا تو اندر گئی بس پھر بخار چڑھ گیا۔“

وہ آرام سے یوں بولے جا رہی تھی جیسے کسی
ڈرامے کا سین سنار ہی ہو اور اس سین سے اس کا کوئی
تعلق نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے مگر
وہ کتابیں اٹھا کر کلاس روم کی طرف چل دی۔

پھر کالج لائف ختم ہو گئی اور ہمارا آپس کا رابطہ
بھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی ڈگر پر چل نکلیں۔ میں سنتی رہی
کہ بانو کا میاں کی منازل طے کرتے کرتے بہت بڑی
ادا کار بن چکی ہے۔ اس کی ایک دو شادیاں ناکام بھی
ہو چکی تھیں مگر اس کی ماں نے اس کے بیٹے رضا کی
پیدائش کے بعد رضا کے باپ سے بانو اور رضا کے لیے
کم از کم ایک گھر ضرور لکھوا لیا تھا جس کے بعد سے وہ
لوگ آج تک اس میں ہی رہتے چلے آ رہے تھے۔

بانو کو اب اسی گھر میں رہتے ہوئے قریباً تیس
سال ہو چکے تھے۔ گلبرگ کے اس گھر میں بانو کی جان
تھی۔ اب ذہنی مریضہ بن جانے کے باوجود وہ اپنے
گھر کو ہی اپنی جائے امان سمجھتی تھی اور کسی صورت کہیں
اور رہنے کو تیار نہ ہوتی۔ بے درپے محرومیوں اور
مشکلات نے اس کا ذہن الٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ ہوش و
خرد کی دنیا سے بہت دور جاتی گئی۔ جب ہی چھوٹی نے
ایک دم اس کے ساتھ پیار محبت اور دوستی کا تعلق پیدا کر لیا
اور باقاعدگی سے اس کی خیر خبر لینے جانے لگی۔ بانو کو کئی
بار ذہنی امراض کے ادارے والے آکر لے کر بھی
جاتے رہے۔ اسے داخل بھی کرایا جاتا رہا مگر وہ ہر بار
وہاں سے رسیاں تڑوا کر بھاگ آتی اور اپنے وحشت
کدے میں ہی قرار پاتی۔

آہستہ آہستہ ہم سب گھر والے اس کی ذات،

سے آنگن کے پتوں بیچ لگے پرانے سے برگد کے نیچے
کھڑی ایک معصوم سی لڑکی کو دیکھ کر کسی نے کہا۔
”دیکھو یہ وہی لڑکی نہیں جو ڈراموں میں آتی
ہے؟“ ہم سب سہیلیاں اس کی طرف لپکیں اور اسے
حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگیں یوں جیسے وہ کوئی عجوبہ
ہو۔ ایک شرمیلی سی سادہ کپڑوں میں ملبوس ہر نی جیسی
حیران آنکھوں والی معصوم صورت لڑکی ہاتھ میں کتابیں
لیے خاموشی سے اکیلی کھڑی تھی۔

”آپ بانو ہیں ناں؟ حیرت کدہ والی؟“ میں
نے اسے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے
بغیر کوئی تاثر دیے سر ہلا دیا اور پھر آگے کو چل دی۔ مجھے
لگا یہ لڑکی کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔ اس دھرتی سے
اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید بھولی بھٹکی کوئی پرانی روح جو
کسی کی متلاشی ہے مگر کس کی! یہ اسے خود بھی خبر نہیں۔

میری اس سے دوستی ہو گئی مگر وہ زیادہ بات چیت
نہیں کرتی تھی۔ البتہ ذہن بہت تھی۔ کلاس میں پوچھے گئے
پر سوال کا جواب اسے آتا تھا۔ میں جو کہ خود بہت لائق
تھی لہذا مجھے وہ اچھی لگنے لگی تھی کہ ذہن لوگ ہمیشہ سے
ہی میری کمزوری رہے ہیں۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک
کالج نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔

جیسے ہی وہ کالج آئی میں اس کی جانب لپکی۔
”کہاں غائب تھیں بانو پری؟“ میں اسے پیار سے
پری کہا کرتی تھی۔

”بیمار تھی۔ بخار ہو گیا تھا۔“ اس نے ہلکی سی
مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”ارے کیسے؟“

”رات بارش میں بھیکتی رہی ناں تو بس صبح بخار
ہو گیا تھا۔“ اس نے نیچی نظر سے اوپر نہ اٹھائیں۔

”رات بھر کیوں، باہر تھیں کیا؟“

”ہاں، وہ شوٹنگ سے آئی تھی ناں تو بارش
ہو رہی تھی۔ امی نے اندر سے ہی پوچھا۔ ”چیک لائی
ہو؟“ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“ پروڈیوسر نے کہا ہے
اگلے ہفتے۔ میں نے بہت مانگا پروہ نہ مانا۔ امی کو غصہ

اس کے دکھ، اس کے مسائل میں انوالو ہوتے جا رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے اور پھر گھبرا کر رہ جاتے کہ یہ اکیلی ذات زندگی کو کیسے برتے گی..... کیسے زندہ رہ سکے گی..... کیا ہوگا اس کا؟ میں ذرا دانستہ طور پر اس کی زندگی سے دور رہتی کیونکہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کوئی بھی اس جیسے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنا آئینہ لگتی اور میں اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنی بڑی اور مانی ہوئی مشہور اداکارہ زمانے کے سانچے سہہ کر معدوم ہو سکتی ہے تو میں کیا چیز تھی..... ایک ذرہ..... ایک ہی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو جانے والی کمتر ذات..... ویسے بانو مکمل طور پر اکیلی بھی نہ تھی۔ اس کی ماں تو آگ میں جل کر ختم ہو چکی تھی۔ ایک بہن ضرور تھی جو نعت خوانی اور مجالس میں مذہبی کلام پڑھ کر اچھے پیسے کمالیتی تھی مگر وہ اپنے شوہر بچوں میں اتنی مصروف تھی کہ اسے ذہنی مریضہ بہن کا خیال رکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

جب چھوٹی نے بانو کے بیٹے کے قتل کا بتایا تو میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ سوچا دو دن سے وہ گھر میں بند پڑی ہوگی۔ کچھ کھانے کو نہ ہوگا۔ کیوں نہ اس سے افسوس کروں اور کچھ کھانے کو دے آؤں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گاڑی اس کی گلی میں موڑ دی۔ گلبرگ کے اس پوش علاقے میں رونقیں ہی رونقیں لگی رہیں۔ گلی کے آغاز پر ایک جدید ترین کافی شاپ کھل جانے کی وجہ سے شہر کے امراء کے لڑکے لڑکیاں وہاں باقاعدگی سے آتے جاتے اور آپس میں میل ملاقات کرتے۔ ایک ہزار روپے کی کافی کا کپ ان کی جیب پر گراں نہیں گزرتا کیونکہ ان میں سے اکثر کے باپوں نے پاکستان کی لوٹ کھسوٹ اور کرپشن میں خوب مال بنایا ہوا ہے جسے ان کے بچے سہولت اور بے دردی سے نوچتے ہیں تو ان کے باپوں کو قطعاً تکلیف نہیں ہوتی بلکہ عین راحت نصیب ہوتی ہے۔

بانو کی بھوک کا خیال آتے ہی میں نے بھی گاڑی

کافی شاپ کے باہر روک دی اور اندر جا کر تازہ مرے دار سینڈویچز، کیک اور کافی پیک کروا کر بیگ بھر لیا کچھ ہی دیر میں، میں بانو کے گھر پہنچ چکی تھی۔ میں نے گاڑی پارک کر دی اور پھر متعدد بار بیل بجائی مگر کوئی کھولنے کو نہ آیا۔ کچھ دیر میں ساتھ والے گھر کا ملازم لڑکا باہر آیا اور بڑے آرام سے بولا۔

”بی بی اوپر کی منزل پر ہوں گی مجھے ابھی نظر آئی تھیں۔“

”ہائے اس کا کیا حال ہے؟“ میں ملازم سے ہی پوچھنے لگی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس دکھیااری ماں کی کسی طرح سے کوئی مدد کر دوں..... کچھ کروں اس کے لیے۔

”پتا نہیں باجی ہم تو انہیں نہیں پوچھتے۔ بیل بجاؤ تو وہ ڈنڈا یا جھاڑو لے کر ہمیں مارنے آ جاتی ہیں اور ان کا حلیہ بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔“ ملازم زپرلب مسکرانے لگا۔ مجھے تھوڑا سا غصہ آیا مگر میں برداشت کر گئی۔ میں نے پھر بیل بجائی تو اوپر چھت پر سے ایک سفید بالوں والا سر نمودار ہوا۔

”کون ہے؟“ بانو نے نحیف آواز میں پکارا اور نیچے جھانکا۔

”بانو میں آئی ہوں چھوٹی کی آپا..... کچھ کھانے کو لائی ہوں تمہارے لیے۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ نیچے آنے کے لیے سیڑھیاں اترتی دکھائی دینے لگی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ بانو میرے سامنے کھڑی تھی۔ میلے بے ترتیب کپڑے، الجھے ہوئے کچھڑی بال، ہونق چہرہ، ویران آنکھیں۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر جذبات کا ایک شدید طوفان اٹھا اور میں نے بے اختیار بانو کو گلے لگانا چاہا۔ مجھے اپنی طرف آگے بڑھتے دیکھ کر وہ غصے سے چینی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ.....! میرے اوپر ہی چڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پیچھے ہٹ کے کھڑی ہوں۔“ میں ہل بھر کو چونکی اور اس کی بات سے سکی محسوس کر کے کچھ پیچھے ہو گئی۔ پھر کچھ سوچا۔ یہ پگلی تو جانتی ہی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہو کیا چکا ہے۔ اس کی کسی

بانو کا ایک بھائی انڈیا کا بہت بڑا طبیب نواز تھا۔ مگر بانو تو اب کسی گنتی یا کھاتے میں ہی نہیں رہی تھی۔
”یہ بھوکی ہوگی۔“ میں کہے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی بہن کی طرف بغور دیکھا۔

”ہم کیا کریں۔ بڑا تنگ کیا ہوا ہے اس نے۔ ابھی میں نے اور میرے میاں نے تھانے سے رضا کی لاش چھڑائی ہے۔ اسے قبر میں اتارنا ہے۔ سو کام ہیں۔ کھپ گئے ہیں ہم تو اس کے بکھیروں میں۔“
”وہ میں کہنا چاہتی تھی کہ میری چھوٹی بہن نے بتایا کہ اس کے گھر میں گیس کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ شاید کوئی پائپ لیک کر رہا ہے۔ کہیں کسی دن گیس سے.....“ میں ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں۔ فاؤنٹین ہاؤس داخل کرواؤ تو وہاں سے بھاگ آتی ہے۔ میرے اپنے بال بچے ہیں۔ میرا اپنا کام ہے۔ میں اس کا خیال کیسے رکھ سکتی ہوں کسی کی سستی تو ہے نہیں۔“ بہن جھنجلا کر بولی۔
”یہ لے بانو کاغذ سائن کر۔ تھانے والے تیرے سائن کے بغیر لاش نہیں دیں گے۔“ اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ آگے بڑھایا اور پین سے بانو سے سائن کروا لیے۔ بانو بالکل چپ کھڑی اس کا حکم بجالاتی رہی یوں جیسے وہ انسان یا ماں نہ ہو، کوئی بے جان کاٹھ کا پتلا ہو، جس میں نہ تو کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات جو بس آگ میں جل کر خاک ہوتا ہی جانتا ہو اور اس کے علاوہ اس میں کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔

میں بانو کے پیچھے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہو گئی۔ کتا لان کے ایک کونے میں بیٹھا مزے سے سینڈوچ اور کیک اڑا رہا تھا۔ اپنی بدنصیب مالکن کے پیٹ اور دل کے خالی رہ جانے کا اسے کوئی احساس ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

بانو حیرت کدہ ڈراموں میں کام کرتی رہی تھی مگر میں جس گھر میں قدم رکھ رہی تھی وہ ہی اصل حیرت کدہ تھا۔ چاروں طرف کسی آسیب کا سایہ چھایا محسوس ہوتا تھا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا جب سب لوگ چلے جاتے

بات کا کیا برا منانا سو پھر اسے مخاطب کیا۔

”بانو..... رضا کے حادثے کے بعد سے تم دو دن سے گھر میں بند ہو۔ بھوک تو لگی ہوگی۔ میں تمہارے لیے یہ کھانا لائی ہوں۔“ میں نے پلاسٹک کے فینسی بیگ میں نفاست سے پیک شدہ فائو اسٹار ہوٹلوں جیسا کھانے پینے کا سامان اس کے آگے لہرایا ہی تھا کہ یک دم نہ جانے کہاں سے وہ لمبا چوڑا ہانپتا کانپتا کتا آیا، رالیں ٹپکاتا ہوا..... بیگ مجھ سے چھینا اور بھاگ گیا۔ میں حیران پریشان رہ گئی۔

”بانو..... یہ کھانا تو میں خاص طور پر آپ کے لیے لائی تھی۔“ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔
”یہ دنیا کتوں کی دنیا ہے اور کتوں کو بہت بھوک لگتی ہے۔ یہ رضا کا کتا ہے..... اس سے چھڑ کر بہت بھوکا ہوگا۔ رضا ہی تو اسے کھلاتا پلاتا تھا۔“ وہ میکا کی انداز میں بولتی چلی گئی۔ اسے اپنے آپ کے پھر سے بھوکے رہ جانے کا قطعاً احساس ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

یک دم ایک گاڑی گیٹ پر رکی اور اس میں سے ایک خوش لباس، صحت مند خاتون باہر نکلی جس کے ہاتھ میں تھا موبائل فون اس کی انگلیوں میں جچی ہیرے کی انگوٹھیوں کے رنگ سے میچ کرتا دکھائی دیتا تھا۔
”بانو یہاں باہر کیوں کھڑی ہے۔ چل اندر۔“ اس نے آتے ہی بانو کو غصے سے ڈانٹا۔

”آپ کون؟“ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
”اس کی بہن ہوں نجمہ۔ دیکھنے آئی ہوں کہ گھر میں بھی ہے یا کہیں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی ہے۔“ اس نے بڑی بیزاری سے کہا۔

”بہن؟“ میں نے دل میں سوچا۔ کیسی بہن ہے جس کی پگلی بہن کی آنکھوں کا نور اس کے جینے کا واحد سہارا اس سے چھین لیا گیا ہو اس کے لیے اتنا سخت لہجہ اور کٹھور پن..... کم از کم اس کے کھانے کے لیے، ہی کچھ لے آتی۔ کوئی روٹی سالن، چائے کا سامان، پانی کی بوتل مگر وہ تو خالی ہاتھ آئی تھی اور بانو کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ عجیب بہن تھی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ

ہیں تو لو دے کے تمام دیے بھج جاتے ہیں سورج سر
 بیہوڑائے سوچتا ہے اب پیچھی بھی اڑ جائیں گے اور
 رات شاید مستقلاً ٹھہر جائے گی۔
 اس گھر میں شاید دن کبھی ٹکٹا ہی نہ تھا۔
 اندھیرے تھے اور گیس کی بدبو۔ میں نے حیران ہو کر
 سوچا۔ یہ عورت کتنی ڈھٹائی سے زندگی بسر کیے جا رہی
 ہے۔ ٹوٹی ہی نہیں۔ زندگی اس کے ساتھ شدید دشمنی
 کیے چلی جا رہی ہے اور یہ ہے کہ ہتھیار پھینکنے کو تیار ہی
 نہیں۔ جیسے چلی جا رہی ہے۔

”بانو..... میں گیس کا والو بند کر دوں؟“ میں
 نے ڈرتے ڈرتے گیس پائپ کی طرف قدم بڑھائے
 تو وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی۔

”خبردار جو میرے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔“
 وہ یوں چیختی جیسے میں نے اس کے راج محل کی کسی دیوار
 سے سونے کی ایک اینٹ کھسکانے کا ارادہ کیا ہو۔ میں
 خاموشی سے پیچھے ہو گئی اور اس کے وحشت زدہ گھر کے
 درو دیوار کا جائزہ لینے لگی۔ سارا گھر ٹوٹے پھوٹے
 سامان، لکڑی کے ٹکڑوں، پرانے کپڑوں، پھٹے ہوئے
 گدیوں اور گند بلا سے اٹا ہوا تھا۔ کتے کی غلاظت،
 کاکروچوں، چوہوں کے مردہ جسموں کے ڈھانچے
 فرش سے چپک کر فرش کا حصہ بنے نظر آتے تھے۔ ایک
 کمرے کا دروازہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

”بانو یہ کیا ہوا؟“ میں نے اس کی طرف اشارہ
 کر کے پوچھا۔

”آگ لگ گئی تھی۔“ اس نے بڑے سکون سے
 جواب دیا اور بیٹے رضا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر گود
 میں لے کر ہولے ہولے گانے لگی۔

”جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لیے..... کیوں
 اتنی دور تم نے ٹھکانے بنا لیے.....“ کس قدر سریلی
 آواز تھی بانو کی پس من کر کانپ گئی اور میری آنکھوں
 سے ٹپ ٹپ آسو بہنے لگے۔ مگر بانو بے خبری سے گائی
 چلی گئی۔ پھر اپنے ادھر سے پھٹے میلے بدبودار بستر پر
 دراز ہو کر اس نے دوسرا گانا شروع کر دیا۔

”زندگی تماشا بنی۔ دنیا دا ہا سانی۔ کدی وی نہ

پیار ملیا.....

”کون کہتا ہے یہ عورت پاگل ہے۔ اسے حقیقتوں
 کی سمجھ نہیں۔“ میرا دل روئے چلا جا رہا تھا۔ بانو کا دل
 اتنا چھلا ہوا تھا۔ میں اسے پیار کر کے تھکانا چاہتی تھی مگر
 وہ تو اس وقت اپنے بیٹے رضا کے ساتھ تھی۔ میں نے
 اس کے اور اس کے بیٹے کے تعلق کے بیچ مغل ہونا
 مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر اس حیرت کدے کے
 دوسرے کمروں کا جائزہ لینے لگی۔ سیلاب بلا کس کے گھر
 آ پہنچا تھا۔ آج معلوم ہو گیا تھا۔

بیٹھک کی دیوار پر لگے پرانے سے بد وضع آئینے پر
 کسی بجھتی ہوئی شمع کی لو سے لکھا تھا ”نسخہ ہائے وفا“ ایک
 پلنگ الٹا کھڑا تھا جس کے ارد گرد وی سی آر کی ٹیپوں کے
 کالے کالے فیتے یوں لپٹے ہوئے تھے جیسے انہوں نے
 اس پلنگ پر لیٹے ہوئے کسی خیالی پیکر کو جکڑ دیا ہو۔

”بانو یہ ٹپس.....؟“ میں نے نہ چاہتے ہوئے
 بھی پوچھ لیا۔

”میرے ڈراموں کی ہیں ذرا دیکھیں تو سہی
 میں نے کتنے ٹی وی ڈرامے کیے ہیں۔ اس طرح سے
 میرا کام میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔“ وہ ہنس
 ہنس کر فخریہ انداز میں بولتی چلی گئی۔ نہ جانے ایسا کیوں
 ہوتا ہے مگر ہوتا رہتا ہے۔ تخلیقی ذہن رکھنے والے لوگ
 اکثر ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھے ماضی کی مشہور اور کامیاب ہندوستانی
 اداکارہ پروین بابی یاد آنے لگی جو شینڈ فریج جیسے الجھا
 دینے والے مرض کا شکار ہو کر گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اس
 نے بھی اپنے آپ کو اپنے فلیٹ میں تنہا مقید کر لیا تھا اور
 دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھتی تھی۔ پھر امریکی اداکارہ
 مارلن منرو کے عروج و زوال کی کہانی سے کون واقف
 نہیں۔ مارلن کو ایک بار ذہنی امراض کے اسپتال میں
 بھی داخل کروایا گیا تھا جہاں وہ مارلن سے نور ماجینز
 (جو کہ اس کا اصلی نام تھا) بن کر وقت گزارتی رہی۔
 اس کا بھی اپنی ماں سے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا جس نے
 اسے ذہنی طور پر کمزور اور ہمہ وقت بے یقینی کی کیفیت
 میں مبتلا کر رکھا تھا ایسی خواتین اکثر محبت میں بھی ناکام
 رہتی ہیں اور اس کی تلاش میں کئی ناخوشگوار تجربے کرتی

ماضی کی عظیم اداکارہ نادیرہ کی کہانی دکھائی تھی۔ جو ایام گزشتہ کے عروج کے ختم ہو جانے کے باوجود خود کو حسین، جوان، مقبول اداکارہ سمجھے جانے پر اصرار کرتی۔ حقیقتیں اسے سانپ کی طرح ڈستی رہتی تھیں۔ اف یہ پرانی اداکارائیں..... میرادل خانی ایام کی بے درد کٹھنایوں کے احساس سے بھر آیا۔ کامیابی کتنی بڑی ناکامی اور عذاب ہوتی ہے۔

اپنے پاس سے کچھ کپڑے اور ایک بہتر سوٹ کیس دے کر میں اسے لے کر ایئر پورٹ روانہ ہو گئی۔ جہاز میں اس نے وہ بدنما پرانا بیوٹی بکس اپنے قریب رکھ لیا اور پھر فلائٹ شروع ہوتے ہی اسے کھول لیا۔ اس میں ٹوٹے پھوٹے آئینوں اور میک اپ کے سامان کے علاوہ کسی سیپارے کے بوسیدہ پھٹے ہوئے اوراق بھی تھے جنہیں اس نے ہاتھ میں تھام کر اونچی اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ مسافر اسے پہچان کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ تلاوت کے بعد ایک دم اس نے اس گرد آلود کالے بیوٹی بکس کو اٹھایا اور

چلی جاتی ہیں۔

☆☆☆

ایک دن چھوٹی کو کسی چینل والوں کا فون آیا۔ وہ بانو کو اپنے ایک گرینڈ ایوارڈ فنکشن میں بلانا چاہتے تھے مگر انہیں پتا تھا وہ اکیلی آنے کے قابل نہیں ہے لہذا انہوں نے بطور ہمراہی مجھے مدعو کر لیا جس کے لیے وہ لاہور سے کراچی تک کا ہوائی سفر ٹکٹ بھی دینے کو تیار تھے۔

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ بانو گو مجھ سے مانوس تھی مگر ذہنی طور پر اس قابل ہر گز نہ تھی کہ اسے دوسرے شہر کا سفر کروایا جاتا۔ ٹی وی چینل والوں کو ریٹنگ درکار تھی لہذا ان کے فون پر فون آنے لگے۔ بانو بھی سن کر مچل اٹھی کہ اسے کراچی بلایا جا رہا ہے۔ اس کا اشتیاق دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔

”میں ضرور جاؤں گی کراچی میری امی کا شہر ہے۔ ہمارا وہاں فلیٹ بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی میں امی جل کر مر گئی تھیں۔ پھر وہ فلیٹ نجیبہ نے لے لیا۔“ بانو اپنی رو میں خاندانی رازوں سے پردے اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس دم مجھے وہ مکمل طور پر ٹھیک اور سمجھدار لگی یوں جیسے اس نے جہان دیوانگی میں کبھی قدم تک نہ رکھا ہو۔ کیا دیوانگی اور فرزانگی کی سرحدیں اتنی قریب، قریب ہوتی ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

میرادل بھی پسج گیا۔ سوچا بے چاری جھلی اگر چند لمحوں کے لیے بہل جائے خوش ہو جائے تو میرا کیا جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ کراچی جانے کی ہامی بھر لی۔

فنکشن میں شامل ہونے کے لیے بانو کے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ سوٹ کیس وہ میلے پیلے پھٹے پرانے چند جوڑے ایک ٹوٹے پھوٹے بکسے میں ڈال کر ایئر پورٹ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہفتوں یا شاید مہینوں سے نہ نہائی ماضی کی عظیم اداکارہ اپنے مردہ پیلے سے رنگ والے چہرے پر سرخ لپ اسٹک لگا کر شان بے نیازی سے ایک کالا بیوٹی بکس ہاتھ میں تھامے بت بنی خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھے جا رہی تھی۔

مجھے گلزار کی بنائی ہوئی فلم Sunset Boulevard یاد آ گئی جس میں اس نے اسی طرح

معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی

الانکے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جا رہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے تاریخیں ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو محبور پائیں گے

زور زور سے جھاڑنا شروع کر دیا تو جہاز میں دھول پھیلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہی۔ نہ جانے کون اس کے سامنے تھا جو اسے اتنا ستا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے شراٹھا دیا رات کا غلاف تھا باہر آسمان پر، چاند چمک رہا تھا۔ بانو نے اپنے بیٹے رضا کی تصویر کھانے والی ٹیبل پر سجالی اور چاند سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے وہ رضا ہو۔

وہاں ایوارڈ کے فنکشن میں اتنا مجمع دیکھ کر بانو جھوم اٹھی اور بیچ میدان میں اٹھ کر ناچنے لگی اور بار بار ہی کہتی چھینل والوں نے میرے بیٹے کو کتنا اچھا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میرا بیٹا اسی عزت کا مستحق تھا۔

ہم دونوں نہیں اکثر اسے گلبرگ کی سڑکوں پر اکیلی بھٹکتے اپنے بیٹے کے کپڑے پہنے چلتے پھرتے دیکھتیں تو ہمارا دل پارہ پارہ ہو جاتا۔ بانو نے چھوٹی کو ایک بار یہ بھی بتایا کہ کئی مطلب پرست خونخوار انسانی کتے دو وقت کی روٹی کا لالچ دے کر اسے کبھی کبھار اپنے ساتھ بھی لے جاتے ہیں یا پھر کھانا لے کر اس کے ہی گھر چلے آتے ہیں۔ چھوٹی یہ سن کر بانو پر بہت ناراض ہوئی اسے ڈانٹا سمجھایا مگر اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ بس کھانا کھانے کی خواہش کا ہی اظہار کرتی رہتی یا پھر رضا کی باتیں سنانے بیٹھ جاتی۔ اب وہ بہت دہلی دھکتی یوں جیسے کوئی کم عمر لڑکی ہو۔ بھوک اور تنہائی کا مہیب دیوا اسے دھیرے دھیرے نگلتا جا رہا تھا۔

”آپنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ زندہ کیسے رہ لیتی ہے؟“ ایک روز چھوٹی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”سردیوں میں اسے سردی اور گرمیوں میں گرمی تو لگتی ہوگی۔ لوڈ شیڈنگ میں اندھیرے سے بھی خوف کھاتی ہوگی اسے ڈینگلی کا پھھر بھی تو کاٹ سکتا ہے۔“ چھوٹی فکر مندی سے بولی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی پھر زبان کھولی۔

”اچھا ہوا اگر یہ مری جائے۔ اسے ڈینگلی کا پھھر

ہی کاٹ لے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ قدرت جب سفاک ہوتی ہے تو دراصل وہ رحم دلی کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں پھر سوچا۔ مجھے یاد آیا پروین بابی ایک روز اکیلی ہی اپنے فلیٹ میں دم توڑ گئی تھی۔ کئی دن تک اس کی موت کا کسی کو علم تک نہ ہو سکا تھا۔

”آپنی یہ مرگئی تو کئی روز تک تو کسی کو اس کا پتا ہی نہیں چلے گا۔“ چھوٹی تڑپ کر بولی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئیں۔

”اور اس کے کتے کا کیا ہوگا۔ اسے کھانا کون دے گا؟“ چھوٹی نے سوال کر کے مجھے لاجواب کر دیا۔ شاعر افتخار نسیم کی ایک نظم یاد آنے لگی جس کے آغاز میں اس نے اپنی پالتو بلیوں سے محبت کے بارے میں بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اسے فکر رہتی ہے کہ اس کی موت کے بعد انہیں کھانا کون دے گا۔

”بانو بھوک پیاسی کب تک زندہ رہ سکے گی۔“ ہم دونوں سر جوڑے بیٹھی سوچتی رہیں۔

”مگر آپ مجھے تو بانو سے زیادہ اس کے کتے کی بھوک کا خیال آتا ہے۔ بلکہ ڈر لگتا ہے سوچ کر۔“ چھوٹی سہم کر بولی۔ ”اگر بانو کو کھانا نہ ملا تو وہ مر بھی سکتی ہے۔“

افتخار نسیم نے اپنی نظم کے آخر میں لکھا تھا کہ اسے پھر بھی تسلی ہے کہ اگر وہ تنہا اپنے فلیٹ میں مر گیا تو اس کی بلیوں کے لیے کوئی انتظام تو ہو ہی جائے گا۔ وہ اس کے نلکے سے رستے ہوئے پانی کو پی کر اپنی پیاس بجھا لیں گی اور اپنے مالک کے مردہ جسم سے خوراک حاصل کر لیں گی۔ میں نظم میں کھوئی ہوئی تھی کہ یک دم چھوٹی کی آواز سے چونک گئی۔

آپنی اگر ایک دن کتے کو شدید بھوک لگی اور باہر سے کچھ کھانے کو نہ ملا تو؟“

”ہاں مگر صوفے پر لیٹی ہوئی زرد رو نیم جاں چھپکلی نما جسم کو تو وہ.....“ میری بات نے میرے لبوں پر ہی دم توڑ دیا۔ میں اپنی بات کو مکمل کرنے کی سکت خود میں نہ پا رہی تھی۔

وہ کون تھی؟

ہالہ احمد

بحث ہونے لگی۔ بالکل ویسے جیسے معمول کی بات ہو..... وہ بھی تو ہستی ہوئی محض بات سے بات نکالے جا رہی تھی۔ ضد کا کوئی عنصر نہ تھا اور نہ کوئی طنز... نامعلوم کیوں یکا یک اس کے شوہر کو بے طرح غصہ آ گیا۔ اس نے حیرت سے غصے کی وجہ جاننا چاہی

وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹی چھت کو تنکے جا رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور بند دروازے کے اس پار آوازیں تھیں شور و غل تھا، قہقہے تھے لیکن ان سب رونقوں کا حصہ بننے کا اس کا بالکل بھی من نہیں تھا۔ ہاں مگر..... کچھ ہی دیر پہلے تک تو وہ ان سب کا حصہ تھی سب سے باتیں کرتی ہوئی، چھوٹے بچوں کے ساتھ بچہ بنی شور مچاتی ہوئی..... بات بے بات زوردار قہقہے لگاتی ہوئی۔ اور بس ایک بل ہی لگا تھا اس کی مسکراہٹوں، اس کے قہقہوں کو یک لخت رک جانے میں..... ہاں ایک بل ہی تو لگا اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ جانے میں۔

☆☆☆

کل سے اس کی دونوں نندیں آئی ہوئی تھیں، اپنے، اپنے بچوں کے ہمراہ چند دن میکے میں گزارنے کو..... ایک کے تین بچے اور دوسری کے چار بچے اور خود اس کا اپنا تین سالہ شرارتی گیلو سا بچہ..... آٹھ بچوں کی چہکاریں اتنی دلفریب تھیں کہ بڑے بھی اُن کے ساتھ بچہ بن جانے پر مجبور تھے۔ اس کی ساس سب بچوں کی بلائیں لیتے ہوئے حد درجہ خوش نظر آرہی تھیں۔ وہ ادھر سے ادھر کام کرتی پھر رہی تھی، کبھی جا کر نندوں کے پاس بیٹھ جاتی تو کبھی بچوں میں جا گھستی..... ساتھ ہی چکے، چکے اپنے شوہر کا بھی انتظار کرتی ہوئی، جس کے گھر آنے کا وقت بس ہوا ہی چاہتا تھا..... ویسے تو ہر روز ہی وہ جی جان سے شوہر کا انتظار کیا کرتی مگر آج تو اسے خاص طور سے انتظار تھا۔

☆☆☆

بات ایسی کچھ خاص بھی نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہی ہلکی مذاق میں کسی ایک نقطے پر آ کر اس کی شوہر سے

تو شوہر نے اسے بے بھاؤ کی سنا دیں۔

”بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کسی نے، شوہر سے خوب مقابلہ کرتی ہو، جواب دیے بغیر چین نہیں آتا تمہیں..... شوہر کی ذرا سی عزت نہیں تمہارے دل میں.....“ یہ اور..... اس جیسی کئی اور باتیں وہ تو پنا پٹکیں جھکے حیرت کی مورت بنی بس اپنے مجازی خدا کا چہرہ دیکھتی رہی کہ آخر بات کیا ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن یعنی آج کی صبح..... اس کا شوہر خاموشی سے ناشتا کر کے کام پر نکل گیا۔ نہ کوئی بات، نہ کوئی الوداع..... وہ بھی چپ رہی، شاید دل ہی دل میں خود سے ہونے والی زیادتی کا غصہ تھا یا ملال تھا۔ بہر حال کچھ دیر تو اداسی کی کیفیت رہی پھر آہستہ، آہستہ گھر کے باقی افراد بھی بیدار ہونے لگے۔ خصوصاً بچوں کے بیدار ہونے کے بعد تو وہ گھن چکر ہی بن گئی۔ کسی کو ناشتے میں کچھ چاہیے تو کسی کو کچھ..... وہ بھی بڑے پیار سے سب کی فرمائشیں پوری کرتی رہی۔ ساس، نندوں کی پسند کا الگ سے خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ خیر سب کچھ خوشی، خوشی نمٹایا ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کی فکر نے سراٹھایا۔ غرض وہی لگی بندھی سی روٹین..... تمام دن یونہی بھاگم بھاگم گزر گیا۔ اچھا تھا کاموں میں لگ کر وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا ورنہ شوہر کے انتظار میں دن کیسے گزرتا..... صبح ناراض ہو کر گیا تھا بلکہ کل شام ہی سے ناراض تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ کام سے گھر واپس آئے گا تو ناراضی کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے کل کے رویے پر اس سے محبت کے ساتھ معذرت کے دو بول بھی بول لے گا کہ آخر غلط بات پر ناراض ہوا تھا..... بلا وجہ..... ایسے ہی..... بس یہی سوچ سوچ کر وہ آپ ہی آپ مسکرا اٹھتی تھی۔

”ماموں آگئے۔“ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آگیا میرا بیٹا.....“

”بھائی آگئے۔“ بچوں کا شور، ساس کی آواز، نندوں کی پکار..... وہ خود زبان سے تو ایک لفظ نہ بولی ہاں دوڑتی ہوئی دروازے تک ضرور گئی۔ دروازہ کھلا، شوہر اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر اندر کی طرف چل دیا۔ اس کا دل برا ہوا مگر ہمت پھر بھی نہیں ہاری، پیچھے پیچھے لپکی مگر ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔ ماں، بہنوں، بھانجے، بھانجیوں اور بیٹے سے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام دن کا احوال ایک دوسرے سے پوچھا گیا۔ وہ بھی خاموش کھڑی رہی، ایک نگاہ غلط بھی شوہر نے اس پر نہ ڈالی تھی۔ جب وہ منہ ہاتھ دھونے اندر کی طرف چلا تو وہ بھی پیچھے بھاگی۔ اندر جا کر خود سے مخاطب کیا مگر شوہر صاحب کا خرخرہ ابھی باقی تھا۔ اس بری طرح سے جھاڑ پلائی اور کمرے سے چلے جانے کو کہا کہ اس کا تو دل ہی لرز کر رہ گیا۔ چہرے کی جوت بجھ گئی۔ یعنی کہ حد ہی ہو گئی تھی۔ الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

”سب کے ساتھ ہنس، ہنس کر باتیں اور مجھ سے ایسا رویہ وہ بھی بغیر کسی وجہ کے.....“ اس کا شوہر تو تازہ دم ہونے کے بعد باہر سب کے درمیان جا بیٹھا تھا۔ اور وہ..... اپنے دل کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ بے پناہ دل چاہا کہ کسی کو اپنی پتلا سنائے، کچھ اپنے من کا بوجھل پن ہی ہلکا کرے..... ایسے میں ماں سے بڑھ کر کون؟

”بتاتی ہوں اماں کو۔“ بڑے طنطنے کے ساتھ موبائل فون اٹھایا۔ نمبر ملایا۔ دوسری طرف ماں کی آواز۔ ”میری بیٹی کیسی ہے؟ اللہ خوش رکھے تجھے، کتنے دن سے آواز نہیں سنی تیری۔“ کیسا پیار کیسا سکون تھا ماں کے لہجے میں..... ابھی تک تو وہ نہیں جانتی تھیں کہ بیٹی پر کیا گزری..... وہ بھی سوچ میں پڑ گئی..... کیا یہ سب رام کہانی سنا کر وہ ماں کے لہجے سے سکون منفی کر دے؟ انہیں بے چین کر دے؟ انہیں فکر میں مبتلا کر دے؟ جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ بیٹی

نے حال چال دریافت کرنے کو معمول کے مطابق فون کیا ہے۔

”نہیں، نہیں، نہیں۔“ ایک پل میں اس نے فیصلہ کیا اور اپنے آپ پر خوب صورتی سے قابو پاتے ہوئے بڑے حوصلے سے معمول کے مطابق بات کی اور فون بند کر دیا۔ کسے بتائے، کسے سنائے؟ ہاں۔۔۔ ہم جولیوں سے دل کی بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے، اسے اپنی سب سے بہترین سہیلی یاد آئی۔ دل کچھ اور بھی بھر آیا۔ دوبارہ موبائل فون ہاتھ میں لیا مگر پھر سے دماغ کی رو بھٹک گئی۔

”کیا کہے گی؟ آج تک تو بڑا بھرم، بڑا مان رکھا۔۔۔ میں نے سب سہیلیوں کے سامنے۔۔۔ اب ایسی بات کر کے ہمیشہ کے لیے وہ بھرم، وہ مان توڑ دوں؟“ دل اور دماغ عجیب کشمکش میں تھے۔ آپس میں گتھم گتھا۔۔۔ دل کہتا تھا کہہ ڈالو سب۔۔۔ شاید خود پر پڑے بوجھ کو اٹھانے سے قاصر تھا جیسی یہ مشورہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف دماغ تھا جو اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہ رک بھی گئی۔

”گھر کی بات گھر ہی میں بھلی۔۔۔“ بے شک سہیلیاں بہت پیاری مگر یہ بات ان سے کہنا چنداں مناسب نہیں۔۔۔ آف! کیا کروں؟“ دل تھا کہ غصے اور دکھ کے ملاپ سے بیٹھا ہی جا رہا تھا۔ بہت ضروری تھا کہ کسی سے دل کا حال کہہ لیا جاتا۔

”ارے اچھا ہے آج تو دونوں نندیں بھی ہیں یہاں۔۔۔ ساس سے شکایت کرتی ہوں، خود ہی تینوں مل کر خبر لیں گی اپنے لاڈ لے کی۔“ تیر کی تیزی سے اٹھی۔۔۔ دروازے تک ہی گئی تھی کہ ساس کی آواز نے قدم روک دیے۔

”بھئی کہاں جا کر بیٹھ گئیں بہو۔۔۔! آفس سے تھکا ہوا۔۔۔ میرا بچہ آیا ہے کوئی پانی کا پوچھتیں۔۔۔ جاؤ بچے! اپنی ممانی کو بلا کر لاؤ۔“ دوسری آواز جو کانوں میں پڑی وہ بڑی نند کی تھی۔

”اللہ بھائی! کیا بھالی روزانہ یونہی کیا کرتی تھیں کہیں کمرے سے باہر ہونا

چاہیے۔“ جواب میں مظلوم بھائی نے کیا کہا اس سے سنا نہیں گیا۔ وہ واپس چلتی بستر تک آئی۔ چپ چاپ لیٹ گئی۔ یہ تھیں ساس جن کی خدمت وہ دل و جان سے کیا کرتی تھی۔ یہ تھیں وہ نندیں جن کی خاطر مدارات اور ان کے بچوں کی فرمائشیں پوری کرتے وہ دن بھر ہلکان ہوا کرتی تھی اور ان سے وہ چلی تھی شوہر کی شکایت کرنے۔۔۔ اس نے جانے یہ سوچا بھی کیونکر کہ وہ شکایت کرے گی تو ساس اپنے بیٹے کے کان کھینچیں گی۔ نندیں اپنے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیں گی۔۔۔ تو گویا کوئی نہیں جس سے وہ سب کچھ کہہ ڈالے، افسوس! اس کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹا۔۔۔ نگاہیں چھت سے ہونی دروازے پر جا لگیں۔ جہاں دستک ہو رہی تھی۔

”مممانی۔۔۔ نانو بلا رہی ہیں۔“ کسی بچے کی آواز۔۔۔ بے دلی سے اٹھی، چپل پاؤں میں اڑی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ساس نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی، نندوں نے عجیب سی اچھتی نظر اس پر ڈالی اور پھر سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ اس نے سلے ہوئے لیوں کو اور بھی سختی سے بھینچ لیا۔ باورچی خانے سے پانی کا گلاس لا کر پھولے منہ والے شوہر کو پیش کیا۔ واپس باورچی خانے میں آئی اور رات کا کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگی۔ آٹا بھی گوندھنا تھا۔ برتن بھی دھلنے کے منتظر تھے اور پھر وہی فرمائشیں۔۔۔

”مممانی! یہ کھانا، مممانی! وہ کھانا۔۔۔“ اور وہ سر ہلاتے ہوئے جُت گئی۔ یہ سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا۔ یہ سب کام اسے ہی کرنے تھے۔ اس کے دل میں کیا پکڑ دھکڑ چل رہی تھی اسے سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے خود ہی دل کو بھی آسرا دینا تھا اور اپنا غم بھی غلط کرنا تھا اور کیوں نہ کرتی۔۔۔؟ ضرور کرتی کیونکہ۔۔۔ وہ ایک بہو تھی، بھاوج تھی، ماں تھی اور بیوی تھی مگر اصل میں وہ تھی کون۔۔۔؟ ہاں تھی تو عورت ہی ناں مگر کیا وہ ایک جیتی جاگتی انسان بھی تھی؟ وہ یہی سوال سوچتی کام میں جُت گئی۔



نبھانا ہے محبت سے

سکینہ سرخ



ابا کا سوڈ سخت آف تھا..... اماں کا چہرہ مُستا ہوا
تھا..... عافیہ نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور عاشر
تو صبح سویرے ہی بائیک لے کر گھبراہٹ سے نکل گیا تھا اور میں
مشین کے کسی فالتو پرزے کی طرح یہاں وہاں لڑھک
رہا تھا۔
پورے گھر میں اگر کوئی چپک رہا تھا تو وہ ماورا
تھی۔ اس کے ہونٹوں پر صبح سویرے جو مسکراہٹ کھلی
تھی وہ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی تروتازہ تھی۔



PDFBOOKSFREE.PK

وہ مستعدی سے پیکنگ میں لگی ہوئی تھی..... نہ آج اسے نیند آرہی تھی اور نہ ہی سر میں درد ہوا تھا..... نہ طبیعت گھبرائی اور نہ جی متلایا..... پہلی بار میں اسے اس قدر چاق و چوبند اور خوش دیکھ رہا تھا..... جبکہ میرا دل وقت کے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈوبا جا رہا تھا..... ساری شوخی اور شرارت ہوا ہو چکی تھی۔ غصے سے ابلتا ہوا خون برف کی طرح ٹھنڈا ہوئے جا رہا تھا اور عقل کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔

”اف یہ میں نے کیا کر دیا..... بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں تک جا پہنچی..... لیکن اب جو ہونے جا رہا تھا اس سے کیسے بچوں؟“ میں نے گنپٹی مسلتے ہوئے سوچا۔

اماں کی طرف بڑھا..... وہ آنسو پونچھ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑی تو منہ پھیر کے بیٹھ گئیں۔ ابا جو بظاہر ”مجھے کیا“ کی عملی تفسیر بنے بیٹھے ٹی وی پر چلنے والا ٹاک شو دیکھ رہے تھے مزید تیوریاں چڑھا کے اینکر کو گھورنے لگے گویا ابھی اسے ٹی وی سے نکال کر باہر لاپٹخیں گے۔

میں نے کچھ کہنے کی ہمت جمع کرتے ہوئے گلا صاف کرنے کو کھٹکھارا..... مگر اس سے پہلے کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکلتا اپا نے ایک دم ٹی وی آف کیا، ریموٹ میز پر پٹخا اور لاؤنج سے نکل گئے۔ اماں کی طرف مڑا تو وہ تنک کے انھیں اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ابا کے پیچھے، پیچھے چل دیں۔ ابا تو خیر کبھی کبھار غصہ کر ہی لیا کرتے تھے مگر اماں کافی مستحمل مزاج تھیں..... زندگی میں پہلی بار میں انھیں غصے میں دیکھ رہا تھا..... گو کہ انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا صرف روئے جا رہی تھیں مگر ان کی نگاہوں میں جو کاٹ تھی وہ مجھے اندر تک کاٹے جا رہی تھی..... شاید غلطی صرف میری ہی تھی مگر جو کچھ بھی ہوا وہ اس قدر اچانک تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ شاید مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ جتنی مصیبت میں، میں پچھلے دس ماہ اور گیارہ دنوں سے مبتلا

تھا وہ شاید میں ہی جانتا تھا، میرے گھر والے مجھ پر بیٹنے والے اس ظلم سے آگاہ نہیں تھے..... ہم مردوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ آدھی زندگی ابا کے زیر تسلط اور باقی کی آدھی بیوی کے خوف میں گزر جاتی ہے..... کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع تب ملتا ہے جب سانس کی آمد و رفت ہی بند ہو جاتی ہے..... کمائیں ہم اور اس کمائی پر عیش دوسرے کرتے ہیں..... شادی شدہ مردوں کی زندگی تو ٹینس کی اس گیند کی طرح ہوتی ہے جو ایک کورٹ سے دوسرے کورٹ تک پھدکتی پھرتی ہے..... کبھی اماں ابا کی سائڈ تو کبھی بیگم کی طرف..... اور جہاں بھی جاؤ ”ہٹ“ ہی لگائی جاتی ہے۔ صبح سے اب تک گھر کے کئی چکر لگانے اور پھر کونوں کھدروں میں بیٹھ کر سگریٹ پینے کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ تف ہے ایسی بے بسی کی زندگی پر..... آدمی جتنا شریف ہوتا ہے ہر طرف سے اس پر اتنے ہی جوتے برستے ہیں..... آنے والے مستقبل کا خوف ابھی سے لرزائے لگا تھا..... بارہویں سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کو زمین پر پھینک کر زور، زور سے جوتے سے مسلنے کے بعد گویا میں نے اپنے اندر کی فرسٹریشن اس پر نکال دی۔

☆☆☆

”لڑکی مجھے سلیقہ شعار لگ رہی ہے..... گھر بھی صاف ستھرا تھا اور وہ خود بھی تمیز دار لگ رہی تھی۔“ اماں خوش ہو کے بولیں۔

”خاندان اچھا ہے، شریف لوگ لگتے ہیں۔“
”خوب صورت بھی ہیں۔“ عافیہ نے گویا میرے ذہن میں اٹھنے والے اس اہم ”سوال“ کو پڑھ لیا۔

عاشق شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں مشرقی مردوں کی طرح سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اپنے سے دو سال چھوٹے اس شریر بھائی سے نگاہیں ملانے سے گریز کر رہا تھا کہ مبادا نگاہیں ملیں اور میری ہلکی چھوٹ جائے اور اماں ابا کے سامنے شرمندگی ہو۔

تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا..... اس کے سامنے تو میں کچھ بھی نہ تھا..... میں اس سے مرعوب ہو گیا۔ نتیجتاً اسے خوش رکھنے کے لیے جو کچھ میرے بس میں تھا اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

وہ حسین تھی..... حسین ترین ہو گئی، مغرور تھی مغرور ترین ہو گئی۔ اماں ابا بھی بہو کے لاڈ اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے..... عافیہ، بھابی کی دیوانی تھی اور عاشر بھی بہت خوش تھا گو وہ عمر میں عاشر سے چھوٹی تھی لیکن وہ بھابی سے انتہائی احترام سے پیش آتا۔

میرا گھر جنت بن چکا تھا..... شادی کے بعد دو مہینے کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا..... روز گھومنے پھرنے اور دعوتیں اڑانے کے ساتھ، ساتھ ہم دونوں پندرہ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی سیر بھی کر آئے۔ رفتہ، رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔

میں نے یا گھر والوں نے ماورا پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ خود ہی آہستہ، آہستہ گھر کے ماحول میں رچ بس جائے گی۔ مگر شاید یہ ہماری خام خیالی تھی۔

شروع، شروع میں جب میں آفس جاتا تو وہ سو رہی ہوتی، واپس آتا تو وہ نئی ٹھنی کمرے میں بیٹھی ہوتی۔ اسے دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ جاتا۔ ہم دونوں لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک دوسرے پر نثار ہوتے..... کبھی وہ میکے جانے کی فرمائش کرتی تو ہم وہاں چلے جاتے اکثر رات کا کھانا بھی وہیں کھا لیتے۔ اس کا گھر بڑا خوب صورت تھا..... کھلا، کھلا سا آراستہ و پیراستہ.....

اس کا کمرہ ابھی تک اس کی اماں نے جوں کا توں رکھا ہوا تھا..... وہ جب بھی جاتی کچھ دیر اپنے کمرے میں ضرور گزارتی..... ماں باپ تو خیر آؤ بھگت کرتے ہی..... دونوں بھائی اور بھابیاں بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں وہ میکے جا کے خوب چہکتی تو مجھے بھی خوشی ہوتی۔

کچھ وقت اور بسر کا..... تو اماں نے کچھ دے، دے انداز میں شکایت کی۔

”دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ سب سے چھوٹی ہے..... دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں..... دونوں بھائی بھی شادی شدہ ہیں..... اماں ابا بفضلِ خدا حیات ہیں بلکہ دادی بھی حیات ہیں اور کافی ضعیف ہیں اور سب ساتھ ہی رہتے ہیں۔“ اماں نے بایوڈٹا بتایا۔

”اگلی بار تصویر بھی لے آؤں گی تاکہ آپ بھی دیکھ لیں۔“ عافیہ کا ذہن ہونے والی بھابی کی خوب صورتی میں اٹکا ہوا تھا۔

”ارے اب پہلے ان لوگوں کو اپنے گھر بلانا ہوگا تاکہ وہ بھی لڑکے کو اور ہمارے گھر کو دیکھ لیں۔“ اماں نے جلدی سے کہا۔

”بالکل صحیح کہا..... گھر تو ضرور دیکھ لیں..... ان کے گھر کے مقابلے میں کافی چھوٹا ہے ہمارا گھر.....“ ابا کا لہجہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”آج کل سمجھ دار والدین لڑکے کو دیکھتے ہیں..... لڑکے کی تعلیم، اس کی جاب اور اس کی شخصیت..... اور ان سب میں ہمارا عام ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ ابا فخر سے بولے۔ میں بدستور سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔

ہر مشرقی اور شریف لڑکے کی طرح میرے دل میں بھی بڑے ارمان تھے۔ ایک اچھی محبت کرنے والی، خوب صورت اور خدمت گزار بیوی کے خواب میری آنکھوں میں تب سے چلنا شروع ہو گئے تھے جب سے انجینئر بننے کے بعد اپائنٹ لیٹر ہاتھ میں آیا تھا اور اب اس خواب کی تعبیر ملنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ہمارے گھر کی پہلی اور ان کے گھر کی آخری شادی، سو دونوں اطراف سے تمام ارمان پورے کیے گئے۔

ماورا میری توقع سے زیادہ حسین تھی۔ بڑے گھر کی انتہائی لاڈلی، خوب صورت لڑکی میری بیوی بن چکی

”کیا مطلب..... کیا ماورا دن میں کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی؟“ میں حیران ہوا۔ روزانہ صبح جب میں آفس جاتا تو مجھے ناشتا اماں یا عافیہ ہی دیتی تھیں۔ وہ سوری ہوتی تھی تو میں بھی اس کا آرام خراب نہ ہونے کی وجہ سے اسے نہیں جگاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ ہی جاتی ہوگی اور باہر آ کے اماں اور عافیہ کا ہاتھ بٹاتی ہوگی۔

”وہ تو سارا دن سوئی رہتی ہے..... شروع، شروع میں کچھ دن عافیہ اس کے لیے ناشتا لے کر گئی تو اس نے منع کر دیا کہ وہ ناشتا نہیں کرتی..... پھر دوپہر کے کھانے پر جگایا تو بولی آپ لوگ کھالیا کریں میرا انتظار مت کریں۔ میں جب اٹھوں گی اور بھوک لگے گی تو خود ہی کھالوں گی۔ اب اس کے بعد کبھی، کبھی تین چار بجے تک باہر آ جاتی ہے اور کچھ کھاپی لیتی ہے کبھی باہر ہی نہیں آتی..... خدا جانے سوری ہوتی ہے یا جاگ رہی ہوتی ہے..... پھر شام میں عافیہ چائے لے کر اس کے کمرے میں جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کسی سے فون پر بات کر رہی ہوتی ہے عافیہ چائے رکھ کے چپ چاپ باہر آ جاتی ہے..... بیچاری کو بڑی تمنائیں تھیں کہ بھائی سے دوستی کرے گی، گپ شپ کرے گی..... ایک بہن کی کمی پوری ہو جائے گی..... مگر.....“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے ماورا سے بات کرنے کا سوچا۔

”اور بھی تم نے یہ تو نہیں بتایا کبھی کہ دن کیسے گزرتا ہے تمہارا.....“ میں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے طریقے سے بات کا آغاز کیا۔

”انتہائی بور اور بیکار۔“ اس نے منہ بنایا۔

”کیا مطلب؟“ میں حیران ہوا۔

”مطلب یہ کہ کچھ کرنے کو ہی نہیں ہے۔ بس سوتی ہوں، سو کر اٹھتی ہوں، فریش ہوتی ہوں کچھ کھاتی چیتی ہوں اپنا کمر صاف کرتی ہوں اور اس کے بعد ٹائم پاس کرتی ہوں..... کبھی فون پہ گپ شپ کر لی، کبھی کوئی مووی دیکھ لی۔“ اس نے منہ لٹکا کے کہا۔

مجھے اپنی اس معصوم بیوی پر پیارا آ گیا۔

”تو کیوں اتنا بور ہوتی ہو..... کمرے سے باہر نکلا کرو۔ اماں، ابا، عافیہ سے گپ شپ کرو۔“ میں نے دانستہ ”کام“ کو گول کر دیا۔

”وہ لوگ میرے مزاج کے نہیں ہیں۔ آٹھ بجے تمہارے گھر ناشتا ہو جاتا ہے..... ایک ڈیڑھ بجے تم لوگ کھانا کھا لیتے ہو..... یہ انڈا، پراٹھا، دال، سبزی، بریانی ٹائپ چیزیں میں نہیں کھا سکتی..... اور نہ ہی اتنی جلدی میرے ناشتے کھانے کا ٹائم ہوتا ہے..... آنٹی کے پاس خاندان والوں کے علاوہ کوئی ٹائپ ہی نہیں ہے بات کرنے کو..... عافیہ صرف اپنے کالج کے گھسے پٹے قصے لے کر بیٹھ جاتی ہے اور انکل سے کیا بات کروں..... بس اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہتی ہوں۔“ اس کے جواب نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ میرے گھر والوں کے لیے کیسے جذبات رکھتی تھی، مجھے بے انتہا افسوس ہوا۔

”تم باہر نکلو گی سب کے ساتھ بیٹھو گی تب ہی تم ان کو اور وہ تم کو سمجھیں گے۔ آہستہ، آہستہ تم سب ایک دوسرے کو سمجھنے لگو گے تو خود بخود سب اچھا لگنے لگے گا۔“ میں نے اپنی مایوسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں زیادہ سوشل نہیں ہوں عامر۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اس میں سوشل ہونے کی کیا بات ہے..... یہ تمہارا گھر اور یہ سب تمہارے گھر والے ہیں یار.....“ میں ہلکا سا جھنجھلا گیا۔

جواباً وہ کچھ نہیں بولی بس اپنے ہاتھوں میں پڑے کنکرن سے کھیلتی رہی جو اسے میں نے منہ دکھائی میں پہنایا تھا۔ یہ کنکرن اسے بہت پسند تھا۔ وہ اسے ہر وقت پہنے رہتی تھی اور میں یہ دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اسے میری دی ہوئی چیز سے کتنی محبت ہے..... میرے دیے ہوئے تحفے سے اتنی محبت مگر مجھ سے جڑے رشتوں کی یہ قدر افزائی.....؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”اچھا چلو ایسا کرو کل سے تم میرے لیے ناشتا بنایا

کرو۔“ میں نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے مگر دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے لگاؤٹ سے کہا۔
”میں..... ناشتا.....؟ سوری عامر میں تو ناشتا کرتی ہی نہیں بناؤں گی بھلا کیا! تم پلیز میری وجہ سے اپنی روٹین مت ڈسٹرب کرو..... جیسے چل رہا ہے چلنے دو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

ماورا شاید عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی مختلف ہے..... یعنی میری انتیس سالہ زندگی میں، میں نے جتنے ڈرامے دیکھے یا دوستوں میں جو بھی گپ شپ ہوئی یا اپنے اور دوستوں کے گھروں کے جس قدر حالات سے میں واقف تھا وہاں کہیں دور، دور تک ایسی ”بہو“ یا بھابی دیکھی نہ سنی تھی۔

میرا تو خیال تھا کہ شادی کو تین ماہ گزرنے کے بعد اسے سب میں کھل مل کے اسی خاندان کا حصہ بن جانا چاہیے تھا..... خیر، لگتا ہے اسے گھلانے ملانے کے لیے مجھے ہی کوشش کرنی پڑے گی۔

☆☆☆

اس دن میں آفس سے جلدی آ گیا..... اماں نے دروازہ کھولا..... اور حیران رہ گئیں۔

”تم اس وقت..... سب خیر تو ہے بیٹا؟“
”جی اماں بس آج ذرا چھٹی مل گئی۔“ میں مسکرایا۔
”چلو آؤ..... ہم نے تو ابھی، ابھی کھانا کھایا ہے تم منہ ہاتھ دھولو، میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”ارے نہیں اماں آپ کیوں..... میں ماورا سے کہتا ہوں۔“ میں نے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھایا۔
اماں کچھ نہ بولیں مگر انہوں نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا میں نے کوئی انہونی ناقابل یقین بات کہہ دی ہو۔

میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا..... ماورا شاید نہا کے نکلی تھی اور ڈریسنگ ٹیبل پہ بیٹھی ہنسنے ڈرامے اپنے بال سکھا رہی تھی..... اس نے چونک کے گردن گھمائی اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں

میں بھی حیرت در آئی۔ ”آپ اس وقت؟“
”ہاں یار، بس آج ذرا جلدی چھٹی ہو گئی..... تم ابھی جاگے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں آدھا گھنٹا سو رہا ہے۔“ اس نے ہنسنے ڈرامے پر ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے وال کلاک پر نظر دوڑائی وہاں سواتین بج رہے تھے۔

”پھر تو تم نے بھی لنچ نہیں کیا ہوگا۔ مجھے بھی بڑی زبردست بھوک لگ رہی ہے۔ ایسا کرو کہ تم اپنا اور میرا کھانا یہیں لے آؤ..... دونوں مل کے کھاتے ہیں۔“ میں نے پلان کے پہلے حصے پر عمل کیا۔

”مگر میں تو لنچ نہیں کرتی۔ کچھ فروٹس اور دودھ لے لیتی ہوں اس وقت.....“ اس نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں..... آج میرے ساتھ میرا دل رکھنے کو ہی لنچ کرلو..... میں کون سا روز، روز اس ٹائم دفتر سے آتا ہوں۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”تم عافیہ سے کہہ دیتے ناں۔“ وہ جھنجھلائی۔
”کیوں اس سے کیوں کہوں..... بھئی اب میں بیوی والا ہوں اپنی بیوی سے کہوں گا کہ جائے میرے لیے گرم روٹیاں بنائے اور پھر ہم دونوں اکٹھا کھانا کھائیں..... سوچو کتنا رومیٹک لگتا ہے ناں.....“ میں نے ہنس کے کہا۔

”بالکل بھی نہیں..... روٹیاں بنانا ہر گز بھی رومیٹک کام نہیں ہے۔“ اس نے برملا کیا۔
”شوہر کے لیے روٹیاں بنانا رومیٹک نہیں لگتا تمہیں؟“ میں نے لہجہ کو افسردہ بناتے ہوئے کہا۔
”پلیز عامر کیوں بور کر رہے ہو..... چھوڑو لنچ..... تم بھی میرے ساتھ آج فروٹ کھاؤ۔“ اس نے بیڈ روم فریج سے سیب اور مالٹے نکالتے ہوئے کہا۔

”مگر مجھے بھوک.....“ میں نے کمزور سا احتجاج کرنا چاہا۔
”تو اس سے بھی بھوک مٹ جائے گی..... اور فروٹ تو صحت کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں..... اس

2015 دسمبر ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2015

سے اسکن اچھی اور خون صاف ہوتا ہے..... یہ بتاؤ دودھ ٹھنڈا پیو گے یا گرم.....“ اس نے پوچھا اور دودھ کا پیکٹ ہاتھ میں لیے مائیکرو ویو کی طرف بڑھی..... کمرے میں فریج بھی تھا، مائیکرو ویو بھی، جو سر اور بلینڈر بھی..... کافی میکر بھی..... اس نے اپنے جہیز میں ملنے والے کچن آئٹمز کو کمرے ہی میں سجا کے منی کچن تعمیر کر لیا تھا..... اب باہر نکلنے کی ضرورت بھی کیا تھی..... ان سب چیزوں کو دیکھ کر پہلی بار ان پر غصہ آیا۔

”دودھ تو میں نے دس بارہ برس کی عمر میں پینا چھوڑ دیا تھا۔“ میں نے منہ بنایا۔

”تو کافی بنا دوں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، یہ کافی پینے کا کون سا ٹائم ہے..... تم کرو اپنے شوق پورے..... میں آرام کروں گا۔“ میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ سارا پلان چوہٹ ہو گیا تھا۔ میرا تو مقصد اسے کمرے سے باہر نکالنا اور اماں کے پاس کچن میں بھیجنا تھا تا کہ کفر تو ٹوٹے کسی طرح..... مگر وہ شاید بہت چالاک تھی..... یا پھر ضدی..... اب عالم یہ تھا کہ واقعی بھوک سے برا حال ہو رہا تھا مگر اب باہر جا کے اماں سے کھانا مانگنے پر شرم بھی آرہی تھی۔

میں نے بس جوتے اتارے اور آفس کے کپڑوں ہی میں بستر میں گھس گیا۔

ماورا بے نیازی سے مالٹے کے چھلکے اتارنے لگی۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اماں کا موڈ مستقل آف رہنے لگا..... عافیہ کے ایگزامز چل رہے تھے، وہ پڑھائی میں مصروف تھی اور گھر کا سارا بار اماں کے کمزور کندھوں پر آ پڑا تھا۔ اباریٹارمنٹ کے قریب تھے، اکثر بیمار رہتے تھے۔ دے کا دائمی مرض تھا انہیں، جس نے انہیں کمزور کے ساتھ، ساتھ چڑچڑاہی بنا دیا تھا۔ جب بیمار پڑ جاتے اور گھر میں رہتے تو اماں بیچاری ان کی دیکھ بھال کرنے ہی میں حال سے بے حال ہو جایا کرتی تھیں..... اور آج کل ان کی بیماری ہی کا دور چل رہا تھا اور اماں گھر کے کاموں اور ابا کی حصار داری

میں بری طرح الجھی ہوئی تھیں۔ عاشر کا میڈیکل کا فائل ایئر تھا..... اس کی اسپتال ہی میں ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ گھر آتا تو وہ بھی ابا ہی میں مصروف رہتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ گھر کے افراد مجھ سے کھچے کھچے سے ہیں۔ وجہ میں بخوبی جانتا تھا مگر افسوس کچھ کرنے پہ قادر نہ تھا کہ میری بیوی اپنے طور طریقے بدلنے پر بالکل بھی راضی نہ تھی اور اب تو اسے ایک مستقل بہانہ ہاتھ آ گیا تھا..... وہ امید سے تھی..... اس پر ختی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

تنگ آکر میں نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک مستقل ملازمہ کا بندوبست کر دیا۔ گوکہ میری تنخواہ کا ایک معقول حصہ اس مد میں نکلنے لگا مگر اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا۔

اماں نے سکون کی سانس لی تو ان کے ماتھے کے بل بھی قدرے کم ہوئے..... مگر ظاہر ہے کام کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا مگر بہو اور سسرال والوں کے درمیان فاصلے تو بدستور برقرار تھے۔

شاید بچہ ہو جائے تو حالات بہتر ہو جائیں..... وہ اپنے خول سے باہر نکل آئے اور سب میں گھلنے ملنے کا قرینہ سیکھ جائے..... امید پر دنیا قائم تھی..... سو میں بھی اس کے ساتھ، ساتھ ”امید“ سے تھا۔

☆☆☆

”مجھے ماما یاد آرہی ہیں.....“ میں آفس سے گھر واپس آیا، تھکا ماندہ کمرے میں داخل ہوا تو سلام دعا کے بغیر اس نے رونی صورت بنا کے کہا۔

”تو ان کو فون کر لو.....“ آج دفتر میں ظہیر صاحب..... جو کہ اتفاق سے میرے پاس ہوتے تھے..... سے میری ہلکی پھلکی جھڑپ ہوئی تھی..... میرا موڈ سخت آف تھا۔ نوکری برقرار رکھنے کے لیے کیسوں کیسوں سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے، آفیسرز کی تلخ و ترش سنی پڑتی ہے..... کتنی ہی بڑی ڈگری ہو یا بھاری بھر کم کو ایفیکشن..... جو نیز بہر حال جو نیز ہی ہوتا ہے..... سینئرز کب کس بات پر بھڑک جائیں..... کچھ پتا نہیں

”تم نے غلطی کی ہے اور اب غلط کہہ بھی رہی ہو... تم نے میرے گھر والوں کو کبھی اپنا سمجھا ہوتا تو آج تمہیں تمہارے اپنے یاد نہ آرہے ہوتے۔“ میں چبا کے بولا۔

”تمہارے گھر والوں سے میرا مزاج نہیں ملتا..... ان کی اور میری سوچ میں بہت زیادہ فرق ہے..... تمہیں نہیں پتا میں یہاں کتنی مشکل سے رہتی ہوں..... کسی سے کچھ کہتی سنتی نہیں ہوں پھر بھی تمہاری ماں اور بہن اکثر کوئی نہ کوئی طنزیہ بات کر جاتی ہیں..... تمہارے باپ اور بھائی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔“ وہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔

”بالکل ایسا ہی ہوتا ہوگا اور اس کی وجہ تم خود ہو۔“ مہینوں سے دل میں بھرا ہوا غبار نکلا تو میری زبان بھی کھلنے لگی۔

”تمہارے اردیتے سہی وہ سب تم سے بیزار ہوئے
ہیں ورنہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سب تمہیں کتنی
محبت اور عزت سے بیاہ کر لائے تھے..... تم ان کے
بڑھے ہوئے ہاتھوں کو ذرا تھامتی تو سہی..... تم نے خود
کھویا ہے ان سب کو.....“ میں نے اسے آئینہ دکھایا۔

”دیکھو میں یہ سب نہیں جانتی..... مجھے صرف اپنا اور اپنے بچے کا خیال ہے..... ساجد بھائی اور ان کی فیملی اگلے ہفتے وہی شفٹ ہو رہے ہیں۔ سائرہ اور عذرا باجی پہلے ہی کینیڈا میں ہیں..... اب صرف عابد بھائی یہاں رہ جائیں گے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر شفٹ ہو جاؤں..... اتنا بڑا گھر ہے..... بھائیں، بھائیں کرتا ہے..... ساجد بھائی کے جانے کے بعد تو اور خالی ہو جائے گا..... ماما، بابا بھی میرے اس فیصلے سے خوش ہیں.....“ میں آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہا تھا..... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم مجھے چھوڑ کے یہاں سے چلی جاؤ گی؟“
 ”تمہیں چھوڑ کے کیوں جاؤں گی..... تم بھی میرے
 ساتھ ہی جاؤ گے۔“ وہ اس عرصے میں پہلی بار مسکرائی۔

ہوتا۔ میں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے جوتے، موزے اتارنے لگا..... دوسری طرف ماورا منہ بتا کے بیٹھی رہی۔
 ”کیا ہوا؟“ میں نے اس کی جانب خاموشی دیکھ کر مڑ کے اسے دیکھا۔

”فون میں ان کو روز کرتی ہوں..... مجھے ان کے پاس جانا ہے۔“ وہ ٹھنکی۔
 ”ٹھیک ہے، کل ہفتہ ہے تمہیں ملا لاؤں گا۔“
 میں نے جلدی سے کہا۔

”کل نہیں آج..... بلکہ ابھی..... اور ملا نہیں۔۔۔
لاؤں گا میں وہاں رہنے جاؤں گی۔“ اس نے بدستور
ٹھنکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوچھی تمہیں..... رہنے کا کیا مطلب..... تمہاری حالت ایسی ہے کسی بھی وقت کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے ابھی تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔“
میں نے اپنے سر کے درد کو یہ شکل ضبط کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”میں نے کہہ دیا کہ جانا ہے تو جانا ہے..... اور حالت کا کیا مسئلہ ہے، اگر وہیں کچھ ہوا تو گھر میں تین تین گاڑیاں ہیں سب لوگ ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میرا دل یہاں نہیں لگتا..... وہاں سارے میرے اپنے ہیں.....“ اس کا آخری جملہ میرے سر میں جو درد سے پھٹنے کے قریب تھلراکت کی طرح جا کے لگا اور بالآخر سر پھٹ گیا۔

”کیا مطلب؟“ میں چیخا۔ ”وہاں تمہارے سارے اپنے ہیں اور یہاں پر اے بلکہ دشمن.....“

اس نے پہلی بار مجھے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھانکا جس پر اس نے فوراً قابو لیا۔

”یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟“ وہ غصے میں بولی۔

”یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو.....؟“
میں بھی غصے میں پھنکارا۔

”میں نے کیا غلط کہہ دیا؟“ وہ تنقلا کے کھڑی ہو گئی۔

”اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہارے پیچھے
 پیچھے چل دوں گا؟“ میں غرایا۔
 ”عقل سے کام لو گے تو چل ہی دو گے..... دیکھو
 تمہارا چھوٹا ساتن کمروں کا تو گھر ہے۔ ایک کمرہ مجھے
 اور تمہیں ملا ہوا ہے..... ایک میں اماں اور عافیہ سوتے
 ہیں اور دوسرا جو ڈرائنگ روم کا کام دیتا ہے وہاں
 تمہارے ابا..... اور بیچارہ عاشر چھت پر بنے ہوئے
 اس نامکمل سے کمرے میں رہتا ہے۔ جہاں دس منٹ
 بیٹھنا بھی مشکل ہے..... اب تمہاری جاب اچھی سی مگر
 ترقی کر کے زیادہ پیسے کما کے اپنا کوئی گھر بناؤ گے تو بھی
 اس میں بیس سال کا عرصہ تو لگ ہی جائے گا۔ جب
 قدرت تمہیں مجھے اور ہمارے ہونے والے بچے کو ایک
 بہتر اور صاف ستھرا ماحول دینے جارہی ہے تو انکار
 کیسا.....؟“ اس نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
 مجھے سمجھایا۔

”جب تمہارے اماں، ابا تم سے میری شادی پر
 تیار ہوئے تھے تو انہیں میرا گھر نظر نہیں آیا تھا؟“
 میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
 ”انہیں تمہاری ڈگری، تمہاری قابلیت اور
 تمہاری وجاہت نظر آئی تھی..... گھر کو انہوں نے انور
 کر دیا تھا..... سچی بات بتاؤں تو وہ یہ بھی کہ انہوں نے
 سوچا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد وہ کرائے پر
 ہمیں کوئی بہتر گھر لے دیں گے..... مگر تمہارا فیملی
 سسٹم..... میں پورے لاؤ لشکر کے ساتھ کہیں بھی
 شفٹ ہونا نہیں چاہتی تھی..... اس لیے.....“

”تو اب تمہارا کیا خیال ہے میڈم..... کہ تم لاؤ
 لشکر یہیں چھوڑ کے صرف مجھے لے آؤ گی..... تو یہ
 تمہاری خام خیالی ہے..... نہ میں کہیں جاؤں گا اور نہ
 ہی تم..... سمجھیں.....“ میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے
 سے پہلے ہی کاٹ دیا..... دو عدد سردرد کی گولیاں پانی
 کے ساتھ نگلیں اور بغیر کچھ کھائے پیے بستر پر لیٹ
 گیا..... خون، رگوں میں گویا آگ کی طرح دوڑ رہا
 تھا..... ولت اور بے عزتی کا ملا جلا احساس اندر ہی

اندر کچھ کے لگا رہا تھا۔ یہ لڑکی نادانی میں یہ سب کچھ کہہ
 رہی ہے یا غرور میں..... شاید نفرت میں یا ہو سکتا ہے
 غصے میں..... میری کنپٹیوں پر دستک دیتا درد دھیرے
 دھیرے کم ہونے لگا..... میں سونے لگا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح آنکھ کھلی تو میں نے مڑ کر اس کی سائڈ پر
 دیکھا..... وہ موجود نہیں تھی..... دھیرے، دھیرے مجھے
 گزشتہ رات کی اپنی اور اس کی تلخ کلامی یاد آئی.....
 میں رات بھی غصے میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا تھا۔

شادی سے پہلے چاہے کچھ بھی ہو جائے اماں
 مجھے کبھی بھوکا سونے نہیں دیتی تھیں اور اب پچھلے چند ماہ
 سے میں ان گنت بار بھوکا سوچکا تھا۔ اماں بھی شاید
 عادی ہو گئی تھیں..... نہ جانے وہ میرے اس عمل کو کیا
 معنی پہناتی ہوں گی۔ ان سے اب میرا آتنا سا مناکم
 ہی کم ہوتا تھا..... عافیہ کا یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا تھا۔

اب مجھے صبح ناشتا نسرین بنا کے دیا کرتی تھی..... اماں
 بھی کبھی کبھار نظر آ جاتی تھیں ورنہ وہ ابا کے ساتھ
 کمرے ہی میں ناشتا کرنے لگی تھیں۔ عاشر کا ہاؤس
 جاب چل رہا تھا وہ تو مفتوں مجھے نظر ہی نہیں آتا تھا خدا
 جانے کب گھر آتا جاتا تھا..... ابا کے کمرے میں خود ڈر
 کے مارے نہیں جاتا تھا وہ ہی اگر باہر نظر آ جاتے تو دو
 گھڑی کو ان کے پاس بیٹھ جاتا ورنہ نہیں..... میں غیر
 محسوس طریقے سے اپنے گھر والوں سے دور ہوتا چلا
 جا رہا تھا..... شادی کے ان سائڈ ایفیکٹس کے بارے
 میں، میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن
 ابھی یہ ہے کہاں..... میں نے اٹھ کر باتھ روم چیک
 کیا..... خالی ملا..... کہیں رات والی باتوں سے متاثر ہو
 کر میرے لیے ناشتا بنانے تو نہیں چلی گئی..... میں نے
 تصور کی آنکھ سے ماورا اور اماں، ابا کو کھانے کی میز پر
 ہنستے مسکراتے ناشتا کرتے دیکھا..... ایک ٹھنڈی
 سانس بھری اور باتھ روم میں گھس گیا۔

تیار ہو کے باہر نکلا تو اماں کچن کے سامنے
 کھڑی تھیں..... اور نسرین میرے لیے ٹیبل پر ناشتا

دن تھا جس نے مجھے کئی معاملات میں دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا اور شاید آج کا دن ممکن ہے کہ کسی فیصلے کا ہو..... میرا ذہن مختلف فکروں میں پھنسا ہوا تھا۔

☆☆☆

توقع کے خلاف آفس کا ماحول نارمل تھا۔ باس کا وہ منہ جو کل پھول کے غبارے کی شکل اختیار کر گیا تھا آج اپنے نارمل سائز پر واپس آ چکا تھا۔ میں بھی ایسا ہی بن گیا جیسے میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں..... مستعدی سے اپنے فرائض انجام دینے لگا..... لنچ ٹائم پر گھر کا محاذ یاد آیا۔ ابھی ماورا کو کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سر صاحب کا نمبر موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا۔

”اوہو..... لگتا ہے اپنے ماں، باپ سے میری خوب شکایتیں لگادی گئی ہیں۔“ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے سوچا۔

”کیسے ہو بیٹا.....؟“ سر صاحب کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا..... یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔

”میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟“ میں نے بھی تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

”ہاں ہم لوگ تو ٹھیک ہیں بس ماورا.....“ وہ کہتے، کہتے رک گئے۔

”کیا ہوا ماورا کو؟“ میں ایک دم پریشان ہو گیا۔

”وہ اصل میں کافی اسٹریس میں تھی..... ایسی حالت میں اسٹریس کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید وہ میرے ضبط کا امتحان لے رہے تھے..... سو میں نے بھی خود پر کنٹرول کرنے کی ہر ممکن کوشش کی..... اور کچھ نہ بولا۔

میری خاموشی دیکھ کر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

”اب بہتر ہے اس کی طبیعت، اسپتال سے گھر لے آئے ہیں۔“ انہوں نے پھر پہلی بجھائی۔

صبح سات بجے وہ میرے گھر سے نکلی..... اور اب دو بج رہے تھے..... اس عرصے میں وہ اسپتال سے بھی ہو آئی..... خیر.....

”چلیں شکر ہے اب اس کی طبیعت بہتر ہے.....“

رکھ رہی تھی..... اس سے پہلے کہ میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اماں سے ماورا کے بارے میں پوچھتا، اماں خود ہی بول پڑیں۔

”ماورا کے گھر سے صبح، صبح گاڑی آئی تھی، وہ میکے چلی گئی ہے، کہہ کر گئی ہے کہ جب تمہیں فرصت ہو تو اس سے بات کر لینا۔“ اماں کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”جی اماں.....!“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ دل نہ چاہنے کے باوجود ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ تاکہ ہر چیز نارمل نظر آئے۔

”اگر ڈلیوری کے لیے اس کا پروگرام میکے جا کے رہنے کا تھا تو کم از کم تم ہی مجھے بتا دیتے، میں تو یہاں تیار یوں میں لگی رہی۔“ اماں سے نہ رہا گیا۔

میں اماں کو کیا بتاتا جب کہ اس کے پروگرامز مجھ پر کل رات ہی منکشف ہوئے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم اماں کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”تم نے تو عامر ہم سب کی ناک ہی کٹادی بیٹا..... ہم تو یوں اپنی نگاہوں میں جرم نہ کر کے بھی مجرم بن گئے کہ کسی سے کیا کہیں؟“ وہ میرے سامنے بیٹھ کر کن انکھیوں سے کچن میں کام کرتی نسرین کو دیکھ کر دبے لہجے میں بولیں۔

”میں آفس سے آ جاؤں پھر اس پر بات کر لیتے ہیں.....“ میں نے جلدی، جلدی چائے کے چند گھونٹ بھرے اور اٹھ کھڑا ہوا..... وہ کچھ نہ بولیں بس مجھے دیکھتی رہیں..... کچھ بھی تھا ماورا میری بیوی تھی..... میری سچ سچ کی پہلی چاہت..... اس کے آنے سے میری زندگی میں بہار آ گئی تھی..... وہ بہار دھیرے دھیرے کیوں خزاں میں تبدیل ہونے لگی مجھے ہرگز نہیں معلوم تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد سب کچھ ایک دم سونا، سونا لگنے لگا تھا..... میں نے باہر آ کے بے دلی سے کار اشارٹ کی اور آفس کی طرف روانہ ہو گیا..... وہاں پر بھی حالات نہ جانے کیسے ہوں گے کچھ پتا نہیں..... کل کا دن شاید میری زندگی کا ایک ایسا

میری طرف سے بھی پوچھ لیجیے گا اسے۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”اب فون بند کرتا ہوں۔“

”ارے، ارے سنو تو میاں..... تم آفس سے سیدھے ادھر آؤ، تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ بالآخر اصل مددے پر آگئے۔

”جی ہاں فرصت ملے گی تو ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے پھر مچھلی جڑی چھوڑی۔

”فرصت کیسی صاحبزادے، آپ آج ہی تشریف لائیں۔“ وہ بھی ذرا تیز ہوئے۔

”دیکھیے انکل“ میں نے عرض کیا ہے ناں..... فرصت ملے گی جب آجاؤں گا۔“ میں نے تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں نکا سا جواب دے کر فون بند کر دیا..... جب میں ٹینشن میں ہوں تو تھوڑی سی ٹینشن دوسروں کو بھی سہی..... میرے سر میں دوبارہ درد شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کئی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو جناب جنید جاوید یعنی سر جی نے انگلیاں ٹیڑھی کر لیں یعنی ابا کو فون ملا دیا۔

میں گھر پہنچا تو میری پھیلائی ہوئی ٹینشن گھوم پھر کے دوبارہ میرے اپنے گھر واپس آ چکی تھی۔

”آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ ابا کا موڈ سخت خراب تھا۔

”جی مجھے نہیں معلوم.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تمہیں نہیں معلوم تو پھر کس کو معلوم ہوگا؟“ وہ تیز لہجے میں بولے۔

”تمہارے سسرال والے چاہتے کیا ہیں آخر.....؟“ اباں کچھ، کچھ معاملے کی تہ تک پہنچ چکی تھیں۔

”ان لوگوں سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔“ ماورا کے ابا نے مجھے گھر بلایا تھا اور میں نہیں گیا۔“ میں نے کندھے اچکائے۔

”ایک دن صبح، صبح تمہاری بیوی ایک چھوٹا سا

بیک اٹھا کے اپنے گھر سے گاڑی منگوا کے اپنے ماں، باپ کے گھر چلی جاتی ہے..... بغیر کسی پروگرام کے..... یہاں تک کہ تم بھی بے خبر..... تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے؟“ اباں نے کریدا۔

”اباں آپ تو جانتی ہیں اس کا رویہ سب کے ساتھ کتنا اجنبی ہے..... میرا وجود تک اس کے لیے بس اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ میں اس کا خیال رکھوں، اس کی باتیں مانوں تو ٹھیک ورنہ میری حیثیت کچھ بھی نہیں.....“ میں جھنجلا کر بولا۔

”تو شریف لوگوں کے طور طریقے یہی ہوتے ہیں کہ گزارہ کرتے ہیں..... مصالحت کی کوشش کرتے ہیں..... لڑ جھگڑ کے تھوڑی بیٹھ جاتے ہیں۔“ اباں نے سمجھایا۔

”تم اس کے گھر جاؤ..... ان لوگوں سے ملو اور بات ختم کرو..... ماورا کو واپس گھر لے آؤ.....“ ابا نے فیصلہ سنا دیا۔

”اور جو وہ واپس ہی نہ آنا چاہے؟“ میں منہ، منہ میں بڑبڑایا۔

”کیا کہا تم نے؟“ ابا چونکے۔

”کچھ نہیں.....“ میں سر جھکا کے بولا۔

”تو پھر تم کل جا رہے ہو۔“ ابا اٹھتے ہوئے بولے۔

اباں بھی ابا کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

جانے میں تو کوئی حرج نہیں..... اگر صرف ماورا کو واپس لے کر آنا ہوتا تو میں سو مرتبہ جانے کو تیار تھا..... مگر میں جانتا تھا کہ معاملہ ماورا کو لانے کا نہیں بلکہ میرے وہاں رک جانے پر ختم ہونے والا ہے..... یہ بات میرے بھولے والدین نہیں جانتے تھے اور میں ان کو بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”ماورا ہماری سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ لاڈلی بیٹی ہے۔“ جنید صاحب مجھے چائے سلکٹ، سمو سے، میسٹری ٹھنسانے کے بعد مطلب کی بات پر

آگئے۔

”ہم نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا ہے۔“
بیگم جنید بھی گویا ہوئیں۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے.....“ میں دل ہی
دل میں چلایا۔

”ہمیں تم نیک اور شریف لڑکے لگے تھے۔“
جنید صاحب پہلو بدل کے بولے۔

”مطلب بے وقوف اور احمق.....“ میرے دل
سے آواز آئی۔

”ہمیں لگا تم ہماری بیٹی کو خوش رکھ سکتے ہو..... وہ
بہت کمزور دل کی ہے۔“ بیگم جنید نے ساڑی کا پلوٹھیک
کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل آپ تو اپنی بیٹی کے لیے جو کمزور دل کے
ساتھ، ساتھ کمزور دماغ کی بھی ہے، ایک بے دُم کا بوم
چاہیے تھا۔ جو ڈگڈگی پہ ناچ کے آپ کی بیٹی کو خوش رکھ
سکے۔“ میں پھر دل میں بدبایا۔

”تم تو کچھ کہہ ہی نہیں رہے ہو۔“ مسز جنید نے
مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہہ تو رہا ہوں..... اگر آپ ہی کو سنائی
نہیں دے تو میں کیا کروں.....“ میں نے۔۔۔ ان کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر دل ہی دل میں کہا۔

”دیکھو بیٹے.....“ جنید صاحب کھنکھارتے
ہوئے سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔ ”ہمیں ماورا

عزیز ہے..... تم بھی بے حد عزیز ہو..... میری خواہش
ہے کہ تم اپنے والدین کی اجازت سے ہمارے پاس

میرا مطلب ہے اس گھر میں شفٹ ہو جاؤ..... اتنا بڑا
گھر ہے..... اوپر کا پورشن اگلے ہفتے خالی ہو جائے گا۔

ساجد اپنی فیملی کے ساتھ دبئی شفٹ ہو رہا ہے، تم لوگ
آرام سے رہ سکتے ہو۔“ انہوں نے بالآخر وہ کہہ دیا جو

میں سننے کے لیے گھنٹے بھر سے تیار بیٹھا تھا۔ میری
کیفیت عجیب ہو رہی تھی اور اس عجیب کیفیت میں

میرے منہ سے نکلا۔
”ٹھیک ہے انکل مجھے منظور ہے۔“ میں نے

ایک دم کہا اور خود ہی حیران رہ گیا۔..... دونوں میاں،
بیوی کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔ ان کے منہ کھلے اور
بند ہوئے وہ دونوں شاید اس جواب کی توقع نہیں
کر رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی وہ شاید اپنی خوشی کو
ہضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تو پھر اگلے ہفتے تم لوگ یہاں شفٹ ہو جاؤ.....
کسی بھی قسم کا سامان لانے کی ضرورت نہیں..... یہاں

سب کچھ موجود ہے اور ہاں اپنے والدین کا خیال ضرور
رکھنا..... میرا مطلب ہے خرچا وغیرہ پہلے کی طرح

دیتے رہنا کوئی کوتاہی مت کرنا..... والدین کے بڑے
حقوق ہوتے ہیں۔“ جنید صاحب بیٹھے، بیٹھے لہجے

میں کہتے ہوئے مجھے اس وقت زہر لگ رہے تھے.....
بجائے اپنی بیٹی کو سمجھانے کے وہ مجھے قابو کرنے چلے

تھے۔ ماورا کو سمجھانے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی
تھی..... جہاں ماں، باپ خود ہی بیٹی کی ہر جائز ناجائز

بات پر پشت پناہی کریں وہاں ہر کوشش بیکار ہو جاتی
ہے..... میرا بچہ اس دنیا میں عنقریب آنکھیں کھولنے

والا تھا اور میں ابھی کسی قسم کی محاذ آرائی میں نہیں پڑنا
چاہتا تھا..... ماورا کی ضدی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا

کہ وہ میرے انکار پر مزید کون سا قدم اٹھالے۔
یہ فیصلہ تو میں نے فوراً ہی کر لیا مگر گھر آ کے اماں،

ابا کو بتانا شاید میرے لیے اب تک کی زندگی کا سب
سے مشکل ترین کام تھا مگر تیرکمان سے نکل چکا تھا اگلی صبح

ماورا اپنا ضروری سامان لینے آئی تو انہیں خبر ہو ہی گئی۔
ان کی نگاہوں میں غصہ، افسوس، بے بسی سب

ہی کچھ تو تھا..... میں جس ذہنی کرب سے گزر رہا تھا اس
سے شاید وہ ناواقف تھے..... ورنہ میری بیچارگی پر

افسوس کرتے یوں مجھ سے خفا نہ ہوتے.....
بیٹیوں کی پیدائش پر والدین کے ذہن میں یہی

خیال ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں رخصت کرنا ہوگا
مگر بیٹیوں کے لیے کم از کم ہمارے معاشرے میں ایسا

کوئی تصور موجود نہیں..... اس بیٹے سے جس کو محنت

کبھی وہ میرے پیچھے آ جاتی..... کبھی تھوڑی دیر کے بعد آتی مگر آتے ہی شکایت کرتی.....
 ”عامر کتنا برا لگتا ہے..... وہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور آپ سلام دعا کے بغیر اس طرح اوپر آ جاتے ہیں۔“
 ”اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے..... میری اپنی زندگی ہے مجھے جس میں آرام ملے گا میں اس طرح رہوں گا۔“ میں نے کندھے اچکائے۔
 ”اچھا..... سیٹر ڈے کو بابا ایک گیٹ ٹو گیدر رکھ رہے ہیں اس دن ذرا جلدی آ جائیے گا۔“ اس نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

”سیٹر ڈے کو تو میرے ایک دوست کی شادی ہے..... اب تم تو اس حالت میں جاؤ گی نہیں، اس لیے مجھے ہی اکیلے جانا ہوگا۔ تم یہاں کانٹکشن اسٹینڈ کر لینا۔“ میں نے ڈریسنگ روم میں گھستے ہوئے جواب دیا۔
 باہر نکلا تو وہ بیڈ پر منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔
 ”کھانے کے لیے چلیں۔“ اس نے مجھے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

”کہاں.....؟“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔
 ”اصل میں آج میری طبیعت خراب تھی اس لیے میں نے کچھ نہیں بنایا۔ ممانے کہا کہ تم لوگ آج کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا لو۔“ اس نے مجھے اطلاع دی۔
 ”دیکھو میں پچھلے آٹھ دنوں سے تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا الٹا سیدھا جنک فوڈز ہر مار کر رہا ہوں..... ایک دو بار نیچے سے تمہارے لیے قورمہ، بریانی آگئی تو وہ بھی میں نے برداشت کر لی..... مگر ایک بات میں تمہیں واضح بتا دوں کہ مجھے میرے گھر کا پکا ہوا، میری کمائی سے آیا ہوا سیدھا سادہ کھانا چاہیے۔ اس لیے آئندہ خیال رکھنا۔“ میں خفگی سے بولا۔

”حد ہوگئی میں برداشت کر رہی ہوں اور تم بڑھے ہی جا رہے ہو.....“ وہ تنک کے کھڑی ہوگئی۔
 ”تو نہ کرو برداشت..... چیخو، چلاؤ جو مرضی آئے کرو..... میں نیچے جا کے کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

مشقت سے پال پوس کر تعلیم دلا کر کسی قابل بنایا جاتا ہے، ماں، باپ بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں..... میں نے اپنے والدین کی ساری امیدیں خاک میں ملا دی تھیں۔

مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے میرے ماں، باپ بہن اور بھائی مجھے جن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہ کچھ اس قسم کی تھیں جیسے میرا جنازہ رخصت کر رہے ہوں..... میں اندر ہی اندر لرز گیا۔ ان کے لیے دوبارہ زندہ ہونا اب میری زندگی کا نصب العین تھا.....

☆☆☆

ماورا کے گھر کا اوپر کا پورشن ہمارے لیے صاف ستھرا اور ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔ ماورا اب اس کو سجانے بنانے میں لگی ہوئی تھی اور مجھے اس سجاوٹ بناوٹ سے قطعی کوئی مطلب نہیں تھا..... وہ ہر روز کچھ نہ کچھ خرید کے لے آتی..... کبھی نئے پردے بنواتی تو کبھی کوئی نیا فرنیچر آ رہا ہوتا..... وہ داد وصول کرنے والے انداز سے مجھے دیکھتی اور میں کوئی دلچسپی نہ لیتا..... وہ جزبز ہو جاتی۔

گھر سیٹ کرنے کے بعد اس کا زیادہ وقت نیچے اپنے ماں، باپ کے ساتھ گزرنے لگا..... میں آفس سے آتا تو وہ نیچے بیٹھی سب کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی ہوتی..... لاؤنج میں قہقہے بکھیر رہی ہوتی اور میں جل کے کباب ہو جاتا..... ان آٹھ دس دنوں میں اس کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ اچھی ہوگئی تھی..... ہر وقت طبیعت کی خرابی کی شکایت کرنا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا..... وہ خوش تھی اور میں اداس..... میں اس کی نیچے موجودگی کو نظر انداز کر کے سیدھا اپنے پورشن کی طرف بڑھ جاتا..... مجھے دیکھ کر وہ لپک کے پیچھے آتی۔

”عامر نیچے رکیں ناں سب کے پاس..... بابا آپ کو پوچھ رہے ہیں۔“ وہ کہتی۔

”میں تھکا ہوا ہوں..... آرام کروں گا۔“ میں اپنے پیچھے اٹھنے والی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا زینہ چڑھ جاتا۔

”جی نہیں..... کس منہ سے جاتا.....“ جملے کا اگلا حصہ صرف میں نے سوچا۔
”تمہیں جانا چاہیے تھا۔“ ساس صاحبہ نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔

”اصل میں ماما یہ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا۔“ ماورا بیگم لوازمات کی ٹرالی کے ساتھ تشریف لاتے ہوئے بولیں۔

”یہ بات تو ٹھیک ہے بیٹا کہ تم مصروف رہتے ہو..... مگر کچھ وقت نکالو..... ماورا کے لیے، ہمارے لیے اور اپنے والدین کے لیے کہ سب تمہارے اپنے ہیں.....“ سر صاحب نے چائے کی جگہ ساری چینی اپنے جملے میں ملا دی۔

”جی بالکل..... آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جاؤں گا ان سے ملنے۔“ میں نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

”ارے پہلے ہم سے تو مل لیا کرو..... ہم تو تم سے زیادہ قریب رہتے ہیں.....“ ساس صاحبہ جلدی سے بولیں۔ جواب میں، میں انہیں صرف دیکھ کر رہ گیا۔
”آپ سے تو ایسا ملوں گا کہ یاد رکھیں گی۔“ ماورا کی ضد میں اس کا ساتھ دینے والی یہی خاتون تو تھیں۔

☆☆☆

”آج چھٹی کا دن ہے کہیں باہر چلیں؟“ اتوار کی صبح ماورا نے مسکرا کر پوچھا۔

”آج کا دن میں امی اور ابو کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں..... چلنا چاہو تو تم بھی چلو.....“ میں نے ختمی لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر آئی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔

”وہاں کسی اور دن چلے جائیں گے..... آج تو.....“
”نہیں وہاں آج ہی جائیں گے..... تمہیں شاید یاد ہوگا جب تم سرال میں تھیں تو ہر اتوار اپنے میکے میں گزارا کرتی تھیں اور میں بھی سارے پروگرامز چھوڑ کے تمہارے ساتھ یہاں آ جایا کرتا تھا۔“ میں نے جتاتے ہوئے کہا۔

”ماما، بابا کیا سوچیں گے، آج تو کھالو پھر نہیں کہوں گی۔“ میری آواز بلند ہوتے دیکھ کر اس نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پا لیا۔

میرے گھر رہتے ہوئے اس کی حرکتوں کی وجہ سے جو دباؤ مجھ پر تھا کہ میرے ماں، باپ، گھر والے کیا کہیں گے اگر ماورا کا چیخنا چلانا انہوں نے سن لیا تو.....
اب وہی دباؤ ماورا کے اوپر تھا..... وہ اپنے گھر والوں کو سب اچھا ہے ہی دکھانا چاہتی تھی..... ماں، باپ سے زیادہ اس پر بھابی کا پریش تھا جو ہر وقت ہمیں معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں۔

”ٹھیک ہے میرا کھانا اوپر لے آؤ۔ میں نیچے نہیں جاؤں گا.....“ میں نے اسے ایک اور آزمائش میں ڈال دیا اور خود آرام سے لیٹ کر ریوٹ سے۔
ٹی وی آن کر لیا..... وہ چند لمحے بے بسی سے مجھے دیکھتی رہی پھر نیچے چلی گئی۔

☆☆☆

میرے ان سب کو نظر انداز کرنے کی حرکت بالآخر ساس صاحبہ اور سر صاحب کی نگاہوں میں آ گئی۔ ایک دن میں آفس سے واپس آیا تو وہ لوگ اوپر براجمان تھے۔

”بھئی ہم نے سوچا کہ تم مصروف ہو تو کیا ہوا..... ہم تو فارغ ہی ہیں، آج تم سے ملنے کو آگئے ہیں۔“ سر صاحب محبت سے گلے لگاتے ہوئے بولے۔

”جی بہت شکریہ.....“ میں ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”جواب کیسی چل رہی ہے؟“ رسی سوالات کا آغاز ہو گیا۔

”بہت اچھی.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔
”والدین ٹھیک ہیں۔“ ساس صاحبہ گویا ہوئیں۔
”ٹھیک ہی ہوں گے.....“ میں نے نکلڑا توڑ جواب دیا۔

”کیا مطلب..... تم وہاں گئے نہیں.....؟“
سر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

اماں، ابا کا نارمل چہرہ دیکھ کر وہ بھی نارمل ہو گیا۔ رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا..... پہلے دن اتنی کامیابی ہی بہت تھی..... ساڑھے گیارہ بجے جب قصر راحت پہنچا تو حسب روٹین دروازہ لاک اور لائنس آف تھیں..... میرے پے در پے ہارن پر سالے صاحب سڑا ہوا منہ بنا کر دروازہ کھول گئے..... میں گنگنا تا مسکراتا سیدھا اوپر چلا گیا۔

ماورا نہ جانے واقعی سو رہی تھی یا سوتی بن گئی تھی..... کمرے کی لائنس آف تھیں اور وہ آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

میں بھی شب خوابی کا لباس پہن کر بیڈ پر آ گیا۔

☆☆☆

کچھ دن اور سرک گئے۔ اس کے گھر والے مجھ سے قدرے اکڑے، اکڑے لگ رہے تھے۔ میں ان کی محبت کا جواب محبت سے جو نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ شام آئی جب میرے بیٹے نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ سب کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

اماں نے پوتے کو گود میں اٹھایا مگر ان کی آنکھوں میں خوشی سے زیادہ حسرت تھی۔ یہ وہ پوتا تھا جس کی چاہ وہ میرے روزگار سے لگنے کے فوراً بعد ہی کرنے لگی تھیں۔ مگر اس کو کھلانے کا ارمان پورا ہونا بظاہر ممکن نہیں تھا۔ ماورا کی اماں پورے استحقاق سے بیٹی کے قریب اور نواسے کو دبوچے بیٹھی مجھے ایک آنکھ نہ بھار ہی تھیں۔ ماورا اسپتال سے گھر واپس آ گئی اور بچے میں بری طرح مصروف ہو گئی۔ وہ اس کے چھوٹے، چھوٹے کاموں میں لگی رہتی اور میں حیران ہوتا کہ یہ وہی ماورا ہے جسے اپنی ذات کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

”عامر، پاپا کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی آپ نے انہیں پوچھا تک نہیں۔“ ایک دن آفس سے آنے پر اس نے شکوہ کیا۔

”کیا ہو گیا نہیں؟“ میں نے حیران بن کر پوچھا۔

دو دنوں سے وہ مجھے گھر پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی گاڑی بھی گھر ہی پہ دکھائی دے رہی تھی۔

”تو تم اس کا بدلہ لو گے۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”اس میں بدلے کی کیا بات ہے..... چیزوں نے اپنی جگہیں بدل لی ہیں مگر حقیقتیں تو اپنی جگہ ہی رہیں گی..... کل تمہارے تو آج میرے والدین منتظر ہیں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولی۔

”شوق سے مت جاؤ..... مگر میں تو جاؤں گا۔“

میں نے جواب دیا اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر ڈریسنگ روم میں کھس گیا۔

میری تیاریاں دیکھ کر وہ منہ بتائے بیٹھی رہی اور میں نے بھی اس کی پروا نہیں کی..... اماں، ابا کے گھر پہنچا تو وہاں دوسرا امتحان تیار تھا۔

مجھے دیکھ کر سب کے چہروں پر خوشی کی جھلک نظر آئی جو کمال مہارت سے چھپالی گئی..... سب بظاہر سرد مہری سے ملے۔

ابا لا تعلقی سے اخبار میں منہ گھسائے بیٹھے رہے..... عاشر ضروری کام کا بہانہ کر کے باہر نکل گیا..... اماں اس قدر انہماک کے ساتھ بھنڈیاں کاٹنے میں لگی رہیں جیسے دنیا میں اس سے زیادہ اہم اور کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہوگا..... البتہ عافیہ میرے لیے جھٹ پٹ میری پسند کی کڑک چائے بنا کے لے آئی..... میں نے شکر گزار نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

مجھے اسی قسم کے استقبال کی امید تھی..... روتیوں پر طاری اس جمود کو توڑنے کے لیے تو میں یہاں آیا تھا..... وہ پورا دن میں نے سب کو منانے میں گزار دیا..... جب واپس جانے لگا تو اس حد تک کامیابی ملی تھی کہ اماں مجھ سے باتیں کرنے لگی تھیں اور اپنی کافی ہوئی بھنڈیاں فریج میں رکھنے کے بعد عافیہ کو میرے لیے پلاؤ بنانے کا کہہ چکی تھیں..... سواپنی پسندیدہ ڈش خوب پیٹ بھر کے کھائی..... اماں اور عافیہ سے کہیں لگانے اور اماں کے بیڈ پر لیٹ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں بڑی حد تک تازہ دم ہو چکا تھا۔ شام ڈھلے عاشر بھی واپس آ گیا مجھے وہیں پا کر حیران رہ گیا۔

لیکن میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔
 ”اتنا زبردست فلو ہو گیا ہے انہیں..... اوپر سے
 بی پی شوٹ کر گیا تھا۔“ وہ تشویش کے عالم میں بولی۔
 ”فلو..... اوہ..... تو دیکھو یا سر کو ہرگز نیچے مت
 لے کر جانا..... فلو تو چھوت کا مرض ہے، اتنے چھوٹے
 بچے کو بالکل نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے حیرت کے
 عالم میں میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے اس
 جواب کی توقع ہرگز نہ رہی ہو۔

مجھے خود بھی اپنے آپ سے ایسے جواب کی امید
 نہیں تھی..... مگر کبھی، کبھی انسان اپنی امید کے خلاف
 بھی تو کچھ کر جاتا ہے۔

☆☆☆

ماورا کے بابا سچ سچ زیادہ بیمار ہو گئے.....
 ہاسپٹل نرڈ ہو گئے..... سارا گھر پریشان تھا..... سوائے
 میرے..... ایک دفعہ غیروں کی طرح جا کے انہیں
 اسپتال میں دیکھ آیا اور بس.....

”آپ آفس سے کچھ دنوں کی چھٹی کر لیں۔“
 ماورا روتے ہوئے بولی۔

”آفس سے چھٹی..... یہ ممکن نہیں بہت ضروری
 پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں.....“

”میرے باپ کا آپ کو کوئی احساس نہیں۔“ وہ
 چیخی۔ ”آپ کے لیے آپ کی ذات اور کام زیادہ اہم
 ہیں..... کسی کی زندگی نہیں.....؟“ وہ زور سے بولی۔

”آہستہ بولو..... نہیں تو مجھے بھی چیخنا آتا ہے۔“
 میں بھی قدرے تیز آواز میں بولا۔

”یہ تم نے ہی مجھے سکھایا ہے کہ انسان کی ذات،
 اس کی پسندنا پسند، اس کا آرام سب سے زیادہ اہم ہوتا
 ہے..... باقی دوسروں کی اس کی زندگی میں اہمیت اس
 کے بعد آتی ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔
 اپنا بریف کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا..... یہ
 دیکھے بغیر کہ وہ بت بنی اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔

☆☆☆

”آپ کو مجھ پر غصہ ہے..... اس کا بدلہ میرے

ماں، باپ سے تو مت لیں۔“ میں حسب عادت رات
 گئے دیر سے گھر واپس آیا..... وہ یا سر کے ساتھ جاگ
 رہی تھی..... مجھے کچھ دیر خاموشی سے دیکھتی رہی.....
 پھر بولی۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں..... کسی بحث میں نہیں
 پڑنا چاہتا۔“

”کھانا تو کھا کر ہی آئے ہوں گے آپ؟“ اس
 نے اگلا سوال کیا۔

”ظاہر ہے..... سسرال کے ٹکڑوں کی لالچ
 میں سارا کام چھوڑ کے گھر تو آنے سے رہا..... دیر سے
 آیا ہوں تو کھانا بھی کہیں زہر مار کر ہی لیا ہوگا۔“ میں
 نے ڈریسنگ روم کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے
 جل کر جواب دیا۔ سلیپنگ سوٹ پہن کر باہر نکلا تو وہ رو
 رہی تھی۔

مجھے افسوس سا ہوا..... مگر میں منہ سے کچھ نہیں
 بولا اور بیڈ پر دوسری طرف کروٹ بدل کے لیٹ
 گیا..... اماں کا آج آفس میں فون آیا تھا۔

ابا کی طبیعت خراب تھی..... عاشران کا چیک اپ
 کروانے گیا تھا..... اماں سخت پریشان تھیں.....
 میں آفس سے سارا کام چھوڑ کر اماں کے بتائے ہوئے
 اسپتال پہنچ گیا..... ڈاکٹر نے بے شمار ٹیسٹ بتا دیے
 تھے۔ عاشرا سی بھاگ دوڑ میں لگا تھا..... ابا مجھے دیکھ کر
 منہ سے کچھ نہ بولے مگر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا
 اطمینان اور سکون اتر آیا۔ عاشر بھی مجھے دیکھ کر خوش
 ہو گیا..... ہم دونوں بھائیوں نے مل کر ابا کے سارے
 ٹیسٹ مکمل کروائے..... کچھ کی رپورٹس فوراً مل گئیں.....
 کچھ کی اگلے دن اور کچھ کی چار پانچ دنوں تک ملنے والی
 تھیں..... عاشر خود ڈاکٹر تھا..... ابا کی رپورٹس اس کی
 پیشانی کے بلوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔

”دعا کریں..... باقی رپورٹس بہتر ہوں.....
 ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا.....“ اس نے جیسے مجھے
 بہلانے کی کوشش کی۔

تھے..... آج کل گھر ہی میں آرام فرما رہے تھے.....
 ”زندہ ہوں۔“ میرے پوچھنے پر مجھے گھور کے بولے۔
 آنٹی سارا ٹائم منہ میں رس گلے بھرے چپ بیٹھی
 رہیں..... طویل خاموشی سے اکتا کے میں وہاں سے
 اٹھ کے اپنے پورشن میں آگیا اور آ کے ماورا سے اس
 کے والدین کے نازیبا رویے کی شکایت کی۔
 ”اس میں آپ کا قصور ہے..... وہ تو سب آپ
 سے اتنی محبت کرتے تھے، آپ نے اپنا رویہ دیکھا ہے
 ان کے ساتھ۔“ وہ تمللا کر بولی۔

”محبت کرتے تھے تو کرتے رہنا چاہیے
 ناں..... میری رویے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو
 ویسے بھی داماد ہوں..... کوئی بہو تھوڑی ہوں۔“
 میں نے معصوم بن کے کندھے اچکائے..... وہ مجھے
 گھورتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

”اچھا آج اتوار ہے..... مجھے میرے میکے جانا
 ہے..... تم چلو گی ساتھ.....؟“ میں نے اسے آفر کی۔
 ”جی نہیں..... آپ ہی جائیں اپنے میکے.....
 مجھے نہیں جانا.....“ وہ چڑ کے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے..... مجھے اپنے میکے میں کام ہے تین
 چار دن وہیں رہوں گا۔“ میں نے ایک اور بم پھوڑا۔
 ”کیا؟“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی..... ”رہیں
 گے کیوں؟“

”رہ کیوں نہیں سکتا..... لڑکیاں بھی تو مہینے،
 مہینے جا کے میکے رہتی ہیں..... میں چار دن رہ لوں گا تو
 کون سی قیامت آجائے گی۔“ میں نے بے نیازی
 سے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔
 ”کیوں، ضرورت کیوں نہیں ہے..... میرے ابا
 بیمار ہیں..... اور پرسوں ان کا آپریشن ہے..... میرا
 وہاں رہنا ضروری ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”میرے ابا بیمار تھے تب تو ایک دن کی چھٹی بھی
 نہیں کی۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”اس لیے کہ وہ تمہارے ابا تھے اور یہ میرے ابا

ڈاکٹر زعیم ہارٹ اسپیشلسٹ اور عاشر کے
 میڈیکل کالج میں استاد بھی تھے۔ انہوں نے ابا کو کچھ
 ضروری دوائیں دے کر ایک ہفتے کے بعد آنے کو
 کہا۔ گھر کا راستہ سب نے خاموشی سے طے کیا.....
 عاشر کے پاس بانیک تھی، ابا کو وہ ٹیکسی میں لے کر آیا
 تھا..... واپس پر سب میرے ساتھ تھے..... مجھے یاد تھا
 جس دن میں نے یہ گاڑی لی تھی سب سے زیادہ خوش ابا
 تھے۔ ابا کی زندگی کا خواب تھا اپنی گاڑی خریدنا.....
 جس کی تعبیر انہیں میری گاڑی کی صورت میں ملی تھی۔

”ارے بھئی ہم نے تو جو کچھ کمایا اس سے شاید
 ایک ٹوٹی پھوٹی چھوٹی موٹی گاڑی خریدی جاسکتی تھی مگر
 میں ہوں ذرا عقل مند..... میں نے سوچا انویسٹمنٹ
 کر دیتے ہیں..... ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر پر.....
 دیکھو بھئی پہلی قسط منافع کی تو مل گئی۔“ انہوں نے
 میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ابھی دوسری قسط دیکھتے
 ہیں کہ کب ملتی ہے۔“ وہ عاشر کو دیکھ کر مسکرائے۔

میں جانتا تھا ان کی خوشی گاڑی کی وجہ سے نہیں
 ہے..... وہ تو بس میری کامیابی پر خوش تھے..... نہ
 انہوں نے میری گاڑی کبھی چلائی اور نہ ہی ایک آدھ
 دفعہ سے زیادہ اس میں بیٹھے..... بس مجھے کار چلاتا دیکھ
 کر خوش ہوا کرتے تھے۔

آج میرے برابر میں خاموش بیٹھے نہ جانے کیا
 سوچ رہے تھے۔ گھر واپس آ کر اماں اور عافیہ کو تسلی دی۔
 سب کے ساتھ کھانا کھایا..... ابا کو ان کی دوائیں کھلائیں
 اور اگلے دن آنے کا کہہ کر واپس ماورا کے گھر آ گیا۔

میں نے اس کے والد کی خیریت تک دریافت
 نہیں کی..... وہ روتی رہی..... میں کڑھتا رہا اور نہ
 جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

میرے اس سرورویے کی وجہ سے ماورا کے گھر
 والے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے..... میں
 نے ایک دن وقت ملنے پر نیچے جا کر انکل کی خیریت
 دریافت کی..... وہ اسپتال سے گھر واپس آ چکے

ہیں۔“ میں نے جلتی پرتیل ڈالا۔

”اوہ..... ٹھیک ہے..... تو پھر آپ کا خاندان آپ کا اور میرا خاندان میرا۔“ وہ تنک کر بولی۔
”میرا خیال ہے کہ پچھلے ایک سال چار ماہ اور چھیالیس دنوں سے کچھ ایسا ہی ہے کہ تمہارا خاندان ہی تمہارا ہے۔ میرا خاندان تمہارا کبھی نہیں رہا۔“ میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اکیلی کیسے رہوں گی.....“ وہ مجھے سوٹ کیس بھرتا دیکھ کر سراسیمگی کے عالم میں بولی۔
”اکیلی کیوں؟ تمہارا سارا خاندان ہے ناں تمہارے ساتھ..... ایک میرے نہ ہونے سے تمہیں کون سی کمی ہوگی۔“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرا دل سچ سچ بھر آیا..... جسے چھپانے کے لیے میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔
اگر میں نے ماورا سے سچ سچ اتنی زیادہ محبت نہ کی ہوتی تو شاید اس کا رویہ مجھے اتنی تکلیف بھی نہیں دیتا۔

☆☆☆

شکر تھا کہ ابا کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا لیکن انہیں ایک لمبے عرصے تک احتیاط کرنی تھی۔ گھر میں سب نے شکرانہ ادا کیا.....
تیسرے دن ماورا بھی اپنے ماں، باپ کے ساتھ ابا کو دیکھنے آئی..... ابا کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

انکل پہلے کی طرح تپاک سے ملے.....

”بیٹا تم اتنے دن اتنے زیادہ پریشان رہے اور ہمیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔“ انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا..... نہ جانے ماورا ان سے کیا کہہ کر انہیں لائی تھی۔

”بس انکل اب تو سب ٹھیک ہے۔“ میں نے سکرانے کی کوشش کی۔

”یا سر کو دو دن سے بخار ہے..... ماورا بھی بڑی پریشان ہے دو دنوں سے۔“ آنٹی نے مجھے اطلاع

دی۔ بیٹے کی بیماری کا سن کر میں سچ سچ پریشان ہو گیا۔
”بخار کیسے ہو گیا؟“ میں ماورا کی طرف مڑا۔
”فلو نہیں ہوا ہے.....“ وہ جل کے بولی۔
”ویکسینیشن کروائی تھی اس وجہ سے ہوا ہے۔“
”اوہ“ میں نے سکون کی سانس لی اور سیدھا ہو گیا۔
”تم کب تک واپس آ جاؤ گے؟“ مسز جنید پہلو بدل کے بولیں۔ اصل پریشانی یہ تھی انہیں۔
”جب ابا گھر شفٹ ہو جائیں گے.....“ میں نے ابا کے سر ہانے لگے مانیٹر کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اس میں تو ابھی کافی ٹائم لگے گا۔“ انہوں نے منہ ہی منہ میں کہا۔

”جی ہاں تقریباً ہفتہ تو لگ ہی جائے گا اگر فاسٹ ریکوری ہوئی تو.....“ میں نے پلٹ کر کہا، وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں۔ ان کے میاں نے ان کو گھورا اور بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”بالکل بیٹا، تم کو ابھی یہیں رکنا چاہیے بلکہ میں تو کہتا ہوں ماورا کو بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہنا چاہیے۔“ جنید انکل مجھ سے کہتے ہوئے ایک دم ماورا کی طرف مڑ کے بولے۔ ماورا اس اچانک حملے پر گڑ بڑا گئی۔ میں نے زخمی نگاہوں سے ماورا کی طرف دیکھا جو اپنے بابا کی بات سنی ان سنی کر کے اپنے موبائل کی اسکرین پر خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھی..... مجھے ماورا کا جواب مل چکا تھا اور مجھے اس جواب کے علاوہ اور کسی بات کی امید بھی نہیں تھی.....
”شاید وہ دن کبھی نہ کبھی تو آئے جب تمہیں اپنی غلطی اور اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہو..... اور تب تک..... مجھے تمہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرنی ہی پڑے گی۔“ میں نے دل، دل میں کہا۔

☆☆☆

میں تقریباً پندرہ دنوں کے بعد ماورا کے گھر واپس پہنچا..... میں تو واپس جانا ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر

اماں نے مجھے واسطے دے، دے کر واپس بھیجا۔

”تمہارا بیٹا ہے وہاں..... تم کو اس کے لیے جانا ہوگا۔ شریف مرد ہر حال میں گزارہ کرتے ہیں۔ نہ تمہارا گھر خراب ہو اور نہ ہی خاندان میں بدنامی ہونی چاہیے۔“ وغیرہ وغیرہ ایک شادی کر کے مرد کے اوپر کتنے پریشاں آ جاتے ہیں..... یہی پریشاں عورت کے اوپر بھی آتے ہیں مگر وہ صنفِ نازک ہونے کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ عورت روئے تو سب وجہ جانے بغیر اس کے آنسو پونچھنے کو آگے بڑھتے ہیں..... مرد کو تو رونے کا الاؤنس ہی نہیں ملتا اور جو اگر کبھی رونے کی غلطی کر بیٹھے تو سب اس پر ہنستے ہی ہیں۔ آنسو کوئی نہیں پونچھتا..... مردوں کے آنسوؤں کو مگر مجھ کے آنسو سے زیادہ اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔

ابا تیزی سے رو بصحت تھے..... گھر شفٹ ہو چکے تھے..... میں نے اس عرصے میں دل و جان سے ماں باپ کی خدمت کی..... ایسی خدمت تو شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ شاید اس خدمت کے پیچھے مجھے ان کو چھوڑ کر جانے کا احساس تھا..... اور یہ احساس جرم مجھے اپنے کیے کی تلافی پر اکسارہا تھا۔ ابا مجھ سے راضی ہو چکے تھے۔ اماں تو خیر موم کی بنی ہوئی تھیں میری ذرا سی محبت کی آنچ بھی انہیں پکھلا دیا کرتی تھی..... عافیہ اور عاشق بھی پہلے کی طرح بے تکلفی سے ہنسنے بولنے لگے تھے..... ساری دوریاں مٹ چکی تھیں۔ میں جلدی آنے کا کہہ کر بجھے دل سے واپس آ گیا۔

ماورا نے سارے گھر کو سجایا ہوا تھا..... بیڈ روم میں تازہ، تازہ پھول مہک رہے تھے..... خود ماورا بھی خوب بھی سنوری تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا کے میرے قریب آ گئی۔

”کیسے ہو؟“ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”ٹھیک ہوں اور تم.....؟“ میں اس پر نظر ڈالتے ہوئے بیٹے کے کاٹ کی طرف آ گیا جو جاگ رہا تھا اور قلعاریاں مار رہا تھا۔

میں نے جھک کر اسے اٹھالیا..... وہ میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ ماورا بھی میرے نزدیک چلی آئی۔ میں ماورا کو نظر انداز کر کے بیٹے کو کھلانے لگا..... مجھے دیکھ کر اس کے معصوم چہرے پر جو مسکراہٹ ابھری تھی اس نے میری زندگی کی آدھی ٹھکن دور کر دی تھی۔ وہ معصوم سا بچہ نہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے اس بات کی پہچان ہو کہ میں اس کا باپ ہوں۔ خون نے جوش مارا ہو یا پھر میرے کھلانے اور..... لگدگانے پر مسکرایا ہو۔ میں کچھ دیر بیٹے سے کھیلتا رہا..... اسے ہنساتا رہا..... ماورا مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی..... پھر یاسر کو نیند آنے لگی اور وہ دھیرے، دھیرے سو گیا۔

میں نے آہستہ سے اسے کاٹ میں لٹا دیا۔ ”تم فریش ہو جاؤ..... میں کھانا نکالتی ہوں.....“ ماورا مجھے دیکھ کر بولی۔ ”نہیں، کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں..... بس چینیج کر کے سوؤں گا..... کل آفس بھی جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آج جلدی کھانا کھالیا.....؟“ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جہاں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ”ہوں..... آج اماں نے میری پسند کا پلاؤ بنایا تھا اس لیے کھائے بغیر رہ نہ سکا۔“ میں نے اسے جتاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا.....“ اس نے مایوسی سے کہا۔ اور میرے قریب بیٹھ گئی۔

میں نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی..... اے سی..... کی ہلکی، ہلکی خنکی، مدھم مدھم روشنی اور پھولوں کی مہک نے ایک عجیب سا رومانوی ماحول بنا دیا تھا۔ یوں جیسے جملہ عروسی ہو..... مجھے اپنا تجلہ عروسی یاد آ گیا..... وہ کمرہ جو سارے گھر والوں نے محبت سے مل کر میرے اور ماورا کے لیے سجایا تھا..... اب لاکھ پڑا تھا..... میرے وہاں جانے پر اماں نے اس کمرے کو کھولنا چاہا مگر میں نے منع کر دیا..... ماورا کے بغیر وہاں قدم بھی رکھنا میرے لیے

دشوار تھا..... وہ کمر تو آباد ہی ماورا کے دم سے تھا.....
میں جتنے دن بھی رہا ابا کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی
رہا..... ان کے بیڈ کے برابر نیچے قالین پر اپنا بستر لگا کے
سوتا رہا..... وہ ناراض ہوتے، منع کرتے مگر میں نہ
سنتا..... عاشق بھی نیچے آ گیا تھا..... اماں اور عافیہ بھی دیر
تک وہاں بیٹھی رہتیں..... رونق لگی رہتی۔

”تمہیں یاد ہے آج سے کچھ عرصے پہلے ایک
اور کمر بھی اسی طرح پھولوں سے مہکا کرتا تھا۔“ میں
نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔

”وہ کمر تمہارے اس کمرے کے جتنا بڑا اور
خوب صورت نہیں تھا مگر وہ ہمارے گھر کا سب سے اچھا
اور بڑا کمر تھا..... اس کمرے میں میرے ماں، باپ
رہا کرتے تھے مگر میری شادی کے وقت انہوں نے وہ
کمر اس بہو کے نام کر دیا تھا جسے وہ پورے ماں اور
محبت کے ساتھ گھر میں لارے تھے..... میں نے وہاں
اٹیچڈ باتھ روم بنوایا تھا تا کہ تمہیں تکلیف نہ ہو.....
عاشق نے نہ جانے کہاں، کہاں سے پیسے بچا کے اکٹھا کر
کے اس کمرے کو اے سی کا تحفہ دیا تھا کہ بھابی آرام سے
گرمیوں کے دن گزار سکیں۔ وہ کمر ایسا تھا جہاں ہوا کا
گزر سب سے زیادہ تھا۔ کھڑکی کے پاس چھوٹے سے
باغیچے میں جہاں کیاریوں میں اماں نے گلاب، موہے
اور رات کی رانی کے پودے لگوائے تھے ان پھولوں کی
خوشبو اس ہوا کے ساتھ کمرے میں آتی تھی اور پورا کمر
مہک جاتا تھا..... تم نے شاید وہ کھڑکی کبھی کھولی ہی
نہیں..... اس لیے تم اس خوشبو سے محروم ہی رہ
گئیں.....“ میں جیسے کسی ٹرانس میں بولے جا رہا تھا۔

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی..... وہ خاموش
کھڑی تھی۔

میں بیڈ کے کنارے ٹک گیا اور اپنے جوتے
اتارنے لگا۔

”تمہارا رویہ روز بروز مشکل ہوتا جا رہا
ہے..... مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ہو کیا گیا

ہے.....“ وہ میرے نزدیک آ کے بیٹھ گئی۔
میں نے اس کا جملہ نظر انداز کر کے اس کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

”جب ایک متوسط خاندان اپنے گھر میں بہو
لارہا ہوتا ہے اور بہو بھی وہ جو اس سے بڑے گھر سے
آ رہی ہو تو وہ اسے عزت، محبت اور اس گھر کے مالکانہ
حقوق دیتے ہوئے اپنے گھر کی زینت بناتا ہے..... تو
ایسے میں اس بہو کو کیا کرنا چاہیے؟ تمہارا کیا خیال ہے
اس بارے میں؟“ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے
ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”دیکھو عامر..... میری اپنی زندگی ہے، اسے
میں اپنے انداز میں گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی سے
کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر میں کسی دوسرے کی خوشی کے
لیے اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتی.....“ وہ کچھ دیر سوچتی
ہوئی بولی۔

”بات تو ٹھیک ہے..... مگر دوسری بات یہ بھی
ہے کہ جب تم کسی کی خوشی کی خاطر خود کو نہیں بدل سکتیں
تو کوئی دوسرا بھی تمہاری خوشی اور مرضی کے لیے اپنی
قربانی کیوں دے..... بہر حال میری پروموشن ہو گئی
ہے اور میں اگلے ہفتے دبئی براج آفس کا چارج
سنجالوں گا.....“ میں نے ٹکیے پر سر رکھتے ہوئے
آرام سے کہا۔

”کیا.....؟ تم دبئی جا رہے ہو..... اور مجھے ابھی
بتا رہے ہو.....؟“ وہ حیرت زدہ رہ گئی..... ”اور میرا کیا
ہوگا..... مجھے ساتھ لے کر جاؤ گے؟“ وہ ایک سیکنڈ کے
بعد دوبارہ بولی..... اس بار لہجے میں پریشانی تھی۔

”تمہاری مرضی ہے..... یہاں رہنا چاہو تو یہیں
رہ لو..... اماں، ابا کے گھر تو رہو گی نہیں..... ہاں ایک
کام کر لینا کہ اپنا سامان وہاں سے منگوا لینا..... تین ماہ
کے بعد عاشق کی شادی اور عافیہ کی رخصتی ہے..... وہ کمر
اماں، عاشق کی بیوی کو دینا چاہ رہی ہیں۔“ میں نے
اسے ایک اور اطلاع دی۔

”عاشق کا رشتہ طے ہو گیا؟“ اس نے حیرت سے

فرحانہ ناز ملک کی برسی

جانے والا سب کے دل کو توڑ جاتا ہے
جو جاتا ہے وہ رنگ اپنا چھوڑ جاتا ہے
یاد کرے جب ایک تو دو جا دوڑ جاتا ہے
دل کو دل سے راہ ہے دل ہر موڑ جاتا ہے
بے شک میں نے فرحانہ ناز کو کبھی نہیں دیکھا
لیکن وہ مجھے نظر آرہی ہے۔ کتنی ہی محبتیں تو وہ ساتھ
لے گئی ہے اور کتنی ہی یہاں چھوڑ گئی ہے۔ یہ اس کی
خوش اخلاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آج اس کو گئے
ایک سال ہو گیا ہے مگر وہ ہم میں موجود ہے۔ وہ مجسم
اپنے بچوں کی زندگی میں شامل رہے گی اور رہنمائی
بھی کرے گی کہ پیار کرنے والے ہر جگہ سے حاضری
دے سکتے ہیں۔

فرحانہ تجھے سلام

شاعرہ کوثر خالد، جڑانوالہ

جاؤ مگر میں تمہیں وہاں جا کے دکھا سکتی ہوں..... کسی
بھی ہوٹل میں آرام سے کئی دن رہ سکتی ہوں۔“ وہ چبا
چبا کر بولی۔

”اوہ..... یقیناً شوق سے..... ضرور جاؤ.....
بلکہ دہی کیا امریکا اور کینیڈا بھی ہو آؤ..... نوپرا بلیم.....“
میں ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گیا اور اسے گھورتے
ہوئے بولا۔

”یونو واٹ..... جب تمہارا رشتہ آیا تھا تو سب
نے منع کیا تھا کہ کوئی جوڑ نہیں..... تمہارے اور ہمارے
اسٹیشن میں زمین آسمان کا فرق ہے..... مگر بابا..... وہ
نہیں مانے وہ تمہاری قابلیت..... وجاہت اور خاندانی
شرافت سے متاثر تھے اور انہوں نے سب کو منالیا.....
اور میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں مان گئی.....“ وہ
کندھے اچکا کے اور آنکھیں گھما کے طنز سے بولی۔ اس
کی بات پر میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

”اوہو..... ایک بات تو رہ گئی..... تمہارے بابا
میری ان چیزوں سے متاثر ہونے کے ساتھ، ساتھ
تمہاری بد لحاظی اور بد زبانی سے پریشان بھی

پوچھا۔ عافیہ کا نکاح تو چند سال قبل ہمارے پھوپھی
زادے ہوا تھا جو انگلینڈ میں تعلیم مکمل کرنے کی غرض
سے مقیم تھا۔

”ہاں اصل میں عافیہ کی رخصتی کرنی تھی..... ابا
کی علالت کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ عاشر کی جلدی
شادی کر دی جائے تاکہ اماں، ابا گھر میں اکیلے نہ رہیں
کوئی ان کی خدمت کے لیے ان کے پاس ہو۔“ میں
نے یاسر کے ننھے ہاتھوں پر آہستگی سے ہاتھ پھیرتے
ہوئے جواب دیا جو بے خبر سو رہا تھا۔

”میں، وہاں ہوتی تو پھر عاشر کو کون سا کرا دیتے
وہ لوگ.....“ وہ تنک کر بولی۔

”تو شاید اتنی جلدی عاشر کی شادی ہی نہ
کرتے..... پہلے اوپر کی منزل مکمل کرواتے پھر یہ نیک
کام کرتے..... لیکن خیر یہ چھوڑو کہ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا
ویسا ہوتا تو کیا ہوتا..... یہ دیکھو کہ ہو کیا رہا ہے.....“
میں نے ٹکسا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے اپنے ساتھ دہی کیوں نہیں لے
جاتے.....“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔
”دیکھو یہ اتنی جلدی ممکن نہیں ہوگا..... پہلے مجھے
وہاں سیٹل تو ہونے دو.....“ میں نے اسے ٹالتے
ہوئے کہا۔

”تم کسی چھوٹی موٹی نہیں بلکہ ایگزیکٹو پوسٹ پر
جار ہے ہو، تمہیں تو فوراً ہی رہائش مل جائے گی پھر فیملی
نہ لے کر جانے کا مطلب.....؟“ اس نے جرح کی۔
”دراصل میں ابھی یہ طے نہیں کر پارہا ہوں کہ تم
میرے ساتھ خوش بھی ہو یا نہیں..... تم اپنے پیاروں کو
چھوڑ کے میرے ساتھ جانا پسند کرو گی یا نہیں..... میرا
مطلب ہے کئی سوال تھے میرے ذہن میں اور وقت کم
تھا اس لیے فی الحال میں نے وہاں اکیلے آنے کی
اطلاع دی ہے۔ تم بھی سوچ لو اور پھر فیصلہ کرو.....“
میں نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو دہی جانے کے لیے میں تمہاری
محتاج ہوں.....؟ کئی دفعہ جا چکی ہوں اور اب بھی
اپنے خرچے پر جا سکتی ہوں..... تم بے شک مت لے

تھے..... تمہارے دو رشتے تمہاری ان ہی کوالیٹیوں کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ انہیں لگا کہ میں اس پجوشن میں تمہارے لیے بالکل فٹ رہوں گا..... میں اور میرا خاندان تمہارے سامنے زبان تک نہیں کھولیں گے اور کچھ ہی عرصے میں تم بہلا پھسلا کر یا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر تک لے آؤ گی اور پھر راوی آگے تم سب کے لیے سکھ ہی سکھ لکھتا رہے گا۔“ میں نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ سخت کر کے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گئی.....

”تمہیں کیسے معلوم ہوا..... کیا عرشہ بھابی نے بتایا؟“ اس کا ذہن عرشہ بھابی کی طرف مڑ گیا.....

”نہیں، تمہاری بھابی بیچاری تو میرے سامنے ہی کم آتی ہیں..... وہ کیا بتائیں گی، میری معلومات کے ذرائع اور بھی ہیں..... جیسے ایک بہو سسرال میں آتی ہے تو وہاں کے راز از خود اس پر آشکار ہو جاتے ہیں..... ویسے ہی ایک داماد جب گھر داماد بن جاتا ہے تو بہت کچھ اس کے کان میں پڑ ہی جاتا ہے۔“ وہ میرے ہاتھوں کے دباؤ سے اپنے کندھے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی.....

”چھوڑ مجھے۔“ ناکام ہو کے چلائی۔

”دل تو یہی چاہتا ہے۔“ میں نے دل میں کہا۔

”تمہیں ایک موقع دیتا ہوں..... سدھر جاؤ.....

رشتوں کی اہمیت کو سمجھو.....“ میں نے ایک دم اس پر سے ہاتھ ہٹا لیا..... وہ اپنے زور میں لڑکھڑا گئی۔ ”یہ جو شادی سے بنائے ہوئے رشتے ہوتے ہیں ناں ان کی واقعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی..... نہ شرعی..... نہ قانونی..... یعنی ساس، سر، دیور، جیٹھ، نند، ساللا اور سالی..... صرف میاں بیوی کے رشتے کی شرعی اور قانونی حیثیت ہوتی ہے..... لیکن یہ رشتے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی خود بخود اتنے نزدیک چلے آتے ہیں کہ بسا اوقات خون کے رشتے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں..... صبح شام کا ساتھ ہو جاتا ہے ان کے ساتھ، اکھٹا کھانا پینا

رہنا سہنا ہو جاتا ہے..... خود ہی سوچو کیا ہر وقت ساتھ رہنے والے ان رشتوں سے نفرت کر کے کوئی سکھ سے رہ سکتا ہے.....؟“ میں نے تھوڑا نرم لہجہ رکھا۔

”میں مانتا ہوں کہ ان سے فوری طور پر محبت ہو ہی نہیں سکتی..... بسا اوقات ان رشتوں کو محبت کبھی نصیب نہیں ہوتی..... کوئی بات نہیں، یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں، محبت ہو جائے تو اچھا نہیں ہو سکے تو نہ سہی..... برداشت تو ہو سکتی ہے ناں..... تھوڑا سا دکھاوا ہی ہو سکتا ہے ناں.....! میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... وہ خاموش رہی۔

”اگر گھر کا ماحول اچھا رکھنے کے لیے، اپنے شوہر کو مطمئن رکھنے کے لیے اور دنیا کو انگلیاں اٹھانے سے روکنے کے لیے عورت سسرال میں سسرالیوں کے ساتھ محبت نہ سہی تھوڑا سا محبت کا دکھاوا بھی کر لے، تھوڑے سے خلوص کا مظاہرہ ہی کر لے تو میرے خیال میں وہ بھی بہت ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”میں دکھاوا نہیں کر سکتی۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

”دکھاوا میں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر کر رہا ہوں..... ورنہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تمہارے باپ اور بھائی کو کھری، کھری سناؤں۔“ میں آج تمام حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھا۔

”کیا مطلب.....؟ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے..... تم ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟“ وہ تنگی۔

”بگاڑا تو شاید میرے گھر والوں نے بھی تمہارا کچھ نہیں تھا مگر وہ لوگ بھی تمہیں خواہ مخواہ برے لگتے تھے.....“ میں نے کندھے اچکائے۔

”تم نے تو ایک دن بھی یہ کوشش نہیں کی کہ میرے گھر والوں کو محبت نہ سہی عزت اور احترام کے لائق ہی سمجھ لو..... جس طرح ایک عورت کو اس کے والدین اور بہن، بھائی بہت عزیز ہوتے ہیں اسی طرح ایک مرد بھی اپنے گھر والوں کے لیے وہی جذبات رکھتا ہے۔ فرق بس اتنا ہوتا ہے کہ عورت ماں، باپ سے جدا ہو کر ان کے لیے پہلے سے زیادہ بے قرار ہو جاتی ہے

باپ کو ذلیل کر کے گھر سے نہ بھاگتی..... یہ دنیا ہے میڈم..... جب خون کے رشتے بیگانے ہو سکتے ہیں تو بنائے ہوئے رشتے کیوں نہیں۔“

”تم کیا چاہتے ہو آخر.....؟“ وہ تھک کر بولی۔

”کچھ نہیں، میرے چاہنے کا وقت گزر چکا.....“

اب صرف ذمے داری باقی رہ گئی ہے۔ تمہاری اور

اپنے بیٹے کی..... وہ میں بھاؤں گا..... تمہیں تمہاری

اسٹینڈرڈ کی زندگی دینے کے لیے کماؤں گا..... اپنے

بچے کو اچھی زندگی دینے کے لیے خود کو داؤ پر لگا دوں گا

تا کہ کچھ سالوں کے بعد اسے میری طرح اپنے گھر،

اپنی حیثیت پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“

”تو گویا..... تمہیں مجھ سے محبت ہے ہی

نہیں.....“ اس نے آخری حربہ استعمال کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ اب نہ رہی ہو..... مگر تم کو تو مجھ

سے محبت کبھی تھی ہی نہیں..... تو پھر کیا، کیا جائے.....“

میں نے دوبارہ بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی بیٹھی رہی۔

”ہائے محبت.....“ میں نے آہ بھری ”اب تو

شاید دنیا ہی سے اٹھتی چلی جا رہی ہے..... ایک نفسا نفسی

کا عالم ہے..... کوئی کسی کا پرسان حال نہیں، سب اپنے

اپنے بکھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں..... ہاں تو سچ

ہے جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، جب کوئی کسی

سے محبت بھی نہیں کرے گا تو پھر سب کو اپنے سارے

کام خود کرنے پڑیں گے اور محبت بھی خود ہی اپنے آپ

سے کرنی ہوگی..... تو سوچ رہا ہوں کہ اب خود سے

محبت کر کے دیکھوں..... دیکھوں تو کیسا لگتا ہے۔“ میرا

جملہ بظاہر طنزیہ تھا مگر دل کرچی، کرچی ہو رہا تھا۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

”سو جاؤ بہت رات ہو گئی ہے۔“ میں نے

کروٹ بدلتے ہوئے کہا فہم پھر بھی یوں ہی بیٹھی رہی۔

رات گزرتی رہی۔ میں اور وہ دونوں جاگ

رہے تھے مگر ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ فاصلے تھے

اور شکایتیں تھیں۔

اور مرد شادی کے بعد اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بے قراری محسوس نہیں کر پاتا..... لیکن تم نے مجھے اس بے قراری سے آشنا کر دیا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ.....“ میں طنزیہ انداز میں بولا۔

”تو یوں کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے ہی

نہیں..... صرف اپنے والدین کا خیال ہے۔“ وہ خفگی

سے بولی۔

”مجھے تمہیں یہ احساس یا یقین دلانے کی اب

ضرورت ہی نہیں کہ میں نے تم سے کتنی محبت کی

ہے..... لیکن تمہاری ضد اور میرے گھر والوں سے بے

جانفرت نے شاید میرے دل سے تمہاری محبت اور

تمہارے گھر والوں کی عزت باہر نکال دی۔“ میں نے

کندھے اچکائے۔

”محبت ایک دفعہ ہو جائے تو کبھی دل سے نہیں

جاتی.....“ اس نے کتابی فقرہ ادا کیا۔

”جھوٹ..... ایک دم بکواس..... محبت ایسی کوئی

ماورائی شے نہیں ہے جو ایک دفعہ ہو جائے تو دائمی

ہو..... انسانی احساسات اور جذبات وقت اور حالات

کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں..... نفرت شاید محبت میں

تبدیل ہونے میں کافی وقت لے لے مگر محبت کو نفرت

میں بدلنے کے لیے صرف چند لمحے درکار ہوتے

ہیں۔ محبت اور نفرت کا یہ کھیل تمام زندگی جاری رہتا

ہے، دونوں میں سے کوئی کیفیت بھی مستقل نہیں ہوتی۔

سامنے والے کا رویہ اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا

ہے۔“ میں نے کافی گہری بات کی تھی جو میرے لیے

اپنی زندگی کا نچوڑ تھی۔

”اگر اولاد ناخلف، نالائق اور اذیت دینے والی

ہو تو پیٹ سے پیدا کرنے والی ماں بھی بیزار ہو جاتی

ہے، چڑنے لگتی ہے، ہو سکتا ہے محبت تب بھی کرتی ہو مگر

وہ محبت اس وقت تک کے لیے سو جاتی ہے جب تک کہ

کوئی جوار بھاٹا نہ آئے۔ باقی کے رشتے اس استثناء سے

عاری ہیں محترمہ..... ورنہ بھائی، بھائی کا خون نہ

کرتا..... باپ، بیٹے کو گھر سے نہ نکالتا..... بیٹی، ماں،

”کل رات گاڑی اندر لاتے ہوئے تمہارے ابا کی گاڑی سے ٹکرا گئی ہے۔ بمپر ٹوٹ گیا ہے ان کی کار کا۔“ میں نے صبح تیار ہوتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“ وہ یاسر کو فیڈ کروا رہی تھی چونک کے بولی۔

”رات کو بتا دیتا تو تم کیا کر لیتیں؟ اب اپنے خاندانی مکینک کو بلا کر ٹھیک کروالینا.....“ میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے تم اس گھر میں رہتے ہو مگر سب سے انتقام لیتے ہوئے۔“ اس نے یاسر کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”داماد ہو یا بہو..... اپنے گھر میں کسی دوسرے کو جگہ دینا اور رکھنا پھر اس کی حرکتوں کو برداشت بھی کرنا یقیناً بڑے ہی صبر و ضبط کا کام ہے۔“ میں نے فوراً اس کی تائید کی۔

”خیر اب تو کچھ ہی دنوں کی بات ہے..... میرے بوجھ سے تمہارے گھر والوں کو نجات مل جائے گی۔“ میں نے خود پر اچھی طرح پرفیوم چھڑکتے ہوئے بے نیازی سے اگلا جملہ ادا کیا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ وہ تنک کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”پہلے تو تمہیں چاہتا تھا..... اب نہ جانے کیا چاہتا ہوں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔

”میں تمہارے ساتھ دبئی جا رہی ہوں۔ کان کھول کر سن لو.....“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”سبحان اللہ کیا انداز ہیں..... اپنی بات منوانے کے لیے لہجے کو شیریں اور الفاظ کو نرم رکھنا ضروری ہوتا ہے..... آپ شاید اس سے بھی واقف نہیں۔“ میں نے اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا..... میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اسی جگہ بے بسی سے کھڑی ہوگی۔

کہانی میں ہلکا سا ٹوٹ تھا..... میں نے ماورا کو جو کچھ بتایا سب سچ تھا، بس معمولی سے فرق کے ساتھ..... یعنی میں دبئی جا رہا تھا..... میری پروموشن بھی ہوئی تھی بس فرق صرف اتنا ہی تھا کہ وہاں میرا ٹرانسفر نہیں ہوا تھا بس ایک ماہ کا ڈیپوٹیشن تھا۔

عافیہ کی رخصتی اور عاشر کی شادی بھی یقیناً تین ماہ کے بعد ہی تھی۔ اور عاشر کو میرا کمر بھی دیا جانے والا تھا کیونکہ میں اوپر کا نامکمل پورشن مکمل کروانے جا رہا تھا..... اسے جدید انداز میں بنوانے کے لیے مجھے کافی

پاڑ بنینے پڑے..... کام کا آغاز ہو چکا تھا اور میں اس سلسلے میں تن من دھن سے لگا ہوا تھا..... مجھے اس مسئلے کا یہی حل نظر آیا تھا کہ ماورا کو اس کے مزاج کے مطابق ایک عدد گھریٹ کر کے دے دیا جائے۔ جہاں وہ بھی خوش رہے اور اطمینان سے یاسر کی پرورش کر سکے اور میں بھی اپنے والدین کے نزدیک رہ کر ان کی خدمت کر سکوں..... سب سے بڑھ کر اپنے گھر میں عزت سے سراٹھا کے رہ سکوں..... گھر دامادی کے ذلت آمیز لیبل سے نجات حاصل کر سکوں..... ویسے بھی اب بات میری یا ماورا کی نہیں تھی..... بلکہ یاسر کی تھی اور یاسر کی شخصیت کی بہترین تعمیر اور اس کی خود اعتمادی کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس گھر میں ہوش سنبھالے جو اس کے باپ کا ہو۔

مجھے یقین تھا کہ ماورا میرے اس فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی..... اتنی سمجھ تو اب تک اسے بھی آہی چکی ہوگی۔

بس اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پار ہوں کہ اسے اس ایک ماہ کے لیے اپنے ساتھ دبئی لے جاؤں یا نہیں؟ لے کر جاتا ہوں تو شاید ماحول کی تبدیلی سے محترمہ کے مزاج پر اچھا اثر پڑے..... اور نہ لے کر جاؤں تو شاید میری زندگی تھوڑی آسان رہے..... لے کر جاؤں یا نہیں.....؟ ویسے آپ کا کیا خیال ہے.....؟



صبر..... رضائے الہی

ہے۔

صبر کی تین اقسام ہیں۔

1- صبر علی العمل

2- صبر فی العمل

3- صبر عن العمل

1- صبر علی العمل: یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک

لینا یعنی اس کام پر استقامت اختیار کرنا، جہم جانا اور قائم رہنا..... مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اعمال صالح کی پابندی اختیار کرنا۔

2- صبر فی العمل: یہ ہے کہ عمل کرتے وقت

نفس کو دوسری طرف التفات کرنے اور متوجہ ہونے سے روکنا..... طاعات بجالاتے وقت اور عبادات میں مصروفیت کے وقت ہمہ تن متوجہ رہنا اور حضوری قلب سے انہیں بجالانا..... ان کے حقوق و آداب کو سکون و اطمینان سے بجالانا..... مثلاً نفس کو اس طرف راغب کرنا کہ سرکشی چھوڑ کر دل لگا کر نماز و اذکار وغیرہ میں مشغول ہو جائے۔

3- صبر عن العمل: یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ

تعالیٰ نے منع کیا ہے اور وہ جو راہ سلوک میں رکاوٹ ہیں ان سے رُکا ہے۔ مثلاً حسد، بغض، شہوت، ہر ممنوعہ عمل سے رکنے اور اپنے نفس کو باز رکھنے کو صبر عن العمل کہا جاتا ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ کا ارشاد ہے کہ ”صبر

کی نسبت بے قراری زیادہ تکلیف دہ ہے۔“
حضرت خواجہ حسن بھری فرماتے ہیں کہ ”صبر اس

اے میرے معبود! میں تیری تسبیح کرتا ہوں، تو مجھ پر کرم بالائے کرم فرما..... بارِ الہا! میں تیری تسبیح کرتا ہوں اور تو بلند و برتر ہے..... اور عزت تیرا ہی جامہ ہے اور عظمت تیری ہی ردا ہے..... کبریائی تیری دلیل و حجت ہے جو کچھ تہ خاک ہے تو اسے سنتا اور دیکھتا ہے۔ تیری ذات ہر راز دارانہ گفتگو سے مطلع ہے..... پاک ہے تو اے وہ جس سے بڑی سے بڑی امیدیں باندھی جاتی ہیں..... جو کچھ پانی کی گہرائی میں ہے اسے تو دیکھتا ہے۔ (تیری ذات) تو سمندروں کی گہرائیوں میں مچھلیوں کے سانس لینے کی آواز سنتا ہے..... تیری ذات پاک اور منزہ ہے میں تیری تسبیح کرتا ہوں..... تعجب ہے کہ جس نے تجھے پہچانا وہ کیونکر تجھ سے خوف نہیں کھاتا۔

اے اللہ! میں حمد و ثنا کے ساتھ تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں۔ پروردگار! حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کی آل پر سب رحمتوں سے افضل و برتر رحمت نازل فرما..... وہ جو برگزیدہ معزز و گرامی اور مقرب ہیں ان پر اپنی کامل ترین برکتوں کا اضافہ فرما..... ان پر اور ان کی آل پاک پر ایسی پسندیدہ رحمت نازل فرما جس سے بالاتر کوئی رحمت نہ ہو..... آمین!

☆☆☆

صبر کے لغوی معنی ہیں..... برداشت، تحمل، قناعت..... مزید صبر کے معنی باندھنے اور روکنے کے ہیں..... قرآن و سنت کی اصطلاح میں خلاف طبع چیز پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کو صبر کہا جاتا

فحص کا ہے جو جزا کے سوال کو درمیان سے اٹھا دے تاکہ اس کا صبر محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو نہ کہ بدن کی سلامتی کے لیے۔“

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ”صبر کے معنی یہ ہیں کہ کڑوی چیز کو کھا کر منہ نہ بگاڑیں.....“ صبر نفس کو خدا کے ساتھ رکھتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ فرماتے ہیں۔ ”صبر یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر دار پر لٹکایا جائے تو آہ نہ کرے۔“ قرآن پاک میں صبر کا ذکر بارہا آیا اور اللہ نے فرمایا..... ”میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں.....“ اگرچہ دیگر تمام عبادات کا اجر بھی بہت ہے لیکن..... ”اللہ کے ساتھ“ کا اجر صرف صابرین کے لیے مخصوص ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ صبر کی مزید تعریفیں فرماتے ہیں کہ ”کسی کڑوی چیز کو ناک منہ بنائے بغیر گھونٹ گھونٹ پی جانا صبر ہے۔“ ہم عموماً صبر اور برداشت میں تفریق نہیں کرتے..... اگر ہم نے کڑوی چیز کو ناک منہ چڑھا کر بالجبر پیا تو یہ برداشت ہے..... لیکن اگر کڑوی چیز کو ناک منہ بنائے بغیر ہلکی خوشی پی گئے تو یہ صبر ہے..... برداشت کا انعام نہیں ہے لیکن صبر کا اجر ہے..... اللہ کی دوستی اور ساتھ کی شکل میں۔

کچھ بزرگوں کے نزدیک صبر سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے آنے والے مصائب کو اپنی تقدیر کا حصہ سمجھ کر شکر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے۔ میرے نزدیک صبر وہ مقام ہے جہاں انسان نعمت اور مصیبت کا فرق کرنا چھوڑ دیتا ہے..... نعمت کے حصول پر اسے جتنی خوشی ہوتی ہے اللہ کی طرف سے بھیجی گئی مصیبت کو بھی وہ اسی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتا ہے۔

اللہ کے احکامات کی بجا آوری کے دوران درپیش آنے والی دشواریوں اور زحمتوں کو ہلکی خوشی سہنا..... تمام مصائب و مشکلات کو ہلکی خوشی برداشت کرنا، تو انسان پھر اس مقام پر جا پہنچے..... جہاں وہ

دیدار الہی کا منتظر رہنے لگے اور اس انتظار کی راہ میں آنے والی صعوبتوں کو ہلکی خوشی برداشت کر جائے..... یہ بہت اعلیٰ پائے کا مقام صبر ہے اور اس مقام پر بہت کم لوگ فائز ہوتے ہیں۔

صبر کے اس مقام تک پہنچنے سے بیشتر دیگر بہت سے مقامات طے کرنا ہوتے ہیں..... ان میں سے ایک مقام ”مقام رضا“ ہے۔

”رضا سے مراد یہ ہے کہ بیماری ہو یا پریشانی جب دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے اور انسان کی سوچ ایک ہی نقطے پر ٹھہر جائے کہ یہ سب میرے آقا میرے رب کی عطا کردہ ہے۔ اس سے گھبرانے کے بجائے میں اسے اپنے آقا اور مالک کی عطا سمجھ کر سینے سے لگا رکھوں تو یہ مقام رضا ہوگا۔

اپنے رب کی طرف سے جو بھی عطا ہو، اسے اپنی تقدیر کا حصہ سمجھ کر ہلکی خوشی قبول کر لے..... خواہ وہ رحمت ہو یا زحمت..... یہ درجہ خالصتاً اللہ کی توفیق ہی سے عطا ہوتا ہے۔

ایک بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ محافل میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”فقر میرے لیے امارت سے بہتر ہے..... بیماری میرے لیے صحت سے بہتر ہے اور موت میرے لیے حیات سے بہتر ہے۔“ کسی شخص نے جا کر حضرت امام حسینؑ سے عرض کیا کہ فضیل بن عیاضؒ یہ جملے کہتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا۔ ”اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے..... یہ رضا کا ایک تمام ہے۔“

☆☆☆

ایک صحابی نے آپ ﷺ سے عرض کیا..... ”یا رسول اللہ ﷺ پہلے تو میرا مال چلا گیا..... اب میرا جسم بیمار ہو گیا.....“ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”تمہارے اندر کچھ نہ کچھ بہتری کا سامان موجود ہے جس کی بنا پر یہ حالات آئے ہیں۔“ اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تعجب کا اظہار فرمایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اے ابو بکرؓ..... کیا تم کبھی بیمار نہیں ہوئے؟ کیا تم پر کبھی کوئی مصیبت نہیں آئی؟ کیا تم کبھی رنجیدہ

کہ ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ مومن کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے بائیں طرف کے فرشتے کو کہتا ہے کہ اس سے قلم اٹھالے.....“ (یعنی اس کے گناہ لکھنے چھوڑ دے) اور دائیں طرف کے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ میرا بندہ نیک عمل کرتا ہے اس سے زیادہ لکھ۔“

حدیث قدسی میں ارشاد رب العزت ہے ”جو میری قضا (حکم) پر راضی نہ ہوا اور میرے عطیہ (دیا ہوا) کا شکر نہ کیا..... اسے چاہیے کہ میرے سوا اور کوئی رب تلاش کرے۔“

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور انہیں کہتا ہے کہ دیکھو میرا بندہ کیا کہتا ہے..... اگر وہ اس حالت میں الحمد للہ کہتا ہے یعنی شکر ادا کرتا ہے تو وہ عمل خدا کی طرف اٹھایا جاتا ہے..... پھر اللہ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ گواہ رہو اگر میں اس بندے کو اس حالت میں فوت کروں گا تو جنت میں جگہ دوں گا اور اگر شفا دوں گا تو اس کے گوشت کو اچھے گوشت سے تبدیل کروں گا اور اچھا خون پیدا کروں گا اور اس کے گناہوں کو معاف کر دوں گا۔

حدیث رسول ﷺ ہے کہ ”صبر نصف ایمان ہے۔“ ایک اور جگہ فرمایا۔ ”صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔“ حرید ارشاد فرمایا..... ”مصائب پر صبر کرنے میں بڑی برکت ہے۔“

☆☆☆

ایک بار حضور اکرم ﷺ حضرت اُمّ صائبہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا..... ”اے اُمّ صائبہ..... کیا ہوا جو تم اتنی کپکپا رہی ہو؟“ انہوں نے کہا ”کجخت بخار آگیا۔“

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”بخار کو برا مت کہو۔ کیونکہ یہ تو انسان کے گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو صاف کر دیتی ہے۔“

☆☆☆

نہیں ہوئے؟ کیا تم نے کبھی مشکلیں نہیں سہیں؟ اگر تم نے زندگی میں یہ سب جھیل لیا تو اس سے تمہارے گناہوں کا تو کفارہ یہیں ادا ہو گیا..... اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔“ پھر آپ ﷺ نے فرمایا..... ”جب اللہ تعالیٰ کسی کو مشکل میں ڈالتا ہے یا بیمار کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کو دراصل اس کی بھلائی مقصود ہے اور اللہ اسے کوئی ایسا درجہ عطا کرنا چاہتا ہے جس پر ان مشکلات کو عبور کیے بغیر پہنچنا ممکن نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”کہ جب کوئی شخص اللہ کی قربت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مشکل میں ڈال کر آزماتا ہے۔“

بد قسمتی سے ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو کوئی مشکل آ جانے پر بولائے بولائے پھرتے ہیں اگر اس لمحے ہم صرف یہ سوچ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مشکلات میں ڈال کر دراصل ہمارے گناہوں کو دھور ہا ہے..... یا پھر ہمیں اس مصیبت سے گزار کر کوئی اعلیٰ درجہ عطا کرنا چاہتا ہے اور یہ مصیبت زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے..... تو اس پر صبر کا انعام اللہ کے ساتھ کی صورت میں عطا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اللہ کا ساتھ چاہتے ہیں تو اس کی طرف سے آنے والے ہر غم اور تنہم (مشکل) کو اس جذبے کے ساتھ قبول کرنا ہوگا کہ یہ ہمارے لیے بہترین ہے۔

☆☆☆

کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی لذت نہیں پاتا جب تک وہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہو اور پھر اس پر صبر کرے اور راضی رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”جو شخص ایک رات بیمار رہا اور اس نے صبر کیا اور خدا کی مرضی پر راضی رہا تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔“

حضرت ضحاکؒ کا قول ہے کہ جو شخص ہر چالیسویں رات میں ایک رات بھی کسی مصیبت یا رنج و غم میں مبتلا نہیں ہوتا اس کی خدا کے نزدیک خیر نہیں ہوتی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے

ایک عورت خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی اور نہایت خوش ہو ہو کر اپنے مولا کے سامنے ”لبیک لبیک حاضر ہوں اے اللہ، میں حاضر ہوں“ کہہ رہی تھی۔ ایک بزرگ جو اس کی یہ حالت دیکھ رہے تھے انہوں نے جب اس کی یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ یہ عورت بے حد خوش حال اور بے فکر معلوم ہوتی ہے کہ کس قدر خوشی کے لہجے میں لبیک لبیک پکار رہی ہے۔ عورت جب طواف سے فارغ ہوئی تو آپ نے اس عورت سے خوشی کا سبب دریافت کیا تب اس عورت نے کہا۔

”اے مرد بزرگ.....! میرا مکان ملکِ شام میں تھا میرا خاوند ایک بڑا تاجر تھا ایک بار جب وہ سفر پر گیا تو دورانِ سفر جہاز غرق ہو گیا اور مجھے خبر ملی کہ میرا خاوند ڈوب گیا..... میں نے یہ سنا اور سن کر صبر کیا..... پھر میرے دو ننھے بچے گھر میں کھیل رہے تھے ایک بچے نے کھیلے کھیلے چو لھے میں ہاتھ دے دیا..... دوسرے پر جلتی ہوئی ہنڈیا الٹ گئی..... دونوں بچے جل کر خاک ہو گئے..... میری جوان بیٹی جو درتپے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اپنے بھائیوں کو جلتا دیکھ کر دوڑی..... اس کا پیر پھسلانے لگی اور اسی وقت مر گئی..... میں نے ان تمام باتوں پر صبر کیا اور میں اپنے پروردگار کے تمام فیصلوں پر راضی ہوں..... پھر اس کی رضا مندی اور صبر کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی لبیک کے ساتھ ہی اس کی لبیک کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہوں اور گویا میرا معبود ہر وقت میرے ساتھ ہے۔“ سبحان اللہ!

☆☆☆

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ الہی بلا اور سالکین کے لیے صبر کی بہترین مثال ہے۔ آپ الہی ثروت تھے۔ مال و دولت کی فراوانی تھی، زرعی زمین اس قدر تھی کہ کھیتی باڑی کے لیے بیلوں کی پانچ سو جوڑیاں تھیں..... ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں تھیں۔ سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں اور ہر قسم کی آسائش میسر تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں مبتلا کیا تو کھیتیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ مال مویشی

سب وبا کی نذر ہو گئے۔ بیٹے اور بیٹیاں سب ایک مکان کی چھت گرنے سے لقمۂ اجل بن گئے اور آپ ایک ایسی جلد کی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ سارا بدن گل سر گیا..... زخموں میں پیپ اور کیڑے پڑ گئے..... اس حالت میں بس ایک وفادار بیوی کے علاوہ سب عزیز و اقارب، دوست یا ر اور عقیدت مند ساتھ چھوڑ گئے وبا کے ڈر سے شہر والوں نے بستی سے نکال دیا۔ اس بیماری میں آپ نے کئی سال گزارے..... کہیں سات سال، کہیں بارہ سال اور کہیں بیس سال کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال یہ تمام عرصہ آپ نے بے حد کمپرسی میں گزارا..... مگر آزمائش کے ان دردناک لمحات میں بھی آپ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا..... اور اپنے مالک سے اپنے رب سے ایک بار بھی ناقابلِ برداشت تکلیف کا شکوہ تک نہیں کیا..... سارا جسم بیماری میں مبتلا تھا فقط ایک زبان سالم تھی اور وہ ہر وقت خالق و مالک کی ثنا میں مصروف رہی..... اور جب یہ کیفیت انتہا کو پہنچی تو زبان سے صرف اس قدر الفاظ ادا ہوئے کہ ”اے میرے رب مجھے تکلیف ہو رہی ہے تو مجھ پر رحم فرما کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“

اور پھر رب العزت نے آپ کی آزمائش ختم کی اور آپ اس آزمائش میں سرخرو ہوئے..... تو اللہ نے آپ پر رحمتوں کی بارش کر دی..... آپ صحت یاب ہو گئے، حسن و شباب پھر لوٹ آیا..... مال و دولت کی پہلے سے زیادہ فراوانی کر دی..... اولاد کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔ جو حضرات رنج و مصیبت میں صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں وہ حضرت ایوبؑ کے قصے سے سبق حاصل کریں۔

واقعہ کربلا صبر و رضا کی عظیم ترین مثال ہے..... جہاں حضرت امام حسینؑ صبر و رضا کا پیکر بن کر سامنے آئے۔

حضرت یحییٰ حضرمیؑ فرماتے ہیں کہ میں سفرِ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ تو جب آپؑ ینوا کے برابر پہنچے تو آپؑ نے پکارا..... ”اے ابو عبد اللہ

خوش آمدید

اسے تھی دسمبر سے گہری نسبت
ملا، تو بھی دسمبر میں

پھڑا، تو بھی دسمبر ہی میں

تھا مزاج بھی دسمبر کی طرح

سرد، برفِیلا سا

تبھی تو دوستو!

ہر سال دسمبر کو اپنے اشکوں کی مالا پہنا کر

خونِ جگر کی، سرخ کارپٹ بچھا کر

ہلکا سا مسکرا کر

خوش آمدید کہتی ہوں

☆☆☆

دسمبر پوچھتا ہے

نخِ بستہ دسمبر کی، اک سرمئی سی شام

جب تقدیر نے تجھ سے ملایا

وہ لمحہ، وہ موسم، آج بھی ہے

سوچ کی دہلیز پر ٹھہرا ہوا

یہی تو تھا وہ موسم، جب میری زندگی رنگین ہوئی

میری پلکوں سے اشکوں کو چن کر

تم نے سنے دکھائے

دسمبر کی اس خنکی کو تو نے

اپنی نرم باتوں اور جذباتوں کی حدت سے گرمادیا تھا

میری سماعتوں کو قہقہوں سے آشنا کیا تھا

آج..... پھر دسمبر کی وہی شام ہے

مگر..... ٹھنڈی، سہمی سی میں تیرا ہجر رو رہی ہوں

کہاں ہے تو

تیرا خیال انگلی بن کے، میرے اشک پونچھتا ہے

ان ہجر لمحوں میں، دسمبر تیرا پوچھتا ہے

شاعرہ: عین الحیاتِ ترمذی، واوی کاغان

فرات کے کنارے صبر کرنا..... میں نے عرض کیا.....
یہ کیا؟“ آپ نے فرمایا..... کہ نبی کریم ﷺ نے
فرمایا۔ ”مجھے جبریلؑ نے بتایا ہے کہ حسینؑ فرات کے
کنارے قتل ہوگا اور مجھے وہاں کی مٹھی بھر مٹی
دکھائی.....“ اور بھی روایات ہیں جن میں حضور اکرمؐ
نے..... حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا اظہار و
اعلان فرمادیا تھا..... لیکن یہ کسی روایت میں
نہیں پڑھا کہ کسی نے دعا کی ہو کہ الہی کر بلا
میں ہونے والا واقعہ یا آنے والے مصائب نہ
آئیں۔ حضور ﷺ دعا فرمادیتے..... حضرت علی کرم
اللہ وجہہ، حضرت فاطمہؑ و حضرت امام حسنؑ اور خود
حضرت امام حسینؑ ہی دعا فرمادیتے کیونکہ کالمین کی
دعا تقدیرِ مبرم کو بھی بدل دیتی ہے۔

تو کسی نے دعا کیوں نہ فرمائی؟ اس لیے کہ وہ
راضی برضا تھے..... اور جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی
طرف سے یہ ایک امتحان اور آزمائش ہوگی۔

اور واقعہ کر بلا میں حضرت امام حسینؑ بے مثال
صبر و ضبط کا پیکر بن کر جامِ شہادت نوش کرتے ہیں
صرف اپنے مولا کی رضا کے لیے۔

بلاشبہ کھرے اور کھوٹے، سچے اور جھوٹے کی
اگر پہچان ہوتی ہے تو امتحان کے میدان میں ہی ہوتی
ہے..... اور ہر شخص کا امتحان اس کی دینی و ایمانی
حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر کوئی دین و ایمان
میں مضبوط اور سخت ہوتا ہے اسی قدر اس کے امتحان
میں سختی کی جاتی ہے..... چنانچہ سرور کائنات ﷺ کا
ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء کا
ہے..... ان کے بعد صالحین کا..... یوں درجہ بدرجہ ان
لوگوں کا جو ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

آقائے دو جہاں ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ
کریں تو دیکھیں کہ آپ..... یتیم پیدا ہوئے..... چھ
سال کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا پھر دادا
نے آپ ﷺ کی پرورش کی..... نو سال کے ہوئے تو

دادا بھی رحلت فرما گئے..... پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی۔ اور جب فریضہ تبلیغ شروع کیا تو کفار کی جانب سے بے تحاشا ذیتیں دی گئیں۔ آپ ﷺ کی پیاری بیوی حضرت خدیجہؓ اور آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپ کا بے حد ساتھ دیا اور بالآخر یہ دونوں بھی وفات پا گئے۔ آپ نے اس بڑے صدمے کو بے حد صبر کے ساتھ سہا..... آپ کی اولادیں آپ کے سامنے وفات پا گئیں مگر آپ ﷺ کے قلب و ذہن پر ہمیشہ صبر کی مہر لگی رہی۔

غزوہ احد میں کفار نے آپ رسول اکرمؐ پر تیر برسائے..... کنکر پھینکے..... دندان مبارک شہید کیے لیکن آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ان کے حق میں یہی الفاظ نکلے..... ”اے اللہ! ان کو معاف فرما یہ نادان ہیں۔“ آپ کی حیات میں شاید ہی کوئی پریشانی ایسی ہو جس سے آپ ﷺ کا واسطہ نہ پڑا ہو..... لیکن کبھی زبان مبارک سے دشمنوں کے حق میں بددعا نہ نکلی..... آپ ﷺ کی سیرت طیبہ صبر و ضبط کی مکمل تفسیر ہے۔

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صبر کو ارکان ایمان میں سے ایک رکن قرار دیا آپؓ نے فرمایا..... ”اسلام چار ستونوں پر مبنی ہے۔

1۔ یقین 2۔ صبر 3۔ جہاد 4۔ عدل“

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ”ایمان میں صبر کی مثال ایسی ہے جیسے بدن میں سر..... جس کا سر نہ ہو اس کا بدن نہیں ہوتا اور جسے صبر حاصل نہ ہو اس کا ایمان نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ لوگ اپنا اجر دو گنا پائیں گے جس پر انہوں نے صبر کیا۔“ (سورۃ القصص) اور فرمایا..... ”صبر والوں کو ہی ملتا ہے ان کا اجر بغیر حساب کے۔“ (سورۃ الزمر)

یعنی صبر کی جزا کو ہر عمل کی جزا سے دو گنا بتایا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ دریائے دجلہ میں ایک

دوریش پھنس گیا وہ تیرتا نہیں جانتا تھا کسی نے کنارے سے پکار کر کہا..... ”اے دوریش! اگر تم چاہو تو کسی کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں نکال لے۔“ دوریش نے کہا۔ ”نہیں“ اس شخص نے کہا کہ ”کیا غرق ہونے کی خواہش ہے؟“ دوریش نے کہا۔ ”نہیں“ اس نے کہا کہ ”پھر کیا چاہتے ہو؟“ جواب دیا۔ ”وہی چاہتا ہوں جو میرا رب میرے لیے چاہتا ہے۔“ سبحان اللہ.....

افسوس صد افسوس..... آج مخلوق سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے افعال و احکامات پر ہر لمحے اعتراض کرنے میں مصروف نظر آتی ہے..... اس کے موسموں پر اعتراض..... اس کے قضا و قدر سے نارضا مندی..... اس کی آزمائشوں پر بے صبری..... اور بہت زیادہ قابل اعتراض فقرے اب ہماری زبانوں پر اس عظیم رب کائنات کے خلاف دن رات جاری رہتے ہیں..... جن سے ہمیں سخت احتیاط برتنا چاہیے..... اور اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر راضی رہنا چاہیے..... جیسے حضرت منصور حلاجؒ خوشی، خوشی اس کی رضا کے لیے سولی پر چڑھ گئے۔

ہمیں اپنے رب کی رحمت پر پختہ یقین ہونا چاہیے..... اور انتہائی صبر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے..... بغیر کسی شکوہ شکایت کے..... اللہ ہمیں صابرين میں شمار فرمائے..... (آمین)

اے میرے پروردگار! اس مضمون کی تیاری میں کہیں کوئی غلطی کمی کوئی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ ہو گئی ہو تو میرے پیارے رب مجھے معاف فرما اہل اس میں تعاون کرنے والوں کو اس کا مطالعہ کرنے والوں کو توشہ آخرت بنادے۔

آمین.....

نوٹ: قارئین کرام! محترمہ اختر شجاعت آٹھ دس مصنفین کی کئی، کئی جلدوں پر مشتمل تصانیف سے مکمل تحقیقی استفادے کے بعد یہ جامع صفحات آپ کے لیے ترتیب دی ہیں۔ (جزاک اللہ)

ہیکتا خیال ہے

عظمتی آفاق سعید

”تعریف شاید دنیا کا سب سے مشکل اور تکلیف دہ کام ہے جو اگر کسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی انجام پا جائے تو وہ یقیناً اکیلے میں اپنا منہ پیٹتا ہوگا کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا۔“

”کسی کی تعریف کر کے ہم کیوں کسی کو خوشی مہیا کریں؟“

”ہماری کون تعریف کرتا ہے جو ہم کسی کی کریں؟“

”دماغ خراب کرنا ہے تعریف کر کے.....“

یہ وہ چند جملے ہیں جو ہم بیشتر اوقات سنتے ہیں۔ یعنی گویا تعریف نہ کر کے آپ اچھے خاصے لوگوں کو پاگل ہونے سے بھی بچا سکتے ہیں۔ چاہے آپ سند یافتہ ڈاکٹر ہوں یا نہ ہوں۔

اب ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا کہ جب ہم نے نیا گھر خریدا..... گویا جیسے چاند کا ٹکڑا خرید لیا ہو (ماشاء اللہ)۔۔۔۔۔ یہ ہماری رائے ہے اوروں کا اس سے متفق ہونا۔۔۔۔۔

بے ضروری ہے۔

نیا گھر تھا تو چیزیں بھی اپنے حساب کتاب سے بڑھ کر یا عرف عام میں کہیں تو اوقات سے بڑھ کر رکھ ڈالیں اور جو پرانی والی بھی رکھیں انہیں بھی منہ دھلوا کر سرخی پاؤ ڈر لگا کر رکھا تاکہ پرانی سی نہ لگیں۔

جب سارا نام جھام بج گیا تو وہی خصلت جو ہر ایک میں موجود ہے کہ اب انہیں دکھایا جائے اور تعریف بھی سنی جائے..... دوسروں کو جلایا جائے..... (یہ بات بار بار دل میں آئی جسے لات مار کر بھگایا کہ بری بات ہے)

”شبانہ آنٹی کو تو ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے گا ہمارا گھر دیکھ کر۔ اسما خالہ تو بے ہوش ہو جائیں گی۔ رفیق ماموں کا تو دماغ الٹ جائے گا..... اور شبو آنٹی تو اسپتال میں ہو جائیں گی“ (گمان بھی تو دیکھیے ایف سکشن 330 کی اڑان رکھتے تھے)

یہ وہ چند گزارشات عرض کی گئی ہیں جو ہم اور ہمارا خاندان اس دعوت سے پہلے کورس میں گایا کرتا تھا جو ہم نے

اپنے نئے گھر کے سلسلے میں رکھی تھی۔ مگر اس دعوت کے بعد ہمارا اپنا دماغ الٹا، ہم بے ہوش ہوئے اور اٹیک آتے، آتے بچا..... کیونکہ ہمارے احباب بھی تو اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں کسی کی تعریف کرنا، گناہ کبیرہ تھا۔ (ٹٹ فارٹیٹ اسی کو تو کہا جاتا ہے۔)

”کہاں سے مل گئیں یہ چیزیں؟ اور پتا کیسے چل گیا

تمہیں کہ کون سی چیز کہاں رکھی جاتی ہے؟“ چھوٹی آنٹی جب ہمارے گھر آئیں تو بیزاری سے تمام چیزوں کا جائزہ لیتی ہوئی بولیں۔ (مجال ہے کہ منہ سے واہ نکلا ہو)

”وہ میں نے یہ تمام چیزیں.....“ ابھی میری بات مکمل

بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے جملہ اچک لیا۔

”اب یہ مت کہنا کہ تمام چیزیں تم نے ڈیزائن کی

ہیں..... یا ڈیکورٹر کے ساتھ مل کر تم نے سیٹ کی ہیں۔“

جملہ اب مکمل ہوا۔

”واقعی میں نے ہی ڈیزائن کی ہیں، کب سے لگی ہوئی

تھی تقریباً ایک سال لگا ہے تمام چیزیں مکمل ہونے میں۔“

میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ (اور حقیقت بھی

تھی..... مجھ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہاؤس ڈیکورٹر

ہو..... ہر چیز کا)

”بھئی دیکھو برا مت ماننا، ہم نے تمہارا پرانا گھر بھی

دیکھا ہوا ہے اور تمہارا ڈیزائنر ماسٹر بھی دیکھا ہوا ہے۔ تو ہم

سے تو تم یہ باتیں کرو نہیں.....“ بڑی آنٹی نے تمسخرانہ لہجے

میں کہا۔

”جی کیا کہہ رہی ہیں آپ.....؟“ کسی ہیروئن کی

طرح سر تھام کر پوچھا گیا۔

”ارے بچوں کے کھلونے ڈرائنگ روم میں رکھتی

تھیں۔ کبھی جو چائے کی پیالی کے نیچے اس کپ کی میچنگ

سار رکھی ہو؟ ہمیشہ کوائرڈ پلیٹ رکھی ہوتی تھی۔“ میری پرانی

سہیلی مجھ پر چوٹ مار رہی تھی..... جس کا مطلب تھا کہ جس طرح ڈھنگ کے کپڑے نہیں پہنتیں اسی طرح ڈھنگ کے برتن بھی نہیں رکھتیں۔

”تمہارے بچوں کے لیے ہی تو رکھتی تھی کھلونے ذیلیوں.....“ میرے اوپر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے کہ یہ میرے اپنے ہیں..... (وہ الگ بات کہ کھلونے ڈیکوریشن میں سمجھ کر ہی رکھے تھے کیونکہ صاف اور نئے وہی تھے)

”سنو یہ اتنا اچھا صوفہ کہاں سے مل گیا.....؟“

یعنی تعریف میں بھی ایک برچھی چھپی ہوئی تھی۔

”کہاں سے مل گیا کا کیا مطلب.....؟ ڈیزائن سوچا تھا

ویسا ہی بنوایا ہے ہم نے۔“ میں نے اتر اہٹ سے کہا کہ چلو اب کے تو کوئی تعریف سننے کو ملی..... جب چچی نے صوفے پر بیٹھ کر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔

”دماغ تو رہنے ہی دو تم اپنا، وہ کہاں چلتا ہے تمہارا، کسی سے گھر سیٹ کروایا ہے تم لوگوں نے ورنہ یہ سب تمہارے بس کی بات نہیں.....“ وہ برا سامنہ بنا کر بولیں..... کہ اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تھا..... تو بھی تعریف کرنے میں کیا حرج تھا۔

”کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے.....؟“ میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا..... حالانکہ اس وقت میرے غصے کی حدود گالم گلوچ کی سرحدوں کو بھی پار کر گئی تھیں۔

”کیوں نہ سمجھوں، دو دفعہ تو الٹی تمہیں پہن کر تم ہمارے گھر آ چکی ہو..... اگر اتنی ہی دماغ کی تیز ہوتیں تو ہمیں پتا چل چکا ہوتا.....“ بس سب تیر برسا رہے تھے۔

(اور میں کھا رہی تھی)

”کہاں جنگل میں گھر بنا لیا ہے اتنی دور.....“ کسی نے جملہ مارا۔

”اب ہم آگئے ہیں منگل کریں گے.....“ میں نے جملے کی مزاحمت میں کہا۔

”سمندر کے قریب گھر لینے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی اگر طوفان آیا تو سب سے پہلے تمہارا ہی نمبر آئے گا.....“ ایک قہقہے کے ساتھ یہ جملہ ادا ہوا۔

”اب کوئی طوفان نہیں آئے گا..... کیونکہ ہم کسی

طوفان سے کم تھوڑی ہیں.....“ دوسرے رشتے دار کا منہ بند کیا گیا..... (اور خیال آیا..... یہ جو عرصے سے طوفان آتے، آتے رک جاتا ہے..... یقیناً اللہ کس، کس کی دعاؤں کو قبول کر رہا ہے اور کرتا رہے گا)

”اتنا بڑا گھر لینے سے کیا فائدہ..... کوئی مار کے بھی چلا جائے تو پتا نہ چلے کہ کب مرے اور کس نے مارا.....“ کسی نے اپنے سینے میں ٹھنڈ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ (ہم کوئی مشہور لوگ تھوڑی ہیں)

”یہاں تو کوئی بھی کسی سے نہیں ملتا..... ایک دم نکو بن جاؤ گی۔“

”کوئی کسی سے بے شک نہ ملے..... مگر ہم سے ضرور ملے گا..... ہمیں لوگوں کی عزت کرنی آتی ہے.....“ دل تھام کر کہا..... جس پر تمسخرانہ قہقہے سنے گئے۔

”جس کو رشتے داروں سے نفرت ہو وہ یہاں آ کر رہے۔“ (ہم نے تو اپنی محبت کے بیان کبھی نہیں دیے تو نفرت کیسے کریں گے)

غرض اسی طرح کی اور کئی باتیں جو سننے کو ملیں اس دعوت میں، جس میں ہم میزبان تھے اور مہمان قسائی جن کے ہاتھوں میں بغدادے تو نہیں تھے مگر زبانیں کسی تیز دھار چھری سے کم نہیں تھیں۔ دعوت سے نمٹنے کے بعد فون کی قطاریں لگ گئیں۔

”جی ہاں، مجھے کہیں جانا ہے اور میں بہت خوش ہوں ابھی کل ہی فون آیا ہے کہ بڑی ممائی نے بھی میرے گھر کے پیچھے ہی گھر بنا لیا ہے اور ایک ہفتے میں ان کے گھر بھی دعوت ہے سو میں نے بھی اپنی زبان کو دھار لگانا شروع کر دی ہے اور وہی جملے میری سماعتوں میں گونجنے لگے ہیں کہ اس تعریف کا وقت آ گیا ہے جو میں نے بھگتی ہے۔

آج کل میں بہت خوش ہوں اور کیوں نہ ہوں..... کہ مجھے بھی تو کافی دنوں بعد کسی کی اچھی طرح تعریف کرنے کا موقع ملنے والا ہے۔

کیوں، کیا خیال ہے.....؟

☆☆☆

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

عزیز بہنو! ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضر خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔
سوالات حاضر خدمت ہیں۔

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے.....

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں..... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

1۔ اپنی شخصیت کو پُر اثر بنانے کے لیے ہر انسان سے پُر خلوص ہو کر ملیں اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھیں۔

2۔ اپنے ابو کے دنیا سے چلے جانے کے بعد میرے فکر و خیال کا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔ کیا، کیا کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔

3۔ میں اکثر گنگناتی ہوں، پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ ان سلسلوں میں بہنیں بہت ہی دلچسپی سے حصہ لیتی ہیں اور یہ سلسلے سب کو ہی پسند ہیں۔ میں چاہوں گی کہ ایک سلسلہ ملاقات کے عنوان سے شروع کیا جائے جس میں بہنیں ایک دوسرے کو پیغام دیں۔

4۔ ضمیر کی عدالت میں ضرور جائیں کیونکہ وہاں غلط فیصلے نہیں ہوتے اور نہ ہی وکیلوں کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔

5۔ میرا تعارف انہی دو اشعار میں ہے۔

دوستی میں خود کو جھکا دینا کوئی عیب نہیں فراز
چمکتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے چاند کی خاطر
جو مانگی تھیں دعائیں زندگی میں اپنی خوشیوں کی
میں ان ساری دعاؤں کو تمہارے نام کرتی ہوں
طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی

1۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خواتین کو دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس میں انہیں اپنے اندر کے ہنر کا جو ہر ضرور تلاش کرنا ہوگا۔ میں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے ابتدائی سال اپنی سسرال کو اپنا بنانے اور ان میں گھلنے ملنے میں گزار دیے۔ اس سارے میں اپنی ذات کہیں گم ہو گئی۔ یقین کر س میں مختلف جرائد میں شادی سے پہلے لکھا کرتی تھی لیکن وہ سب چھوٹ گیا تھا۔ اس طرف واپس لانے والی ہستی انجم انصاری جی کی ہے انہوں نے مجھے واپس لکھنے کی ترغیب دی۔ سو آپ ہاؤس وائف ہیں یا ورکنگ وومن..... آپ اپنے ہنر کو استعمال میں لائیں

اور اپنے اخلاق کو ہر قدم پر بہتر رکھیں۔
2۔ مجھے نہیں پتا کہ میری پاکیزہ بہنوں کو یہ واقعہ دلچسپ لگے یا نہیں لیکن میرے لیے بہت اہم ہے جب ہماری نئی، نئی شادی ہوئی تو ہمیں سب سے زیادہ بے چینی اپنے پیارے پاکیزہ کو پڑھنے کی تھی۔ ہمارے میاں جانی نے ہمارے شوق کو دیکھتے ہوئے باقاعدگی سے پاکیزہ ہمیں لا کے دینا شروع کیا۔ میری سسرال میں مطالعے کا کوئی شوقین نہیں تھا ہمیں اپنی ساسو امی سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ان کو اعتراض نہ ہو..... میں خوب دل لگا کر کام کرتی اور پھر وقت ملتے ہی کمبل میں چھپ کر پاکیزہ پڑھتی.....

پر جناب ایک دن جب دوپہر کے کام نبٹا کے ہم نے سب کو آرام کرتے پا کر اپنے کمرے کی راہ لی اور کمبل میں گھس کر پاکیزہ میں ایسے گم ہوئے کہ پتا بھی نہیں چلا کہ ساس امی کب ہمارے پلنگ پر آ کے لیٹ گئی ہیں۔ پتا تو تب چلا جب انہوں نے ہمارے کندھے پر دھپ لگائی اور پوچھا یہ کیا ہے جو تم روز پڑھتی رہتی ہو ہماری تو شئی گم ہو گئی لیکن ان کی اگلی خواہش یہ تو ہم حیران ہی رہ گئے جب امی نے ہم سے کہا کہ جب پڑھنا ہی ہے تو تھوڑا اونچا پڑھا کرو تاکہ میں بھی سن لیا کروں..... پھر ہم ساس بہو کا یہ معمول بن گیا کہ میں ان کو ناول سناتی اور وہ سنتیں اور مزے کے تبصرے بھی کرتی تھیں۔ ان کے اسی عمل نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا اور مجھے ایک سہیلی مل گئی۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے اس لیے پسند ہیں کہ ان میں انفرادیت ہے..... اصلاح ہے، مزہ ہے۔ خواہش ہے کہ یہ ایک سلسلہ شروع ہو کہ پاکیزہ کی قاری بہنیں (اخلاق کے دائرے میں رہ کر) ایک دوسرے کو پیغامات دے سکیں۔ دوسرا ہم جیسی نو آموز شاعرات کو بھی موقع ملنا چاہیے۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے بہت پیارا اور احترام سے یہ استدعا کرنا چاہوں گی کہ وہ اپنے ناول کے

5۔ الفاظ میں پڑ جائے گی جان مکمل لے آئیں گے ہم عشق پہ ایمان مکمل آجائے میرا نام پاکیزہ کے ہمراہ ہو جائے کسی روز تو پہچان مکمل

فرخندہ جعفری، گجرات

1۔ میں اپنے تجربے کے حوالے سے یہ کہوں گی کہ خواتین سروس کر رہی ہوں یا امور خانہ داری..... دن رات گورکھ دھندوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ پلاننگ کے تحت زندگی گزاریں اور عظمندی سے اپنی شخصیت کو پُر اثر بنانا اور حالات کا مقابلہ کرنا آتا ہو تو کوئی بھی گورکھ دھندا یا مشکلات ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے..... وہ اپنے حسن سلوک سے دوسروں کے دکھ درد میں ان کا ساتھ دیں تو ان کی شخصیت خود بخود پُر اثر ہو جائے گی۔

2۔ بہت سے واقعات ہو سکتے ہیں کسی ایک کا کیا ذکر..... پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا۔

3۔ پاکیزہ کے سب ہی سلسلے بہت پسند ہیں سب میں زندگی کی رمت نظر آتی ہے۔ اختر شجاعت صاحبہ کا شمع ہدایت پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے ملا کر ایک گلدستہ بن جاتا ہے اور اسی گلدستے کا نام پاکیزہ رسالہ ہے۔ ہر خط کا جواب بڑی محنت سے دیا جاتا ہے۔

4۔ میں پاکیزہ مصنفات سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ سب بہت محنت کر رہی ہیں، بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کوئی ناولٹ ہو، کوئی افسانہ ہو یا کوئی کہانی ہو سب میں کچھ نہ کچھ پیغام دے رہی ہیں۔ ماشاء اللہ..... مگر کہانی میں اتنا ظلم بھی نہ دکھایا کریں کہ ان پر دل دکھی ہو جائے خاص کر بیٹیوں کے بارے میں.....

5۔ تعارف کے سلسلے کیا کہوں میرا نام فرخندہ جعفری ہے جو آپ جان گئی ہوں گی اور میں پاکیزہ کی

گلشاد نذیر..... مری

1: روز و شب کے اس گزرتے وقت میں دوسروں سے گلے شکوے کم سے کم کریں بلکہ دوسروں کے کام زیادہ آئیں۔ ضروری نہیں کہ پیسے خرچ کریں بلکہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے دکھ درد سن کر اور انہیں اچھے مشورے دے کر اپنی شخصیت کو پُر اثر بنائیں۔ میں نے بھی ہمیشہ دوسروں کو عزت دی۔ خواہ وہ صفائی والا ہو، مانگنے والا ہو یا کوئی اور بڑی شخصیت، یہی وجہ ہے کہ میں ان کی طرف سے عزت پاتی بھی ہوں کہ عاجزی تو میرے مولا کو بھی پسند ہے۔



2: تفسیر قرآن پاک پڑھنے کے بعد خیالات میں بڑی مثبت تبدیلی آئی ہے اور دنیا کی محبت دل سے ختم ہو گئی بلکہ اب میں صرف اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہوں۔

3: پاکیزہ ڈائری بہت پسند ہے کہ عظمیٰ کو دریا کوزے میں بند کرنا آتا ہے۔ جلت رنگ، ادارہ، حمد و نعت، شعر، لطیفے غزل، غرضیکہ ان صفحات میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ خواتین کے لیے مختلف موضوعات پر مختصر مضامین لکھنے کا سلسلہ بلکہ انعامی سلسلہ شروع کیا جائے کیونکہ ہر بہن افسانہ نہیں لکھ سکتی۔ مگر مختصر موضوعات کو قلم بند کر سکتی ہے۔

4: پاکیزہ مصنفات سے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے مگر صرف اتنا کہوں گی کہ حقیقت سے قریب ترین تحریر ہی دلوں کو چھوتی ہے۔ بس اس کا خیال رکھیں۔

5: یہ محفل جو آج بھی ہے اس محفل میں ہے کوئی ہم سا ہم سا ہو تو سامنے آئے

کوثر خالد، جڑانوالہ

1- منادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے میں نے سسرال والوں کے لیے اپنی لڑکپن کی عادات بدلیں اور پھر ان لوگوں کو بدلنے پر مجبور کر دیا۔ آج میں سرخرو ہوں، راج کرتی ہوں۔ اس شعر کی مکمل تفسیر بنی ہوں کہ

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا سچ بولنا اور سادہ رہنا..... گھر کے ڈھیروں کام کم کر دیتا ہے اور سکون بھی رہتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی وقت ملتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ تقویٰ، سادگی، سچائی اور میانہ روی کامیابی کا زینہ ہے۔

2- جناب... کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں..... ہزاروں واقعات، کروڑوں لمحے ہوں گے جب ہم نے دعا کی ہوگی کہ اللہ ایسا بنادے اور اللہ ایسا بننے سے بچالے۔ پانچویں جماعت میں مس محمودہ کی بیٹی بے بی آئیں..... کلاس لی اور لڑکیوں سے رسالے برآمد ہوئے تو ایک بات کہی..... دیکھو میں رسالے پڑھنے کی اجازت اس بچی کو دوں گی جو ہیرو سے متاثر ہو کر نیکی کی ہر بات خود میں پیدا کرے اور بد کرداروں سے پناہ چاہے..... ہم اس بات پر آج تک قائم ہیں۔ بسم اللہ پڑھ کر رسالہ کھولتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ اس رسالے کی ساری اچھی باتیں مجھ میں پیدا کر دے مولا..... اور باقیوں سے بچالے کہ دعا ہی من کا ہتھیار ہے۔

3- میں چاہتی ہوں کہانیاں کم اور مختصر ہوں بلکہ ان کی جگہ بالکل سچے واقعات ہوں تاکہ ہمیں پتا چلے پاک لوگ دن بھر میں کیا کرتے ہیں اور ماضی میں کیا، کیا..... ہر رسالے میں حمد و نعت اور اسلامی سلسلوں کو بہت زیادہ ہونا چاہیے۔ غلط باتوں کو سرعام نہ کریں۔

4- پہلے تو میں ہر بندے سے ہر عالم سے ہر مصنف سے پوچھنا چاہتی تھی مگر جب ایک حدیث پڑھی۔

امنت باللہ کہہ اور قائم رہ..... کسی سے سوال نہ

پوچھنا پڑے گا..... تو الحمد للہ اب سوالوں کے جواب خود ہی چل کر آ جاتے ہیں۔ یہ آپ کا سوالنامہ بھی میری دعا یا آرزو کا نتیجہ ہے کہ میں نے بارہا واقعہ لکھ کر بھیجنے کا سوچا مگر نہ کر سکی۔ تو میرے مولانا سوال بھیج دیے۔

ظاہر میں کچھ ایسی ہوں نوکر و نوکر دھکتی ہوں
باطن میرا ایسا ہے سب پر حکومت کرتی ہوں
آخر میں اک پیغام مسلمانوں کے نام.....

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یا سکین کنول..... پسرور

1۔ اپنی شخصیت کو پُر اثر بنانے کے لیے اپنا خیال رکھیں صرف کاموں کو زندگی کا مقصد نہ بنائیں وہ تو ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اوپر بھی توجہ دیں خصوصاً

متوازن خوراک کی طرف تاکہ اپنے خاندان کو سنبھال سکیں ویسے بھی ایک صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ رکھتا ہے۔

2۔ میرا چھوٹا بیٹا باتوں، باتوں میں کہہ گیا پہلے ماما فوت ہوں گی اور

آخر میں، میں کیونکہ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ فکر و خیال کا رخ فوراً دنیا سے آخرت کی طرف مڑ گیا۔ ہم نے بچوں کو کیا بنانا ہے ان کی بہتر تعلیم و تربیت کریں گے تو بعد میں یاد رکھیں گے۔

3۔ اشعار والے سلسلے زیادہ پسند ہیں۔ غزلیں، نظمیں علیحدہ صفحات پر ہونی چاہئیں۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے اتنی گزارش ہے کہ زندگی کے تلخ واقعات ضرور لکھیں مگر شیریں بیانی کے ساتھ..... ہر طرف یہاں بری خبریں بکھری پڑی ہیں۔

انسان مایوسی کی طرف چلا جاتا ہے اپنی تحریروں میں امید اجاگر کریں تاکہ عام آدمی کا مورال بلند ہو۔

5۔ یا سکین کنول ایم اے، ایم ایڈ..... انجم انصار

صاحبہ کی بہت پرانی فین..... پاکیزہ سے رشتہ کبھی نہ توڑنے والی ایک معمولی شاعرہ ہے جس کی دو کتابیں ”خاموشی جب کلام کرتی ہے“ اور ”آنکھ میں سمندر“ شائع ہو چکی ہیں۔

ردا حسین، کراچی

1۔ آج گھر کے اندر بیٹھ کر آس پاس سے..... بے خبر ہو کر زندگی نہیں گزاری جاسکتی اس لیے اپنی ذات کی انفرادیت کو سب سے پہلے پہچاننے کی کوشش کریں اور پھر ہر طرح کے لوگوں اور ماحول میں اپنی جگہ بنائیں۔

2۔ میں نے مصنف ہاشم ندیم کا ناول ”عبداللہ“ خرید کر رکھا ہوا ہے جب کبھی روٹین لائف سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے تو اس کتاب کے مختلف حصے پڑھ لیتی ہوں کیونکہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس کو پڑھ کر میری زندگی میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آئیں۔

3۔ پاکیزہ میں بے شمار موضوعات ہوتے ہیں جو روزمرہ زندگی کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر لڑکی کو پاکیزہ پڑھنا چاہیے..... سوشل میڈیا کے حوالے سے مفید معلومات کا سلسلہ بھی شروع کریں۔

4۔ پہلی مرتبہ محترمہ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھی اگلے ماہ کے پاکیزہ کل انتظار ہے اسی طرح ہمارے لیے اچھی، اچھی چیزیں لکھتی رہیں۔

5۔ مجھے نئے، نئے لوگوں سے ملنا اور ان کے بارے میں جاننا اچھا لگتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے رویے اور ان کی فطرت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے جو زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

بنت اصغر حسین..... کراچی

1۔ اس تیز رفتار دور میں اپنی شخصیت کو مضبوط اور پُر اثر بنانے کے لیے باعمل اور با مقصد کاموں کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں۔

2 زندگی میں ہونے والا ہر حادثہ یکسر تبدیل کرتا گیا اور آج بھی گزرے کل سے مختلف ایک نئی شخصیت ہوں۔

سلوک

ایک مرتبہ حضرت علی ابن الحسین المعروف امام زین العابدینؑ قحط کے زمانے میں مدینے کے لوگوں میں کھانا تقسیم فرما رہے تھے۔

ایک شخص کی باری آئی تو اس نے کہا۔

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“

آپؑ نے فرمایا۔ ”میں تجھے کیسے بھول

سکتا ہوں جب ہم کربلا سے قیدی بن کر جا رہے

تھے تب تو نے ہمیں پتھر مارے تھے۔“

اس نے کہا۔ ”آپ پھر بھی مجھے کھانا

دے رہے ہیں؟“ آپؑ نے فرمایا۔

”اس وقت ہم تیرے در پر آئے تھے اور

وہ تیرا سلوک تھا لیکن..... آج تو ہمارے در پر آیا

ہے اور یہ آل محمد ﷺ کا سلوک ہے۔“

سبحان اللہ.....

مرسلہ: نیلو فرخان، بہارہ کہو

3۔ افسانے بہت پسند ہیں کیونکہ ایک ہی وقت میں بیٹھ کر ایک سبق آموز تحریر دلچسپی کا باعث بنتی ہے..... اور بیوٹی ٹیس کا سلسلہ بھی ہونا چاہیے۔ (اب تو یہ حاضر ہے جناب)

4۔ سب مصنفات کی تحریروں میں انفرادیت ہوتی ہے اکثر کسی نہ کسی کہانی میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے تو بے اختیار مصنفہ سے روبرو ملاقات کر کے یہ بات بتانے کو بہت دل کرتا ہے کہ آپ کی کہانی کا یہ کردار تو بالکل میرے جیسا ہے۔

تندی بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

انجم مشیر..... کراچی

1۔ اپنے قیمتی وقت کے کچھ لمحے اپنے ان عزیزوں کے نام کریں جو نادار ہیں، بیمار ہیں، ضعیف ہیں اور بے اولاد ہیں۔ خلوص دل سے ان کی مدد کریں، احوال پوچھیں، دل جوئی کریں۔ شخصیت خود بخود پُر اثر بن جائے گی۔

2۔ بہت پرانی بات

ہے، والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا والدہ اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ بھائی والدہ سے زیادہ ہم سے ڈرتے تھے کہ ہم نے کہا ہوا تھا کہ آپ دونوں سات بجے کے بعد گھر سے کہیں نہیں جائیں گے ایک دن



چھوٹا والا بھائی جس کی عمر نو، دس سال تھی ٹیوشن سے گھر آتے ہوئے ساتھی بچوں کے ساتھ کھیل تماشے میں لگ گیا۔ باقی بچے اپنے گھروں کو چلے گئے اور وہ نو بج جانے کی وجہ سے ڈر کے مارے گھر نہ لوٹا..... اور ساری رات ایک زیر تعمیر مسجد کے سامنے پڑی بجری پر سوتے جاگتے گزار دی۔ ہم گھر والے، محلے والے رات بھر ڈھونڈتے رہے۔ صبح ہونے پر لوگ ڈھونڈ کر لائے تو ہم نے پوچھا ایسا کیوں کیا رات بھر خود بھی

پریشان رہے اور ہم سب بھی تو بولا۔ آپ سزا دیتیں تب اس لمحے ہم نے عہد کیا کہ اب کبھی اتنی سختی نہیں کریں گے کہ یہ بھی غلط ہے۔

3 کیونکہ سب بہنوں کی محفل میں آکر سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ حال احوال پتا چلتا ہے جلت رنگ مسکرانے قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر ماہ ایک رائٹر کا انٹرویو ضرور ہو۔

4۔ عشق و محبت کی داستانوں میں دوپٹے کو اتنا پرکشش بنا کر پیش کریں کہ ہماری نئی نسل جو اس سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے اس کو دوبارہ سینے سے لگالے۔

ہم روبرو سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ



آواز کی دنیا کا درِ نایاب

ربیعہ اکرم

پروگرام مینجر ایف ایم 101 کراچی سے دلچسپ باتیں

ہیں۔ ربیعہ اکرم نام ہے عزم مصمم اور عمل پیہم کا..... پیکر اخلاص و محبت، ربیعہ اکرم کا کمال یہی ہے کہ نہایت جانفشانی اور خوش اسلوبی سے اپنی تمام تر منصبی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے بھی ہر دم انہی مسکراتی نظر آتی

قارئین کرام! السلام علیکم راہِ عمل میں جذبہ کامل ہو جن کے ساتھ خود ان کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی اور ہماری پاکیزہ کی مہمان اس شعر کی عملی تفسیر

کئی عشروں سے زوال کی کیفیت طاری ہے لیکن مجھے زوال کے اس عہد میں بھی ربیعہ اکرم اور ایسے ہی درجن بھر تخلیق کاروں میں ایک بار پھر اس قومی ادارے کے عروج کی امید نظر آتی ہے۔“

اور اب ملتے ہیں پاکیزہ کی مہمان ربیعہ اکرم سے.....
پاکیزہ..... ”پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے جاتے ہیں۔“ یہ مثل آپ پر کتنے فیصد صادق آتی ہے؟
ربیعہ اکرم..... یہ مثل خاکسار پر ۱۰۱ فیصد صادق آتی ہے کیونکہ بچپن ہی سے اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بے تابی تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری جماعت کی ننھی منی طالبہ نے بھرے مجمع کے سامنے اسٹیج پر اپنے اسکول کی سینئر طالبہ کے ساتھ لگائی بجھائی کرنے والی بڑھیا کا کردار فل گیٹ اپ کے ساتھ سفید بال، پانوں سے رنگا منہ اور چوڑی دار پاجامہ کرتا پہنے جب انٹری دی تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور سب نے پر فارمنس کے بعد بہت سا پیار کیا۔ پھولے پھولے گالوں کو خوب نوچا اور وہیں کسی نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ بچی مستقبل میں عرش منیر ثابت ہوگی۔

پاکیزہ..... زمانہ طالب علمی میں کس نوعیت کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں؟

ربیعہ اکرم..... اسٹیج ڈرامے، تقاریر، مباحثے، ڈینی آزمائش، ٹیبلو، ملی نغموں، مضمون نویسی، کلاس سجانے، کارڈز بنانے، مصنوعی پھول بنانے غرض ہر طرح کے مقابلوں میں حصہ لیا۔

پاکیزہ..... عموماً زمانہ طالب علمی میں ہر فن مولا قسم کی طالبات تعلیم ختم ہوتے ہی تمام سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لیتی ہیں۔ اس کے برعکس ماشاء اللہ آپ تو اتر سے سرگرم عمل ہیں، راہ میں رکاوٹ نہیں آئی؟
آپ کے عزائم بلند تھے یا پھر حوصلہ افزائی کا ٹانگ ملتا رہا اور سفر جاری رہا؟

ربیعہ اکرم..... جی ہاں! الحمد للہ سفر جاری رہا۔ راہ میں رکاوٹ تو آئی لیکن وہ رکاوٹیں مجھے بہت

ہیں۔ بذلہ سنج، خوش اطوار اور خوش ذوق ربیعہ اکرم کا تعارف لکھنے بیٹھی تو خیال آیا کیوں نہ لندن میں مقیم ممتاز براڈ کا سٹر اور عالمی اخبار کے چیف ایڈیٹر محترم صفدر ہمدانی صاحب سے جو ربیعہ اکرم کے ریڈیو کے استاد بھی رہ چکے ہیں ربیعہ اکرم کے بارے میں تاثرات معلوم کیے جائیں اور اسے ابتدائی حصہ بنایا جائے۔ بے حد ممنون ہوں صفدر ہمدانی صاحب کی کہ انہوں نے میری درخواست پر ربیعہ اکرم کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے دی جو نذر قارئین ہے۔

”پہلی بات ربیعہ اکرم کے بارے میں جو میرے لیے بہت اہم ہے، وہ محبت میں گندھا ہوا اس کا خمیر ہے کہ جس سے اس کے والدین کی تہذیب و تربیت کی خوشبوئے مسلسل آتی ہے۔ ریڈیو پاکستان کی اکیڈمی میں زیر تربیت پروڈیوسر کے طور پر اس کا استاد ہونے کے ناتے مجھے اس کی ریڈیو میں آمد یاد ہے اور پھر ملازمت کے مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچنے کا سارا سفر بھی معلوم ہے۔ ربیعہ میرے ان شاگردوں اور دوستوں میں سے ہے جو دنیا کے جس بھی کونے میں رہی اس نے مجھ سے رابطہ رکھا اور مناصب اور عہدہ بڑھنے کے باوجود مجھ فقیر کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دی جو بلاشبہ اس بے بھر اور مفاد پرست عہد میں ایک نعمت ہے۔ بلاشبہ ربیعہ ایک بہت اچھی انسان ہے عزت کرنا اور کروانا جانتی ہے۔ وہ ایک بہت پیاری بیٹی ہے، محبت کرنے والی بیوی اور ماں ہے۔ دوستی کی حدود جاننے والی دوست ہے۔ افسر کیسی ہے اس کا مجھے تجربہ نہیں لیکن یقین ہے ٹریک ریکارڈ کے طور پر ہر دلعزیز ہوگی۔ میرے الفاظ میں وہ تخلیق کار پروڈیوسر ہے۔ نشریات کی دنیا سے واقف ہے، جدید نشریاتی تقاضوں سے بھی آگاہ ہے۔ محنت اور لگن سے نشریاتی سفر پر رواں دواں ہے۔ میں اگر اس کا استاد تھا تو مجھے بے پناہ خوشی ہے کہ وہ اب خود استاد کی جگہ موجود ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس نے میرے فلسفہ نشریات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ریڈیو پر

پیاری تھیں۔ مثلاً پیا کے گھر ہجرت کر جانا، ماں کے عظیم رتبے پر فائز ہو جانا۔ لہذا بچوں کے بچپن اور ازدواجی زندگی کے آغاز پر اپنے بلند عزائم کو کچھ عرصہ silent mode پر رکھ دیا، تاہم جب بچے بڑے ہو گئے اور وہ خود میرے مددگار بنے تو یہ بلند عزائم دوبارہ سے میرے رگ و پے میں موجود محرکات کو پیش منظر میں لانے کا باعث بنے اور اگر شوہر کی جانب سے حوصلہ افزائی کا ٹانک براہ راست نہ ملتا تو پھر شاید یہ سفر جاری نہ رہ پاتا۔

پاکیزہ ✧..... آواز کی دنیا سے شناسائی کیسے ہوئی؟
ربیعہ اکرم ✧..... یہ 1979ء کی بات ہے کہ ہم علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پاکستان نیشنل سینٹر حیدرآباد گئے وہاں پر ریڈیو پاکستان کے ایک کارکن تنویر عسکری جو طلباء طالبات کے سیکشن سے وابستہ تھے بحیثیت جج موجود تھے۔ انہوں نے کہا بی بی! آپ اتنی اچھی تقریر کرتی ہیں تو ریڈیو پاکستان کے طالبعلموں اور نوجوانوں کے پروگراموں میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟ مقابلوں کے دوران مائیکروفون پر گفتگو کرنے کا حوصلہ تھا ہی اس لیے فوراً ہی ہم رضا مند ہو گئے کہ چلو ریڈیو پاکستان کے مائیکروفون پر بھی اپنے فن خطابت کو آزمائیں اور پھر 1979ء سے ہی آواز کی دنیا سے شناسائی ہو گئی۔

پاکیزہ ✧..... آپ نے ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کی سند حاصل کر کے براڈ کاسٹنگ کی راہ لی جبکہ آپ نے کامیابی بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کی تھی۔ اس کی کیا بنیادی وجہ ہے؟

ربیعہ اکرم ✧..... جی ہاں ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کرنے والی میں واحد براڈ کاسٹر ہوں جس نے کسی کالج میں لیکچرر بننے کے بجائے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کی پروڈیوسر بننے کو ترجیح دی۔ سندھ پبلک سروس کمیشن کا امتحان Top کرنے کے باوجود میں کالج آف ہوم اکنامکس اس لیے جوائن نہیں کر سکی کہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اس وقت کے اسٹیشن

ڈائریکٹر عنایت بلوچ صاحب جو کہ اسم باسکی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ربیعہ! لیکچررز تو ہمارے شہر میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن خاتون پروڈیوسر آپ پورے حیدرآباد میں واحد ہیں لہذا یہ ہی شناخت قائم رکھیں اور شکر ہے کہ یہ شناخت پھر وجہ شہرت بنی، تو بنیادی وجہ وہ جذباتی بلیک میلنگ بنی۔ سو آج تک ریڈیو پاکستان ہی سے وابستہ ہوں۔

پاکیزہ ✧..... حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر آپ کی تقرری کس بنیاد پر ہوئی؟

ربیعہ اکرم ✧..... ہم یہ بات اللہ رب العزت کا بہت سا شکرانہ ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں ہماری تقرری خالصتاً میرٹ پر ہوئی اور 1988-1989 کے ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسرز کے بیچ میں صوبہ سندھ سے منتخب ہونے والی میں واحد لڑکی تھی جس نے تحریری امتحان اور انٹرویو میں امتیازی نمبروں سے اپنی جگہ بنائی۔ (بہت خوب)
پاکیزہ ✧..... آپ کی ریڈیائی تربیت میں کس کا کردار اہم رہا؟

ربیعہ اکرم ✧..... ریڈیو میں میری تربیت میں سب سے پہلے تو میرے مشاہدے، تجربے اور ذوق سماعت نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ میرے سینئر ز اشفاق احمد خان، محمود صدیقی، سید نور اظہر جعفری، الیاس رضا، پرویز اختر، قاصد عزیز، اسرار احمد خان اور دیگر بہت سے نام ہیں۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور تربیت کا عمل تو آج بھی جاری ہے۔ جبکہ دوران تربیت میرے اساتذہ میں صفدر ہمدانی، مشکور صدیقی، ضمیر صدیقی، سلیم خان اور نشاط انجم شامل تھے۔ جنہوں نے ہمیں پاکستان براڈ کاسٹنگ اکیڈمی میں نشریات کی الف ب پڑھائی۔ کراچی میں میری سینئر کمپیئر شبینہ افتخار صاحبہ کو میں نے سن کر بہت کچھ سیکھا اور وہ بھی میرے استادوں میں شامل ہیں۔

پاکیزہ ✧..... بحیثیت پروڈیوسر پہلا پروگرام کون سا تھا اور خود آپ کی ذاتی دلچسپی کس نوعیت کے



پروگراموں میں ہوتی ہے؟
ربیعہ اکرم ❖..... خواتین
کا ہفتہ وار پروگرام ”انجمن“
تھا جس میں نصف گھنٹے میں ہم
سامعین کو بہت کچھ فراہم کرتے
تھے اور مجھ سے پہلے یہ پروگرام
ریکارڈ ہوتا تھا لیکن میں نے براہ
راست پیش کرنے کا رسک لیا یہ
1989ء کا ذکر ہے۔

پاکیزہ ❖..... خواتین
کے پروگرام کرتے وقت کن
امور کو ملحوظ رکھتی تھیں؟

ربیعہ اکرم ❖..... خواتین
کے پروگرام چونکہ میں حیدرآباد اسٹیشن سے کرتی تھی
جس کی نشریات کا دائرہ سماعت ہماری دیہی آبادی
تک بھی پھیلا ہوا تھا لہذا میں شہری اور دیہات میں
رہنے بسنے والی خواتین دونوں کے حساب سے سیگمنٹ
ترتیب دیتی تھی تاکہ وہ خواتین بھی ایسا محسوس کریں کہ
میں نے یہ سوچا گویا کہ یہ بھی میرے دل میں تھا۔ صحت
کے مسائل، بجٹ بنانا، کم خرچ والی
ڈشز بنانا، لڑکیوں کی تربیت اور دیگر پیش پروگرام میں
شامل ہوتی تھیں۔

پاکیزہ ❖..... بحیثیت ڈراما پروڈیوسر کون، کون
سے یادگار ڈرامے کیے؟

ربیعہ اکرم ❖..... حیدرآباد میں ابن اثرجلی کا
لکھا ہوا ڈراما ”کلیاں اور چنگاری“ صابر وسیم کا لکھا
ہوا ڈراما ”پروڈیوسر“ پروین کاظمی صاحبہ کا لکھا ہوا
ڈراما ”اوپر والا ہاتھ“ یادگار ڈرامے تھے۔ ان
ڈراموں میں پروڈکشن کے علاوہ صداکاری بھی کی
جبکہ کراچی اسٹیشن سے میثاق حسین زیدی کا تحریر کردہ
ڈراما ”خواب نگری“ نادیہ فاطمہ کا لکھا ہوا ڈراما
”انمول رشتے“ وغیرہ۔

پاکیزہ ❖..... کبھی ایسے کرداروں کی ادائیگی کا

گزشتہ سال کے اختتام پر صبح پاکستان کے ریڈیو پاکستان کے مقبول پروگرام کا
ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد ڈائریکٹر پروگرام محترمہ نیر جمال اور سابق انچارج
FM101 تنویر اقبال صاحب کے ساتھ ایک یادگار تصویر

موقع ملا جو آپ کے لیے آزمائش اور سامعین کے لیے
باعث حیرت تھے؟

ربیعہ اکرم ❖..... ایسے بہت سے ڈراموں میں
صداکاری کے مواقع ملے جو واقعی ایک چیلنج تھے۔
مثلاً مردانہ کردار، تیسری جنس کا کردار، 80 برس کی
بوڑھی خاتون کا کردار، تیز طرار لڑکا خاتون کا کردار
اور جو سب سے کامیاب بات رہی وہ یہ کہ لوگ مجھے
پہچان نہیں سکے کہ یہ کردار میں نے کیے، سامعین نے
حیرت اور ستائش کا اظہار کیا۔

پاکیزہ ❖..... اپنی نسائیت اور نغمگی سے بھرپور
آواز میں جب مردانہ اور تیسری جنس کردار ادا کیا تو
سامعین کے کیا تاثرات تھے؟ اور اس مشقت میں خود
آپ پر کیا گزری؟

ربیعہ اکرم ❖..... سامعین کی جانب سے تو
پزیرائی ملی ہی لیکن میرے اپنے صوتی ڈبے یعنی
vocal chords پر بہت شدید اثر پڑا اور گلا
پٹھ گیا، غرارے کرنے پر ٹھیک ہوا۔

پاکیزہ ❖..... کس قسم کے ڈرامے پیش کرنے
میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖..... سچ جائے تو مجھے ہلکے پھلکے

طعریہ و مزاحیہ ڈرامے پروڈیوس کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ خود میری نیچر میں دوسروں کو ہنسانا، خوش رکھنا شامل ہے۔ حیدر آباد ریڈیو پر میں نے محترمہ انجم انصار صاحبہ کی معرکتہ الآراء کتاب جلت رنگ سے بھی مزاحیہ خاکے منتخب کر کے ان کی ڈرامائی تشکیل کی اور بہت لطف آیا، کراچی میں 101 پر پوسٹنگ ہوئی تو انجم انصار صاحبہ کو ٹیلیفون پر آن لائن لے کر جلت رنگ سے منتخب حصے ان ہی کی آواز میں نشر کرتی تھی۔ اور پاکیزہ کا یہ مقبول سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔

پاکیزہ ✧..... کراچی اسٹیشن آئیں تو بطور پروڈیوسر کس شعبے کی ذمہ داری آپ کے حصے میں آئی؟ ربیعہ اکرم ✧..... کراچی اسٹیشن پر آپ کا خط ملا کے ساتھ، ساتھ ڈراما پروڈکشن اور ڈیک جوکی پروگرام ”گل نغمہ“ کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ اور ہم نہایت جوش و خروش کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو نبھاتے تھے۔

پاکیزہ ✧..... سینٹرل پروڈکشن یونٹ سے کس نوعیت کے پروگرام نشر ہوتے تھے؟

ربیعہ اکرم ✧..... سینٹرل پروڈکشن یونٹ میں موسیقی کی مختلف اصناف مثلاً گیت، غزلیں اور کلاسیکل آئٹمز کی ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مشاہیر کی برسیوں، تہواروں خصوصی اور اہم ایام کے فیچرز، دستاویزی پروگرام اور تقاریر ہوتی تھیں۔ سینٹرل پروڈکشن یونٹ میں پوسٹنگ کے دوران مجھے موسیقی کی بہترین پروڈیوسر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ وہیں پر مجھے ایک خصوصی پروگرام بھی تفویض کیا گیا تھا جس کا نام شب بخیر تھا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ محترم انور مقصود صاحب نے ریڈیو پر کسی پروگرام کی میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں ہمارے ”آواز خزانے“ میں موجود مختلف یادگار پروگراموں سے انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ مجھے پہلا نیشنل ایکسی لینس ایوارڈ اسی پروگرام پر ملا تھا۔

پاکیزہ ✧..... آپ کے حصے میں یہ اعزاز بھی آیا

کہ ریڈیو پاکستان میں اپنی مدت ملازمت کے ایک عشرے کے بعد ہی آپ کو وائس آف امریکا کے لیے بھیج دیا گیا آپ کا انتخاب کیسے اور کس بنیاد پر کیا گیا؟ ربیعہ اکرم ✧..... وائس آف امریکا کے لیے میرا انتخاب خبروں کے ترجمے میں مہارت اور آواز کی بنیاد پر ہوا تھا۔ وہاں جانے کے لیے میرٹ ہی بنیادی شرط ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧..... کبھی فی البدیہہ ترجمہ کرنے کا موقع ملا اور یہ تجربہ کیسا رہا؟

ربیعہ اکرم ✧..... اس وقت کے امریکا کے صدر بل کلنٹن تقریر کر رہے تھے اور میں ساتھ ساتھ آن لائن ترجمہ کرتی جا رہی تھی شدید سردی کے باوجود پسینہ آ گیا تھا، وقتی طور پر گھبراہٹ ہوئی جو فوری طور پر میری طاقت بھی بن گئی اور فطری خود اعتمادی سے ترجمہ کرتی رہی۔ وائس آف امریکا کے انچارج نے بہت تعریف کی جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور اس روز مجھے جو اعتماد ملا براڈ کاسٹنگ کے سفر میں وہ آج بھی میرا ہم قدم ہے۔

پاکیزہ ✧..... وائس آف امریکا کی اردو سروس سے آپ کس حیثیت سے منسلک رہیں؟ اور کون، کون سے کامیاب پروگرام آپ کے حصے میں آئے؟

ربیعہ اکرم ✧..... وائس آف امریکا سے انٹرنیشنل ریڈیو براڈ کاسٹر کی حیثیت سے منسلک رہی وہاں پر پروگرام صبح بخیر اور سوالوں کے موتی جوابوں کی مالا اور امریکا میں مقیم پاکستانیوں کی سرگرمیوں کی رپورٹس بہت کامیاب رہے۔ مجھے آٹھ روزہ دورے پر خصوصاً کیلی فورنیا بھیجا گیا تاکہ وہاں پر مقیم پاکستانی کمیونٹی کے نمایاں افراد کے انٹرویو کروں۔ بہت مزہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ خبریں اور رپورٹس تو روز کی ذمہ داری تھیں۔

پاکیزہ ✧..... ریڈیو پاکستان اور وائس آف امریکا کے پروگراموں میں واضح فرق کیا محسوس کیا؟ ربیعہ اکرم ✧..... بنیادی فرق پالیسی کا ہے۔ بس اس ایک جملے کو ہی بہت جانیں۔ ہاں قدر



ربیعہ اکرم اپنی فیملی کے ساتھ

ایف ایم ۱۰ کی پروگرامنگ کے لیے ہمیشہ خلوص دل سے کوشاں رہتے تھے لہذا ان کی ذاتی کوششوں سے ایف ایم ۱۰ پر میری پہلی تعیناتی ہوئی۔

پاکیزہ ✦ ایف ایم 101 کراچی مرکز سے آپ نے اپنے سابقہ دور میں خواتین کے کون کون سے کامیاب پروگرام کیے؟

ربیعہ اکرم ✦..... نامور خواتین کا کھانا پکانے کا پہلا تجربہ آن لائن پوچھا جاتا تھا۔ دوسرا گھریلو آمدنی کے ذرائع حاصل کرنے کے طریقے اس وقت کی اپوا کی روح رواں اور معروف ڈراما آرٹسٹ جہاں آراء جی صاحبہ سے معلوم کیے جاتے تھے۔ بہت مقبول ہوا وہ پروگرام۔ پھر غذا اور غذائیت پر مبنی سلسلے ماہرین غذائیت کو مدعو کر کے معلوماتی گفتگو ہوتی تھی۔ پروگرام خواتین کے لیے قانونی مشورے ایڈووکیٹ جنرل تبسم غنفر قانونی مشورے دیتی تھیں۔ گھر میں حادثات سے نمٹنے کے لیے خواتین کو احتیاطی تدابیر بتانے کے لیے معروف برن سرجن پروفیسر ڈاکٹر شائستہ آفندی اہم ٹپس بتانے آتی تھیں۔ بیویشن سیمینار کا پروگرام گوری کرت سنگار بھی خواتین کا پسندیدہ رہا۔

پاکیزہ ✦..... گویا آپ کی امور خانہ داری کی

مشترک نہ تھی کہ یہاں ہم حکومت پاکستان کی پالیسیوں کے ترجمان ہوتے ہیں جبکہ وہاں امریکی سرکاری پالیسیوں پر عمل پیرا ہونا پڑتا تھا۔

پاکیزہ ✦..... وائس آف امریکا میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ کون، کون سے سینئر براڈکاسٹر تھے کہ آپ کو ان سے سیکھنے کا موقع ملا؟

ربیعہ اکرم ✦..... محترم اظہار کاظمی صاحب، محترمہ صفیہ کاظم، شہناز عزیز صاحبہ، صلاح الدین احمد صاحب سلطان غازی صاحب شامل تھے۔ اور ان تمام سینئرز سے بہت زیادہ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کو سن، سن کر ترجمہ کرنے میں روانی آتی گئی۔

پاکیزہ ✦..... وطن واپسی کب ہوئی؟

ربیعہ اکرم ✦..... وطن واپسی 2001ء ماہ ستمبر کے اختتام پر ہوئی اور پھر یکم اکتوبر کو سینٹرل پروڈکشن یونٹ کراچی جوائن کیا۔

پاکیزہ ✦..... سینٹرل پروڈکشن سے ایف ایم 101 تک رسائی کیسے ہوئی؟

ربیعہ اکرم ✦..... cpu سے ایف ایم ۱۰ تک رسائی میں انتہائی اہم کردار سابق کنٹرولر جناب ثار میمن نے ادا کیا۔ وہ جوہر شناس براڈکاسٹر تھے اور

سند یہاں کام آئی؟

ربیعہ اکرم ❖..... جی بالکل اور مجھے اطمینان بھی محسوس ہوتا تھا ایسے پروگرام کر کے۔

پاکیزہ ❖ ایف ایم 101 ہاٹ لائن پیشکش کا تجربہ کیسا رہا؟ اور سامعین اس سے کیسے مستفید ہوئے؟

ربیعہ اکرم ❖..... یہ ایک نمایاں اور شاندار تجربہ رہا اور ہمارے ایک پروگرام کو جو اولڈ ہومز کے بارے میں تھا، اسلام آباد میں اسٹیشن ڈائریکٹرز کی کانفرنس میں بہت سراہا گیا۔ معاشرے کی بہت سی دھکتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔ ایف ایم 101 کے مائیکروفون کو اسٹوڈیو سے نکال کر عوام الناس تک لے گئے۔ اور معاشرے کے مختلف مسائل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی پیش کیا گیا۔ سامعین شدت سے انتظار کرتے تھے اس پروگرام کا۔ 5,6 گھنٹے کی ریکارڈنگ میں سے آدھے گھنٹے کا بیچ تیار کرنا بھی کاردار تھا۔

پاکیزہ ❖ خود آپ کو کبھی آؤٹ ڈور براڈ کاسٹنگ کا موقع ملا؟

ربیعہ اکرم ❖..... جی بالکل ہم نے مختلف مواقع پر Road Shows کیے OB کوریج بھی کی اور خوشی ہوتی تھی کہ ہم ریڈیو پاکستان / ایف ایم 101 کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنی شناخت کے ساتھ تقریب کو کرتے تھے۔

پاکیزہ ❖..... فرائض منصبی کے حوالے سے وہ کون سے اصول ہیں جن پر آپ کبھی سمجھوتا نہیں کر سکتیں اور ان ہی کی وجہ سے آج آپ کامیاب براڈ کاسٹر اور پروگرام منیجر ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖..... میں کسی بھی پروگرام کی تیاری میں غیر سنجیدہ رویے بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا کوئی پروگرام ہو میں خود involve نہ ہوں تو مطمئن نہیں ہوتی۔

پاکیزہ ❖..... فیچر اور ڈاکومنٹری پیش کرتے وقت روایتی انداز اختیار کرتی ہیں یا اپنی جدت پسند

طبیعت کے مطابق کرتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖..... روایتوں سے انحراف کرنا ہی میری جدت پسندی کا خاصہ ہے اور میں لگے بندھے فرسودہ طریقوں سے پروڈکشن نہیں کر سکتی۔

پاکیزہ ❖..... پروگرام منیجر کا عہدہ ملنے پر کیا احساسات و عزائم تھے؟ پُر امید تھیں کہ خوش اسلوبی سے تمام ذمے داریاں نباہ لیں گی؟

ربیعہ اکرم ❖..... PM کا عہدہ ملنے کے بعد بھی مجھے تو پروڈیوسر کی طرح ہی کام کرتے ہوئے پایا گیا بلکہ PM بننے کے بعد انتظامی امور کے ساتھ ساتھ پروڈکشن کا بے تحاشا کام کیا۔ مسلسل چار سال قومی نشریاتی رابطے کے تمام اہم پروگرام پی بی سی کراچی سے پیش کیے۔

پاکیزہ ❖..... پروگرام منیجر کی بنیادی ذمے داری کیا ہے؟ فرائض کی ادائیگی میں آزمائش کی گھڑی آئی تو آپ کیسے نبرد آزما ہوئیں؟

ربیعہ اکرم ❖..... PM کی بنیادی ذمے داری تو پروگرام کا انتظام و انصرام ہے لیکن چونکہ پروڈکشن اسٹاف کی کمی ہے۔ لہذا پروڈکشن کا کام بھی کرنا پڑتا ہے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت کا تو دوسرا نام ہی آزمائشوں سے نبرد آزما ہونا ہے بس یوں سمجھ لیجیے ع ایک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے۔ بس آپ کو تیرا کی کا ماہر ہونا چاہیے۔

پاکیزہ ❖..... قومی نشریاتی رابطے پر آپ نے پہلا پروگرام کب اور کون سا کیا؟

ربیعہ اکرم ❖..... قومی نشریاتی رابطے پر پہلا پروگرام تو میں نے پروڈیوسر بننے سے بھی کافی پہلے بحیثیت میزبان کر لیا تھا۔ جب ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے ہم ہر ہفتے ایک نیا ڈراما پیش کرتے تھے تو اس وقت کے پروڈیوسر پرویز اختر صاحب مجھ سے براہ راست پورے ڈرامے کا خلاصہ / تعارف قومی نشریاتی رابطے پر پڑھوایا کرتے تھے۔

پاکیزہ ❖..... ایف ایم 93 سے عرصہ دراز سے



نشر ہونے والے پروگرام ”یہ بچہ کس کا ہے“ میں بحیثیت میزبان اور پروڈیوسر اپنی ذمہ داری کیسے پوری کی۔ اس ضمن میں کوئی کامیابی آپ کے حصے میں آئی؟

ربیعہ اکرم ❖ ایف ایم 93 پر ہمارے سابق اسٹیشن ڈائریکٹر تنویر اقبال صاحب نے پروگرام ”یہ بچہ کس کا ہے“ کی ذمہ داری سونپی۔ میں نے اس پروگرام کے انداز پیشکش کو

ربیعہ اکرم پروگرام ”یہ بچہ کس کا ہے“ کی میزبانی کرتے ہوئے

تیسرا نیشنل ایکی لینس ایوارڈ ملا۔ اس پروگرام کو ریڈیو پاکستان کا مقبول ترین پروگرام قرار دیا گیا۔ یہ وہ واحد پروگرام تھا جس کے لیے ریڈیو پاکستان کی اس وقت کی ڈائریکٹر جنرل محترمہ ثمنینہ پرویز نے خود فون کر کے مجھے پروگرام کرنے کے لیے کہا۔ اس پروگرام کی بدولت مجھے ملک بھر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاکھوں سامعین کی محبت، ستائش اور خلوص حاصل ہوا جو میرا اثاثہ تھا۔

بھی جو برسوں پرانا تھا تبدیل کیا۔ ایدھی ہوم سے آنے والے بچوں کے ساتھ میرے انداز گفتگو کو سامعین اور اسٹاف نے بہت سراہا۔ یقین کیجیے کہ میں خود بچوں سے گفتگو کرتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی اور مجھے خوشی ہے کہ میرے انٹرویو کے 95 فیصد بچے اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔ یہ پروگرام مجھے تو ایک ثواب جاریہ محسوس ہوتا تھا۔ میں تنویر اقبال صاحب کی انتہائی شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے اس کام کے لیے مجھ پر اعتماد کیا۔

پاکیزہ ❖ ایف ایم 93 کے پروگرام ”صبح پاکستان“ میں بحیثیت میزبان پروڈیوسر آپ نے صرف سامعین کی تعداد ہی میں نہیں مقبولیت میں بھی اضافہ کیا۔ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ربیعہ اکرم ❖ پروگرام ”صبح پاکستان“ میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ مجھ سے پہلے عظیم سرور، اقبال فرید اور نرگس رشید جیسے مقبول براڈکاسٹرز یہ پروگرام پیش کر چکے تھے اور ایک عرصہ دراز کے تعطل کے بعد یہ پروگرام دوبارہ شروع ہوا تھا۔ اس لیے سب کچھ نئے سرے سے کرنا تھا۔ اللہ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اپنی محنت اور نیند کی قربانی کی بدولت اس پروگرام کی پیشکش میں کامیاب رہی اور

پاکیزہ ❖ ایف ایم 94 کے بارے میں بتائیے؟
ربیعہ اکرم ❖ ایف ایم 94 سے ریڈیو پاکستان کے ”آواز خزانے میں“ موجود بیش بہا ریکارڈنگز کے مناسب کمپرینگ کے ساتھ باقاعدہ پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ایف ایم 94 ریڈیو پاکستان کے ورثے کو مقبول عام کر رہا ہے۔
پاکیزہ ❖ ایف ایم 93 اور ایف ایم 101 کے مزاج میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ربیعہ اکرم ❖ ایف ایم 93 اور ایف ایم 101 دونوں کا انداز پیشکش مختلف ہے۔ ایف ایم 93 پر ریڈیو پاکستان کے روایتی طرز کے پروگرام ہوتے ہیں۔ جبکہ 101 پر پروگراموں میں موسیقی کا تناسب زیادہ ہوتا ہے جبکہ پبلک سروس کا بھی خیال رکھا

جاتا ہے۔ یہاں پر نسبتاً نوجوانوں کو میزبانی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے جس کا ٹیمپو فاسٹ ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧ آپ کے زرخیز تخلیقی ذہن نے ہمیشہ ریڈیو پاکستان کے توسط سے خواہ وہ ایف ایم 101 ہو یا ایف ایم 93 خواتین کے لیے کارآمد اور مفید پروگرام پیش کیے۔ آج کل ایف ایم 101 سے خواتین کے کون، کون سے پروگرام پیش کر رہی ہیں؟

ربیعہ اکرم ✧ آج کل ایف ایم 101 سے معاشرے کی کامیاب خواتین کے انٹرویوز پر مبنی پروگرام ”کہانی میری کامیابی کی“ نشر ہو رہا ہے اس کے علاوہ رشتوں ناتوں کی نزاکتوں پر مبنی روحانی مسائل پر مبنی نفسیاتی مسائل اور ان کے حل پر مبنی اور ایف ایم 101 کی خواتین آر جیز کی آپس کی کھٹی میٹھی باتوں پر مبنی پروگرام پیش کیے جارہے ہیں۔

پاکیزہ ✧ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں؟

ربیعہ اکرم ✧ مقصد میں کامیابی اگر سامعین کی تعداد میں اضافہ ہے تو یقیناً یہ کامیابی ہے۔

پاکیزہ ✧ آواز کی دنیا میں اپنے ہم عصروں میں سے کس کی آواز اور کارکردگی سے متاثر ہیں؟

ربیعہ اکرم ✧ اپنے سینئرز سید نور اظہر جعفری، شہناز وسیم، شبینہ افتخار صاحبہ، یاسمین طاہر صاحبہ، تنویر اقبال صاحب، خلیل چنہ صاحب میری پسندیدہ آوازیں اور ماہرین نشریات ہیں۔

پاکیزہ ✧ براڈ کاسٹنگ کے شعبے میں آنے کے خواہشمندوں کو آپ کیا صلاح دیں گی؟

ربیعہ اکرم ✧ براڈ کاسٹنگ کے شعبے کو ملازمت سمجھ کر نہ آئیں اسے ایک جذبہ یا شوق سمجھ کر اپنائیں۔

پاکیزہ ✧ پسندیدہ ادیب و شاعر کی فہرست میں سرفہرست کون سے نام ہیں؟

ربیعہ اکرم ✧ ادیبوں میں مشتاق احمد یوسفی کی دلدادہ ہوں جبکہ پسندیدہ شاعر فیض صاحب اور پروین شاکر ہیں۔

پاکیزہ ✧ ہمارے قارئین کی دلچسپی کے لیے بتائیے کہ فیض صاحب سے اپنی عقیدت کا عملی ثبوت آپ نے کیسے پیش کیا؟

ربیعہ اکرم ✧ میں نے اپنے بیٹے کا نام ہی فیض خان رکھ دیا۔ فیض صاحب کا شعر ہے

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام بیٹی کا نام وفا ہے گویا مذکورہ شعر کے مصرعہ اول سے ہم نے بیٹے اور بیٹی دونوں کا نام رکھ کر فیض صاحب سے اپنی عقیدت کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

پاکیزہ ✧ بیٹی بھی اکلوتی اور بیٹا بھی، کیا آپ ان کی تعلیم و تربیت پر مساوی توجہ دیتی ہیں؟

ربیعہ اکرم ✧ ربیعہ اکرم: جی ہاں اولادوں کے سلسلے میں چاہے وہ تعلیم ہو یا تربیت مساوی سلوک کی قائل ہوں، دعا گو ہوں کہ میری بیٹی وفا علی نصیب ہو اور ایک قابل ڈاکٹر کے روپ میں مسجانبے جبکہ بیٹا فیض اپنے والد کا سہارا بنے اور خاندان کا نام روشن کرے آمین! پاکیزہ ✧ وہ کون سی حکمت عملی ہے جسے اختیار کر کے ملازمت پیشہ عورت گھر اور دفتر دونوں میں توازن برقرار رکھ سکتی ہے؟ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

ربیعہ اکرم ✧ سچ بتاؤں تو میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ یہ توازن برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی۔ میرا اپنا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ خواتین کو ملازمت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بہر حال نہ صرف گھر بلکہ صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧ ازدواجی زندگی کے استحکام کے لیے گھریلو اور ملازمت پیشہ عورت کا کردار ایک ہی ہے..... یا جدا جدا؟

ربیعہ اکرم ✧ جدا جدا ہیں بھئی، ملازمت پیشہ خواتین تو بیچاری دوہری ذمے داریاں ادا کرتی ہیں۔ پھر بھی طعنے ہی سنتی ہیں جبکہ گھر بیٹھی خواتین زیادہ فائدے میں رہتی ہیں۔



پاکیزہ ✧..... آپ کی
نظر میں آزادی نسواں کا تصور
کیا ہے؟

ربیعہ اکرم ✧..... میری
نظر میں آزادی نسواں اس حد
تک ہی ہے جب ہماری مذہبی
اقدار متاثر نہ ہوں، معاشی
استحکام کے لیے باہر کام ضرور
کریں لیکن اگر اس کام سے تمام
نمازیں قضا ہو جائیں تو
پھر کوئی فائدہ نہیں۔

ربیعہ اکرم جنرل راحیل شریف کی ہمشیرہ محترمہ خالدہ سعادت کا انٹرویو کرتے ہوئے

ڈائجسٹ ہے؟

ربیعہ اکرم ✧..... پاکیزہ ڈائجسٹ بھی اسم
باسمٰی ہی ہے اور یہی پاکیزہ کا کمال ہے۔

پاکیزہ ✧..... پاکیزہ ڈائجسٹ کی قارئین بہنوں
سے کچھ کہیں گی؟

ربیعہ اکرم ✧..... خود بھی خوش رہیں اور
اوروں کو بھی خوش رکھیں۔ پاکیزہ کی قارئین بہنوں
کی انتہائی شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے آخری سطور
تک برداشت کیا، بس جن نگاہوں سے یہ سطور گزر
رہی ہیں پلیز وہ میری اور میرے اہل خانہ کی صحت و
سلامتی کے لیے خصوصی دعا کریں اور مجھے دیارِ
رسول ﷺ اور خانہ خدا کی حاضری نصیب ہو اور
میں وہاں احسن طریقے سے تمام ارکان پورے کر
سکوں آمین۔ ثم آمین!

آخر میں بہنو! ہم اپنی اور ادارہ پاکیزہ کی
جانب سے ربیعہ اکرم کے بے حد ممنون ہیں کہ جنہوں
نے انتہائی مصروفیت کے باوجود پاکیزہ کو میزبانی کا
شرف بخشا اور معلومات سے پردہ لچپ گفٹگوں ذرا قارئین
کی۔ انشاء اللہ اسی طرح ہم میزبانی کے فرائض انجام
دیتے ہوئے مزید گوہر نایاب اس محفل میں لانے کی
کوشش کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

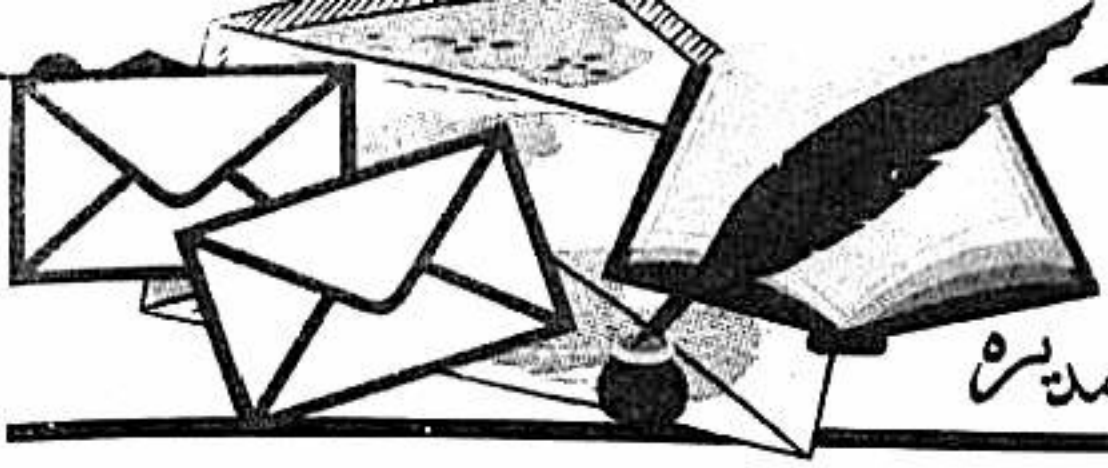
پاکیزہ ✧..... آپ کا پسندیدہ رشتہ، رنگ،
خوشبو، موسم، وقت، کتاب، ڈش، تہوار، تفریحی مقام
اور کھیل کون کون سے ہیں؟

ربیعہ اکرم ✧..... پسندیدہ رشتہ ماں، رنگ نیلا،
گلابی اور سفید، خوشبو ہر اچھے پرفیوم کی، موسم بہار کا ڈش
کڑھی چاول اور کوہنہ، پالک پنیر، باربی کیو، وقت
عصر اور مغرب کا درمیانی وقت، کھیل کرکٹ اور تفریحی
مقام ساحل سمندر۔

پاکیزہ ✧..... آپ کا شمار پاکیزہ ڈائجسٹ کے
قارئین میں کس وقت سے ہوتا ہے، اپنی یادیں تازہ
کریں گی؟

ربیعہ اکرم ✧..... میں پاکیزہ ڈائجسٹ کی اس
وقت سے قاری اور شیدائی ہوں جب لڑکیوں کو ڈائجسٹ
پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ لحاف میں چھپ چھپ
کر یا کتاب میں چھپا کر پڑھتی تھیں۔ ہمارا بھی کچھ یہی
حال تھا پاکیزہ کے فہرست والے صفحے سے لے کر آخری
اشتہار تک کئی بار نظر سے گزرتے تھے اور پھر اگلے ماہ کا
انتظار شروع ہو جاتا۔ میری شادی کی تصویر بھی پاکیزہ
میں چھپی تھی۔ اب دفتری اور گھریلو ذمے داریوں میں
الچھ کر وہ پہلی سی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بے قاعدگی سے سہی
موقع ملے تو پاکیزہ پڑھتی ضرور ہوں۔

پاکیزہ ✧..... باعتبار مجموعی پاکیزہ کیسا



مدیر

بہنوں کی محفل

عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہر حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔ پیاری بہنو! اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو۔ یا الہی دونوں جہان میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے۔ آمین ثم آمین۔

☆ پیاری بہنو! 2015ء کے آخری شمارے کے ساتھ حاضر ہوں..... 2015ء کب آیا اور کب ختم ہوا کہ دن بھاگ رہے ہیں اور وقت کا پہیا تیز چل رہا ہے۔ کتنے پیارے لوگ ہم سے بچھڑ گئے اور کتنے حادثات اور سانحات اس سال کی جھولی میں آگرے..... پھر بھی اللہ کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں ہماری اوقات سے بہت زیادہ عطا کیا۔ ہماری خطاؤں گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود..... ہمیں اپنی پناہ میں رکھا۔ (الحمد للہ)

پياري بہنو! آج آپ سے چند باتیں اپنے بچوں کے متعلق کہنی ہیں..... کہ بطور ماں ہمارا کام انہیں صرف کھانا، پلانا، اسکول اور ٹیوشن بھیجنا ہی نہیں ہے..... آپ اپنے بچوں کی دوست بھی بنیں کہ وہ بات جو بچہ کسی نے نہ کہہ سکے وہ اپنے والدین سے شیئر کر سکے۔ میں نے بہت سے ایسے گھرانے دیکھے ہیں جہاں غربت کے باوجود بچوں کا اتنا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان بچوں میں احساسِ کمتری کہیں دور، دور تک نظر نہیں آتا..... یاد رکھیے جس بچے کا اپنے گھر میں کسی بھی وجہ سے مذاق اڑایا جاتا ہے وہ بزدل بن جاتا ہے..... اور جس بچے پر اعتبار نہیں کیا جاتا وہ دھوکے دینا سیکھتا ہے جن گھرانوں میں بچوں کی ہر بات پر تنقید کی جاتی ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا، ویسا کیوں نہیں کیا، تم تو کبھی اپنی جماعت میں فرسٹ آہی نہیں سکتے وغیرہ تو ایسے بچے کوشش کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ جان کر شاید آپ کو حیرت ہو کہ بچہ اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوتا ہے اور تعریف اسے توانا بنا دیتی ہے اس کا حوصلہ بڑھتا ہے مگر جن گھرانوں میں اپنے بچوں کی تعریف اس وجہ سے نہیں کی جاتی کہ کہیں ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے ایسے زیادہ تر بچے اچھی چیزوں کو پسند کرنا ہی ختم کر دیتے ہیں۔ آج بھی ہمارے بیشتر گھرانوں اور اسکولوں میں مارنے پینے کا رواج ہے۔ میڈیا پر ایسے بہت سے شواہد دکھانے کے باوجود بچوں کو گھروں میں مارنا بند نہ ہوا..... والدین بھی انہیں مارتے ہیں، استاد بھی، جہاں وہ ملازمت کرتے ہیں وہاں کے مالکان بھی تشدد کرتے ہیں..... اور ایسے تمام بچوں کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں..... ایک اخباری سروے کے مطابق بہت سے بچوں کے قد چھوٹے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی..... انہیں بچپن میں بے حد مارا پیٹا گیا..... اور بہت سے بچوں کی سماعت بھی کم ہو گئی۔ نئے سال کا سورج طلوع ہونے کو ہے اب یہ آپ کا فیصلہ ہے کہ اپنے پھول جیسے بچوں کا کیسا اور کتنا خیال رکھنا ہے۔

☆ آئیے اس سے قبل کہ اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوں، آئیے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے، ابھی پڑھ لیں اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

ہر اگر ہمیں ویزا مل گیا تو انشاء اللہ، جنوری میں آپ کی باجی انجم انصار، سڈنی (آسٹریلیا) میں ہوں گی وہاں پاکیزہ کی قاری بہنیں ٹیلی فونک رابطہ کرنا چاہیں تو مجھ سے فی الحال کراچی کے اس نمبر پر رابطہ کر کے اپنا فون نمبر بتادیں اور دیگر بہنیں بھی میرا یہ نیا نمبر نوٹ کر لیں کیونکہ پرانا نمبر میں نے بند کر دیا ہے۔ میرا کراچی کا نیا نمبر یہ ہے۔ 021-36964779

ہر پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری کی بیٹی میثا نے اپنا میڈیکل مکمل کر لیا ہے اور 24 جنوری کو اس کی شادی طے پا گئی ہے۔ (مبارک!)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری شاعباس، پیرگودھانے اپنا ایل ایل بی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے۔ (ماشاء اللہ)
✽ مصنفہ ساجدہ حبیب کی پیاری بیٹی جس نے حال ہی میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہے اس کی شادی گزشتہ دنوں...
یہ پورا آزاد کشمیر میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارکاً)

✽ مصنفہ نسیم منیر علوی اپنے قریبی عزیزہ کی شادی میں شرکت کرنے اس ماہ دہی سے کراچی آرہی ہیں۔ (خوش آمدید)
✽ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ شمسہ الماس، عزیز واقارب سے ملنے کے لیے ناروے سے پاکستان آنے والی ہیں۔ (خوش آمدید)

✽ پاکیزہ کی معروف شاعرہ شگفتہ شفیق، لندن میں ہونے والے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے کراچی سے لندن روانہ ہو گئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✽ مصنفہ سلمیٰ غزل چھ ماہ اپنے بیٹے کے پاس امریکا رہنے کے بعد واپس کراچی آگئی ہیں۔ (خوش آمدید)

✽ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، لاہور سے کراچی آگئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✽ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ارم کمال، فیصل آباد کی بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

✽ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا حمید فاروق، کراچی کی ڈاکٹر بیٹی، سعدیہ کی شادی عبداللہ کے ساتھ خوب دھوم دھام سے ہوئی..... جس میں شرکت کرنے کے لیے بیرون ممالک سے بہت سے مہمان آئے۔ (مبارکاً)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری مس ریمہ کی مگنی اپنے کزن فیصل کے ساتھ انگلینڈ میں ہوئی۔ (مبارک باد)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز فریدہ سجاد کی بھتیجی نام شاہد نے اے یول کے امتحان میں ٹاپ کیا اور اب اسکالرشپ پر لندن میں داخلہ ہو گیا ہے (ماشاء اللہ)

✽ گزشتہ سال مصنفہ رخ چوہدری کی پیاری سی بھانجی ربیعہ کی مگنی خرم کے ساتھ خوب دھوم دھام کے ساتھ ہوئی۔

✽ مصنفہ اور تبصرہ نگار نائلہ بلخ الرحمن، بہاول پور کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

✽ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فرحانہ پروین، راول پنڈی کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

✽ پاکیزہ کی تبصرہ نگار رخسانہ امجد، ملکوال کی بھی اس ماہ سالگرہ ہے۔

✽ اس ماہ تبصرہ نگار فصیحہ آصف خان، ملتان کی بہن حمیرا کی سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔

☆ میرا کزن سید احمد کمال بناری، امریکا میں شدید بیمار ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ستارہ شیخ، کراچی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شازیہ محبوب، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔

☆ ہماری بہت سی دیگر تبصرہ نگار بہنیں اور مصنفات ان دنوں موسم کی تبدیلی کے باعث موسمی بخار و نزلہ و زکام میں مبتلا ہیں۔

☆ مصنفہ سیما بنت عاصم کی والدہ کے لیے دعائے صحت۔

☆ مصنفہ شائستہ زریں کی والدہ کے لیے دعائے صحت۔

☆ مصنفہ نگہت غفار کی سہمن ان دنوں بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی علیل ہیں۔

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور ان دنوں بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔

☆ مصنفہ شاعرہ سیما رضا ردا، ریڈیو پاکستان کراچی کی خورشید آ پاشدید بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ مصنفہ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی بیمار ہیں۔

☆ مصنفہ فاخرہ گل، اٹلی کی پاکستان میں مقیم والدہ علیل ہیں۔

☆ شاعرہ اور تبصرہ نگار گل شاہین، رحیم یار خان کی والدہ بیمار ہیں۔

☆ ہم سب کی لاڈلی تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلا نوالی اس ماہ بھی شدید بیمار ہیں اور انہیں کئی بار اسپتال

بھی ایڈمٹ ہونا پڑا۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ، شریف آباد بے حد پریشان ہیں۔

☆ بہن الف، ج، سندھ کی اپنے شوہر سے بحث و تکرار اتنی زیادہ بڑھی کہ ان کے شوہر نے کہا کہ اگر انہوں نے یہ

چائے پی لی تو وہ ان پر حرام ہیں اور وہ بہن وہ چائے سرعت سے پی گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو نیک ہدایت دے..... اور

اب ان کے شوہر لگا تار ساٹھ روزے رکھیں یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں اور ایسے معاملات مجھ سے پوچھنے کے بجائے

دارالعلوم سے رابطہ کیا کریں..... مگر ہماری بہنیں سب کے لیے لازمی دعا کریں کہ ایسے لوگوں کو عقل سلیم عطا فرمائے..... اور

اپنا دماغ فضول باتوں پر خرچ نہ کریں کہ مذاق میں یا بحث میں طلاق یا حرام کی باتیں کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

انتقال برمال

☆ گزشتہ دنوں مصنفہ سدرۃ المنتمی کے والد ماجد انتقال کر گئے۔

☆ مصنفہ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین کے بھائی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار راشدہ صد، ٹورنٹو اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔

☆ نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے

لیے دعا کریں۔

☆☆☆

بھ عصمت، اوکاڑہ سے۔ ”پاکیزہ کی بہنوں کی محفل میں میرا خط شائع ہوا..... میرے پاس تو بہت فون آئے مگر مجھ سے

زیادہ میرے ڈاکٹر بھائی سرور چوہدری کے پاس آئے۔ وہ چائلڈ اسپیشلسٹ ہے۔ اس کی تمام مریض خواتین نے اس سے کہا

آپ کی آپا کا خط پاکیزہ میں لگا ہے۔ ماشاء اللہ یہاں ہمارا بہت بڑا حلقہ احباب ہے اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ سرگودھا

اور اوکاڑہ والے آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور آپ کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔“ (ہمیں بھی تو آپ لوگوں سے محبت

ہے..... اور محبت کا جواب تو محبت ہی ہوا کرتا ہے)

بھ نسیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”اداریہ زبردست تھا۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کیسی خوب صورت روداد

ہے..... کیسا پیارا لکھا ہے ذکیہ صاحبہ نے کہ ان پر بے اختیار پیار آ جاتا ہے۔ نگہت سیما کی اعتبار وفا کی ہر قسط دوسرے سے بڑھ کر

ہوتی ہے۔ عدیہ محمد بیگ کی کہانی وہ طلب گار تھا میں مریم مجبور تھی اسے معافی دینے کے لیے کہ رویتے انسان سے بعض فیصلے کرا دیتے

ہیں۔ نبیلہ امیرا جا کا متاع دل ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا۔ درخشاں بلال کے ناول کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ رفاقت

جاوید کا افسانہ ایک حقیقت ایک فسانہ پڑھ کر کہیں لڑکیاں فوجیوں سے شادی کرنے سے منکر نہ ہو جائیں۔ صدف آصف کی وقعت

پڑھ کر مزہ آیا۔ دلچسپ کہانی تھی۔ شیریں حیدر کی زندگی خاک نہ تھی کا یہ حصہ بھی بے حد اثر انگیز تھا۔ غزالہ عزیز کی جیت خرد کی جیت

تو تھی ہی لیکن اس کہانی میں خدا پر یقین کا خوب صورت سبق دیا گیا ہے۔ قیصرہ حیات کی آخری امید اس شمارے کی جان تھی.....

کتنے لوگ ہوں گے جن کا ایمان اس کہانی کو پڑھ کر مضبوط تر ہوا ہوگا۔ تم میرے قریب ہو تیں قیصرہ تو میں تمہاری انگلیاں جوم لیتی۔

اقبال بانو کا اپنا الگ انداز ہے ان کے ناولٹ کے دوسرے حصے نے مزہ دیا۔ ام ایمان قاضی کی شناخت دلچسپ کہانی تھی لیکن اینڈ

میں جلدی کر دی۔ فاطمہ خان کی مختصر کہانی، کہانی محبت کی نے مزہ نہیں دیا۔ مکمل ناول حقیقت سحر ساجد کی سچ سچ کی حقیقت تھی کچھ

حقیقتیں کڑوی ضرور ہوتی ہیں لیکن ہوتی تو حقیقت ہی ہیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ اختر شجاعت کی شمع ہدایت سچ سچ کی شمع تھی۔

سندھ میں شادی کی رسمیں نے علم میں اضافہ کیا..... رفعت شبانہ بڑی پیاری سی ہیں۔ پاکیزہ کے مہمان، اب رائٹرز کے علاوہ اور

لوگ بھی ہونے لگے..... سارہ رضا خان سے ملاقات اچھی لگی۔ جلت رنگ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ عیدی، سب سے اچھا لگا.....

اللہ آپ کو اور آپ کے قلم کو سلامت رکھے آمین۔“ (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

بھ شگفتہ قدیر، لاہور سے۔ ”انجم باجی میں جاب کرتی ہوں اور گھر کے کام کاج بھی مگر آپ میری روحانی استاد ہیں اور آج آپ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے رابطہ کر رہی ہوں جب سے آپ نے روزانہ دو نفل شکرانے کے پڑھنے کے لیے بتایا تب سے میں روز پڑھا کرتی ہوں اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ میں ریڈیو سے بھی فوجی بھائیوں کا پروگرام پیش کرتی ہوں۔ پاکیزہ میں آپ کی تحریریں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں..... آج آپ سے اس وجہ سے بھی رابطہ کیا ہے کہ عظمیٰ آفاق کی تحریروں کی بھی تعریف کروں، مجھے ذیشان کی شادی کا احوال بے حد اچھا لگا ہے..... اتنی سچائی سے ایسا سب کچھ لکھنا..... شاباش ہے بھئی میری مبارک باد دیجیے گا عذرا بہن کو۔“ (پیاری شگفتہ اس محفل میں خوش آمدید..... تم نے تو آتے ہی میری اس قدر تعریفیں کر دی ہیں کہ جی مجھے شرم آرہی ہے..... یہ سب آپ بہنوں کی محبت ہے اور اللہ کا مجھ پر کرم کہ میں جو بھی جیسا بھی لکھ دوں آپ سب کو اچھا لگتا ہے۔ ہاں عذرا رسول آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں کہ آپ ذیشان کی شادی کا احوال پسند آیا)

بھ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”ذیشان کی شادی کا احوال پتا نہیں کتنی مرتبہ پڑھا ہے آپ کو بتا نہیں سکتے اور تصویریں تو بار بار دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ شادی کا احوال مزے کا ہے یا تصویریں زیادہ اچھی ہیں..... ہر چیز اتنی پیاری ہے کہ مزہ ہی آگیا۔“ (شکریہ)

بھ صبا نور، لیہ سے۔ ”باجی آپ کے حکم کے مطابق اب میں انٹر کا امتحان علامہ اقبال یونیورسٹی سے دینے والی ہوں..... اور میری تعلیمی قابلیت بڑھانے میں سونی صد آپ کا ہاتھ ہے۔ (یہ سب تمہاری اپنی محنت وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر تم میری بات نہ مانتیں تو ایسا کیسے ہو سکتا تھا) اس ماہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قسط پڑھ کر بہت مزہ آیا مگر پلیز صفحات بڑھا دیں۔“ (ہاں اس دفعہ صفحات بڑھے ہوئے ہیں)

بھ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ ”ہر ماہ پاکیزہ لازمی پڑھتی ہوں اور تجربہ بھی اکثر لکھتی ہوں مگر مسئلہ ڈاک میں پوسٹ کروانے کا ہے کہ کون جائے میری جاب ایسی ہے کہ گھر آتے آتے اکثر چار بج جاتے ہیں۔ آپلی مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میں ایک ہی دن میں رسالہ ختم کر کے اگلے ماہ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگتی تھی اور بعض دفعہ تو آپ اور خاص کر کے نزہت کے کان کھا جاتی تھی کہ اگلا شمارہ کب آئے گا۔ عذرا آپلی کیسی ہیں۔ میری طرف سے عذرا، عظمیٰ اور نزہت کو پیار و سلام کہیے گا۔ آپ کا تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ مجھے بھولی نہیں کہ آپ ہر سالگرہ پر میرا نام انتہائی پیار سے دیتی رہیں ہیں۔ ہاں نزہت آپلی مجھے بھول گئی ہوں۔“ (ہم پیارے قارئین، مصنفات، تجربہ نگاران کسی کو نہیں بھولتے۔ وہ بھی نہیں بھولیں اب آپ مکمل تجربے کے ساتھ آنا)

بھ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا..... پچھلے سال حج میں یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا..... دل چاہتا ہے اس مقدس سفر کے بارے میں لکھوں اگر آپ کی اجازت ہو (جی ضرور) اب ہو جائے بات ناولٹ کی..... نبیلہ اور اقبال بانو کے ساتھ ام ایمان قاضی کو بھی پڑھا..... تینوں ناولٹ اچھے رہے۔ افسانوں میں کرچیاں دل کی سب سے اچھا افسانہ رہا۔ خصوصی مضامین کے حوالے سے چاروں سلسلے اچھے تھے۔ ناہید سلطانہ اختر کب پاکیزہ کی مہمان بنیں گی۔ انتظار رہے گا۔ (بہت جلد، انشاء اللہ..... پیاری ناہید تیار ہو جاؤ) اعتبار وفا کی یہ قسط بھی اچھی رہی۔ اس دفعہ پاکیزہ ڈائری میں اشعار بہت زبردست لگے۔ جلت رنگ میں عیدی اور بے اختیاری میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اختر شجاعت اب باقاعدگی سے آرہی ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔“ (تجربے کا شکریہ)

✉ راحت وفا، لاہور۔ گڑیا آپ کو میرا فون اس وجہ سے نہیں مل رہا کہ پرانا نمبر بند کروا دیا ہے۔ اب آپ اور دیگر بہنیں میرا نیا نمبر نوٹ کر لیں۔ 021.36964779

بھ انیسہ زینب، فاروق آباد سے۔ ”نمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا تبھی وقت پر تجربہ بھجوا رہی ہوں ورنہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں میں۔ پورا تو ابھی تک پڑھ نہیں پائی مگر جلت رنگ، وہ آئے بزم میں، مجمع ہدایت اور ملنے کو جی کرتا ہے پہلے پڑھ لیا اور سب سلسلے پسند بھی آئے۔ افسانوں میں ابھی تک بھوک پسند آیا۔ باتیں بہار و خزاں کی نامی سلسلہ اچھا اضافہ لگا۔ سلسلے دار ناول بھی اچھے رہے باقی پڑھنے باقی ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روداد دلچسپ لگی ہے اور اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔“ (شکریہ)

بہ شبنم کنول، گاؤں پاپانگری سے۔ ”آخری امید، قیصرہ جی کیا کمال ہے آپ کی۔ نگہت سیمہ، شیریں حیدر، فرحین اظفر تسی وی گریٹ او..... دُرُمن بلال کے ناول نے اچھا اشارت لیا ہے امید ہے یہ اسٹوری ہمیں بور نہیں کرے گی اور پلیز اسے زیادہ لمبا بھی مت کیجیے گا۔ افسانے بھی سب اچھے تھے، یادوں کی مالا زبردست جی کیا ہی عشق ہے۔ ملنے کو دل کرتا ہے عظمیٰ آپ کی آپ کے سوا یہ منظر کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا تھا کیا خوب صورتی سے منظر کھینچا ہے۔ ارے میں تو اپنے فوٹو ناولٹ کو بھول گئی کیا نہیں جی ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں متاع دل کو بھول جاؤں نبیلہ جی..... ناولٹ مکمل ہونے پر لاکھوں مبارک باد۔“ (ہماری مصنفات شکر یہ کہہ رہی ہیں)

بہ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ”رائٹرز کی کہکشاں عظمیٰ آفاق کے قلم سے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ویسے عظمیٰ جی آپس کی بات ہے ہمیں آپ کا دانہ شانہ کہیں نظر نہیں آیا بلکہ اپنی تحریر کی طرح آپ خود بھی بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ باجی آپ دوپٹے میں اتنی گریس فل لگ رہی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میں جب بھی رسالہ کھولتی ہوں پہلے آپ کی تصویر دیکھتی ہوں پھر آپ کو دیکھ کر آپ کے ساتھ مسکرا کے آگے بڑھتی ہوں۔ سلسلے دار ناول تمام رائٹرز بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھا رہی ہیں۔ قیصرہ حیات، عبدالرحمن کے کردار کو پورے نام سے لکھ رہی ہیں ایسا ہی لکھنا اور بلانا چاہیے بعض رائٹرز صرف رحمن جی یا رحمن صاحب لکھتی ہیں اس طرح لکھنا یا بلانا غلط ہے رحمن اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ بھوک اور ٹھپا حقیقت سے قریب افسانے تھے۔ یادوں کی مالا اور مجمع ہدایت مضامین میں بہت اچھا اضافہ ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ رخسانہ امجد، ملکوال۔ گڑیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں..... بہت دنوں سے تمہارے مراسلات نہیں ملے ہیں۔
بہ مقدس بیگم، کراچی سے۔ ”باجی آپ کو فیس بک پر کئی بار ریکوئسٹ بھیجی مگر آپ نے جواب تک نہیں دیا۔ آپ کی بہت ساری کتابیں میں نے نیٹ پر پڑھی ہیں۔ پلیز ہمیں پاکیزہ میں اور اپنے ساتھ نیٹ پر بھی شامل کرئیں۔“ (پیاری مقدس..... پاکیزہ میں خوش آمدید..... میں اپنے فیس بک کا اکاؤنٹ روز چیک نہیں کیا کرتی اور جب میرا موبائل میرے پوتا، پوتی کے ہاتھ میں چلا جائے تو پھر تو وہ کیا کچھ کر ڈالتے ہیں..... آپ پاکیزہ میں بھر پور تبصرہ بھیجیں)

بہ گل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ”اداریہ پڑھا جہاں ہمیشہ ہی ایک بہترین موضوع ہوتا ہے بے شک انسان ایک معاشرتی حیوان ہے جو تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ پھر جلدی سے صفحے پلٹے اور ذیشان بھیا کی شادی کے احوال اور تصاویر میں گم ہو گئے۔ ماشاء اللہ بہت پیارا کھل ہے دونوں کے چہروں پر معصومیت کے رنگ ہیں۔ اللہ کریم خوش و خرم رکھے، سلامت رکھے آمین۔ ویسے دولہا، دلہن کا کلوز اپ بھی ہونا چاہیے تھا۔ ویسے کی بھی صرف ایک تصویر ہے اور تمام تصاویر کلرڈ ہونی چاہئیں تھیں۔ تمام رائٹرز کی ہی تصاویر اچھی ہیں۔ اور عذرا آپا تو ماشاء اللہ دولہا کی والدہ کم اور بہن ہی لگ رہی ہیں۔ عذرا آپا اپنے مخصوص انداز میں سر پر دوپٹا اوڑھے بہت باوقار اور پیاری لگ رہی ہیں۔ ذیشان کی بہن سین کو ہم نے پہلی بار دیکھا وہ بھی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ عذرا آپا کے قلم سے جھلکیاں پڑھیں عذرا آپا آپ کو یہ خوشیاں بہت، بہت مبارک ہوں اللہ کریم آپ کو مزید خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔ آپ کے بچوں کو سلامتی دے اور انکل معراج کو صحت و زندگی عطا فرمائے آمین۔ عظمیٰ کے مخصوص انداز تحریر میں شادی کا احوال پڑھا بہت خوب..... تمہارا طرز تحریر مجھے جیسی سیریس لڑکی کو بھی ہنسنے مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے کچھ اور لوگوں کی تحریر بھی پڑھی ہیں۔ شادی کے احوال کے حوالے سے مگر جو بات تمہاری تحریر میں ہے وہ ان میں نہیں کیونکہ عظمیٰ تم صرف خوب صورت لباس، جیولری، میک اپ اور کھانوں کی تشہیر نہیں کرتیں بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول، ان کے رویے اپنے پچھلی تاثرات اور بچوں کی معصوم باتیں اور شرارتیں ان سب کو بھی تحریر میں اس طرح سموتی ہو کہ پڑھنے والا لمحہ بہ لمحہ بہت انجوائے کرتا ہے۔ اللہ کریم تمہارے قلم کو مزید نکھارے۔ عظمیٰ ڈیر آپ کو تو انجم باجی کی بیٹی ہونے پر فخر ہو گا ہی مگر ہمیں بھی تم پر فخر ہے کہ تم باجی کے نقش قدم پر چل کر ان کی روایت کو لے کر آگے بڑھو گی۔ اللہ تعالیٰ ہماری انجم باجی اور تمہاری والدہ کو لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ اعتبار وفا کی اس قسط نے تو ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔ ویسے نگہت آپا کی عقل و دانش کو داد دینی پڑتی ہے اتنی زبردست پیچ و خم والی کہانی اور بے شمار کرداروں کو کس قدر خوب صورتی سے لے کر چل رہی ہیں۔ محبت یوں نہیں ہوتی عام سی کہانی ہے مگر عزم نے بروقت درست فیصلہ کیا۔ محترمہ رخ چوہدری کا انٹرویو پڑھنا نہ جانے کیوں پڑھ کر ہم اداس ہو گئے۔ ویسے باتیں بہت اچھی کیں انہوں نے۔ مجمع ہدایت، محبت الہی کے موضوع پر بہترین تحریر رہی

سبحان اللہ۔ (دیکھو تمہارا خط خاصی تاخیر سے ملا تھا مگر پھر بھی شامل اشاعت ہے)

بھ خولہ بنت عرفان، کراچی سے۔ ”آپ کے خطوط اور جلت رنگ ہمیشہ کی طرح آنکھ میں پانی اور پیٹ میں بل ڈالنے والے تھے۔ اس کے حسن بیان سے کوئی بد ذوق ہوگا جو انکار کرے۔ متاع دل میں کہانی آگے بڑھی دیر لیکتا سکون میں آئی تو ذہن بھی سکون میں آگیا۔ شمیم فضل خالق نے کرچیاں دل کی میں اپنے ڈز سیٹ کی صورت میں گھریلو محبتوں کی بہت پیاری عکاسی کی۔ کہانی محبت کی عام سی کہانی مگر انداز بہت خوب صورت، مختصر اور جاندار..... باقی سب افسانے اور ناول، ناولٹ بھی شاندار تھے۔“ (خولہ..... تم اب جاگ جاؤ..... بہت سوچیں..... ہاں تمہارا افسانہ قابل اشاعت ہے)

بھ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ”ٹائٹل گرل فرینڈ اعجاز بہت پیاری لگی۔ ادارہ ہمیشہ کی طرح بہت، بہت سبق آموز رہا۔ باجی زور قلم اور زیادہ..... دین کی باتیں نے دل و ذہن کو منور کیا۔ یادوں کی مالا کا دوسرا باب محترمہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی پُر اثر یادیں بہت متاثر کر رہی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت عقیدت بھری داستان ہے اگلی قسط کا ابھی سے انتظار شروع ہو گیا ہے۔ ملنے کو دل کرتا ہے، عظمتی آفاق کے قلم سے مزے دار احوال پڑھ کر بے حد اچھا لگا اور اپنی تعریف پڑھ کر بہت بہت خوشی ہوئی۔ مجھ ناچیز کو خوب صورت کہنے پر عظمتی تمہارا بہت، بہت شکریہ ہمیشہ خوش رہو، آمین۔ ناول سب اچھے جارہے ہیں۔ منی ناول، شیریں حیدر، زندگی خاک نہ تھی، ویری ویل ڈن شیریں صاحبہ اتنی زبردست تحریر پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد قبول کریں۔ ناولٹ، کیسی ایمر جنسی نزہت جیہیں ضیا آپ کی تحریر بہت پُر اثر رہی سیدھی دل پہ لگی نزہت جی اتنی اچھی تحریر پر بہت مبارکباد..... باقی سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ مستقل سلسلے سب بہت اچھے جارہے ہیں۔ بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے۔ میں سب بہنوں کی خوشی غمی میں ان کے ساتھ ہوں جن کو خوشیاں ملی ہیں ان کو دل سے مبارکباد اور جن کو دکھ ملے ہیں ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اور جو بیمار ہیں اللہ پاک ان سب کو صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ نزہت آپ نے محترمہ رفاقت جاوید سے بھرپور ملاقات کروائی۔ نزہت آپ ہی ہمیشہ خوش رہیں جو اتنی پیاری، پیاری شخصیات سے ملواتی ہیں، شمع ہدایت کی میں خصوصی طور پر تعریف کروں گی۔“ (شکریہ)

بھ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ”اقبال بانو کا ناولٹ اچھا لگا پڑھ کر خاصی فلمی سچویشن تھی کہانی میں۔ متاع دل میں دیر لیکتا کے دکھ ختم ہونے والے لگتے ہیں۔ اگست کے شمارے میں شمیم فضل خالق نے تاک کر صحیح نشانہ لگایا۔ ایک یاد دہانی اپریل کے پاکیزہ میں صبیحہ شاہ کی کہانی خواب زادی میں ایک لفظ ہضم نہیں کر پار رہی۔ اگر میں غلط ہوں تو معذرت..... دوسرے پیرا گراف کی آٹھویں لائن میں انہوں نے لِق و دِق مائز کا ذکر کیا ہے۔ لِق و دِق بارونق جگہوں کے لیے ہرگز نہیں لکھا جاتا بلکہ بہ لفظ بیابانوں، صحراؤں کے حوالے سے لکھا بولا جاتا ہے۔ کرچیاں مرے دل کی شمیم فضل خالق نے کہانی لکھ کر حقیقت بیان کی ہے کہ ہماری والدہ صاحبہ کے جہیز میں مانا مرحوم نے انگلش ڈز سیٹ دیا تھا اس وقت ظاہر ہے دو نمبر پلاسٹک وغیرہ کا نام و نشان کا نام و نشان کہاں تھا جب سونا 22 روپے تولہ تھا۔ بے حد خوب صورت نیلے رنگ کے ڈز سیٹ کو اماں عزیز رکھتیں اور خاص مہمانوں کے لیے نکالا جاتا۔ ہمیں آج تک دسترخوان پر ان ڈونگوں میں کپے سجے کھانے لذت، شکل سب یاد ہے۔ اگلی ہماری بڑی ہمشیرہ کو ان کی سگر سلاکی مشین پیروں والی بڑی عزیز ہے کہ ان کو ہماری والدہ نے اس لیے لے کر دی تھی کہ وہ سلاکی کڑھائی کی شوقین تھیں۔ جہیز کی کڑا ہی کے نام سے کہانی میرے اپنے گھر کی ہے۔ جب میں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی پیرا ایک بھائی دادا کے گھر کی بڑی، بڑی دیگوں کو آج تک نہیں بھولا کہ وہ سب کہاں گئیں جن میں ہر سال دو مرتبہ نذر نیاز پکتی جتی تھی۔ عظمتی کی ترتیب دی ہوئی پاکیزہ ڈائری.... خوب سے خوب تر ہے۔“ (تبرے کا شکر یہ لِق و دِق کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خالی ہوں اور سنسان سے ہوں آج سے بیس سال پہلے مجھے کینیڈا کے مائز بھی لِق و دِق سے لگے تھے..... کہ لوگ ہی نظر نہیں آرہے تھے..... سامان بے حساب..... خریدنے والے غائب)

بھ قائمہ رابعہ، گوجرانہ سے۔ ”اقبال بانو کی دو بہنوں کے انتقال کی خبر پڑھ کر دلی رنج ہوا..... میری دلی تعزیت ان تک پہنچا دیجیے (ضرور) پاکیزہ کا شمارہ..... مصنفات کی تصاویر سے دمک رہا ہے۔ مگر انجم آپ مجھے خاصی کمزور لگی ہیں (نہیں بھئی) اس ماہ کے روحانی مشورے کی میں جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی..... استعارے کے بارے میں لوگوں کی معلومات انتہائی کم بھی اور غلط بھی ہیں..... آپ نے بہت عمدگی سے استعارے کے بارے میں معلومات دی ہیں (شکریہ)

ہاں شیریں حیدر کو مبارک باد ضرور دیں۔ بہت اچھا لکھا۔“ (تبصرے کا شکریہ)

بھ نائلہ ضیا، ڈیفنس کراچی سے۔ ”یوں تو میں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ مگر اپنی رائے دینے کی اصل وجہ عظمیٰ آفاق کی خوب صورت اور پرمزاح تحریریں ہیں۔ ایسی جاندار تحریریں پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ مصنفات کی عید ملن کی کورٹج بے حد شاندار رہی۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس میں سے بہت سی باتیں ایسی تھیں جو انسان دوسرے سے چھپایا کرتا ہے مگر عظمیٰ نے کس آسانی سے لکھ دیں۔ جو اکثر پڑھنے والوں کو بھی اپنے دل کی باتیں لگیں گی۔ اس کے بعد مجھے پاکیزہ میں جو ہارٹ فیورٹ تحریریں رہی ہیں وہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا، انجم انصار کی روحانی مشورے اور جلت رنگ اور محترمہ اختر شجاعت کی شمع ہدایت پڑھ کر واہ، واہ نکلا۔ میری مبارک باد سب کے لیے۔“ (نائلہ بہن اس محفل میں خوش آمدید، آئندہ آپ کے بھرپور تبصرے کی منتظر رہوں گی۔ اختر شجاعت، ذکیہ بلگرامی اور عظمیٰ آفاق شکریہ کہتی ہیں)

بھ فریحہ مبین، کراچی سے۔ ”پہلی بار اپنی رائے دے رہی ہوں پاکیزہ میرا پسندیدہ میگزین ہے۔ میں ایک معلم ہوں۔ مصروف رہتی ہوں مگر اس کو ضرور پڑھتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس کو پڑھ کر ہماری قاری بہنیں یقیناً مثبت چیزیں ضرور سیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بے حد پسند آرہی ہے۔ جلت رنگ تو ٹینشن ختم کرنے کا ٹانک ہے۔ عظمیٰ آفاق نے عید ملن کا احوال جس انداز میں لکھا ہے پڑھ کر لطف آیا ہے۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دینا ایک عمدہ طرز بیان کی دلیل ہوتی ہے۔ تمام ناولوں میں مجھے شیریں حیدر سب سے زیادہ اثر رکھ کر رہی ہیں۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی پسندیدگی کے لیے مشکور ہوں۔ شیریں حیدر شکریہ کہتی ہیں)

بھ مسز سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ”اس ماہ جلت رنگ بہت ہی اعلیٰ تھا اور بہت مزہ آیا۔ عظمیٰ آفاق کی تحریر کی جتنی تعریف کروں وہ کم ہوگی۔ ویل ڈن نگہت سیما کی تحریر میں دھیمپن ہے۔ مگر شیریں حیدر کی یہ قسط قدرے ماضی سی لگی۔ فرحین اظہر اور بشری گوندل کی تحریروں میں ربط کا فقدان ہے اور بڑی الجھی ہوئی تحریریں۔ جو مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئیں۔ ذکیہ بلگرامی کی تحریر پڑھ کر دل میں سکون اترتا ہے۔ عالیہ توصیف کی مختصر تحریر بہت اچھی لگی۔ رفاقت جاوید کی تصویریں بہت خوب صورت ہیں۔ مگر سچی بات کہوں گی کہ ان کی وضاحت کے باوجود بھی ان کا ناول ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ سائرہ کی آزادی کی بھی قائل ہیں اور دوسری لڑکی کے بارے میں وہ چاہتی ہیں کہ وہ خبر کے آگے سر جھکا دے۔ حالانکہ وہ تو لڑکے کی محبت نہیں جنون تھا۔“ (رفاقت کی وضاحت کے بعد آپ کا یہ اعتراض بے جا ہے۔ پھر بھی ہم آپ کی رائے ان تک پہنچا رہے ہیں)

بھ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے رائٹرز کی عید ملن کا احوال پڑھا۔ ہر سطر پڑھ کر مسکراہٹ آرہی تھی۔ مگر میں اپنی رائٹرز سے یہ کہنا چاہوں گی کہ اپنے سروں پر دوپٹے ضرور لیا کریں۔ اس کے بعد رفاقت جاوید کا انٹرویو پڑھا۔ تصویریں دیکھ کر ایسا لگا جیسے کسی بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی ہیروئن ہوں۔ رفاقت جاوید تو مجھے اپنے بچوں اور بہوؤں سے زیادہ خوب صورت لگیں۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ مڈل کلاس یا غریب غریبا کے مسائل پر افسانے لکھنے کے بجائے اپنی کلاس کے مسائل پر قلم اٹھائیں کہ وہ اس پر زیادہ بہتر لکھ سکیں گی۔ ذکیہ بلگرامی کی تحریر تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ اور میں ان کی سب سے بڑی فین ہوں۔ افسانوں میں نئی لڑکیوں کی تحریروں میں مشکل نویسی زیادہ نظر آرہی ہے۔ تحریر کی روانی نظر نہیں آتی۔ مگر شیریں حیدر کی ناول کی قسط سب سے عمدہ تھی۔ اختر شجاعت نے بھی اچھا لکھا۔“ (تبصرے کا شکریہ)

بھ پروین وحید، لاہور سے۔ ”ایک طویل عرصے بعد اپنی رائے دے رہی ہوں۔ رفاقت جاوید کا انٹرویو اتنا خوب صورت شائع ہوا ہے کہ آج تک ایسا انٹرویو نہیں لگا ہوگا۔ ساڑی پہن کر تو وہ حسینہ لگ رہی ہیں۔ مصنفات کی عید ملن کی تصاویر میں مجھے سب سے اچھی عذرا رسول اور عظمیٰ لگیں۔ باقی بھی ٹھیک ہیں۔ احوال کی کورٹج زبردست رہی۔ انجم باجی آپ کے ناول کا انتظار ہے۔ بہت سال ہو گئے آپ کا ناول پڑھے ہوئے۔ آخر میں خاص بات ذکیہ بلگرامی کو پھولوں کے سو ٹوکے پہنچا کر یادوں کی مالا کی مبارک باد دیجیے گا۔“ (پاکیزہ کے تمام انٹرویو ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی تعریفیں پہنچا کی جارہی ہیں، مجھ میں اتنی کہاں سکت کہ سو ٹوکے اٹھاؤں گی، یہ کام تم خود کر لو)

بھ رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ”میں نے اپنا انٹرویو پڑھنے کے بعد سب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے اختیاری میں

قلم اٹھایا۔ میں سب سے پہلے عذرار رسول کا شکر یہ ادا کرتی ہوں جنہیں رب العزت نے اس کا رخیر کے لیے منتخب کیا تھا۔ پھر مجھے یک لخت انجم انصار کی بے لوث محبت، توجہ اور راہنمائی ماضی میں لے گئی جو آپ سب سے شیر کرنا چاہتی ہوں۔ جب میں نے پاکیزہ میں پہلی بار فون کیا تو رمضان صاحب سے میری تفصیلات بات ہوئی۔ انہوں نے مجھے انجم انصار کی طرف کہانی بھیجنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہانی بھیجنے کے بعد تین بار رمضان صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ چوتھی بار انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ یہاں سے جارہے ہیں۔ اس لیے آئندہ آپ انجم انصار سے خود رابطے میں رہیں۔ انہوں نے انجم کا نمبر لکھوا کر ان کی بہت تعریف کی۔ اگر میں ان کی باتوں سے مطمئن نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں انجم سے رابطہ ہی نہیں کر پاتی۔ میں نے انجم سے ایک رائٹر کے نام سے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے میرے ماضی اور شوق کو پرکھتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی اور پھر یکے بعد دیگرے میری کہانیاں پاکیزہ میں چھپنے لگیں۔ وہ ہر کہانی کو پڑھنے کے بعد میری راہنمائی کرتے تو میں نے انہیں اپنا استاد مان لیا۔ آج بھی انہیں کئی بار اسی مقدس رشتے سے پکارتی ہوں۔“

(پیاری رفاقت آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا پر محبت طویل خط شائع نہیں کر رہی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ میں ٹیلنٹ نہ ہوتا تو دو افسانے لکھ کر ہی ہار مان جاتیں..... گامڈ کرنے کا فائدہ تب ہی ہوا کرتا ہے جب کسی میں لکھنے کا ہنر بھی ہو۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے، محترمہ عذرار رسول اور دیگر اراکین پاکیزہ بھی آپ کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں)

بھ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”اداریہ کے بعد ذکیہ آپا کی یادوں کی مالا کا دوسرا موتی بھی زبردست تھا..... مسلم باغ میں ان کی جیب کا حادثہ اور پھر سب کا بچ جانا..... دوبارہ پڑھنے میں ہی بہت اچھا لگا..... قیصرہ حیات کا ناول بھی بہت عمدگی سے جارہا ہے۔ نو مسلم لوگوں کے کردار بہت اچھے بیان کیے ہیں..... صرف عظمیٰ کا ہی دل ملنے کو نہیں چاہتا ہے ہم لوگ بھی خنجر ہیں تحریروں سے ملاقات تو ہوتی ہے مگر تصویری ملاقات بھی زبردست رہی بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک رہی..... بہت سی مصنفات سے ملاقات کروانے کا شکر یہ..... تم مجھے بتاؤ کہ اتنی کمزوری کیوں لگ رہی ہو..... (نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے) رخ چوہدری نے اپنے انٹرویو میں تصویریں نہیں دی تھیں مگر عید ملن میں ان کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ پیاری بھئی عظمیٰ تمہارے طرز تحریر کے بارے میں ہم کیا کہیں سوائے اس کے کہ زور قلم اور زیادہ ہو۔ مزاح کی ملکہ کی تحریروں کے ہم فین تھے..... اب مزاح کی شہزادی بھی اپنی تحریروں کے رنگ جمانے لگی ہیں..... نگہت سیما نے بھی اعتبار وفا کے آئینے سے گرد صاف کرئی شروع کر دی ہے۔ نبیلہ امیرا جانے اپنوں اور غیروں کا فرق واضح کر دیا..... دُرُشمن کا ناول اچھا لگ رہا ہے۔ شیریں زندگی خاک نہ تھی..... کہ بارے میں یہی کہتا ہے کہ تم نے جب بھی لکھا ہمیشہ نئے موضوعات پر قلم اٹھایا..... ایک ماں کی چاروں بیٹیوں کی کہانی جس کی ڈور اپنی ماں سے جا کر ملتی ہو..... بہت خوب صورت ہے..... اختر شجاعت کی تحریر حاصل مطالعہ رہی..... اللہ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق دے..... رفاقت جاوید سے ملاقات اچھی رہی..... تصاویر بہت خوب صورت تھیں..... بہت گریس فل کھل تھا۔ اب عمیرہ احمد کو اور شیریں حیدر کو بھی لے کر آئیں۔ جلت رنگ کی شادو بھابی واقعی ایسی خواتین بہت ہیں..... دوسرا خاکہ بھی بہت زبردست رہا۔ گھبراہٹ کے باوجود..... انجم تم نے استخارہ کے بارے میں لکھا اس سے خواتین و حضرات دونوں کو مدد ملے گی۔“ (بھر پور تبصرے کا شکر یہ)

بھ شوکت، کراچی سے۔ ”مجھے سب رائٹرز کی تصویریں بہت اچھی لگیں۔ مگر عذرار رسول کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے..... مجھے یوں تو پاکیزہ کی ہر تحریر بہت اچھی لگتی ہے بار، بار پڑھتی ہوں مگر عظمیٰ آفاق کی تحریروں کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ تحریر میں سادگی، شوخی، ہمدردی سب ہی کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے نگہت سیما کا ناول بھی بہت پسند آ رہا ہے اور ذکیہ بلگرامی کی مالا تو روزانہ پڑھتی ہوں میری خصوصی مبارک باد ان تک پہنچائیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے آپ کی محبت کا کوئی جواب ہی نہیں ہے)

بھ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیا الدین اسپتال، کراچی سے۔ ”ذکیہ تمہاری یادوں کی مالا بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ذرا دھیان دو اس میں ایک چھوٹا سا موتی ہی ہمارا بھی ہے۔ آخری امید بہت اچھا چارہ ہے مگر ان کے قلم سے یہ جملہ اچھا نہیں لگا کہ ویسے کی رسم ختم ہو گئی۔ رسم کی جگہ تقریب کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ اف عظمیٰ ملنے کو دل کرتا ہے نہیں بلکہ ملنے کو بار بار دل کرتا ہے۔ واہ کیا خوب صورت کوریج کی ہے تم نے جس کے لیے ہم تمہیں نہیں بلکہ عذرار رسول کو خود کو اور دیگر بہت سے قارئین کو شاباش دیتے ہیں جنہوں نے انجم کو ہر اگر تمہیں لایع کیا..... تمہاری پارٹی کی تیاری بہت مزیدار لگی اجیہ نے تمہیں کتنا پیارا مشورہ دیا پھر بھی تم اپنے پیارے، پیارے بچوں سے شاکی رہتی ہو۔ بنین ہمیں بہت پیاری لگی ہم سمیت سب کے اتنے

اچھے فوٹو گرافس جو بنائے اس بچی نے... تمہارے سوالات اور مصنفات اور قارئین کے جوابات بہت اچھے لگے۔ نہیں میں تمہاری صحیح تعریف کر کے تھکی نہیں تھی، تمہاری مصروفیت کا خیال تھا۔ آخر جان محفل تھیں تم... تقریب اور ہمارے مصنفین بہت پیارے ہیں عذرا، نزہت اور انجم کی تو ایک الگ ہی اور خصوصی جگہ ہے ہی مگر باقی لوگ بھی اتنے اچھے ہیں۔ ہم جیسوں کو کسی کا پبلیکس کا احساس نہیں ہوتا اتنی محبت اور خلوص سے سب ملتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ حمیرا طارق اور شائستہ اعجاز بھی بہت پیار سے ملیں۔ عظمیٰ تم نے جو اپنے گھر آنے کی شرط رکھی ہے اب اس کی سزا بھگتو جلدی سے ایک کہانی لکھ کر ہمیں بھیج دو جیسے ہم اپنے نام سے چھوا کر تمہارے گھر آنے کے حصے دار بنیں... جلدی، جلدی بلکہ ہر شمارے میں آتی رہا کرو۔ سیماسراج کی مختصر کہانی بہت کچھ سکھا گئی۔ نگہت سیمابہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ متاع دل اختتام پزیر ہوا۔ بہت زیادہ اچھا نہیں لگا۔ بھوک، کسی بے خبر اور ٹھٹھا اچھی تحریریں ہیں۔ زندگی خاک نہ تھی، اتنا نازک موضوع اور شیریں کا قلم بس یہی کہہ سکتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اگر کچھ لوگ بھی تسبھل گئے اس کو پڑھ کے اور شیریں کا اجر بے حساب ہوگا، انشاء اللہ۔ دُرُثْمَن کے ناول پر تبصرہ کچھ اور قسطوں کے بعد کیسی ایمر جنسی ہلکی پھلکی اچھی تحریر ہے۔ تم نے کہا تھا خاص نہ لگی۔ تو کل، یقین الہی بہت ایمان افروز مضمون ہے۔ اللہ اختر شجاعت کو اسی طرح راہنمائی کی توفیق عطا کرے آمین... رفاقت جاوید بہت بھرپور انداز سے بزم میں آئیں۔ ان سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ان کے نام کے حوالے سے دلچسپ تجربہ اچھا لگا اگر رفاقت بہن برانہ مانیں تو معذرت کے ساتھ میں ان سے کہنا چاہوں گی کہ حساس صرف لکھاری ہی نہیں ہوتے بلکہ قارئین اور تبصرہ نگار بھی حساس ہوتے ہیں۔ ان کے لیے انہوں نے کچھ زیادہ سخت الفاظ استعمال نہیں کر لیے۔ جیسے موٹا اور ڈل دماغ، تیر نہ شیر، نہ انگریزی کے نہ اردو کے وغیرہ وغیرہ۔ تنقید یا تبصرے سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہوتی، یہ تو انسان کی اپنی رائے ہے جس سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب باری ہے بہنوں کی محفل کی اس میں تم نے بچیوں کی حفاظت کے لیے والدین کو جو پیغام دیا ہے کاش ان کے دل میں اتر جائے۔“ (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

عزیز بہنو! آپ کی اس محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا... آئیے اب حسب دستور درود ابراہیمی پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ اللہ بزرگ و برتر کی توفیق کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت ہے نہ برائی سے بچنے کی ہمت میں اس کلمہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے ساتھ مدد مانگتی ہوں، اپنی زندگی اور موت پر اور ملک الموت کی آمد پر... سکرات الموت اور اس کی بے ہوشیوں کے نزول کے وقت... اے ارحم الراحمین! میں اپنی جان، اپنے اہل خانہ، اپنے مال، اپنی اولاد اور جو بھی موجود یا غائب ہے اے آج تیرے پاس امانت رکھتی ہوں... اے اللہ! ایمان کے ذریعے ہماری حفاظت فرما اور اس کو ہم پر محفوظ رکھ... اے اللہ! ہمیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور ہم سے اپنا فضل و کرم نہ چھین... ہم تیری ہی طرف راغب ہیں۔ اے اللہ! ہم پناہ طلب کرتے ہیں سفر کی تکلیفوں سے اور پریشانی کی حالت دیکھنے سے اور اہل و عیال اور مال و دولت کے برے منظر سے، اے وہ جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے! اے وہ جو چاہے سو کرے... اے وہ جو بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اپنی طاقت و قوت سے ہمارے اور ہمیں تکلیف دینے والے کے درمیان حائل ہو جا... اے ہر چیز کو مستغنی کرنے والے جس سے کوئی چیز بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

اے ارحم الراحمین! دنیا اور آخرت کی تمام مہمات سے ہمیں مستغنی اور بے پروا کر دے۔
آمین، ثم آمین

یا مجیب، یا مجیب، یا مجیب

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ - 63 فیروز - سٹیشن، ڈیش - مین کورنگی روڈ - کراچی - پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا
کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: سعدیہ سلیم، سڈنی

حج کے دوران وفات پانے والے

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص جو احرام باندھے ہوئے تھا اونٹ سے گرا اور گردن ٹوٹ جانے کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اسے پیری کے پتوں اور پانی سے غسل دے دو اور ان ہی کپڑوں میں کفن دے دو اور اس کا سر نہ ڈھکو کیونکہ قیامت کے دن یہ اسی طرح تھلیل یا تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔“

جامع ترمذی شریف
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلا نوالی

بخش دیا جاتا ہے

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”دو مسلمان شخص جس وقت آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے ان کو بخش دیا جاتا ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ جس وقت دو مسلمان باہم ملیں اور مصافحہ کریں اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور اس سے بخشش چاہیں تو ان کو بخش دیا جاتا ہے۔“

مشکوٰۃ شریف
مرسلہ: صبا نور، لیہ

دیکھا جو حرم کو

روشن ہوئی روح بھی، دل بھی نظر بھی
پہنچی جو تیرے در پر، دیکھا جو حرم کو

حمد

میرے مالک، میرے مولا کرم اپنا سدا رکھنا
رحمتوں کی بارشیں یونہی مجھ پر برسا رکھنا
بات جب آئے میرے گناہوں کی بھرم میرا بنا رکھنا
ذکر جب آئے تیری رحمت کا دروازہ عطا کھلا رکھنا
میرے بس کی بات نہیں عطاؤں کا تیری شمار رکھنا
میری خطاؤں کو ہمیشہ اے غفار بھلا رکھنا
میری دعاؤں کو شرف قبولیت کا اذن دیا رکھنا
جسم و روح کی ہر بیماری میں بس تو اپنی شفا رکھنا
گناہوں کا بوجھ لیے حاضر ہوں، کرم اپنا عطا رکھنا
مجھ نگی کے عیبوں کو اپنی رحمت تلے چھپا رکھنا
شاعرہ: ام ایمان قاضی، کوٹ چٹھہ

نعت

اگر چھوڑ دے مجھ کو سارا زمانہ
ملے جب نہ مجھ کو کہیں بھی ٹھکانا
تو عاصی پہ اپنا کرم کیجیے گا
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا
میں عاشق نبی ﷺ کا بتادوں گا سب کو
فنا میں بقا ہے دکھاؤں گا سب کو
میں سہ لوں گا ہر غم مگر پیارے آقا
مجھے آپ ﷺ اپنا بنا لیجیے گا
گناہوں کی چادر میں لپٹا ہوا ہوں
چھپایا ہے چہرہ کہ سہا ہوا ہوں
مجھے دست شفقت عطا کیجیے گا
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا
مدینے کی گلیوں میں پھرتا رہوں گا
میں دیوانہ اُن کا رہا ہوں رہوں گا
زمانہ ہنسے گا مگر میرے آقا

کیا مانگنے آئی تھی، نہ یاد رہا کچھ
نظریں جو انھیں اوپر، دیکھا جو حرم کو
بن مانگے ملا سب کچھ اک تیرے کرم سے
ٹھنڈک سی پڑی دل میں، دیکھا جو حرم کو
واپس نہ کبھی جاؤں، رہ جاؤں یہیں پر
دل سے یہ دعا نکلی، دیکھا جو حرم کو
کلام: عالیہ ضیاء کراچی

شکر

اگر ہم اپنے آپ پر، اپنے حالات اپنی زندگی
اور اللہ تعالیٰ کی عنایتوں پر نظر ڈالیں تو سارا دن اور
ساری رات بھی شکر ادا کرتے رہیں تو بھی اللہ پاک کی
ایک عنایت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتے ہیں۔

کیونکہ سب سے پہلے تو یہ کہ اس نے ہمیں
مسلمان گھرانے میں پیدا کیا، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان،
ناک، دماغ سب صحیح سلامت عطا کیا اگر ان میں سے
ایک چیز بھی کم ہو جائے تو ہم ادھورے ہیں اگر آنکھ نہ
ہو تو دنیا کی رونقیں نہیں دیکھ سکتے۔ پاؤں نہ ہو تو چلنے
پھرنے سے معذور ہوتے۔ ماں، باپ جیسی دولت عطا
کی۔ کھانے کو دیا، پینے کو دیا، ہر طرح کا سکون عطا کیا تو
ہمیں ہر وقت اٹھتے بٹھتے اپنے رب کا شکر ادا کرنا
چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو شکر گزار بندے بہت پسند ہیں۔
اور وہ شکر کرنے والوں کو زیادہ عطا کیا کرتا ہے۔

تحریر: رفعت مبین رنی، یو ایس اے

دعا

سن	لیں	میری	دعائیں
مدنی	مدینے	والے	
پھر	اپنے	گھر	بلائیں
مدنی	مدینے	والے	
جب	جب	سوئے	مدینہ
جب	قافلے	رواں	ہوں
بس	خواہش	مدینہ	
دل	میں	مرے	جگائیں

گرد	و غبار	پا	میں
میں	ڈھونڈتی	ہوں	راہیں
اک	آس	آرزو	ہے
مجھے	اپنے	گھر	بلائیں
تیرے	کرم	کا	مجھ کو
اک	انتظار	سا	ہے
جاگے	مرا	نصیبہ	
شاہ	عرب	بلائیں	
سن	لیں	مری	دعائیں
مدنی	مدینے	والے	

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

ماں

ایک ایسا پیارا رشتہ جس کا کوئی جواب
نہیں..... یہ رشتہ جب نظروں سے اوجھل ہوتا ہے تو
اولاد کی دنیا اجڑ جاتی ہے۔ بد قسمت ہے وہ اولاد جو اس
رشتے کو پہچان نہیں پاتی۔ آج کل آپ کو ہر جگہ سے ہر
رشتہ دل بہلانے کو اور وقت گزارنے کو مل جائے گا مگر
ماں جتنا عظیم رشتہ نہ ملا ہے نہ کسی کو مل سکتا ہے۔ جن کے
پاس یہ رشتہ ہے وہ اس کا احترام کریں اور جو بے ضائے
ربی اس رشتے سے محروم ہو چکے ہیں ان کے لیے
دعائے مغفرت کریں تاکہ وہ دین و دنیا کی فلاح پائیں۔
مرسلہ: فرح ناز، ملکوال

زلزلہ

دیکھتے	دیکھتے	اس	آفت	نے
کس	قدر	ظلم	آہ	کر ڈالا
کوئی	کیسے	کہے	کہ	کیا، کیا کچھ
زلزلے	نے	بتا	کر ڈالا	

مرسلہ: ماہا بلوچ، میرپور خاص

عورت

☆ ڈاکٹر کی نظر میں ایک تھرما میٹر ہے جو حالات
کے مطابق ٹمپرچر ظاہر کرتی ہے۔
☆ شاعر کے تصور میں قدرت کی شاعری کا

جن کے بلے تلے
ہیں گھروں کے مکین
منتظر کسی مہرباں ہاتھ کے
پیار کا اپنے مرہم ہی
رکھے کوئی
زندگی کی طرف
پھر بلائے کوئی

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ٹھیکا

اپنے بارے میں کبھی برا مت سوچو کیونکہ یہ ٹھیکا
آپ کے رشتے داروں نے اٹھایا ہوا ہے..... اور خاص
طور پر آپ کے کزنز نے.....

مرسلہ: مس فوزیہ، راول پنڈی

نفرت اور محبت

میاں، بیوی کا رشتہ دنیا کا وہ واحد رشتہ ہے جس
میں ایک ہی انسان سے کئی بار نفرت اور بار، بار محبت
ہو سکتی ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

اس ماہ کی انعام یافتہ تحریر

بیمار ساس اور ہم

کتنا آسرا ہے سوئے ہوئے بزرگ کا بھی
ہمیں لگتا ہے ہم اکیلے نہیں
کیسا سکون ہے بیمار کی سنگت میں
یہاں دنیا کے کچھ جھیلے نہیں
دعاؤں کے نادیدہ حصار میں مقید ہیں
اس لیے عذاب ہم نے جھیلے نہیں
غیب کی امداد بھی ہے سوا نیزے پر
ہم بہت خوش ہیں گویہاں میلے نہیں
شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

☆☆☆

مجموعہ ہے۔
☆ قسائی کی نظر میں ایک ایسی چھری ہے جو ذبح
تو کرتی ہے مگر خون نہیں کرتی۔
☆ دھوبی کی نظر میں ایسا کپڑا ہے جو صرف
تعریف کے صابن سے دھویا جاسکتا ہے۔
☆ درزی کی نظر میں ایسا لباس ہے کہ جب پرانا
ہو جائے تو فوراً نظر سے اتر جائے۔
☆ شوہر کی نظر میں شاپنگ کرنے کی مشین ہے۔
مرسلہ: آمنہ ولید، ٹاؤن شپ لاہور

زندگی کے نام

کیسے ممکن ہے
بھول جاؤں تمہیں
زندگی کو بھی بھلا کوئی
فراموش کیا کرتا ہے

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

خوشامد

☆ دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا
سمجھے کہ سچ ہے..... اور..... کہنے والا جانتا ہے کہ جھوٹ
ہے..... وہ خوشامد کہلاتے ہیں۔

واصف علی واصف

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

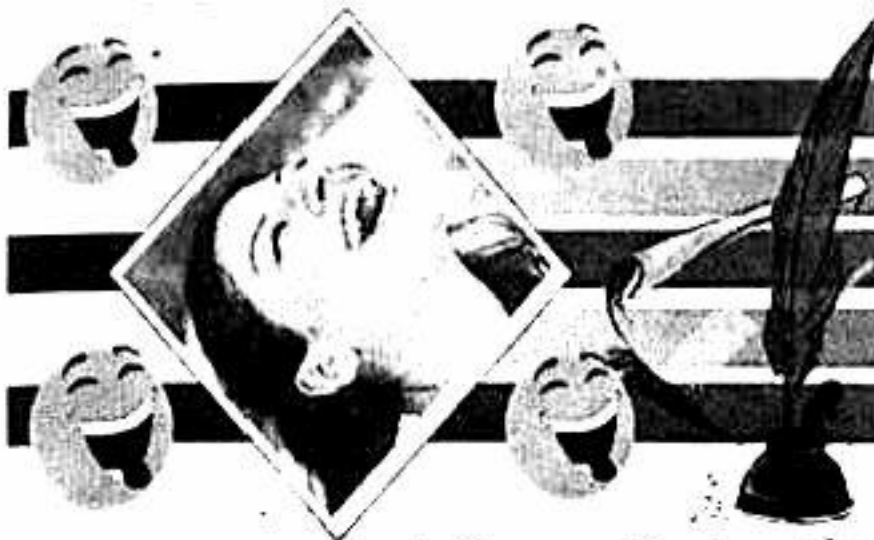
زندگی

ہجوم غم میں کھو گئی برسوں سے
تلاش کرتی ہوں زندگی نہیں ملتی
وہ غم نصیب جنیں، کہاں جائیں
کہ زندگی میں جنہیں زندگی نہیں ملتی
مرسلہ: عائشہ اعوان، رحیم یار خان

بیمار کا مرہم

کھو چکی ہے ہنسی
گم ہوئی ہر خوشی
جو مکاں تھے کبھی
خاک کا ڈھیر ہیں

جنگِ خیمہ انصار



ثاب

”ساری بات نصیب کی ہوتی ہے، دل بھی لگایا تو کس سے.....“ میں اکثر آہ بھر کر سوچتی، یہ حقیقت تھی کہ شارق بڑے مشکل سے شخص تھے بات کرو تو یوں لگتا تھا جیسے بندہ حساب کا پرچہ دے رہا ہو۔

”کل آپ کیوں نہیں آئی تھیں؟“ وہ عجیب کھڑتل سے لہجے میں پوچھتے۔

”آپ کو میری کمی محسوس ہوئی تھی؟“ میرا انگ انگ آنکھوں میں سوال لیے پوچھتا۔

”لاحول ولا قوۃ.....“ اُدھ بھنا جاتے۔

”کیسے آتی میں.....؟“ میں کسی ہیروئن کی طرح اپنا دوپٹا انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہتی۔

”کیا روزانہ ہوائی جہاز پر آتی ہو۔“

”کاش کوئی بایک پر لینے آ جاتا۔“ میں دل ہی دل میں سوچتی مگر کہہ نہ پاتی۔

”یہ سر جھکا کر کیوں بیٹھ گئیں، کیا پوچھ رہا ہوں میں؟“

”گھر میں مہمان آگئے تھے کیسے آتی؟“ میں اپنی

چپل کی نوک سے قالین کا رداں نوچتے ہوئے کہتی۔

”مہمان داری ہوتی رہے گی تو کیا آپ پڑھیں

گی نہیں.....؟“

”کیوں نہیں پڑھوں گی، جب سے ہوش سنبھالا

ہے کتابوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا..... یہی میری

دوست ہیں اور یہی میری دشمن۔“

”کتابیں بھی کہیں دشمن ہوا کرتی ہیں؟“

”ہاں ہوتی ہیں..... جب ان کو یاد کر کے جاؤ

اور امتحانی ہال میں وہ ذہن سے نکل جائیں تب اپنی

کسی سہیلی سے صرف یہ پوچھنا ہوتا ہے کہ پلیز صرف

شروع کا بتا دو باقی میں سب خود لکھ لوں گی۔“

”لگتا ہے آپ کی سہیلیاں بھی آپ جیسی ہیں؟“

”نہیں..... میری سہیلیاں سب کالی کلونی سی

ہیں، میں تو بے حد خوب صورت ہوں۔“ میں انہیں

آگاہی دیتی۔

”افوہ بات کا مطلب کتنا غلط سمجھتی ہیں آپ.....“

مجھے تو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے آپ کی

نالائقی دیکھ کر۔“

”میں نالائق تھوڑی ناں ہوں..... آپ کی ایک

بات کے دس مطلب تو سمجھ جاتی ہوں۔“

”میں آپ کے امتحان کے بارے میں سوچ رہا

ہوں کیا ہوگا.....؟“ وہ سر تھام لیتے۔

”میں ہر امتحان میں پوری اتروں گی۔“ میں شرما

کر کہتی۔

”بہت مشکل ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے۔

”جی کہہ دیا ناں..... اب چھٹی نہیں کروں گی،

میں نے اماں سے کہہ دیا ہے کہ اب گھر میں چاہے کتنے

ہی مہمان آئیں میری وجہ سے کل آپ نے صبا کو بھی

نہیں پڑھایا تھا۔“ میرا لہجہ ٹوٹا پھوٹا سا ہوتا۔

”فیل تو آپ ویسے بھی ہوں گی بالکل ہی گھامڑ

ہیں آپ۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر

کہتے۔

”میں تو سمجھتی ہوں کہ میں پاس بھی ہو گئی۔“

میں آنکھوں میں نشہ بھر کر کہتی۔ اپنی دوست صبا کے یہ

پروفیسر بھائی مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آگئے تھے۔

”خاک ہوں گی آپ پاس.....“ وہ آنکھوں کی

زبان سمجھ ہی نہیں پاتے۔ تب میرا دل چاہتا کہ جو کچھ

میرے دل میں ہے وہ سب کہہ ڈالوں مگر ان کی طبیعت

ایسی تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں دل کی بات ان سے

نہ کہہ پاتی۔

”مگر کیا.....؟“

”جاہل بیوی کے ساتھ گزارہ کرنا مشکل ہوگا۔“

آخر سوال حل ہو ہی گیا۔

”کیا.....!“ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن

تھی پتھر کو چونک لگی تو کیسے۔

”محترمہ آپ جیسی نالائق لڑکی ایک قابل

پروفیسر کی زندگی میں شامل ہو رہی ہے، تمہاری اماں

نے میرے کہنے سے تمہیں لاعلم رکھا ورنہ فیل

ہو جاتیں۔“

”فیل تو پہلے ہوتی اگر آپ مجھے نہ بتاتے غم کے

مارے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ آپ کو کیا پتا محبت سے محرومی

کے غم کیا ہوتے ہیں۔ اب تو ٹاپ کروں گی ٹاپ.....“

میں ہنستی کھلکھلاتی ان کے کمرے سے بھاگ آئی۔

بارش کے بعد

بارش کی کیلی، کیلی سی دوپہر کا وقت تھا مگر بارش

چھما چھم برس رہی تھی۔ چھت کی انگنی کے کپڑے اب

نی وی لاؤنج میں سوکھ رہے تھے..... باہر سے برآمدے

کا سامان بھی اندر آ گیا تھا۔ جنریٹر کو بھی بارش سے

بچانے کے لیے اندر کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا.....

نمبل اور چادریں کھانے کی ٹیبل پر سوکھ رہی تھیں۔

”کتنا گندا گھر ہو رہا ہے، ہر طرف چیزیں پھیلی

ہوئی ہیں.....“ میاں جی اپنے کمرے سے نکل کر آئے

تو تیوری چڑھا کر بولے۔

”بارش میں کون آرہا ہے..... جس کے لیے میں

صفائیاں کروں..... یہ گھر ہے اسپتال تھوڑی جو ہر وقت

صاف ستھرا رہے۔“ (میرا لہجہ بھی کٹ خنسا تھا)

”کوئی نہ بھی آئے..... بے ترتیبی سے ابھن تو

ہوتی ہے ناں.....“ وہ لہجے میں سلیقہ سمو کر بولے۔

”مجھ سے نہیں ہوتی اتنی صفائی ہر وقت

کام..... کام..... مجھ سے نہیں ہوتا..... اور بارش میں تو

اچھے اچھوں کے گھر گندے نظر آتے ہیں۔“

اور پھر یوں ہوا کہ بڑی جیٹھالی اپنی ہائی روف

میں اپنے بچوں کو بھر کر ہمارے گھر آ گئیں۔ ان کے

”سرکل آئیے گا ہمارے ہاں صبا کے ساتھ۔“

ایک دن میں نے ہمت کر کے کہا۔

”نہیں بھئی، یونیورسٹی سے آ کر مجھ میں قطعاً

ہمت نہیں ہوتی کہ کسی کے گھر جاؤں۔“

”مگر اماں نے آپ کو بلایا ہے۔“ میں گھبرا کر کہتی۔

”کوئی خاص وجہ.....؟“ ان کی خفیف سی

مسکراہٹ بھی بے روح ہوتی۔

”ہمارے ہاں حلیم پک رہا ہے۔“ میں دبے،

دبے لہجے میں بتاتی۔

”سوری، میں زیادہ شوق سے نہیں کھاتا ہوں۔“

”پھر کیا کھاتے ہیں؟“ میرا رواں، رواں

سوالیہ بن جاتا۔

”جو مل جائے، سیدھی سادی غذا۔“ وہ

اتراتے۔

”اچھا تو پھر نہیں آرہے آپ.....؟“ میرا لہجہ غم

سے بوجھل ہو جاتا۔

”جی نہیں۔“ تڑ سے کہا جاتا۔

”جی بہت اچھا..... میں اماں کو بتا دوں گی۔“

میں آنکھوں میں ستارے چھپا کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

”ہاں، آنٹی سے یاد سے کہہ دینا۔“ انہوں نے

حکم نازل کیا۔

”بھلا کیا کہہ دوں.....؟“

”یہی کہ اس امتحانی سیزن میں بالکل ڈسٹرب نہ

کریں ورنہ میری ساری محنت اکارت جائے گی اور تم

فیل ہو جاؤ گی۔“

”آپ کو کیا اگر میں فیل ہو گئی تو.....؟“ آنسو

رخساروں سے گرنے کو بے تاب ہو گئے تھے۔

”مصیبت تو میری ہی ہوگی۔“ انہوں نے

کھنکھارا۔

”جی نہیں، آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“ میں

نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”کسی کے کہنے کی میں پروا بھی نہیں

کرتا مگر.....؟“

بچے جب گاڑی سے اتر رہے تھے..... تو مجھے یہی لگا کہ کسی اسکول کے بچے اتر رہے ہیں۔
مگر جب چاچی السلام علیکم..... چاچی السلام علیکم کی تکرار..... کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئی تو میں سمجھ گئی کہ اس خراب موسم میں..... میرے گھر کی خراب حالت کا آج انسپیکشن ہو رہا ہے۔

”قمر آرا..... کیا بیمار ہو.....؟“ بھابی نے پوچھا۔
”ہاں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے.....“ میں نے قدرے نڈھال سے لہجے میں کہا۔
”کیا تم لوگ کہیں شفٹ ہو رہے ہو؟“ وہ جگہ، جگہ سامان پھیلا دیکھ کر بولیں۔
”نہیں تو.....“ میں کھسیا کر بولی۔
”پھر یہ سامان کیوں پھیلا ہوا ہے؟“ جیٹھ

صاحب نے آخر کہہ دیا۔
”وہ بارش ہو رہی تھی ناں..... اس لیے سب چیزیں یہاں آگئیں..... حالانکہ یہ وہاں کی تھیں.....“ میں بدحواسی میں اٹک، اٹک کر بول رہی تھی۔

”کراچی میں بارش ہوتی ہی کتنی دیر کی ہے..... مشکل سے آدھے گھنٹے کی بارش ہوئی تھی۔“ جیٹھانی نے گونہس کر کہا مگر مجھے ان کا جملہ خاصا کس کے لگا۔

اور پھر ایک ہی ہفتے بعد..... جب گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی..... میں اپنے میاں سے ضد کر کے جیٹھ کے گھر گئی..... ان کے ماشاء اللہ درجن بھر بچے..... دو بچے چھت پر..... دو محلے میں..... ابھی ہماری گاڑی ان کے علاقے میں داخل ہوئی تھی اور ان کے دو بچوں نے اپنے گھر میں بخری کردی کہ چاچا، چاچی ان کے گھر آ رہے ہیں..... ڈھیر بچوں کا انہیں کچھ تو فائدہ تو ہونا ہی تھا۔ ان پانچ سات منٹوں میں جب تک ہم ان کے گھر پہنچے..... دو بیٹیوں نے آنا فانا گھر سنگو کر جھاڑو پوچھا لگا دیا..... دو بیٹیاں شامی کباب تلتے ہوئے پکوڑے بنانے کی تیاری کر چکی تھیں..... ہم ابھی بیٹھے ہی تھے..... پکوڑے..... نمک پارے..... کباب..... چٹنی کے ساتھ سامنے رکھ دیے گئے۔

”دیکھا اے کہتے ہیں سلیقہ.....“ گھر آ کر میاں جی موزے ڈرینگ نیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔
”بھابی کے ڈھیر سارے بچے ہیں..... سلیقہ تو ہوتا ہی تھا ناں ہمارے سامنے..... دو فارغ بچیاں تو لوڈو کھیل رہی تھیں۔“ میں نے تنک کر کہا۔

”تمہاری بھی تو دو بیٹیاں ہیں..... ان کو سلیقہ کیوں نہیں سکھایا؟“

”اتنے کم بچوں کو میں کیا، کیا سکھاؤں گی..... ان کی تو آپس کی لڑائیاں ہی ختم ہونے میں نہیں آتیں..... تو وہ سلیقہ کہاں سے سیکھیں گی..... یہ سلیقہ تو ان کے ہاں نظر آتا ہے جن کے ہاں بچوں کی فوج ہوتی ہے..... ہے ناں.....“

☆☆☆

سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای



وِلکمز بُک شاپ

سپینس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

ایم ایس: 27869 کراچی، دبئی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 052-9695984

ای میل: welbooks@emirates.net.ae

www.pdfbooksfree.pk ستمبر 2015ء



☆ انعم حیدر خان..... پاک پتن

قتل کرتے ہیں نہ جینے کی دعا دیتے ہیں
لوگ کس جرم کی آخر یہ سزا دیتے ہیں
جب بھی ہم چاہتے ہیں اُن سے وفاؤں کا صلہ
سر پر لٹکی ہوئی تلوار دکھا دیتے ہیں

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں، پیڑوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ

☆ نگہت زیدی..... اسلام آباد

اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

☆ ایمان چوہدری..... فیصل آباد

بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثل سچ ہے
کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے

☆ ناظمہ شاہین اعوان..... واہ کینٹ

کڑے سفر کا تھکا مسافر تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کر لیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

☆ نفیسہ آرا..... دبئی

مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

☆ ردا اقبال..... اوکاڑہ

اے صبا آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اڑا
ہم نے جل، جل کے تیرے راستے چمکائے ہیں

☆ ناعمہ تحریم..... کراچی

خوشبو کی طرح پھیلے گی یہ بات کبھی تو
بخشنے گا ہمیں شرفِ ملاقات کبھی تو

اب تک کی ملاقاتیں ہیں آئندہ کی خاطر
مل جائیں گے آپس میں خیالات کبھی تو

☆ ماہ رخ..... لطیف آباد

بسا سکتے تھے یادوں کے کئی چہرے کئی پیکر
مگر کچھ سوچ کر ہم نے یہ دل ویران رکھا ہے
ہمیں شوقِ اذیت ہے وگرنہ اس زمانے میں
تیری یادیں بھلانے کو بہت سامان رکھا ہے

☆ عنبر وسیم..... گوجرانوالہ

تجھ کو ڈھونڈے ہے گزرتا ہوا پل، پل جاناں
دیکھ ہم کب سے کھڑے ہیں سرِ مقتل جاناں
اب بھی ہونٹوں پہ الجھتے ہیں تیرے نام کے حرف
اب بھی سانسوں میں مہکتا ہے وہ آنچل جاناں

☆ سیما گل..... ملتان

کبھی جو دل میں رہتا تھا ہمارے
پرائی آنکھ میں اب بس گیا ہے
نہ اس سے تم کوئی امید رکھو
سحر دنیا بڑی ہی بے وفا ہے

☆ سیما ممتاز عباسی..... لاڑکانہ

قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں پاتا
آنکھیں ہی نہیں خالی رستی ہیں لہو سے
اک زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

☆ صدف آصف..... کراچی

اور ہتھیلی سے مہکاریں پھوٹ پڑیں
میں نے تو بس نام تمہارا لکھا تھا
☆ فردوس شاہی..... لاڑکانہ

دیکھی ہے اس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اداس ہے

☆ شازیہ حسن..... کراچی

ایسی حقیقتوں سے تصادم ہوا کہ بس
میں تو گیا ہوں بچ مگر خواب مر گئے

☆ راحت و وفا..... ملتان

خاک مٹھی میں لیے قبر کی یہ سوچتے ہیں
مرتے ہیں انسان تو غرور کہاں جاتا ہے

☆ طیبہ عبید..... کراچی

نہیں کرتی پریشاں ان کو زندگی کی ٹھوکریں
خدا کا نام لے کر جن کو اٹھ جانے کی عادت ہو

☆ بیٹہ..... کھاریاں

شاخ جھکتی جا رہی ہے قربتوں کے بوجھ سے
پیار پہ ترک تعلق کا ثمر آنے کو ہے

☆ کرن ناز..... کھاریاں

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

☆ حمزہ قتیل..... کمالیہ

درد حد سے بڑھا ہے تو یہ احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے پتھر نہیں ہوتا

ہر شخص کو منہ مانگی مرادیں نہیں ملتیں
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

☆ نسا شامخود..... گجرات

نیند پھر شب کو کہاں آپ کی زلفوں کی قسم
ذکر یاں جب سے سرِ شام تمہارا نکلا

☆ فوزیہ الیاس..... کھاریاں

پیار کے سچے مراسم کا پتا دیتا ہے
خط کے القاب میں اس کا مجھے پاگل کہنا

☆ گلنا زگل..... ملتان

اب تو بیٹے بھی چلے جاتے ہیں رخصت ہو کر
صرف بیٹی کو ہی مہمان نہ سمجھا جائے

☆ کائنات عبدالحلیم..... میرپور خاص

روشنی بانٹتے رہنے سے بھر جاتا ہوں
شام ہوتے ہی میں پانی میں اتر جاتا ہوں

میں ہوں پلکوں سے اترتا ہوا آنسو مظہر
چادرِ خاک پہ آتا ہوں تو مر جاتا ہوں

☆ مہرین ضیا بنگش..... کیاڑی

نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرنے کہ نیا سال سب کو اس آئے

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

دل جیتنے کے فن پہ اگر دسترس نہ ہو
دھکتی رگوں کو چھیڑنا دانشوری نہیں

☆ نایاب کرن صدیقی..... کمالیہ

روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
صرف ایک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر

☆ ارم کمال..... فیصل آباد

میں اپنی روح کی پوشاک بھی پہنا دوں اسے
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

☆ یاسمین کنول..... پسرور

مریضانِ محبت کو فقط دیدار کافی ہے
ہزاروں طب کے نسخوں سے نگاہ یار بہتر ہے

☆ ایمن زرناب ڈوگر..... کمالیہ

میں چپ رہوں کبھی بے وجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کے عجب حوصلے تلاش کروں

☆ صائمہ سجاد بنگش..... کوہاٹ

بس یونہی دور جا نکلتے ہیں
بھلا خیال کی سرحد بھی کوئی ہوتی ہے

☆ نگینہ ضیا..... کیاڑی

مگر کے آنسو ختم نہیں ہوتے
لوگ جب بین ڈال دیتے ہیں

☆ کوثر خالد..... جڑانوالہ

شاید شبِ وصال کی منزل قریب ہے
کانوں میں آرہی ہے کسی کی صدا مجھے

☆ جبین نیاز..... ملتان

گلدان سے جب مجھ کو تیری یاس نہ آئی
مجھ کو میرے کمرے کی ہوا راس نہ آئی

☆ ماہ نور قیصر..... راول پنڈی

خاموشی کی تہ جچی تھی ایک مدت سے جہاں
دل کے دروازے پہ وہ جذبے صدا کرنے لگے

☆ زونہ..... دینہ

کہاں تک مجھ سے ہو پاتی ہے اس دل کی نگہبانی
مکاں کی دیکھ بھال اس کے مکس پہ چھوڑ دیتا ہوں

چچ۔ لہسن کے جوئے چھلے ہوئے، آٹھ عدد۔ (باریک کاٹ لیں) تیل، چار کھانے کے چچ۔

ترکیب: فریز کیے ہوئے گوشت کے ٹکڑے نکال کر تیز چھری کے ساتھ باریک پارچے کاٹ لیں پھر ان پارچوں میں نمک، چینی، کالی اور سفید مرچ، سویا ساس، سرکہ، لہسن، کارن فلاور اور میدہ ڈال کر اچھی طرح ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب پکانا ہو تو ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں پھر سب مسالا لگے پارچے ڈال کر تیز آنچ پر اسٹرفرائی کر لیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو آنچ ہلکی کر دیں۔ دوسرے فرائی پین میں ایک کھانے کا چچ تیل ڈال کر ہری مرچوں کو اسٹرفرائی کر کے گوشت میں ڈال دیں پھر تیل کا تیل ڈال کر گرم، گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔ اس کے ساتھ خشکے چاول کھائے جاتے ہیں۔ چاہیں تو کچپ یا ہاٹ ساس کے ساتھ کھائیں۔

مرسلہ: منہ نور خان، بہارہ کھو

جائیز ڈرم اسٹکس

اجزاء: چکن لیگ پیس، آٹھ عدد۔ پیاز، ایک عدد۔ سفید سرکہ، دو چائے کے چچ۔ انڈا، ایک عدد۔ سفید مرچ پسپی ہوئی، حسب پسند۔ چائیز نمک، ایک چائے کا چچ۔ کارن فلاور، ایک کھانے کا چچ۔ میدہ، آدھا کپ۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ (باریک کاٹ لیں)

ترکیب: لیگ پیس کو ایک سرے سے پکڑ کر گوشت کو تیز چھری سے اس طرح کاٹیں کہ وہ ہڈی سے علیحدہ ہو جائے مگر ہڈی کے سرے پر جڑا رہے۔ اس علیحدہ شدہ گوشت پر بھی چھری سے ہلکے، ہلکے کٹ لگائیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے لیے ان پر سرکہ اور چائیز نمک لگا کر رکھ دیں۔ ایک پیالے میں پیاز کو آملیٹ کی

پشوری قیمہ

اجزاء: قیمہ، مشین کا، ایک کلو۔ ثابت دھنیا، دو کھانے کے چچ۔ لال مرچ کٹی ہوئی، ایک کھانے کا چچ۔ لہسن، ادراک پیسٹ، ایک کھانے کا چچ۔ پیاز سلائس میں کٹی ہوئی، دو عدد۔ زیرہ ثابت، ایک چائے کا چچ۔ قصوری میتھی، دو چائے کے چچ۔ ہلدی پاؤڈر، آدھا چائے کا چچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ہری مرچیں، چھ عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ ادراک، باریک کٹی ہوئی، ایک کھانے کا چچ۔ تیل، آدھا کپ۔

ترکیب: ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ زیرہ، ثابت دھنیا، ادراک لہسن کا پیسٹ اور قیمہ ڈال کر فرائی کریں۔ ساتھ ہی نمک، کٹی ہوئی لال مرچ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو قصوری میتھی، ادراک، ہری مرچیں اور پیاز ڈال کر دم پر رکھیں۔ قیمہ گل جائے اور پیاز نرم ہو جائے تو ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم نان اور لیموں پیاز کی سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: فرحین عمران، کراچی

ڈرائی بیف جلیز

اجزاء: گائے کا گوشت انڈر کٹ، ایک کلو۔ بڑے بڑے ٹکڑے کر لیں، ان ٹکڑوں کو ایک سے دو گھنٹے کے لیے فریز کر لیں۔ ہری مرچ، پندرہ عدد۔ (بیج نکال کر کبھی، لمبی کاٹ لیں) سویا ساس، چار کھانے کے چچ۔ چینی، ایک چائے کا چچ۔ کالی مرچ پسپی ہوئی، حسب ذائقہ۔ سفید سرکہ، دو کھانے کے چچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تل کا تیل، چند قطرے۔ کارن فلاور، دو چائے کے چچ۔ سفید مرچ پسپی ہوئی، حسب پسند۔ چکن کیوب ملا ہوا میدہ، ایک چائے کا

طرح کاٹ لیں، ہری مرچیں بھی ملا دیں۔ پھر نمک، سفید مرچ، کارن فلاور، انڈا اور میدہ بھی ملا دیں۔ اس مرکب کو مرغی کی ٹانگوں پر اندر اور باہر اچھی طرح لگا دیں۔ ہاتھ سے پانی لگا کر اچھی طرح شپ دے کر ایک بڑی پلیٹ میں کر کے فریج میں رکھ دیں۔ جتنی دیر فریج میں رکھیں تلنے کے بعد اتنی ہی زیادہ مزے دار ہوں گی کیونکہ تمام مسالے اور خوشبو خوب رچ بس چکی ہوگی۔ کڑاہی میں کافی سارا تیل گرم کر کے ان کو تیل لیں۔ آنچ تیز اور تیل زیادہ گرم نہ ہو ورنہ اندر سے کچی رہیں گی۔ تلتے ہوئے بھی کانٹے سے کچکوائے لگاتے جائیں تاکہ اندر تک پک جائیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر تیل کر نکال لیں اور ڈش میں نکالیں اور ڈش میں سجا کر گرم پیش کریں۔

مرسلہ: نفیہ آرا، راس الخیمہ

کھجور کا میٹھا

کھجور اگرچہ ماہ رمضان میں زیادہ کھائی جاتی ہے مگر موسم سرما میں اس کے بنائے گئے میٹھے بہت قوی اور حدت بخش ثابت ہوتے ہیں۔

اجزاء: کھجور، ایک پاؤ (گٹھلیاں نکال لیں) کریم، آدھا کپ۔ دودھ، آدھا کلو۔ پنا ناریل، دو کھانے کے چمچ۔ میوہ، بادام، پستہ، کشمش، حسب ضرورت و حسب استطاعت۔ چینی، دو کھانے کے چمچ اگر ضرورت ہو تو ورنہ کھجوریں میٹھی ہوں گی۔

ترکیب: کھجوروں کو دودھ میں اچھی طرح ابال کر نرم کر لیں اور پھر میٹھا کر لیں اس میں چینی، کریم، ناریل اور میوہ ڈال کر پکائیں اور خوب گاڑھا کر لیں۔ یکجا ہو جائیں تو ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔ چاہیں تو اوپر سے بھی باریک کٹا میوہ چھڑک دیں۔

مرسلہ: عرشہ جنید، کراچی

شاشلک

اجزاء: بکرے کا گوشت، آدھا کلو، بغیر ہڈی کا۔ پیاز، درمیانے دو عدد۔ ہرے سیب، دو عدد۔ انڈا، ایک عدد۔ شملہ مرچ، دو عدد۔ سویا ساس، دو کھانے

کے چمچ۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ تیل، 3/4 کپ۔ لال ٹماٹر، تین عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ اجینو موتو، حسب ذائقہ۔ کارن فلاور، دو چائے کے چمچ۔

ترکیب: گوشت کے چار 1/2 انچ موٹے پارچے بنا کر ان کے تقریباً ڈیڑھ، ڈیڑھ انچ کے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ پیاز، مرچیں، ٹماٹر اور سیب سب کے ایک، ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ گوشت کے ٹکڑے سبزیوں کے ساتھ ملا کر سویا ساس، نمک، چائیز نمک، سرکہ، سیاہ مرچ، انڈا اور کارن فلاور ملا کر رکھ دیں۔ اب شاشلک بنانے والی سیخوں یا تنکوں میں اس طرح پرو دیں کہ پہلے ایک بوٹی پھر پیاز پھر شملہ مرچ، ایک سیدھے پینڈے کی فرائی پین میں تیل گرم کر کے ان سیخوں کو گھما، گھما کر تیل کر چاروں طرف سے پکائیں۔ ابلے چاولوں کے اوپر رکھ کر پیش کریں۔ شاشلک چکن اور بیف کے بھی بن سکتے ہیں۔

مرسلہ: بینا عباس، کراچی

سیب کی کھیر

اشیا: سیب، دو عدد کش کر لیں۔ کوکونٹ ملک، تین کپ۔ سبز الائچی، دو عدد۔ مکھن، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول کا آٹا، دو کھانے کے چمچ۔ فریش کریم، ڈیڑھ کپ پھینٹی ہوئی۔ چینی، آدھا کپ۔ بادام، پستے سجاوٹ کے لیے۔

ترکیب: ایک پتیلی میں مکھن گرم کر کے الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ اب اس میں چاول کا آٹا ڈال کر بھونیں اور مہک آنے پر چولھے سے اتار کر مسلسل چمچ چلاتے ہوئے اس میں کوکونٹ ملک شامل کریں اور اچھی طرح مکس کر کے دوبارہ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ساتھ چینی بھی ڈال دیں۔ جب گاڑھا ہونے لگے تو اس میں کش کیے ہوئے سیب، بادام، پستے ڈال دیں۔ تھوڑی دیر پکانے کے بعد چولھے سے اتار لیں۔ جب کھیر ٹھنڈی ہو جائے تو اس میں کریم ڈال کر مکس کریں اور سرونگ ڈش میں نکال لیں۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور



جھائیاں اور ان سے مکمل

بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

جھائیوں سے بچاؤ بہت آسان اور مکمل مستقل مزاجی سے ہی ہو سکتا ہے۔ آپ کو اپنے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق خوراک، ادویات اور ہلکی پھلکی ورزش یہ سب مل کر مستقل طور پر کرنا ہوگا۔ ابھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا وقفہ ہو جائے تو کوئی بات نہیں مگر مستقل بے پروائی آپ کی جلد کو مزید خراب کرنے کا باعث ہوگی۔

جھائیوں کا مکمل میڈیکل علاج:

جیسے، جیسے سائنس نے بے پناہ ترقی کی ہے ویسے ویسے جھائیوں اور جلد کی دوسری بیماریوں کے علاج بھی اب بہت آگے جا چکے ہیں۔ جھائیوں کے علاج کے سلسلے میں سب سے اہم بات وٹامن سی کا استعمال، سورج کی شعاعوں سے بچاؤ کے لیے سن اسکرین، ہارمونز کی ہلکے جانچ، ٹینشن اور پریشانیوں سے نجات بہت ضروری ہے۔ آپ کو پانی اور دودھ کا استعمال خاصی حد تک بڑھانا ہوگا۔ ایسی کریمیں جن میں وٹامن سی اور Hydrog cartizone شامل ہوں صرف اور صرف ڈاکٹر کے مشورے سے ہی استعمال کی جاسکتی ہیں اگر کوئی بھی خاتون یا شخص اپنی مرضی سے ایسی ادویات یا کریمیں استعمال کرے گا تو ہو سکتا ہے بہت ہی زیادہ نقصان ہو جو ناقابل تلافی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ نہ صرف جھائیوں کی رنگت اور زیادہ سیاہ ہو جائے بلکہ آپ کا پورا چہرہ ہی خراب ہو جائے۔

جدید علاج کے علاوہ آج کل Peeling بھی موجود ہے جو بہتر طریقہ علاج ہے اور اس کے کوئی نقصانات بھی نہیں ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ Peeling صرف اور صرف ماہر اور مستند ڈاکٹر سے ہی

کروانی چاہیے کہ اسے آپ کی جلد کی ساخت اور اندرونی عوارض کا پوری طرح سے علم ہو اور وہ آپ کی صحت، عمر اور ساخت کی کیفیت کے حساب سے آپ کا علاج کرے اور اس کے بعد کیا دوا تجویز کرنی ہے اسے اچھی طرح سے معلوم ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ peeling کا عمل ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اور صرف ماہر ڈاکٹر کی نگرانی میں ہونا چاہیے کیونکہ غیر سند یافتہ شخص آپ کی جلد کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

عام طور پر جلد سرخ و سفید اور شاداب کیسے رہی جاسکتی ہے

اگر ہم اپنے اندر سے بلاوجہ کا حسد و بغض، کینہ اور ٹینشن نکال دیں۔ باوجود ہیں، پانچ وقت نماز پڑھا کریں۔ ہلکی پھلکی غذائیں کھائیں۔ مرغن غذاؤں سے بچیں، پانی اور دودھ کا استعمال بڑھائیں۔ سرسبز و شاداب علاقے میں ہلکی پھلکی ورزش اور چہل قدمی کریں۔ غرض یہ کہ سکون کی زندگی گزاریں تو اس کا عکس ہمارے چہرے پر بھی آ جائے گا اور ہم نکھرے، نکھرے، خوب صورت اور دلکش نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ خواتین کا زیادہ تر وقت بچن میں گزرتا ہے تو اس کے لیے آپ بچن کی چیزوں سے فائدہ اٹھائیں۔

کچی سبزیاں جو بہ آسانی کھائی جاسکیں استعمال کریں۔ مرغن غذاؤں سے بہتر ہے کہ پھل اور سبزی سے پیٹ بھریں۔ ہرے پتوں والی سبزیوں کا استعمال کریں۔ ہرے پتوں والی سبزیوں کا استعمال فولاد کی کمی پوری کرے گا۔ اپنی بچیوں کو بچپن سے ہی باقاعدگی سے دودھ پینے کی عادت ڈالیں تاکہ آرن اور کمیلیم مل سکے۔ اس کے ساتھ، ساتھ مختلف قسم کی پھلیوں کو غذا میں شامل کریں۔

☆☆☆

بزرگ پاکستانی پریز پاکستانی پریز



جواب۔ حیرت ہے کیا ٹی وی کے ٹاک شو نہیں دیکھتی ہو تم..... مجھے تو جھوٹے فریبی لوگوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑی ہنسی آتی ہے۔

عذر الیافت..... فیصل آباد

سوال۔ سب لوگ روٹی گول ہونے کا ہی اصرار کیوں کرتے ہیں؟

جواب۔ انہیں ٹیڑھی میڑھی محبت سے پکی ہوئی روٹی کی لذت معلوم نہیں ہوتی۔

نرگس نسیم..... صابہ موہڑہ

سوال۔ باجی جب میں نسوار کلر کی ساڑی پہنتی ہوں تاں تو.....؟

تو میں سب کو قوام جیسی دلکش نظر آتی ہوں۔

شمع خالد..... جڑانوالہ

سوال۔ کیا سبزیاں صرف غریب غربا ہی کھاتے ہیں؟

جواب۔ نہیں، موٹے اور مریض بھی سبزیاں کھاتے ہیں۔ کولیسٹرول والے تو بہ حالتِ مجبوری بھی کھاتے ہیں۔

عبر وسیم..... گوجرانوالہ

سوال۔ آنٹی کھیانی ہنسی کسے کہتے ہیں؟

جواب۔ جب ہنستے ہوئے رونے کو دل چاہے۔

فردوس شاہی..... لاڑکانہ

سوال۔ کہتے ہیں کہ زندگی ایک امتحان ہے تو اس

کارول نمبر کہاں ہے۔

جواب۔ بغیر رول نمبر، بغیر ایڈمٹ کارڈ اور بغیر

امتحانی سینٹر کے..... یہ امتحان ہوتا رہتا ہے۔

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری، گجرات

سوال 1۔ اگر میرے جیسی بوڑھی خاتون کو گڑیا کہا جائے تو وہ کیا محسوس کرے گی؟

جواب۔ یہی کہ سچ بولنے والے اب بھی موجود ہیں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ ارم ڈوگر..... کمالیہ

سوال۔ امتحان میں بغیر محنت، بغیر نقل اور بغیر رشوت..... کامیابی حاصل کرنے کا آسان سا طریقہ بتادیں؟

جواب۔ پھر خواب میں امتحان دے دو اور خوابوں میں ہی ٹاپ بھی کرلو۔

حمنا قتیل..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال۔ مسالا زیادہ ڈالوں تو ساس کا موڈ خراب ہوتا ہے اور مسالا کم ڈالوں تو کھانا خراب ہوتا ہے، کیا کروں؟

جواب۔ نندوں سے پکوا یا کرو..... تم کیوں جاتی ہو کچن میں۔

اُم ایمان قاضی۔ کوٹ چٹھہ

سوال۔ ایک بیٹی اور ایک بہو کے لیے ایک ہی قسم کے معاملات میں اصول کیوں مختلف ہوتے ہیں؟

جواب۔ ساس ماں بننے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی بہو..... بیٹی بننے کے لیے رضامند ہے تو پھر ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔

ایمن رانی..... پنجاب

سوال۔ چلو پھر آج کوئی بچپنے کا کھیل کھیلیں ہم

بڑی مدت ہوئی بے ساختہ ہنس کر نہیں دیکھا

جواب۔ بے فکری کے چند سال ہی کافی ہیں
جب آپ آئینہ دیکھنا چھوڑ دیں۔
نازیہ نازی..... نوشہرہ کینٹ
سوال۔ نفسیاتی سا ہونے کے لیے کیا بے وقوف
ہونا ضروری ہوتا ہے؟

جواب۔ چڑچڑے لوگوں کو بھی نفسیاتی ہونے کا
میڈل مل سکتا ہے۔

انیسہ زینب..... شیخوپورہ
سوال۔ اگر پاکستان کا وزیر اعظم کسی پاکستانی
اداکارہ کو بنا دیا جائے تو کس کو بنایا جائے؟
جواب۔ کوئی بھی..... میرا..... ماہرہ..... عائشہ
عمر کسی کو بھی۔

مسز روزینہ عابد..... کراچی
سوال۔ سیدھی آنکھ پھڑکے تو غم اور الٹی آنکھ
پھڑکے تو خوشی ملتی ہے۔ مگر میری تو دونوں پھڑک رہی
ہیں، کیوں؟

جواب۔ آپ آشوپ چشم میں گرفتار ہیں۔
فلک بنت ندیم..... حیدرآباد
سوال۔ کس طرح کے لوگ جلد ناراض ہو جاتے
ہیں؟

جواب۔ جس سے بھی بدتمیزی کرو، سب ہی
ناراض ہو جاتے ہیں۔
فرحین..... لاہور

سوال۔ مست گستاخی کرنا اس سے..... کس
سے؟

جواب۔ اپنے شوہر کی ماں سے کہ ماں صرف
ماں ہی ہوتی ہے اور ان سے بدتمیزیاں نہیں کی
جاتیں۔

نور افشاں..... شکارپور
سوال۔ کتابی چہرے کیسے ہوتے ہیں؟
جواب۔ جن کی پیشانی پر دیباچہ درج ہوتا ہے۔

☆☆☆

شہلا نواز..... لاہور
سوال۔ عمر یا بیتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے.....
بتائیے کیا کروں؟
جواب۔ کسی اچھے اور قابل اعتماد میرج بیورو
سے رابطہ کریں۔

سیدہ غزالہ عالم..... لاٹھی
سوال۔ 2015ء تو گزر گیا، یہ سال کس کا تھا۔
جواب۔ گزرنے والوں کا۔

ماہ رخ..... حیدرآباد
سوال۔ مینڈ کی کوز کام کب ہوتا ہے؟
جواب۔ جب وہ کچن کے کام نمٹا کر اپنے اے
سی چلتے کمرے میں آ جاتی ہوگی۔

انیقہ صدف..... لطیف آباد
سوال۔ سفید جھوٹ کسے کہتے ہیں؟
جواب۔ جو سفید سوٹ پہن کر بولا جائے۔

نسیم منظر..... بفرزون
سوال۔ افواہیں کیسے پھیلتی ہیں؟
جواب۔ موبائلز اور ٹی وی کے چینلوں سے؟

صائمہ سجاد بگلش..... کوہاٹ
سوال۔ ان کے تیل نے ہمارے تیل کو ٹکر
مار دی؟

جواب۔ تم اُن کی کھڑی بائیک کو اپنی سینڈل سے
کچل دو۔

ارم کمال..... فیصل آباد
سوال۔ تو، تو اور میں، میں کا اینڈ کیا ہوتا ہے؟
جواب۔ دور فٹے منہ..... پر.....

پروین افضل شاہین..... بہاول نگر
سوال۔ طبیعت زیادہ خراب ہو تو کس سے رجوع
کیا جائے؟

جواب۔ اسی سے جس کی وجہ سے طبیعت خراب
ہوئی ہے۔

یاسمین اسرار..... کمالیہ
سوال۔ کمر کو کمر بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟



ادارہ

روحانی مشورے

نماز شکرانہ پڑھنا اپنی عادت بنالیں۔ یاد رکھیے گا اللہ تعالیٰ شکر ادا کرنے والوں کو ہمیشہ زیادہ دیا کرتا ہے۔ اللہ پاک کے کلام مجید میں بہت شفا اور برکت ہے۔ سورہ قاریہ لکھ کر اپنے ساتھ رکھیں یا دفتر، دکان، مکان میں کسی پاک جگہ پر رکھ دیں چھوٹی سی سورہ ہے جلد یاد ہو جائے گی اس کا ورد بھی کرتے رہیں۔

جب طبیعت میں چڑچڑاہٹ ہو

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بلا وجہ غصہ آتا ہے اور طبیعت میں تناؤ سا آ جاتا ہے۔ نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے اور اگر کچھ کھا بھی لیا جائے تو تسلی نہیں ہوتی۔ جب آپ کا مزاج ڈپریشن بھی محسوس کر رہا ہو اور بے بات رونا بھی آ رہا ہو تو آپ فوراً وضو کر کے دو رکعت نماز توبہ پڑھیں اور درود شریف پڑھنا شروع کر دیں..... آپ خود دیکھیں گی کہ صرف پندرہ منٹ میں آپ کے مزاج کا تمام چڑچڑاہٹ اپن از خود ختم ہو جائے گا۔ (انشاء اللہ)

اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے

سب سے پہلے نماز کی پابندی کریں..... بزرگوں کی دعائیں لیں۔ حسب استطاعت صدقہ روزانہ دیں..... یا معید یا مقدم کی ایک، ایک تسبیح دس دن تک مسلسل پڑھیں اول و آخر درود ابراہیمی کے ساتھ انشاء اللہ حسب پسند ملازمت مل جائے گی۔

نظر لگنا

بچوں کو نظر لگ جانا حقیقت ہے اور ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے اس کی تصدیق کی ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی ہدایت کی ہے کہ چھوٹے بچوں کو مغرب کے وقت گھروں سے لے کر نہ نکلا جائے اور جب تک اندھیرا نہ پھیل جائے..... (عشا تک) انہیں

ڈینگی وائرس کا موثر علاج

☆ سیب کے جوس میں لیمن کے چند قطرے ملا کر ڈینگی وائرس کے مریض کو پلایا جائے تو اس سے پلینٹیس کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے یہ ڈینگی وائرس کا آزمودہ علاج ہے۔ اب آپ اس... جوس پر 41 مرتبہ سورہ فاتحہ (الحمد) اول و آخر تین مرتبہ درود ابراہیمی بھی پڑھ کر دم کر دیں۔ انشاء اللہ سو فی صد افاقہ ہوگا۔

برے اثرات، حاسدین اور

شر پسندوں سے بچاؤ کے لیے

☆ روزانہ بلند آواز میں سورہ بقرہ کی تلاوت کریں اگر آپ پوری نہیں پڑھ سکتے تو ایک رکوع ہی پڑھ لیں اور ایک رکوع پڑھنے کا بھی ٹائم نہیں ہے تو ایک صفحہ ہی پڑھ لیں مگر ہر روز پڑھیں..... کسی دن کا ناغہ نہ کریں۔ (سوائے اس کے آپ کو ناپاکی کی وجہ سے پڑھنا نہ ہو) چند ہی دنوں میں آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے پڑھنے کی وجہ سے آپ کی پریشانیاں کتنی آسانی سے از خود ختم ہو گئی ہیں۔ آپ خود بھی پڑھیں اور دیگر لوگوں کو بھی پڑھنے کو کہیں..... اس سے آپ بھی ایک نیک عمل میں شریک ہو جائیں گی۔

کاروبار میں ترقی کے لیے

اگر آپ کی کوئی دکان، آفس، یا کمپنی ہے اور گھانٹے میں جارہی ہے تو سب سے پہلے صدقہ دیں..... اور خیال رکھیں کہ آپ کے رشتے داروں یا آس پڑوس میں کوئی یتیم، غریب، مسکین ہے تو اس کی مدد کریں۔ اور اپنے آفس میں کسی قسم کی تصاویر نہ لگائیں۔ صبح جا کر تلاوت کریں..... روزانہ دو رکعت

جوشاندہ بنا کر پی لیں انشاء اللہ اچھی اور پرسکون نیند آئے گی..... اور جن لوگوں کو راتوں کو جاگنے کی عادت ہے انہیں جوشاندہ پینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ساری رات ٹی وی دیکھنے کے بجائے استغفار کی تسبیح پڑھا کریں تاکہ وقت تو ضائع نہ ہو۔

بال خوب لمبے ہو جائیں

اگر آپ کے بال گر رہے ہوں اور کسی صورت بڑے نہ ہو رہے ہوں تو یہ نسخہ ہمیں ایک قاری بہن نے راول پنڈی سے بھیجا ہے۔ بقول عاصمہ بہن کے یہ ان کا آزمودہ ہے۔ اس کے لیے آپ دو مٹھی پتری تمباکو لے لیں اور صرف ایک مٹھی نیم کے خشک پتے۔ ان کو اسٹیل کے تین گلاس پانی (یا کوئی بھی گلاس کا پیانا لے لیں) میں کسی اسٹیل کی پتلی میں یہ دونوں چیزیں پکنے کے لیے رکھ دیں اور جب پانی آدھا گلاس رہ جائے تو چھان کر یہ پانی علیحدہ رکھ لیں اور تمباکو اور نیم کے پتے ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔

اب کڑا ہی میں آدھا کلو سروسوں کا خالص تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں یہ تمباکو اور نیم کی پتی کا عرق جو ہمارے پاس آدھا گلاس موجود ہے اس تیل میں ڈال دیں۔ اب چولہا تیز کر دیں۔ اور کڑا ہی پر ڈھکن ڈھک دیں۔

تیل جب تیز پکنے لگے تو چولہا ہلکا کر دیں جب ہمیں یہ اندازہ ہو جائے کہ اس تیل میں ہم نے جو پانی ڈالا تھا وہ ختم ہو گیا ہے تو اتار لیں اور ٹھنڈا ہو جانے پر اسے شیشی میں گیارہ مرتبہ سورہ فاتحہ اور سات مرتبہ سورہ بقرہ پڑھ کر اس تیل پر دم کر دیں۔ رات کو سر میں اچھی طرح لگا کر سو جائیں اور سیمپو کم سے کم کریں۔ آج کل بالوں کا ستیاناس صرف شیمپوز کے زیادہ استعمال کی وجہ سے بھی ہو رہا ہے اور دوسرے ہم نے تیل لگانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ لڑکیاں روزانہ تیل نہیں لگا سکتیں مگر ہفتے میں دو دن تو لگا سکتی ہیں۔ اس تیل کے اثرات تین ماہ کے اندر انشاء اللہ آپ خود دیکھ لیں گی۔

☆☆☆

گھروں میں ہی رکھا جائے..... اس وقت آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا ہے اور گھر سے باہر نکلے ہوئے بچے اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یوں بھی جب ہم بڑے بھی گھر سے باہر نکلیں تو آیت الکرسی پڑھنے کی عادت پکی کر لینی چاہیے۔ بعض گھرانوں میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بچے کسی وجہ سے بھی بیمار ہوں اس ضمن میں آپ کی بے احتیاطی کی وجہ بھی نمایاں ہو مگر وہ پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے بچے کو نظر لگ گئی ہے..... کوئی غلط فیصلہ کرنے کے بعد جب اس کا نتیجہ حق پر نہ نکلے تو اسے بھی بد نظری سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے..... اسی طرح رزق میں تنگی آجائے یا کمی ہو جائے تو یہ نتیجہ نکالنا کہ میرا رزق کسی نے باندھ دیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم سب کا رازق صرف وحدہ لا شریک اللہ ہی کی ذات ہے۔ اگر میرا رب مجھے رزق دینا چاہے تو مخلوق میں سے کسی کی بھی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرا رزق باندھ سکے اور اگر خدا نخواستہ میرا رب کسی بندے پر رزق تنگ کر دے تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اسے رزق دے دے۔ اللہ اپنی مرضی کا مالک ہے اور وہ اپنی مرضی کے بغیر نہ کسی کی سفارش سنتا ہے اور نہ کسی کی مجال ہے کہ اسے مجبور کر سکے..... اس لیے جب رزق کی کمی ہو تو ہمیں اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ استغفار پڑھنا چاہیے۔ توبہ کے نفل پڑھنے چاہئیں۔ اور معوذتین سورہ فلق، سورہ ناس کا ورد ضرور رکھیں۔ اور جب ہمارا اللہ ہم سے راضی ہوگا تو ہماری ساری مشکلات از خود ختم ہو جائیں گی..... اس لیے پیارے قارئین کرام..... لوگوں کی خوشامد، بے جا سفارش کے بجائے اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں..... کہ وہ جس کا دوست ہے اس کا کوئی دشمن نہیں۔

بے خوابی

رات کو نیند نہ آنے کی شکایت ہو..... تو دو رکعت توبہ کے نفل پڑھیں۔ پہلے کلمے کی تسبیح پڑھیں اور سوٹھ کا



شواہے ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھلتے جا رہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اچھا رہا جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولما شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں،

ڈسمینو ریا

آمنہ فیصل..... فیصل آباد

مجھے ایام کے وقت الٹیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں

ٹوکن

برائے شواہے ہومیوکلینک

جنوری 2016

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

Downloaded From

Paksociety.com

پتا:



ہے۔ میں اس کے ساتھ رپورٹ
نتھی کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی
میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز
کریں تاکہ اس مرض سے نجات
مل جائے۔

جواب: کھانے کے ساتھ اور بعد پانی کا
استعمال نہ کریں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغ
اور بھاری غذا کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی اشیاء،
مرچیں، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی
تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کہ کس
چیز سے تیزابیت ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا
باعث بنتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی
Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10
قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔
ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

جوڑوں کی آوازیں

حافظ سلیم.....ضلع بدین

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے
جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں پاؤں بلاتا تھا تو
ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔
ڈاکٹر صاحب اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے بیٹھتے
وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی
ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔
اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ویری کوسل
ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں
اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: جب ہم بالغ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم
میں اور جذبات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔
والدین اور بڑے بزرگوں سے جھجک و گھبراہٹ کے
باعث ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم عمر لوگوں
سے کرتے ہیں جن کو خود کچھ نہیں پتا ہوتا۔ نتیجتاً غلط
معلومات پر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت عام مسئلہ

اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔
پھر ایک دن بعد Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60
کی ایک، ایک گولی دن میں 3
مرتبہ میں چوسیں۔

لیکوریا

امامہ ارم.....سکھر

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80%
بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان
ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے
بال کالے جائیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت بھی ہے،
تقریباً چودہ سال سے ہے۔ میرا پیٹ بھی بڑھ گیا ہے۔
دواؤں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے۔ آپ میرے
لیے اچھی سی دوا تجویز کر دیں تاکہ میرے مسئلے حل
ہو جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری،
شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے
ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا
ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں کچھ افاقہ ہونے پر
علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی
کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ بڑھ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر
ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال
کریں۔ Borax-30، Lycopodium-30،
Calc. carb-30، Pulsatilla-30۔ ہر بوتل میں
سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں
3 مرتبہ پیئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

معدے کا مسئلہ

رمیش.....کوٹ ادو

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے
ہے۔ معدے میں درد رہتا ہے۔ کھانے کے بعد کبھی
فوراً اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہو جاتی ہے۔
الٹراساؤنڈ سے معلوم ہوا۔۔۔ کہ مجھے معدے کا السر



ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو اس جانب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اپنے نو جوان بچوں اور بچیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے رہنمائی کی جائے کہ

وہ بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔

آپ قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. Staphisagria-30، phos-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

گردے کی پتھری

حمیرا کلیم..... ضلع شکر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 8 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہو میو پیٹھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی، علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 17cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تک آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لکھا ہے کہ آپ علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جس بھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا

اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پیئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیرھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی ایک گولی تھورے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔

مختلف بیماریاں

رومان المان.....راولپنڈی

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے مسئلے کا حل بتادیں۔ میں بہت پریشان ہوں اور اب تو شدید مایوسی کا شکار ہو چکی ہوں۔ میرے موجودہ مسائل جن کا میں جلد حل چاہتی ہوں وہ چہرے کے دانے اور داغ دھبے، چہرے اور سینے پر بالوں کا آنا، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں، گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کیلشیم کی بھی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹراساؤنڈ، پیشاب ٹیسٹ رپورٹس بھجوا رہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتادیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اور آپ کی احسان مند رہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو جواب جلد دے

بعد 30، Pulsatilla-30، Thyroidinum-30
، Fucus ves-Ø، Phytolcca- e-beccis-Ø
Ruta-30، Physostigma-30 کے 7-7 قطرے
ایک کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت
سے مطلع کریں۔

سورانسس

مسز فا کہہ ارسلان..... آزاد جموں کشمیر

میں ایک تکلیف دہ مسئلے کی طرف آپ کی توجہ
دلارہی ہوں۔ میں پانچ چھ سال سے دونوں پاؤں
میں ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس کا بار بار علاج
کرنے کے باوجود وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل
نہ ہو سکا۔ پہلے کئی بار ایلو پیتھک علاج کرایا۔ ان
لوگوں نے سورانسس تجویز کیا۔ بعد میں ہومیو
پیتھک علاج بھی کروایا۔ علاج سے وقتی فائدہ تو
ہو جاتا ہے لیکن مکمل افاقہ نہیں۔ مرض پھر بڑھ جاتا
ہے۔ میں Housewife ہوں۔
عمر تقریباً 60 سال ہے۔

مہربانی کر کے اس لا علاج بیماری کا مناسب حل
تجویز کریں جس سے مستقل افاقہ ہو اور مجھے صحت کاملہ
نصیب ہو۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی
Bacilinum 200 کی ایک خوراک ہفتے میں
ایک دفعہ لیں، ایک دن کے وقفے کے بعد Ars.iod
30 اور 30 Hydrocotyle کے بھی
5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت
سے مطلع کریں..... شوگر ٹیسٹ کروائیں اور میٹھی
چیزوں کا استعمال بھی کم سے کم کریں۔

شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات تین ماہ تک
استعمال کرائیں Physostigma 30، Calc
Phos 30، Calc. Flour 30 کے 5، 5
قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال
کرائیں۔

بیماریاں

عاصمہ..... فیصل آباد

ماہواری سے پہلے الٹیاں آتی ہے۔ کچھ بھی کھایا پیا
ہو سب نکل جاتا ہے۔ پھر معدے کے منہ پر درد شروع ہو
جاتا ہے۔ نہ پیٹ کھانے کو لہے بال بھی گرتے ہیں اور
میں نے آپ کو عینک کے متعلق بھی لکھا تھا۔ آنکھوں کی
سیدھ میں سر میں درد ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر کیل
نکلتے ہیں اور ناک پر بلیک ہیڈز بہت زیادہ ہیں۔ اب میرا
جسم پھول گیا ہے اور طاقت نہیں ہے، سیرھیاں چڑھنے
سے سانس پھولتی ہے۔ میرے منہ میں تالو والی جگہ پر
خارش ہوتی ہے۔ اکثر منہ میں چھالے نکل آتے ہیں۔
جب خارش ہوتی ہے تو زبان تالو پر پھیرنے سے چھینکتی
آتی ہیں اور غصہ بہت آتا ہے۔ تھوڑا سا کام کر کے تھک
جاتی ہوں۔

جواب: بی بی آپ کا مسئلہ ہارمونز کی خرابی کا ہے
اس لیے آپ کو باقاعدگی سے اس کو ٹھیک کرنے کے لیے
علاج کرنا ہوگا۔ خطوط کے ذریعے جواب دے دیا جاتا
ہے۔ فون نمبر دینا بیکار ہے کہ ہر کیس یاد نہیں رکھا جاسکتا
کہ کس کو کیا ہے؟ اور کیا دوائی دی؟ خط میں بھی پچھلی
دوائیوں کا ذکر ضرور کیا کریں تا کہ معلوم ہو کہ پہلے کیا دیا تھا
اور اب کیا صورت حال ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی
Calc carb-200 کی ایک خوراک 5 قطرے ایک
گھونٹ پانی میں ہر ہفتہ لیں ایک دفعہ اس کے ایک دن



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی